خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

MEMBER	
APNS	رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
CPNE	رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ـــــ 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ـــــ 6000 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا ـــــ 7000 روپے

ستمبر 2016
جلد 44 شمارہ 5
قیمت 60 روپے

رنگا رنگ پھول

میری بیاض سے

پکوان

نفسیات

بیوٹی بکس

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔
پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیر

کرن کرن روشنی

خواتین ڈائجسٹ کا ستمبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔
یہ شمارہ آپ کو ملے گا تو عید الاضحیٰ کی آمد آمد ہو گی۔ آپ سب عید الاضحیٰ کی تیاریوں میں مصروف ہوں گی۔
آپ سب قارئین کو ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے عید مبارک۔ ہماری دعا ہے عید آپ کے آنگن میں سچی اور حقیقی خوشیاں لے کر اترے۔ آمین۔
دین اسلام انسان اور انسانیت کی فلاح اور بہبود کا پیغام لے کر آیا ہے۔ اس کے تہوار بھی اجتماعیت کا رنگ لیے ہوتے ہیں۔ عید الفطر پر جہاں فطرانے کی ادائیگی کے ذریعے غریبوں کو عید کی خوشیوں میں شامل ہونے کا موقع دیا جاتا ہے، وہیں عید الاضحیٰ پر قربانی کے گوشت میں غریبوں کو شامل کر کے انہیں گوشت سے لطف اٹھانے کا موقع دیا جاتا ہے جو اپنے حالات کی وجہ سے اس نعمت سے سارا سال محروم رہتے ہیں۔
عید الاضحیٰ قربانی کے ایک عظیم واقعہ کی یاد میں منائی جاتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اپنے فرزند کو قربانی کے لیے پیش کر کے ثابت کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر عزیز ترین شے بھی قربان کی جا سکتی ہے۔ ہمیں بھی اپنے پروردگار کی رضا اور خوشی کے لیے اپنی خواہشات کو اس کے حکم کے تابع کر دینا چاہیے۔
عید کے موقع پر اپنے ارد گرد موجود مستحقین کو ضرور یاد رکھیں۔ یہ ان کا حق اور آپ کا فرض ہے۔

ایک وضاحت،

قارئین کو مطلع کر رہے ہیں کہ فیس بک پر ہمارے ادارے کا کوئی آفیشل پیج نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو خواتین ڈائجسٹ، شعاع یا کرن سے منسلک ظاہر کرتا ہے تو وہ غلط ہے اور اس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ قارئین محتاط رہیں اور اس سے کسی بھی قسم کے رابطے سے گریز کریں۔

اس شمارے میں،

- نمرہ احمد کا مکمل ناول۔ نمل،
- کنیز نبوی کا مکمل ناول۔ عمر، ماروی،
- ام طیفور کا مکمل ناول۔ ہوک،
- امت العزیز شہزاد کا ناولٹ۔
- عمیرہ احمد اور آمنہ ریاض کے سلسلے وار ناول،
- سائرہ رضا، نازیہ جمال، فرح طاہر، حاجرہ ریحان اور سویرا فلک کے افسانے،
- معروف شیف شیریں انور سے ملاقات،
- ٹی وی فنکار اکرام عباسی سے باتیں،
- حرف سادہ کو عنایت ہوا اعجاز کا رنگ۔ ایمل رضا کے جواب،
- کرن کرن خوشبو۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ آپ کو کیسا لگا! آپ کے خطوط کے منتظر ہیں۔ ہمیں اپنی رائے ضرور لکھیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے۔ اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

قربانی سے متعلق احکامات و مسائل

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو چتکبرے اور سینگوں والے مینڈھوں کی قربانی کیا کرتے تھے اور (ذبح کرتے وقت) بسم اللہ اور تکبیر پڑھتے تھے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی گردن پر قدم مبارک رکھ کر اپنے ہاتھ سے انہیں ذبح کرتے دیکھا۔ (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ عید الاضحیٰ کے موقع پر صاحب استطاعت کو کم از کم ایک بکری، مینڈھا، گائے یا اونٹ کے ایک حصے کی قربانی کرنا ضروری ہے۔

2۔ ایک سے زیادہ جانوروں کی قربانی بھی جائز بلکہ افضل ہے۔

3۔ گھر کے فرد کو اپنے ہاتھ سے قربانی کا جانور ذبح کرنا چاہیے، تاہم کوئی دوسرا شخص بھی ذبح کر سکتا ہے۔

4۔ قربانی کا جانور عمدہ اور خوب صورت ہونا چاہیے۔

5۔ قربانی کے جانور کو ذبح کرتے وقت درج ذیل حدیث میں مذکور دعا پڑھنا مسنون ہے۔

6۔ ذبح کرتے وقت جانور کے جسم پر پاؤں رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ جانور قابو میں رہے اور بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔

قربانی کی دعا

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے دن دو مینڈھے قربان کیے۔ جب انہیں قبلہ رخ کیا تو فرمایا:

ترجمہ : میں نے یکسو ہو کر اپنا چہرہ اس اللہ کی طرف کر لیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکین میں سے نہیں۔ بے شک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے، جو

سارے جہانوں کا مالک ہے' اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اسی بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا فرماں بردار ہوں۔ اے اللہ! یہ جانور تجھ ہی سے ملا اور تیرے ہی لیے قربان کیا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کی امت کی طرف سے۔"

(ابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی

حضرت عائشہؓ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب قربانی کرنا چاہتے تو دو بڑے بڑے' موٹے تازے' سینگوں والے' چتکبرے اور خصی مینڈھے خریدتے۔ ایک اپنی امت کی طرف سے ذبح فرماتے' یعنی امت کے ہر اس فرد کی طرف سے جو اللہ کی توحید کی گواہی دیتا ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام پہنچانے (اور رسول ہونے) کی گواہی دیتا ہو۔ اور دوسرا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آل کی طرف سے ذبح کرتے۔ (مسند احمد)

فوائد و مسائل :

1۔ قربانی کے جانور عمدہ ہونے چاہیں۔
2۔ جانور ظاہری شکل و صورت میں بھی اچھا ہونا چاہیے اور موٹا تازہ اور صحت مند بھی۔
3۔ خصی جانور کی قربانی درست ہے۔ اسے عیب شمار نہیں کیا جاتا۔
4۔ گھر کے تمام افراد کی طرف سے ایک جانور کی قربانی کافی ہے۔
5۔ کسی اور کی طرف سے قربانی کرنا درست ہے۔

قربانی واجب ہے یا نہیں؟

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے'

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس کے پاس (قربانی کرنے کی) گنجائش ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو اسے چاہیے کہ ہماری عیدگاہ کے قریب بھی نہ آئے۔" (مسند احمد)

فوائد و مسائل :

1۔ اس حدیث سے بظاہر قربانی کا وجوب ثابت ہوتا ہے لیکن دوسرے دلائل سے اس کا استحباب و استنان معلوم ہوتا ہے' اس لیے محدثین نے ان سارے دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ قربانی سنت موکدہ ہے' یعنی ایک اہم اور موکد حکم ہے فرض نہیں' تاہم استطاعت کے باوجود اس سنت موکدہ سے گریز کسی طرح بھی صحیح نہیں۔
2۔ قربانی مسلمانوں کی اجتماعیت کا مظہر ہے اور اس سے آپس کے تعلقات بہتر ہوتے ہیں۔
3۔ قربانی نہ کرنے والا مسلمانوں کی خوشیوں میں شریک ہونے کا حق نہیں رکھتا' تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے نماز عید پڑھنے کی ضرورت نہیں بلکہ مقصد اسے تنبیہہ کرنا ہے تاکہ وہ قربانی ترک نہ کرے۔

واجب

حضرت محمد بن سیرین رحمتہ اللہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا: "میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا

"کیا قربانی واجب ہے؟"

انہوں نے فرمایا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمان قربانی کرتے رہے اور یہی طریقہ جاری ہے۔" (طبرانی)

قربانی کا ثواب

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

"قربانی کے دن آدم کا بیٹا کوئی ایسا عمل نہیں کرتا جو اللہ کو خون بہانے (جانور کی قربانی کرنے) سے زیادہ محبوب ہو۔ وہ (جانور) قیامت کے دن اپنے سینگوں' کھروں اور بالوں سمیت آئے گا (اور نیکی کے پلڑے میں رکھا جائے گا) قربانی کے جانور کا خون زمین پر

گرنے سے پہلے اللہ کے ہاں (قبولیت کا) مقام حاصل کرلیتا ہے' اس لیے خوش دلی سے قربانی کیا کرو۔"
(ترمذی)

کون سی قربانی مستحب ہے؟

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا:
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سینگوں والے نر مینڈھے کی قربانی دی۔ وہ سیاہی میں کھاتا' سیاہی میں چلتا اور سیاہی میں دیکھتا تھا۔ (ابوداؤد)

فوائد و مسائل:

1۔ قربانی کا جانور دیکھنے میں بھی خوب صورت ہونا چاہیے۔
2۔ "نر" (فحیل) سے مراد یہ ہے کہ وہ خصی نہ تھا۔
3۔ نر اور خصی دونوں قسم کا جانور قربانی میں دینا جائز ہے۔
4۔ سیاہی میں کھانے' چلنے اور دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا منہ بھی سیاہ تھا' اس کے پاؤں بھی کالے تھے' اور اس کی آنکھوں کے ارد گرد کی جگہ بھی سیاہ تھی۔ اس طرح کا مینڈھا خوب صورت سمجھا جاتا ہے' نیز دیکھنے میں بھی خوب صورت اور بھلا لگتا ہے۔

قربانی کا جانور

حضرت یونس بن میسرہ بن حلبس رحمتہ اللہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا۔
"میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت ابوسعید زرقی رضی اللہ عنہ کے ساتھ قربانی کے جانور خریدنے لگا۔
یونس بن میسرہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نے ایک ایسے مینڈھے کی طرف اشارہ کیا جس کے کانوں اور گلے کا کچھ حصہ سیاہ تھا۔ وہ جسمانی طور پر نہ زیادہ اونچا تھا نہ زیادہ پست تھا۔ انہوں نے فرمایا۔
"میرے لیے یہ خرید لو۔" گویا انہوں نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مینڈھے کے مشابہ قرار دیا۔

فوائد و مسائل:

1۔ بزرگ آدمی کے ساتھ اس کی ضروریات کے سلسلے میں جانا اس کی خدمت اور احترام میں شامل اور باعث ثواب ہے۔
2۔ قربانی کا جانور بالکل نکما نہیں ہونا چاہیے' ہاں البتہ بہت زیادہ قیمتی اور نمایاں نہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔
3۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ کوشش کرتے تھے کہ ان کا ہر عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ممکن حد تک مشابہ ہو' اسی لیے امام ابن ماجہ رحمتہ اللہ نے باب کے عنوان میں اسے مستحب قرار دیا ہے۔

حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بہترین کفن وہ ہے جو ایک رنگ کی دو چادروں پر مشتمل ہو اور بہترین قربانی سینگوں والا مینڈھا ہے۔"

کتنے افراد کی طرف سے کفایت کر سکتی ہے؟

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: "ہم لوگ ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے کہ عید الاضحیٰ آگئی' چنانچہ ہم نے دس دس آدمیوں کی طرف سے ایک ایک اونٹ اور سات سات آدمیوں کی طرف سے ایک ایک گائے مشترکہ طور پر ذبح کی۔
(ترمذی)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا:
ہم نے حدیبیہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ایک اونٹ سات افراد کی طرف سے اور ایک گائے سات افراد کی طرف سے ذبح کی۔" (صحیح مسلم)

فائدہ:

1۔ پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ میں دس آدمی شریک ہوسکتے ہیں اور دوسری حدیث سے

معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ میں سات آدمی شریک ہو سکتے ہیں۔ امام مسلم رحمتہ اللہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے متعدد احادیث روایت کی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج میں بھی اور عمرے میں بھی سات آدمیوں کو ایک اونٹ میں شریک کیا۔ لیکن ان دونوں احادیث میں باہم کوئی تعارض نہیں، کیونکہ اونٹ میں دس آدمیوں کی شرکت کا واقعہ عام قربانی کے موقع کا ہے جب کہ سات آدمیوں کی شرکت کا تعلق حج و عمرہ سے ہے۔ بنا بریں حج و عمرہ میں گائے اور اونٹ دونوں میں صرف سات سات افراد ہی شریک ہوں گے، جب کہ عام قربانی میں گائے میں سات اور اونٹ میں دس افراد شریک ہو سکتے ہیں۔ یہ فرق حدیث سے ثابت ہے۔

گائے کی قربانی

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجتہ الوداع میں آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک گائے ذبح کی۔ (ابوداؤد)

کس عمر کے جانور کی قربانی درست ہے؟

حضرت عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کچھ بکریاں دیں جو انہوں نے قربانی کے لیے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے) صحابہ کرام میں تقسیم کر دیں۔ (ان کے پاس) بکری کا ایک سالہ بچہ (باقی) رہ گیا۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی تو انہوں نے فرمایا:

"اس کی قربانی تم دے دو۔" (بخاری)

فائدہ :

1۔ حدیث میں عتود کا لفظ ہے۔ جس کا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے: "جو بچہ خود چارہ چرنے کے قابل ہو جائے اور ماں کا محتاج نہ رہے۔"

2۔ نواب وحید الزمان خان رحمتہ اللہ نے عتود کے معنی ایک سال کا بکرے کا بچہ کیے ہیں۔ (ترجمہ حدیث زیر مطالعہ) ہم نے اپنے ترجمہ میں اسی کو اختیار کیا ہے۔

جذعہ کی قربانی

حضرت ام بلال بنت ہلال رحمتہ اللہ اپنے والد سے روایت کرتی ہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بھیڑ کے جذعہ کی قربانی جائز ہے۔" (مسند احمد)

فوائد و مسائل :

1۔ ثنیہ یا مسنہ اس جانور کو کہتے ہیں جس کے دودھ کے دانت ٹوٹ کر دو نئے دانت آجائیں۔

2۔ جذعہ اس جانور کو کہتے ہیں جس کے دودھ کے دانت نہ ٹوٹے ہوں۔

3۔ مذکورہ بالا حدیث اور ام بلال رحمتہ اللہ سے مروی حدیث: "بھیڑ کے جذعے کی قربانی کرو اس لیے کہ اس کی قربانی جائز ہے۔" (مسند احمد ۶/ ۳۶۸) سے معلوم ہوتا ہے کہ عام حالات میں بھی بھیڑ کا جذعہ قربانی کیا جا سکتا ہے۔ البتہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت، جو کہ صحیح مسلم (۱۹۶۳) میں ہے، کی رو سے مسنہ (دو دانتا) جانور کی قربانی کرنا افضل ہے نیز راجح قول کے مطابق جذعہ صرف بھیڑ میں جائز ہے، یعنی دنبہ اور چھترا، دیگر جانوروں کے اس عمر کے بچوں کی قربانی کرنا جائز نہیں۔

4۔ شیخ زہیر شاویش لکھتے ہیں "بھیڑ بکری اور گائے بیل میں مسنہ وہ ہوتا ہے جو تیسرے سال میں لگ جائے اور اونٹوں میں جو چھٹے سال میں لگ جائے۔ بھیڑ کے جذعے کے متعلق علما کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ (بھیڑ کا بچہ) ہے جو پورے سال کا ہو جائے۔

لیکن یہ بات حتمی نہیں، الگ الگ ملکوں کی الگ الگ آب و ہوا کی وجہ سے اس میں فرق بھی ہو سکتا ہے، اس لیے اصل اعتبار بکرے، گائے بیل اور اونٹ میں دو دانتا ہونا ہے اور دنبے چھترے کا ایک سالہ ہونا۔

دو دانت والے جانور کی قربانی

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"دو دانتے کے سوا کوئی جانور (قربانی میں) ذبح نہ کرو' سوائے اس کے کہ تمہارے لیے (دو دانتا جانور تلاش کرنا) مشکل ہو جائے تو بھیڑ کا جذعہ ذبح کر دو۔" (مسلم)

فائدہ :

1۔ علامہ البانی رحمتہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت مجاشع رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جذعہ سے مراد بھیڑ کا جذعہ ہے' بکری کا جذعہ نہیں۔

حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ نے نماز عید سے پہلے قربانی کا جانور ذبح کر لیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ گوشت کی بکری ہے۔ قربانی کی نہیں۔" انہوں نے کہا: "اے اللہ کے رسول! میرے پاس ایک بکری کا جذعہ ہے۔ (کیا میں اس کی قربانی دے دوں؟)"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قربان کر دو لیکن تمہارے سوا کسی اور کے لیے درست نہیں۔" علامہ البانی نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کی روشنی میں بکری کا جذعہ ذبح کرنے کی اجازت نہیں' البتہ حضرت مجاشع رضی اللہ عنہ کی حدیث کی روشنی میں بھیڑ کا جذعہ (ایک سال کا بچہ جس کے دانت نہ ٹوٹے ہوں) جائز ہے۔

جس جانور کی قربانی دینا مکروہ ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا:
"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جانور کو ذبح کرنے سے منع فرمایا ہے' جس کا کان آگے سے کٹا ہوا ہو' یا جس کا کان پیچھے سے کٹا ہوا ہو' یا جس کا کان چرا ہوا ہو' یا جس کے کان میں (گول) سوراخ ہو' یا اس کا ہونٹ کٹا ہوا ہو۔" (ابو داود)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: "ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم (قربانی کے جانور کی) آنکھیں اور کان اچھی طرح دیکھ لیا کریں۔ (ترمذی)

فوائد و مسائل :

1۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانور کے کان سلامت ہونے چاہئیں۔

2۔ آنکھیں دیکھ لینے کا مقصد یہ ہے کہ جانور کی دونوں آنکھیں سلامت ہوں۔ جس کو ایک آنکھ سے نظر نہ آتا ہو' اس کی قربانی درست نہیں۔

3۔ قربانی کا اصل مقصد اللہ کے لیے اچھی چیز قربان کرنا ہے' اس لیے بے عیب جانور ذبح کرنا چاہیے۔ گوشت کھانا یا غریبوں کو کھلانا ایک اضافی فائدہ ہے' اصل مقصد نہیں۔ ورنہ آنکھ یا کان کا عیب گوشت کھانے کے مقصد میں رکاوٹ نہیں بنتا۔

قربانی کی کھالیں

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ وہ آپ کے (قربانی کے) تمام اونٹوں کا گوشت' ان کی کھالیں اور جھولیں غریبوں میں تقسیم کر دیں۔

فائدہ : قربانی کا گوشت کھانا اور کھالیں اپنے استعمال میں لانا اگرچہ جائز ہے' تاہم بہتر یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ غریبوں اور مسکینوں کو دیا جائے۔

قربانیوں کا گوشت کھانا

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ہر اونٹ کی ایک ایک بوٹی لے کر ہنڈیا میں ڈالی گئی (اور پکائی گئی) تب انہوں نے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں نے) کچھ گوشت کھایا اور کچھ شوربا پیا۔ (مسند احمد)

غزل

انشاء جی

کس کو پار اُتارا تم نے، کس کو پار اُتارو گے
ملاحو تم پردیسی کو بیچ بھنور میں مارو گے

منہ دیکھے کی میٹھی باتیں سنتے اتنی عمر ہوئی
آنکھ سے اوجھل ہوتے ہوتے جی سے ہمیں بسارو گے

آج تو ہم کو پاگل کہہ لو، پتھر پھینکو، طنز کرو
عشق کی بازی کھیل نہیں ہے، کھیلو گے تو ہارو گے

اہل وفا سے ترکِ تعلق کر لو پر اک بات کہیں؟
کل تم اِن کو یاد کرو گے، کل تم انہیں پکارو گے

اُن کا ہم سے پیار کا رشتہ، اے دل چھوڑو بھول چکو
وقت نے سب کچھ میٹ دیا ہے، اب کیا نقش ابھارو گے

انشا کو کسی سوچ میں ڈوبے، در پر بیٹھے دیر ہوئی
کب تک اس کے بخت کے بدلے اپنے بال سنوارو گے

کوکنگ چینل پہ آپ دن رات مختلف شیفس سے ملتے ہیں۔ لیکن کچھ شیف ایسے ہوتے ہیں جو آپ کے دلوں میں بھی گھر کرلیتے ہیں۔ انہی میں ایک "شیرین انور" ہیں .... اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے وقت نکال کر انہوں نے ہمیں انٹرویو دیا' اس کے لیے ان کا بے حد شکریہ۔

"کیا حال ہیں جی....؟"

"اللہ کا کرم ہے۔"

"آپ کے پروگرام دیکھتی ہوں اور آپ کی ریسیپیز آزما بھی چکی ہوں۔ بلاشبہ آپ بہترین شیف ہیں۔ یہ بتائیں کہ آپ کے لہجے میں جو مٹھاس' ہے' کیا نام کا اثر ہے یا....؟"

"اب اگر کسی کا نام "سنجیدہ" ہے تو کیا وہ سنجیدہ ہو گی۔" ہنستے ہوئے.... "ہاں ہو سکتا ہے۔"

معروف شیف

شیریں انور سے ملاقات

شاہین رشید

"بہت مصروف رہتی ہیں آپ.... تو کیا مصروفیات ہیں آپ کی....؟"

"مصروفیات یہ ہیں کہ صبح کے وقت میرا لائیو شو ہوتا ہے ایک چینل پہ اور دوپہر کو میں گھر پر کوکنگ کلاس لیتی ہوں' شام کو بھی گھر پر ہی کوکنگ کلاس لیتی ہوں۔"

"گویا لڑکیوں کو سگھڑ بنا رہی ہیں.... باقاعدگی سے کلاسز لیتی ہیں لڑکیاں؟"

"بالکل سگھڑ بن رہی ہیں اور بہت باقاعدگی سے اور بڑے شوق سے کلاسز لیتی ہیں.... اور سسرال میں سرخرو ہوتی ہیں۔"

"شعبہ خواتین کا ہے مگر بڑے بڑے ہوٹلوں اور ریسٹورنٹس میں مرد شیف ہوتے ہیں' اس کی کیا وجہ ہے؟"

"شوق کی بات ہے.... مرد بھی ہر شعبے میں نام کما رہے ہیں اور خواتین بھی.... اور ایسا نہیں ہے کہ بڑی بڑی جگہوں پہ خواتین نہیں ہوتیں اب تو آپ جا کر دیکھیں تو خواتین آپ کو زیادہ نظر آئیں گی اور جب سے یہ چینل آیا ہے' اس شعبے میں آپ کو خواتین کی تعداد زیادہ نظر آئے گی۔ کافی رجحان بڑھ گیا ہے' کافی سارے انسٹی ٹیوٹ کھل گئے ہیں جہاں کوکنگ کی ٹریننگ دی جاتی ہے اور بہ نسبت لڑکوں کے آج کل لڑکیاں اس فیلڈ میں زیادہ نظر آ رہی ہیں۔"

"ماشاء اللہ سے لڑکیاں تو ہر فیلڈ میں آگے نکل رہی ہیں' یہ بتائیں کہ کورس پورا ہونے پر آپ سند دیتی ہیں لڑکیوں کو؟"

"جی بالکل دیتی ہوں.... یہ ان کا حق ہے کہ ان کے پاس ایک ثبوت ہو کہ انہوں نے کچھ سیکھا ہے۔"

"میں نے ایک مرتبہ زبیدہ آپا کا انٹرویو کیا تو انہوں نے بتایا کہ شادی ہو کے جب سسرال آئیں تو انہیں کچھ بھی پکانا نہیں آتا تھا.... آپ اپنے بارے میں بتائیں کہ...."

"مجھے بھی کچھ نہیں آتا تھا.... مجھے تو چنے کی دال اور

موٹنگ کی دال کی پہچان تک نہیں تھی.... لیکن شادی کے تیسرے دن میری جو دو نندیں تھی انہوں نے کہا کہ آپ کو کھانا پکانا ہے آج، مجھے تو کھانا پکانا آتا نہیں تھا۔ میں تو بہت پریشان ہو گئی.... اپنے کمرے میں گئی اور اپنی امی کو کال کی کہ میری نندیں کہہ رہی ہیں کہ آپ کھانا پکائیں اور مجھے تو کچھ نہیں آتا تو بتائیں کہ میں کیا کروں۔ بہت روئی دھوئی .... تو امی نے کہا کہ پریشان نہ ہو، میں بتاتی ہوں کہ کیا اور کس طرح پکانا ہے انہوں نے مجھے قیمہ پکانے کی اور دال پکانے کی آسان سی ترکیب بتائی.... پرانا زمانہ تھا پیاز بھی خود ہی سنہری کرنی پڑتی ہے .... جدید مشینیں بھی نہیں تھیں۔ مسالا بھی خود ہی پیسنا پڑتا تھا۔ جب چالیس سال پہلے میری شادی ہوئی تو کوئی سہولت میسر نہیں تھی۔ ادرک لہسن بھی خود چھیلو، پیاز بھی خود ہی کاٹو اور پھر "سل بٹے" پہ پیسو.... بہرحال پھر جب سر پر پڑی تو سب کچھ کرنا پڑا.... میں شادی کے وقت 19 سال کی تھی اور لہسن چھیلتے وقت عجیب سا لگتا تھا کہ ہاتھوں میں بو ہو جاتی تھی.... تو بڑی مشکل ہوتی تھی.... تو سر پر پڑے تو کرنا تو پڑتا ہے سب کچھ .... خواہ آج کا دور ہو یا گزرے وقت کا۔"

"نندوں نے کہا۔ آپ نے حکم کی بجا آوری کی، آپ کہہ تو سکتی تھیں کہ مجھے پکانا نہیں آتا....؟ ویسے کھانا صحیح پک گیا تھا؟"

"نندوں نے اس لیے کہا کہ میری ساس حیات نہیں تھیں اور میں نے انکار اس لیے نہیں کیا کہ یہ میری عزت کا سوال تھا.... اور ہاں کھانا اچھا پک گیا تھا۔"

"ماؤں کو تو بڑی فکر ہوتی ہے بیٹیوں کی کہ وہ پرائے گھر جائیں گی تو انہیں سب کچھ آنا چاہیے.... تو آپ نے کیوں نہ سیکھا؟"

"اصل میں بات یہ تھی کہ ہماری فیملی ماشاء اللہ کافی بڑی تھی، ہم جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتے تھے، چچا ان کے بچے ہم سب مل کر رہتے تھے اور ہمارے گھر میں دو تین خانسامے بھی ہوتے تھے تو ہماری امی اور ہماری دیگر بزرگ خواتین بچیوں کو مردوں کے درمیان کچن میں نہیں جانے دیا کرتی تھیں.... کہ نوکروں کے ہوتے ہوئے کچھ نہ کرنا تو بس اس وجہ سے کچھ سیکھنے اور کرنے کا موقع ہی نہیں ملا.... مگر خیر جب سر پر پڑی تو سب کچھ آ گیا.... آج کل کی لڑکیاں ماشاء اللہ ہوشیار اور عقل مند ہیں اور انہیں شوق بھی ہے تو سیکھ کر سسرال جاتی ہیں۔"

"سسرال میں نندوں نے کہا تو شرمندگی کی وجہ سے سیکھا، مگر کامیابی کی جس منزل پہ آپ آج ہیں اس کی بھی کوئی وجہ تھی کیا؟"

"مجھے موقع نہیں ملا، لیکن مجھے کوکنگ کا شوق تو بچپن سے ہی تھا.... اور شادی سے پہلے میرے شوہر نے مجھے کہا تھا کہ تمہیں ہمارے گھر میں سب کچھ ملے گا مگر کھانا پکانے کے لیے خانساماں نہیں ملے گا، کھانا تمہیں خود ہی پکانا پڑے گا.... کیونکہ ہمارے گھر میں خانساماں رکھنے کا رواج نہیں ہے.... اور پھر جب میں بیاہ کر آئی اور مجھے اندازہ ہوا کہ اب مجھے ہی پکانا ہو گا تو پھر میں نے کوکنگ کلاسز لیں، ٹریننگ لی۔ بہت ساری جگہوں سے.... میں ٹریولنگ بہت کرتی تھی اور جن جن ممالک میں جاتی تھی تو جہاں جہاں جاتی تھی وہاں کے کھانے پکانا ضرور سیکھتی تھی۔ کورسز کرتی تھی اور یوں آہستہ آہستہ مجھ میں کھانا پکانے کا جنون کی حد تک شوق ہو گیا.... اور میں نے بہت کچھ سیکھ لیا اور پھر ایک دن اپنے شوہر سے کہا کہ میں نے اتنا کچھ سیکھ لیا ہے کہ میں بہ آسانی کوکنگ کلاسز لے سکتی ہوں اور اگر آپ کی اجازت ہو تو گھر پر ہی کوکنگ کلاسز شروع کر دوں اور ان کی اجازت سے 1982ء سے میں نے اپنے گھر سے کوکنگ کلاسز کا آغاز کیا۔ جون کا مہینہ تھا اور 29 تاریخ تھی.... اور تب سے لے کر اب تک الحمدللہ میرے گھر میں پچاس ساٹھ لڑکیاں ہر وقت موجود ہوتی ہیں سیکھنے کے لیے.... اور الحمدللہ جو لڑکیوں نے سیکھنا چاہا، جس ملک کا کھانا پکانا سیکھنا چاہا.... میں نے سکھایا۔"

"زیادہ تر لڑکیاں کیا سیکھتی ہیں۔ دیسی کھانے یا کانٹی نینٹل کھانے؟"

"لڑکیوں کو "میٹھا" پکانے کا بہت شوق ہوتا ہے.... مختلف جگہوں پر جا کر کھاتی ہیں اور پھر ہم سے "ریسیپی" مانگتی ہیں.... اور سکھانے کے لیے کہتی ہیں اور میں

سیکھاتی ہوں۔ اسی طرح "چائنیز"، "اٹالین" اور فاسٹ فوڈ بھی بہت سیکھتی ہیں.... جیسے برگر، پزا، پاستا وغیرہ۔"

"شوق سے زیادہ ٹرینڈ بھی چل پڑا ہے شاید؟"

"جی.... ٹرینڈ بھی چل پڑا.... لڑکیاں اب سب کچھ سیکھنا چاہتی ہیں۔"

"چینل سے وابستگی کس طرح ہوئی؟"

"پندرہ سال قبل جب کوکنگ ٹی وی چینل کا اجرا ہوا تھا تو سلطانہ آپا نے مجھ سے رابطہ کیا اور کہا کہ تم آؤ اور ہمارا چینل جوائن کرو۔ لیکن اس وقت چونکہ میرے بچے چھوٹے تھے تو میں نے انہیں منع کردیا.... اور پھر جب ماشاء اللہ میرے بچے بڑے ہو گئے ان کی شادی ہو گئی تو انہوں نے کہا کہ اب تو آجاؤ.... اور یوں میں نے کوکنگ ٹی وی کو جوائن کیا اور اب آٹھ سال ہو گئے ہیں مجھے اس چینل پہ کام کرتے ہوئے۔ روزانہ صبح گیارہ بجے سے دوپہر ساڑھے بارہ بجے تک میرا شو ہوتا ہے اس دوران مجھے دیگر چینلز سے بھی آفرز آئیں مگر مجھے نہیں جانا تھا کہیں کہ میں اسی چینل پہ سیٹ تھی.... بہت اچھا چینل ہے کام کرنے میں مزہ آتا ہے اور دل بھی لگ گیا ہے۔ دیگر لڑکیاں اور خواتین بھی ہوتی ہیں تو ایک فیملی ماحول بن گیا ہے۔"

"کوکنگ چینل پہ سارا دن پکوان پکتے ہیں۔ یہ سب کہاں جاتے ہیں یا آپ سب انجوائے کرتے ہیں؟"

"یہ سب مینجمنٹ کے پاس جاتے ہیں اور وہاں سے کہاں جاتے ہیں مجھے نہیں پتا اور الحمد للہ ہم سب بھی انجوائے کرتے ہیں۔"

"کسی میگزین کے لیے بھی آپ نے کام کیا۔ اور پیسہ ہے اس فیلڈ میں؟"

"جی.... میں نے "میگ" کے لیے 20 سال لکھا ہے اور ہاں.... اس فیلڈ میں پیسہ ہے اور ہر پروفیشن میں پیسہ ہے اگر آپ دل لگا کر اور ایمان داری کے ساتھ کام کریں تو.... اپنے پروفیشن کے ساتھ سنجیدہ ہونا پڑتا ہے.... ویسے لڑکیوں سے میں کم لیتی ہوں۔ ہزار روپے ایک کلاس کے ہوتے ہیں جس میں، میں آٹھ ڈشیں سکھاتی ہوں اور سارا سامان میرا اپنا ہوتا ہے اور جو پکتا ہے وہ لڑکیاں کھا پی کر جاتی

ہیں .... اور مزید لڑکیاں آنا چاہیں تو آپ میرا نمبر شائع کر دیں۔ اور میں آپ کو بتاؤں کہ پیسے سے بھی زیادہ شہرت ہے اس فیلڈ میں .... ہم دنیا میں کہیں بھی چلے جائیں لوگ ہمیں پہچان لیتے ہیں اور بہت عزت کرتے ہیں لوگ ہماری

"بازار میں اتنے مسالا جات آگئے ہیں۔ کیا اس کے باوجود کوکنگ سیکھنا ضروری ہے؟"

"بازار میں جو مسالے ملتے ہیں وہ صحت کے لیے اچھے نہیں ہوتے۔ اس میں کئی ایسی چیزیں شامل ہوتی ہیں جو صحت کے لیے بالکل بھی اچھی نہیں ہوتیں .... اور آپ دیکھیں کہ ان مسالوں سے پکے ہوئے کھانوں اور گھر کے مسالوں سے پکے ہوئے کھانوں کے ذائقوں میں بھی فرق ہوتا ہے۔"

"اگر ایسا ہے تو پھر اتنے مسالے کیوں ہیں بازار میں؟"

"دیکھیں جو بیچلرز ہیں۔ ملک سے باہر پڑھنے کے لیے گئے ہیں ان کے لیے وقتی طور پر یہ مسالے صحیح ہیں کہ گزارا کرنا ہے۔ بس سب کی اپنی اپنی سوچ ہے۔"

"سنا ہے کہ شیف اپنا ایک "گر" چھپا کر رکھتے ہیں؟ آپ بھی ....؟"

"نہیں نہیں .... میری یہ نیچر ہی نہیں ہے اور جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ 1982ء سے میں اسٹارٹ لیا اور جو میری ریسیپی آزماتے ہیں وہ یہی بتاتے ہیں کہ آپ کی بتائی ہوئی تراکیب کے ذائقے بہت عمدہ ہوتے ہیں .... یہ تو بہت ہی غلط اور بے ایمانی ہے کہ آپ کوئی گر چھپالیں .... یہ بھی تو دیکھیں کہ سامنے والے کا پیسہ' ٹائم آپ کتنا ضائع کریں گے .... آپ نے اللہ کو جواب نہیں دینا ہوتا کیا ....

کسی کو اپنا ہنر سکھانا بھی تو صدقہ جاریہ ہے نا ...."

"لائیو کالز میں کبھی گڑبڑ ہوئی یا لائیو پکوان میں کوئی گڑبڑ ہوئی؟"

"میں یہ نہیں کہوں گی کہ گڑبڑ نہیں ہوتی ہے۔ ہوتی ہے مگر سنگین گڑبڑ نہیں ہوئی .... کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ میں گھر سے کوئی چیز لانا بھول جاتی ہوں .... تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا .... بریک میں ہم وہ چیزیں منگوا لیتے ہیں۔"

"لائیو پروگرام ایزی رہتے ہیں یا ریکارڈڈ؟"

"مجھے تو لائیو پروگرام زیادہ ایزی لگتے ہیں ویسے میرا تو روز لائیو پروگرام ہی ہوتا ہے۔ وقت کی پابندی بھی ہو جاتی ہے اور وقت پر ختم بھی ہو جاتا ہے .... اور مجھے وقت کی پابندی کی بہت زیادہ عادت ہے اور ہم سیزن کے حساب سے ہی پکوان سکھاتے ہیں۔ جیسے اب بقرہ عید آنے والی ہے .... عیدالفطر پہ کیا ہو .... تو اس طرح سے پروگرام ترتیب دیتے ہیں۔"

"بقرعید پر گوشت کو اسٹور کرنے کا کیا طریقہ ہے؟"

"بقرعید پر گوشت کو اسٹور تو کرنا ہی نہیں چاہیے۔ یہ غریبوں اور رشتے داروں کا حق ہوتا ہے۔ ہاں دس پندرہ دن کے لیے اپنے لیے بھی رکھ لینے میں کوئی حرج نہیں .... اور اسٹور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ چربی وغیرہ صاف کر کے پلاسٹک کی تھیلیوں میں حصے بنا کر رکھ دیں اور لکھ دیں کہ یہ چانپیں ہیں یہ گوشت ہے' تاکہ نکالنے میں آسانی ہو اور دھو کر نہ رکھیں بلکہ پکانے سے پہلے دھولیں۔"

"گوشت کی وجہ سے پورے گھر میں بو ہو جاتی ہے تو اس کے لیے کیا کرنا چاہیے؟"

"آپ اسپرے بوتل میں پانی ڈالیں اور لیمو نچوڑ کر ڈالیں اور پھر پورے گھر میں اسپرے کریں بو ختم ہو جائے گی۔"

"کلیجی گردے' سری پائے .... صحت کے لیے کتنے نقصان دہ ہیں؟"

"کثرت سے کچھ بھی کھائیں نقصان دہ ہے۔ ان میں کولیسٹرول زیادہ ہوتا ہے .... سال میں ایک دو بار کھانے سے کوئی نقصان نہیں ہے۔"

"اگر شیف نہ ہوتیں تو اس وقت کیا ہوتیں؟"

ہنستے ہوئے .... "یہ بات تو میں نے کبھی سوچی ہی نہیں

تھی' انٹر کے بعد میری شادی ہو گئی۔ پڑھائی کا مجھے بہت زیادہ شوق نہیں تھا۔ ہاں میں نے شادی سے پہلے مونٹیسوری کورس کیا ہے اور سوچا تھا کہ اسکول کھولوں گی .... مگر پھر شادی ہو گئی۔"

"آپ کے بچے ماشاء اللہ سے؟"

"چار بچے ہیں .... میری ایک بیٹی بالکل میری طرح ہے۔ ٹی وی پر پروگرام بھی کرتی ہے .... گھر میں میرے

''ہوٹلنگ کرتی ہیں؟''

''بہت شوق سے.... اور کھانے میں اس کے ذائقے میں جو کمی بیشی ہوتی ہے مجھے فوراً پتا چل جاتا ہے.... اس پروفیشن میں 32 سال سے ہوں۔ کوئی مذاق کی بات تو نہیں ہے نا....''

''لوگ پہچان کر پریشان کرتے ہیں؟ سیلفیاں بنواتے ہوں گے؟''

''نہیں اب تو عادت ہو گئی ہے۔ البتہ میرے بچے گھبراتے ہیں کہ پرائیویسی نہیں ہے.... مگر کیا کریں.... لوگوں کی محبت کو بھی تو نظرانداز نہیں کر سکتے۔''

''ملک سے باہر بھی تو جاتی ہیں۔ وہاں کیا صورت حال ہوتی ہے؟''

''وہاں.... بھی ایسا ہی ہوتا ہے.... بیٹا پریشان ہو جاتا ہے کہ یہاں بھی آپ کے چاہنے والے آپ کو نہیں چھوڑتے۔''

''اور آخر میں کچھ کہنا چاہیں گی؟''

''یہی کہنا چاہوں گی کہ لڑکیاں جو بھی کام کریں سچے دل سے کریں۔ ایمان داری سے کریں.... ایمان داری میں بہت برکت ہے' اپنے پروفیشن کے ساتھ انصاف کریں.... اور لڑکیوں کو ضرور کام کرنا چاہیے۔ صرف مردوں پر ہر کام کا بوجھ نہ ڈالیں.... کیونکہ مہنگائی کا دور ہے گھر میں سب کو کام کرنا چاہیے۔''

ساتھ کلاس بھی لیتی ہے سمیرا نام ہے 'اس کا' باقی کو بھی شوق ہے مگر جنون کی حد تک نہیں.... بیٹا میرا دبئی میں جاب کرتا ہے ماشاء اللہ سے۔''

''کچھ اپنے بارے میں بتائیں۔ مطلب فیملی بیک گراؤنڈ؟''

''میں 14 اپریل 1957ء میں پیدا ہوئی۔ میرے والد بزنس مین تھے.... اب تو دونوں حیات نہیں ہیں۔''

''مزاج کی کیسی ہیں اور آپ کے میاں صاحب آپ کی اس ایکٹویٹی کو پسند کرتے ہیں؟''

''ہمیشہ سے مزاج کی خوشگوار ہی رہی۔ بتایا نا کہ لگتا ہے کہ نام کا اثر ہے اور میرے میاں صاحب بہت اچھے ہیں' انہوں نے کبھی میری اس ایکٹویٹی پہ اعتراض نہیں کیا.... اور بہت شوق سے میرے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے کھاتے ہیں.... اور میرے میاں کا اپنا بزنس ہے۔''

''اپنے لیے سب سے اچھی چیز کیا پکاتی ہیں؟''

''سچ بتاؤں.... مجھے اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا ہی پسند نہیں ہے کھا لیتی ہوں.... مگر بہت شوق سے نہیں.... شاید پکا پکا کر دل بھر جاتا ہے۔''

حرفِ سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ

امت الصبور

ایمل رضا

اللہ کے بابرکت نام سے شروع جس کی رحمانیت ہمیشہ میرے ساتھ رہی۔

رائٹر کے طور پر شاید اپنے بارے میں بات کرنا مشکل ہوتا ہے اور میرے لیے مشکل تر۔ کیونکہ پہلا تعارف بیج سے نکلنے والی ابتدائی ننھی کونپلوں کی طرح ہوتا ہے۔ جس میں تناور درخت کی پوری باس کو منتقل کرنا پڑتا ہے۔

میری ذات کسی ایک پیراہن میں قید نہیں.... مکمل اور ادھورے خاکے ہیں۔ جن کی تعداد لاتعداد ہے۔ کسی ایک خاکے کی جھلک آپ کو دکھاوں تو باقی سب کے ساتھ ناانصافی ہو جائے گی۔ میں نے ایک شیف بننے کی بھی کوشش کی ہے۔ بچپن سے اسکیچز بنانے کا بھی شوق رہا ہے۔ ہینڈی کرافٹ کا کام بھی آتا ہے۔ پیال ساز میں نانو کا کردار کسی حد تک میں ہی ہوں۔ میرے کمرے میں بھی میرے ہاتھ سے بنا ہوا ایک "نگار خانہ" موجود ہے۔ درختوں، پھولوں، پتھروں، آلاتِ موسیقی ان سب سے مجھے خاص لگاؤ ہے۔

(1) "میں نے لکھنا ہے" یہ بات تو شاید میری پیدائش کے وقت طے پا گئی تھی۔ اور یہ اسی بات کا نتیجہ ہے کہ سمندر کے دہانے پر پہنچے دریا کی طرح میرے ڈیلٹا کی شاخیں خواتین کے ادارے سے ٹکرا گئیں۔ کینٹ پارک کی وہ سفید عمارت مجھے آج بھی یاد ہے جس نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔

"یہ لائبریری ہے۔" کسی نے بتایا تھا۔

"یہاں بچے اندر داخل نہیں ہو سکتے۔" مجھے ہال کے اندر نہیں جانے دیا گیا۔

لیکن مجھے خوشی تھی۔ شیلفوں میں لگی ہزاروں کتابیں نظر سے گزری تھیں۔ مجھے اس عمارت نے سب سے پہلے محصور کیا جس کے اندر ہزاروں کتابیں موجود تھیں۔ لفظوں نے جو ان کتابوں کے اوراق میں قید تھے، مجھے اپنی طرف اتنی دور سے بھی کھینچ لیا تھا۔ کم عمری میں ہی کم گوئی کے لبادے میں لپٹے میرے رجحانات نے کتاب کے دو رنگوں، سفید اور سیاہ کو "کل" سمجھ لیا۔ نفسیات کے علم نے مجھے حساس بنا دیا۔ دیکھنا، محسوس کرنا، سوچنا، سوچتے رہنے کی عادت نے میرے رائٹر بننے کی داغ بیل ڈالی۔

گھر میں کتابوں، رسالوں کا ذخیرہ تھا۔ کچھ حصہ خاندانی تھا۔ کچھ خریدا گیا اور کچھ رشتے داروں کی طرف سے آیا ہوا اور کچھ مانگ کر واپس نہ کیا گیا۔ (ہی ہی) لائبریری والوں نے تو مجھے روک دیا تھا لیکن گھر کا ذخیرہ میرا تھا۔ اس ذخیرے میں سب سے زیادہ اضافہ میں نے کیا۔

بچوں کے رسالے بے تحاشا پڑھے۔ لکھنے کی ابتدا بھی ان ہی سے کی۔ ابتدائی دور میں احمد یار خان اور عنایت اللہ مرحوم کو پڑھا۔ پہلی کتاب "رات کا راہی" پڑھی۔ دنوں اس کتاب کے سحر نے مجھے خود میں جکڑے رکھا۔ راجہ گدھ میں نے ساتویں جماعت میں پڑھ لی تھی۔ یہ عمر کا اثر تھا یا کتاب کا کہ بانو قدسیہ کے علاوہ مجھے مدتوں کسی خاتون مصنفہ کا لکھا کچھ پسند آ ہی نہ سکا۔ چند سال پہلے میری بہن نے کہا کہ میں نے ہر مصنفہ میں بانو قدسیہ کو ڈھونڈنا چاہا ہے۔ اسی لیے مجھے کوئی اور پسند نہیں آتا۔" اس کی بات نے میرے دل پر اثر کیا اور میں نے دوسری مصنفین کو کھلی نظر سے پڑھنا شروع کیا۔ ان کی الگ ثقافت، الگ حیثیت سے۔ مجھے چند اچھے نام ملے۔

بانو قدسیہ جیسا ہی مزاج رکھنے والی بنگال کی سیتا جی، ازابیل آئندے اور بشریٰ سعید۔ ان سب کی کہانیوں کا مدار اور انداز نا صرف الگ تھا بلکہ ان کی کہانیوں میں ایک "بڑے پن" کی جھلک بھی تھی۔ ایملف شفق کی

کتاب "بلیک ملک" کے تھیم نے مجھے متاثر کیا۔ ہمارے یہاں ایسی کتابیں نہیں لکھی جاتیں۔ لکھی جائیں بھی تو ان کی ایسے پذیرائی نہیں کی جاتی۔

گھر میں ہر کوئی 'اپنے اپنے طے کردہ مقصد کے تحت چلتا جا رہا ہے۔ ایک بھائی کا کچھ عرصہ پہلے ایک البم نکالنے کا بھی پکا ارادہ تھا۔ (ویسے وہ یہ البم نکال چکا ہے اور ہٹ بھی ہو چکا ہے۔ (خواب میں) اس سے پہلے وہ اپنا ڈیری فارم بنا کر سارے لاہور کو خالص دودھ سپلائی کر چکا ہے۔ (خواب میں ہی - ہاہاہا) ایک بہن سنگنگ سیکھ رہی ہے۔ آج کل یہ بہن ہمیں ہر چھوٹے 'بڑے 'ہٹ فلاپ سنگر کی آواز کے اسکیل 'سُر' لے اور ٹیمپو کے بارے میں بتاتی پائی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر کسی کا گانا سننا' مطلب اس سنگر کی آواز پر ایک لیکچر سننا ہے۔ دعا ہے کہ یہ جلد سنگر بن جائے تاکہ ہماری تو خلاصی ہو۔ لوگوں کو سنائے 'لوگوں کے کان پکائے' ہمیں تو بخشے۔ کیونکہ اگر یہ جلد از جلد سنگر نہ بنی تو ہم ضرور از ضرور بہرے بن جائیں گے۔

پھر پڑوسی بھی پوچھتے ہیں یہ آپ کے گھر سے چیخوں کی آوازیں کس کی آتی ہیں۔ اب انہیں کیا بتائیں یہ چیخوں کی نہیں "سُروں" کی آوازیں ہیں۔

آپ دیکھ ہی سکتے ہیں کہ جب گھر میں اتنے "فن کار" موجود ہوں تو یہ بتانا اور طے کرنا کہ کوئی کب کیا کر دکھائے اور کیا سرپرائز دے دے 'ممکن نہیں۔ کچھ کچھ امید تو نظر آ رہی ہے کہ فنکاروں کے اس ہجوم میں سے کوئی نہ کوئی کچھ کر ہی دکھائے گا۔ (ہاہا)

(2) نہیں ..... اس سوال کے ہر جز کا جواب ہے نہیں ..... یہ بات گھر والوں کے علم میں نہیں کہ میری کہانیاں شائع ہو رہی ہیں۔ جب بچوں کی لکھی تھیں تب بھی اور اب بھی۔ کچھ عرصے پہلے خواتین ڈائجسٹ گھر میں باقاعدہ آنے لگا تو انہوں نے خود ہی اندازہ لگا لیا کہ شاید اس میں میری کہانیاں شائع ہوتی ہیں۔ راز کی بات ہے ان کا اندازہ سو فی صد درست ہے۔ ویسے بھی ان کے نزدیک یہ کوئی ایسا معرکہ نہیں۔ پھر فائدہ باقاعدہ اعلان کرنے کا؟

(3) اطمینان ..... اطمینان کا لفظ ابھی تو دور دور تک نظر نہیں آتا۔ لکھتے ہوئے زیادہ عرصہ بھی نہیں ہوا۔ کہانیاں بھی زیادہ نہیں ہیں۔ یہ تو وہی بات ہو گئی جیسے بقول بانو قدسیہ "اوس سے کسی کی پیاس کیا بجھے۔" اب تک جو لکھا' وہ اوس کے اس ننھے سے قطرے سے ہی مشابہ ہے۔ اس ننھے قطرے نے میرے دل کو تر کیا ہے لیکن بھگویا نہیں۔

تاہم "مرگِ سیاہ" اور "وڈا کھیل" لکھ کر اچھا ضرور لگا تھا۔ آج کل پیال ساز زیرِ قلم۔ محبت اور محنت سے۔ پھر بھی ہر بار امتل آپی کو قسط بھجوا دینے کے بعد بارہا ارادہ کیا کہ قسط واپس منگوا لوں۔ اور آپی سے کہہ دوں کہ آپی اس بار قسط کی جگہ شائع کر دیں کہ "امل کی قسط ان کی ناسازیٔ طبع کے باعث موصول نہیں ہو سکی۔" اور میں اس ایک ماہ میں "خراب طبیعت کے باوجود قسط کو نئے سرے سے پھر لکھوں۔" خوب محنت کروں۔ دل کی تسلی کروں اور بس دل کو تسلی ہی نہیں مل پاتی۔ شاید تمام مصنفوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ مصنف کے لیے اطمینان وہ سنجیونی بوٹی ہے جسے بڑے جتنوں کے بعد حاصل کیا جاتا ہے۔ لمبا سفر کرنا پڑتا ہے۔ پھر بھی وہ قسمت والوں کو ہی ملتی ہے۔

میری کہانیوں کے بارے میں اکثر ریڈرز کہتے ہیں کہ وہ ڈارک ہوتی ہیں۔ شاید میرے اندر کچھ ایسا ہو۔ میری ذات کے رنگ میری کہانیوں کے رنگوں سے مختلف ہیں۔ میری کہانیوں سے مجھے جج نہ کریں تو مجھے اچھا لگے گا۔ ریڈرز کہتے ہیں کہ میں ہلکی پھلکی کہانیاں لکھوں۔ یقین کریں کہ کہانی لکھتے ہوئے میں نے کبھی اس کو میزان میں نہیں رکھا کہ کون سی ہلکی پھلکی ہے۔ غبارے کی طرح کہ خود بھی اڑ جائے اور پڑھنے والے کو بھی اڑا کر لے جائے (ہاہاہا)۔ مجھے لگتا ہے کہ رائٹر کی کہانیاں کسی سرپرائز کی طرح ہوتی ہیں۔ وہ خود رائٹر اور ریڈر دونوں کو چونکا سکتی ہیں کہ

اوہ! کیا واقعی میں نے لکھا ہے... واؤ... (رائٹر)۔
اوہ! کیا یہ واقعی اسی رائٹر نے لکھا ہے... گریٹ... (ریڈر)۔

(4) پسندیدہ مصنفین اور کتابوں کی فہرست تھوڑی طویل ہے۔ بانو قدسیہ پسند تھیں' ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ ان کے انٹرویوز کو بھی پانچ پانچ بار پڑھا ہے۔ جلد یا بدیر ان کے اعزاز میں لکھا گیا ناول "قدسیہ کہانی" بھی آپ پڑھ سکیں گے۔ اس کے علاوہ جیلانی بانو' رام لعل' کرشن چندر' قاضی عبدالستار' ابوالفضل صدیقی' گلزار' محمد الیاس اور محمد اشرف۔ محمد اشرف جن کی ایک پدما شری ایوارڈ یافتہ کہانی "آدمی" اور "رنگ" نے مجھے دنگ ہی کر دیا تھا۔

زندگی میں ابھی تک دو کہانیاں ایسی پڑھیں جنہوں نے مجھے بری طرح سے جھنجھوڑا (چونکایا تو بہت سوں نے) ایک یہ کہانی "رنگ" اور دوسری منوج داس کی "جنگل میں" ہے۔ ایسی کہانیوں کا سوچا جانا اور پھر لکھ دیا جانا' تاریخ رقم کرنے کے مترادف ہے۔ (تیسری کب مجھے جھنجھوڑنے آتی ہے مجھے اس کہانی کا انتظار ہے۔)

ایک کہانی جسے میں نے بار بار پڑھا' پی رومانوف کی "وجود" ہے۔ اردو میں آپ اسے عورت نامہ کہہ سکتے ہیں۔ ویسے تو عورت کی بے وفائی پر بہت لکھا گیا۔ جس میں گستو فلابیر' لیو ٹالسٹائی اور حلت ضیا گل کے ناولوں نے غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ لیکن پی رومانوف کی یہ کہانی جیسے ان سب ضخیم ناولوں کا جواب ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کو پڑھا لیکن کم۔ پھر خود لکھنا شروع کیا تو پڑھنا بھی شروع کیا۔ جس ادارے کے ساتھ ہم منسلک ہوں اس کے بارے میں آگاہی ہونی چاہیے۔

تنزیلہ ریاض کا "عہد الست" ایک عہد کی مانند ہے۔ "اوہ ری جھگوری" پڑھا تو سائرہ رضا سے تعارف ہوا۔ نمرہ احمد اور سمیرا احمد نئے دور کی آوازیں ہیں۔ وہ اپنے خیالات کو لفظوں کے پیراہن میں ڈھالنا جانتی ہیں۔ مصباح علی شاید موسموں کے حساب سے لکھتی ہیں۔ سال میں چار۔ گزارش ہے کہ زیادہ نہ لکھیں تو اتنا کم بھی نہ لکھیں۔ "جو زیست کو" پڑھا تو میمونہ صدف سے واقفیت ہوئی۔ جواب غائب ہیں۔ فریدہ فرید اپنی کہانیوں میں ہمیشہ نئے پہلو دیتی ہیں۔ عفت سحر طاہر' نازیہ' شازیہ جمال طارق' قانتہ رابعہ سب بہت اچھا لکھتی ہیں۔

(5) بچپن سے ہی عادت ہے جو کتاب پڑھی' اچھے لفظوں' اچھی باتوں کو نوٹ بک میں نوٹ کر لیا۔ ان ہی نوٹ بکس میں سے کچھ اقتباسات جو مجھے اچھے لگے۔

"کوئی شخص مضبوط نہیں... جب اس کی جبلت اسے برہنہ کر کے پتھر اور دھات کے زمانے میں لے جاتی ہے۔ ساری تہذیب' آدرش' مذہب' دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے اور وہ صرف خواہش اور ضرورت کا غلام رہ جاتا ہے۔" (بانو قدسیہ)

"خدا نے کائنات بنتے ہوئے بنائی ہو گی اور محبت میں۔ اس لیے کہ چیزیں غصے یا انتشار میں نہیں بنائی جا سکتیں۔" (اسد محمد خان)

"پتا نہیں لوگ بیٹیوں کے نام زینب' مریم کیوں رکھ دیتے ہیں۔ بڑے ناموں کے ساتھ دکھ بھی بڑے ہی وابستہ ہوتے ہیں۔ عیسیٰ' عباس' حسین' اتنے بڑے نام' غم کی صورت میں کچھ نہ کچھ خراج تو وصول کرتے ہی ہیں۔" (محمد الیاس)

"جب محبت کا یوسف ہجر کے کنویں میں گرتا ہے تو اس کے چاہنے والے کی آنکھیں یعقوب ہو جایا کرتی ہیں۔" (طارق بلوچ صحرائی)

"اڑو کہ اڑنے کا حق صرف پر والوں کے پاس ہی نہیں۔" (سمیرا احمید)

عید خوشیوں کی نوید

لفظ عید ذہن میں آتے ہی خوشیوں' مسکراہٹوں' اہتمام اور دوستوں کا تصور پردہ ذہن پر ابھر آتا ہے اور بات عید قرباں کی ہو تو خوشیوں اور ملے گلے کے ساتھ ساتھ کچن سے اٹھتی اشتہا انگیز خوشبوئیں اور بارونق دسترخوان کا خیال آتا ہے۔ سنت ابراہیمی پر عمل کرکے جہاں ایک فریضہ ادا کیا جاتا ہے۔ وہیں اس خوشی میں دوستوں اور احباب کو شامل کرکے اس کے لطف کو دوبالا کرنے کا اہتمام بھی زور و شور سے ہوتا ہے۔

اس دفعہ کے عید سروے پر ہمارے سوالات بھی اس عید کی تیاری سے لے کر قربانی' پکوان اور دعوت طعام سے متعلق تھے۔ سروے کے سوالات یہ تھے۔

(1) عیدالاضحیٰ پر آپ کے گھر میں دعوت کا اہتمام ہوتا ہے یا آپ خود مہمان بن کر جاتی ہیں۔ گھر پر دعوت ہو تو آپ کیا اہتمام کرتی ہیں؟ کوئی خصوصی ڈش جو مہمان شوق سے کھاتے ہیں۔

(2) گوشت کی کوئی ایسی ڈش جسے آپ کے گھر' خاندان یا علاقے کی خاص ڈش کہا جاتا ہے۔

(3) کیا عید قرباں پر آپ کے گھر کے مرد گوشت کی تقسیم یا کھانے پکانے میں آپ کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔

آیئے دیکھتے ہیں قارئین نے ان سوالات کے کیا جوابات دیے ہیں۔

جشن عید مبارک

ادارہ

شجیعہ۔۔۔ لاہور

1 ۔ ہاں جی بالکل اس عید کے تو تینوں دن ہی مصروفیت میں گزر جاتے ہیں۔ پہلے دن حسب معمول دادو کے گھر سب چاچو' تایا اور پھوپھو کی فیملیز اکٹھی ہوتی ہیں اور بہت رونق لگتی ہے سال میں یہ ہی تو دن ہوتے ہیں جب سارا خاندان اکٹھا ہوتا ہے۔ اور جناب دوسرے دن ساری فیملیز ہمارے ہاں تشریف لاتی ہیں تو سارا دن بس مہمانوں کے آگے پیچھے گزر جاتا ہے اور تیسرے دن پھر کسی تایا کے گھر جاتے ہیں بس اسی طرح مصروفیت میں دن گزر جاتے ہیں۔

کوئی خاص ڈش تو نہیں ہوتی۔ لاسٹ عید یہ امی نے دعوت میں نہاری اور اسٹو بنایا تھا جو کہ بہت ہی لذیذ تھا۔ تو یہ دونوں ڈشز بہت ہی شوق سے سب نے کھائی تھیں۔

2 ۔ نہیں جناب ایسا کچھ نہیں ہے کہ کوئی خاص ڈش ہو' مگر ایک ڈش جو کہ شاید آپ لوگوں کو بہت عجیب لگے' مگر مجھے بہت پسند ہے۔ یہ بہت سادہ سی ہے اور بس مزہ آجاتا ہے کھا کر۔

بیف بوٹی

بڑا گوشت کیوب میں کٹی ہوئی بوٹیاں' نمک حسب ذائقہ' لال مرچیں حسب ذائقہ' لیمن جوس حسب ذائقہ' گرم مسالا حسب ذائقہ

گوشت میں ان سب چیزوں کو اچھی طرح مکس کردیں اور کچھ دیر پڑا رہنے دیں تاکہ مسالا اچھی طرح رس بس جائے۔ اب توے پر گھی ڈالیں یا آئل' آئل گرم ہوجائے تو بوٹیاں ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر رکھ دیں۔ کچھ دیر بعد پلٹیں اور پھر ڈھانپ کے رکھ دیں۔ لیں جی! مزیدار بیف بوٹی تیار ہے۔ ویسے یہ میں نے خود نام دیا ہے' میں یہ بچپن سے بناتی آرہی ہوں شاید ہی کوئی بناتا ہو اسے ٹھنڈی بوتل کے ساتھ نوش فرمائیں۔

3 ۔ ہاں کچھ حد تک تو بات ٹھیک ہے۔ مرد چھوٹی عید پر تو بالکل ساتھ نہیں دیتے سوائے حکم چلانے کے جب کہ بقر

عید پر کچھ نہ کچھ ہاتھ بٹا ہی دیتے ہیں۔ خاص طور پر میرے والد محترم جیسا کہ سلاد بنا دی گوشت کی بوٹیاں بنا دیں وغیرہ۔۔۔۔

مسرت الطاف احمد۔۔۔۔ کراچی

1 ۔ عیدالاضحیٰ کے موقع پر قربانی سے فارغ ہونے کے بعد سب کزنز کو پہلے کلیجی کا ناشتا کرایا جاتا ہے جب کہ رات کو باربی کیو کا پروگرام ارینج کرتے ہیں۔ ہم ہر سال اپنے حصہ کا گوشت باہر بہاری بوٹی بنانے کے لیے بھی دیتے ہیں۔ دعوتوں کا سلسلہ تو عید کے دوسرے دن سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ دوسرے دن دادا ابو کے گھر اور تیسرے دن نانی اماں کے گھر سب اہل و عیال جمع ہو جاتے ہیں اور اس دن خوب ہلا گلہ، مستی کرتے گزارتے ہیں۔ ہر طرف گہما گہمی اور رونق نظر آتی ہے۔

سب ہی عید کی خوشیاں منانے میں مگن نظر آتے ہیں۔ وقت کے سمندر میں کچھ خوب صورت لمحات یاد بن کر ہمیشہ زندگی کو رنگین کرتے ہیں۔

2 ۔ ہر سال عیدالاضحیٰ کے موقع پر ہمارے گھر ایک خاص روایتی ڈش ضرور بنتی ہے یہ ڈش صائمہ اور میری فیورٹ ڈش ہے، ہمارے گھر قربانی کا گوشت اتنا نہیں کھایا جاتا۔ ندا گوشت سے ایسے بھاگتی ہے جیسے گائے بکرے قصائی سے اور ام رباب بھی ندا کے نقش قدم پر سبک روی سے گامزن ہے۔ یہ کوالٹی ابو کی طرف سے انہیں وراثت میں ملی ہے۔ خیر چھوڑیں بدذوق لوگوں کو، امی خاص طور پر ہمارے لیے بہت ہی پیار سے بناتی ہیں اس ڈش کا کوئی خاص نام تو نہیں بس ابھی حال ہی میں رکھا ہے۔ ریشمی گوشت بہت ہی مزے دار اور ذائقہ دار ہوتا ہے۔

ریشمی گوشت

اجزا :

گوشت دو کلو، نمک حسب ذائقہ، ادرک، لہسن، دو چائے کا چمچہ، ہری مرچ اور پودینہ کا پیسٹ، دو چائے کا چمچہ لال مرچ پاؤڈر، دو چائے کا چمچہ کٹی ہوئی لال مرچ، دو چائے کا چمچہ گرم مسالا، ایک چائے کا چمچہ چاٹ مسالا، دو چائے کا چمچہ

ترکیب :

گوشت کو اچھی طرح دھو کر ابال لیں۔ ساتھ میں نمک اور ادرک، لہسن کا پیسٹ بھی ڈال دیں جب گوشت اچھی طرح گل جائے اور ریشہ ریشہ ہو جائے اور ذرا سا پانی رہ جائے تو اس میں ہری مرچ اور پودینہ کا پیسٹ بھی ڈال دیں اور ساتھ میں لال مرچ پاؤڈر، کٹی ہوئی لال مرچ، گرم مسالا اور چاٹ مسالا ڈال کر تھوڑا سا پکنے دیں اس میں آئل نہیں ڈالتے کیوں کہ قربانی کے گوشت میں چکنائی ہوتی ہے جب ذرا سا شوربا رہ جائے تو ڈش آؤٹ کرکے دوسروں کو کھلائیں اور تعریفیں وصول کریں۔

3 ۔ عیدالاضحیٰ یا کسی بھی تہوار سے زیادہ عام دنوں میں میرے بابا انواع و اقسام کے ڈشز بہت ہی ذوق و شوق سے پکاتے ہیں۔ بریانی ہو یا کڑاہی، قورمہ ہو یا تکہ یہ کوالٹی میرے بابا میں دادا جان کی وجہ سے منتقل ہوئی ہے۔ دادا جان کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے، ایک بار دادا جان نے ہمارے لیے اسپگیٹی بنائی تھی آج بھی وہ ذائقہ نہیں بھولتا۔

وردہ گل طارق۔۔۔۔ کوئٹہ

1 ۔ امی ابو، منزہ (بہن) اور عمر (بھائی) یہ لوگ تو صبح بارہ بجے تک سب سے عید ملنے کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں (بھئی سب سے چھوٹے جو ہیں نا) اور رہی بات ہماری اور لاریب کی (بھئی ہماری دوسری بہن) تو وہ اور میری مما، دادی اور دادا ابو ہم گھر میں ہی ہوتے ہیں اور مما اور دادا سے ملنے ان کے دوسرے پوتے، پوتی آجاتے ہیں، مگر کھانا وغیرہ نہیں کھاتے، لیکن دوسرے روز پھپھو اپنے پورے کنبے سمیت آن وارد ہوتی ہیں تو دعوت کا اہتمام کیا جاتا ہے اور ہماری مشہور ڈش یعنی پلاؤ بنتا ہے جو کہ پورے خاندان میں مشہور ہے (بھئی ہمارے ہاتھ میں ذائقہ بہت ہے نا) تو وہ دیگر لوازمات کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔

2 ۔ کوئی اتنی خاص ڈش تو نہیں ہے البتہ دادا ابو کو اور ہمیں بھی۔۔۔۔ کلیجی بہت پسند ہے جسے ہم بھون کر بناتے ہیں۔ اس کے علاوہ پلاؤ ہوتا ہے، تو یقیناً "یہ سب کو آتا ہوگا تو لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

3 ۔ یہ تو آپ نے بڑا چنگا سوال کی تا اے (یہ تو آپ نے بڑا اچھا سوال کیا ہے) بس جی کیا بتاؤں۔ آپ کو، ہمارے گھر کے مرد حضرات یعنی دادا ابو سے لے کر چھوٹے عمر تک کوئی ہل کر پانی تک نہیں پیتا تو کھانے بنانے میں مدد کرنا تو جی بڑی بات ہے۔ ہاں میرے پھپھو کے شوہر یعنی میرے

پھپھا اور ان کے بیٹے یعنی میرے کزنز وہ بڑی اچھی کوکنگ کرتے ہیں تو ان کے ہاتھ کی کڑاہی اور باربی کیو بہت پسند کیے جاتے ہیں۔

نادیہ علی۔۔۔ سرجانی ٹاؤن کراچی

1۔ عیدالاضحیٰ پہ تو ہم کہیں نہیں جاتے۔ ہاں آپی عید کے پہلے دن ضرور آتی ہیں اور دوسرے یا تیسرے دن سب سے چھوٹی خالہ آتی ہیں۔ ہمارے گھر دعوت ہو تو میں بریانی اور پائے کو ترجیح دیتی ہوں اور ساتھ میں سلاد والا رائتہ۔ ہمارے مہمان پائے بہت شوق سے کھاتے ہیں اور بچ جائے تو فرمائش کرکے لے بھی جاتے ہیں۔ (ویسے ہمارے ننھیال میں کہیں بھی دعوت ہو ساتھ میں پارسل کا بھی انتظام ہوتا ہے۔)

2۔ ہمارے گھر کی گوشت کی خاص ڈش جو آپی بہت فرمائش سے بنواتی ہیں وہ چھوٹی کے ہاتھ کے تکے اور بابدولت کے ہاتھ کی بریانی اور نہاری ہے اور آپی کے علاوہ باقی میرے ماموں، انکل، خالہ وغیرہ کو ہمارے گھر کے پائے بہت پسند ہیں اور اگر ہمارے گھر پائے کی دعوت ہو تو سب بہت ذوق و شوق سے قبول کرتے ہیں۔

ہمارے خاندان کی تو کوئی خاص ڈش نہیں ہے۔ ہاں ہمارے علاقے کی ایک ڈش بہت مشہور ہے، لیکن وہ گوشت کی نہیں آلو کی ہے یعنی آلو کی بریانی چٹ پٹی اور ذائقہ دار، وہ بھی صرف 60 روپے کلو۔ ہو گئے نا حیران۔ جو بھی سنتا ہے یہی کہتا ہے کہ بریانی ساٹھ روپے کلو ناممکن اور کراچی جیسے شہر میں بالکل ناممکن۔ مزے کی بات کہ بریانی لینے اور کھانے کے بعد بھی یقین نہیں آتا کہ بریانی ساٹھ روپے کلو ہے۔

3۔ بھئی عید میٹھی ہو یا نمکین ہمارے تو دونوں تہوار کچن کی نذر ہوتے ہیں۔ ہم کیوں کہ قربانی میں حصہ لیتے ہیں تو گوشت آنے تک دو یا تین بج جاتے ہیں پھر بعد کا کام میں اور مما سنبھالتے ہیں۔ سب کے حصے بنوا کر بٹوانا اور اپنا حصہ ٹھکانے لگانا۔ مما بابا سے میں لہسن، پیاز وغیرہ ضرور بنواتی ہوں، مگر پکاتی میں خود ہوں۔ بابا کہتے بھی ہیں کہ میں پکاؤں، مگر میں منع کردیتی ہوں۔

روبینہ شاہد۔۔۔ کراچی

1۔ عید کے پہلے روز ہم اپنے لیے ہی اہتمام کرتے ہیں اور عید کے دوسرے روز قربانی ہوتی ہے۔ ہماری چونکہ جوائنٹ فیملی ہے اور ہماری اکلوتی نند صاحبہ پہلے روز اپنے گھر قربانی کرکے ہمارے گھر ہی آجاتی ہیں، سو ہم سب خود ہی میزبان اور خود ہی مہمان کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

عید کے دوسرے روز قربانی بھی ہوتی ہے اور ڈھیروں کزنز رشتے دار آتے ہیں کیوں کہ رات کو ہمارے گھر کی چھت پر ہر سال باربی کیو کا انتظام ہوتا ہے اور باربی کیو کے مزے دار ذائقے کے چٹخارے لینے کے لیے ہی سب عید کے دوسرے دن رات گئے تک ہمارے گھر میں محفل جمائے رہتے ہیں۔

2۔ عید کے پہلے روز تو تمام آئٹم چکن کے ہی بنتے ہیں کیوں کہ قربانی دوسرے روز ہوتی ہے۔ قربانی کے فوراً بعد کلیجی بنتی ہے جسے کوئی بچہ چھوتا تک نہیں اور فرمائشی دال چاول بنتے ہیں۔

کیوں کہ رات میں ہم تمام خواتین کی ہمارے اپنے ہی گھر میں دعوت ہوتی ہے بلکہ یوں کہہ لیں کہ باربی کیو کا لنگر عام ہوتا ہے۔ سال ہا سال سے ہمارے گھر عید کے دوسرے روز تکہ بوٹی، سیخ کباب، چپلی کباب، گولہ کباب، بہاری بوٹی اور اس کے ساتھ چپاتی، پراٹھے، رائتہ، سلاد، چٹنی اور کولڈ ڈرنک کا بھی انتظام ہوتا ہے۔

یہ ہمارے گھر کی خاص دعوت ہے۔ جس میں سب خود بخود آتے ہیں، ہمارے کزنز اور دیگر رشتے دار، گلی کے چوکیدار، دکان کے ملازم وغیرہ۔ رات گئے تک لوگ آتے رہتے ہیں اور گرما گرم لوازمات سے شکم پری کرتے ہیں۔

ہمارے گھر میں تو گوشت بڑے پتیلوں میں رکھا ہوتا ہے۔ مسالے بھی اندازے سے لگائے جاتے ہیں اور ہمارے دیور بار بار مسالے لگا کر بھابھیوں کو چکھاتے ہیں پھر پہلی سیخ بھی بھابھیوں کے پاس ہی آتی ہے کہ سب سیٹ ہے، کوئی کمی تو نہیں اور ساری بھابھیاں گرما گرم بوٹیاں منہ میں رکھے، گڈ! ایکسیلینٹ! زبردست! کیا بات ہے بھئی! مزہ آگیا ہے۔ جیسے جملے بولتی ہیں حالانکہ کئی بار زبانیں جل جاتی ہیں، مگر کیا کیا جائے، دیور جی کی تعریف کرنا بھی تو مقصود ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہ بے چارے کیا کیا کرتے ہیں یہ اگلے سوال کے جواب میں آئے گا۔

ذیل میں ہم ایک کلو بوٹی بنانے کی ترکیب لکھ رہے ہیں۔ بے حد آسان ترکیب ہے۔

ضروری اشیا:

چھوٹی بوٹی (گائے کے گوشت کی) ایک کلو پسی لال مرچ ایک چائے کا چمچہ، کٹی لال مرچ ایک چائے کا چمچہ، پسا گرم مسالا ایک چائے کا چمچہ، ہلدی پاؤڈر ایک چوتھائی چمچہ، لہسن پسا ہوا ایک چائے کا چمچہ، ادرک پسی ہوئی دو چائے کے چمچے، لیموں کا رس، چار چائے کے چمچے کچا پپیتا پسا ہوا، دو چائے کے چمچے، گھی حسب ضرورت، نمک حسب ذائقہ

(ویسے تو تمام اشیا حسب ضرورت اور حسب ذائقہ ہی رکھی جاتی ہیں کیوں کہ کچھ لوگ چٹپٹا پسند کرتے ہیں اور کچھ ہلکا۔)

ترکیب

تمام مسالے پپیتے سمیت - بوٹیوں پر لگا کر کم از کم تین سے چار گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پھر سیخوں پر لگا کر باربی کیو کریں۔ اوپر سے گھی سے برش کریں۔ سیخیں گھما کر سینکیں اور ——— چٹنی اور رائتے کے ساتھ نوش فرمائیں۔

1 - میٹھی عید خواتین کا اور عید قرباں مردوں کا تہوار ہے یہ بات سو بلکہ دو سو فیصد درست ہے۔ عیدالفطر میں ماہ رمضان کی ابتدا سے ہی یا بلکہ اس سے پہلے سے ہی تمام تر ذمہ داریاں خواتین کے ناتواں کاندھوں پر ہوتی ہیں۔ ساتھ ساتھ گھریلو امور، شاپنگ، مختصر یہ کہ تمام امور خواتین کو پوری ذمہ داری کے ساتھ انجام دینے ہوتے ہیں۔ عید کی دعوتوں کے انتظامات بھی خود ہی کرنے ہوتے ہیں۔

اور عیدالاضحیٰ میں قربانی کے جانور کی خریداری سے لے کر، رکھوالی، خاطرداری، نازبرداری وغیرہ کی تمام تر ذمہ داری مرد حضرات کے سر ہوتی ہے۔ قربانی اور گوشت کی تقسیم کے بعد بھی کہاں چین سے بیٹھتے ہیں، پھر ہوتی ہے. چٹ پٹی، مزے دار باربی کیو پارٹی کی تیاری۔ جس کی لے رکھی ہے ہمارے گھر کے مردوں نے، خود بخود ساری کی ساری ذمہ داری۔ ہم خواتین تو شام سے پہلے تک بس ہیلپر کے فرائض انجام دیتی ہیں۔

جیسے ہی دن ڈھلتا ہے اور شام چپکے چپکے رات کی آغوش میں چھپنے لگتی ہے۔ ہمارے گھر کی تمام خواتین سج سنور کر مہمان بن کر چھت پر پہنچ جاتی ہیں۔

چھت کو برقی قمقموں سے بقعہ نور بنایا ہوتا ہے ایک طرف تخت لگا دیا جاتا کہ کوئی بزرگ آرام کرنا چاہیں تو لیٹ جائیں۔ دیوار کے ساتھ کرسیاں لگادی جاتی ہیں اور درمیان میں بہت بڑا فرشی انتظام ہوتا ہے اور مستقل دستر خوان بچھا ہی رہتا ہے۔ آتے رہیے کھاتے رہیے کے مترادف۔

تمام ہی مرد آرام دہ ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس میزبانی کے فرائض انجام دے رہے ہوتے ہیں۔

کوئی سیخوں پر بوٹیاں پرو رہا ہے تو کوئی سیخ کباب پر دھاگا لپیٹ رہا ہے۔ کوئی پنکھا جھل رہا ہے تو کوئی سیخیں گھما گھما کر سینک رہا ہے اور چمٹے کی مدد سے پلیٹوں میں ڈال رہا ہے دوسری طرف کوئی چپلی کباب کی ٹکیاں بنا رہا ہے تو کوئی تل رہا ہے اور کوئی مستقل تمام لوازمات سرو کر رہا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ نہ ماتھے پر کوئی شکن، نہ اظہار تھکن بلکہ تمام امور انتہائی خندہ پیشانی سے ہنستے مسکراتے بحسن خوبی انجام دیے جاتے ہیں اور تمام خواتین ہاہاہا، ہوہوہو، کھی کھی کھی میں مصروف، باتیں، کھانا اور ہنسنا۔

کیوں کہ ہم خواتین کو اپنے گھر میں یہ ایک شام یا رات ایسی ملتی ہے جب اپنے ہی گھر میں ہم مہمان بن جاتی ہیں اور گھریلو ذمہ داریوں سے ہمیں چند گھنٹوں کے لیے چھٹی مل جاتی ہے۔ یعنی مرد ہمارا ہاتھ نہیں بٹاتے بلکہ پوری ذمہ داری اٹھاتے ہیں۔ عیدالاضحیٰ پر۔

یہاں میں عیدالاضحیٰ کے حوالے سے ایک واقعہ آپ سے شیئر کرنا چاہوں گی۔

یہ اب سے پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ جب سنہری رنگت، براؤن بالوں، ستارہ آنکھوں، پھولے رخساروں اور چہرے پر بلا کی معصومیت رکھنے والی زینب کی عمر صرف چار برس تھی۔ یہ ہمارے سب سے چھوٹے دیور زریاب کی بیٹی ہیں۔ گھر بھر کی لاڈلی زینب کا خمیر تو جیسے شرارت اور تجسس سے مل کر گوندھا گیا ہے۔ صحت مند زینب بھاری سے بھاری وزن یوں اٹھالیتی ہے جیسے معمولی بات ہو، ننھی سی عمر سے ہی.... ہمارا گھر کمرشل ایریا میں ہے نیچے دکانیں اوپر رہائش۔ چھٹی کے دنوں میں تمام دکانیں بند ہوتی ہیں۔ ہماری گلی کے سامنے کئی کٹ گلیاں ہیں وہاں سائیڈ پر مین ہول ہیں، جن پر خاصے بھاری ڈھکن موجود ہیں۔ کٹ گلیاں ہماری کھڑکیوں سے صاف دکھائی دیتی ہیں۔

عید سے دو تین روز پہلے زینب نے مین ہول سے کسی آدمی کو نکلتے دیکھا۔ اس نے فوراً" آکر اپنی امی سے پوچھا۔
"زمین کے اندر کون لوگ رہتے ہیں؟"
اس کی امی بے حد مصروف تھیں۔ کہہ دیا۔ "بھوت رہتے ہیں"
زینب نے خوشی خوشی سب کو بتایا کہ آج اس نے ایک بھوت دیکھا ہے اگر کسی دن اسے موقعہ ملا تو وہ بھوت کے گھر جائے گی' اس نے اپنے ہم عمر بچوں کو بتایا۔ بڑے بے خبر تھے یا کسی نے بچی کی بات کا نوٹس ہی نہ لیا۔ کیونکہ ویسے تو بچوں کو اکیلے نیچے اترنے کی اجازت ہی نہیں ملتی۔ بڑوں کے ساتھ ہی اترتے ہیں۔ مگر جب بچوں نے کوئی کارنامہ انجام دینا ہو تو وہ بڑوں کی موجودگی میں بھی دے لیتے ہیں' بس زینب جیسی پھرتی اور طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔
پانچ سال پہلے عید کا دوسرا دن تھا اور قربانی ہو رہی تھی۔ گائے کی گردن پر دعا پڑھ کر چھری پھیری جا رہی تھی۔ تمام گھر کے مرد نیچے تھے سو بچے بھی نیچے اتر گئے تھے۔ آس پاس کے لوگ بھی جمع ہو گئے تھے۔ گھر کی کچھ خواتین جو قربانی دیکھنا چاہتی تھیں وہ فرسٹ اور سیکنڈ فلور سے یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ کمزور دل والیاں کمروں میں دبکی ہوئی تھیں۔
اچانک ہی نیچے سے زینب زینب کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ تمام ہی خواتین فرسٹ اور سیکنڈ فلور کی کھڑکیوں میں لٹک گئیں جیسے بس اب سے نیچے نکل جائیں گی۔ اور نیچے جیسے ہی زینب نے مین ہول کا بھاری ڈھکن ہٹایا اور نیچے کی راہ لی۔ ساتھ کھڑے کزن زید (جو بڑا کے توتلے ہیں) نے شور مچا دیا دینب دینب (زینب زینب) ڈینب دئی بوت تے در (زینب گئی بھوت کے گھر)۔
تب کسی بڑے کزن نے پوچھا "کیا ہوا؟" کیونکہ زید کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں تب زید نے اشارہ کیا اور بتایا۔ (شکر تھا کہ اندر لوہے کا جال تھا) پھر شور مچا اور ہمارے نندوئی جو گائے کی بندھی ہوئی ٹانگیں پکڑے ہوئے تھے گھبرا کر پلٹے اور گائے گلے پر چھری پھرنے کے بعد مچلی' اور وہ بیچارے بیلنس برقرار نہ رکھ سکے اور گر پڑے ـــــ معمولی چوٹ بھی لگی۔
خیر لڑکوں نے فوراً" ہی زینب کو باہر نکال لیا جب زینب گھر میں داخل ہوئی تو بالکل بھوت کا بچہ لگ رہی تھی۔
زینب کو دیکھ کر ہی تمام خواتین کا رونا چیخنا بند ہوا۔ خبر بھی یا جنگل کی آگ ان کی آن میں دور دور تک کے لوگوں کو بریکنگ نیوز مل گئی کہ "ایک بچی گٹر کا ڈھکن نہ ہونے کے سبب اندر گر گئی۔" زینب کو نہلا دھلا کر خوشبویات میں بسایا گیا۔ خدا کا شکر تھا کہ زینب کے معمولی سی خراش بھی نہیں آئی تھی صدقہ دیا گیا۔ لرزتے کانپتے دل قابو میں آئے تو سوال و جواب کا سیشن شروع ہوا۔
مختلف سوالات پر زینب کے جوابات یہ تھے۔
کسی نے پوچھا۔ "تم گریں کیسے؟"
"میں گری نہیں تھی میں نے تو خود چھلانگ لگائی تھی۔"
"پھر؟" کسی نے ایک لفظ میں آگے کی کہانی جاننی چاہی۔
"مجھے لگا مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا۔"
"ہائے اللہ رے!" دادی گھبرائیں۔ "پھر کیسے نظر آنا شروع ہوا۔"
"وہ دادی میں نے چھلانگ لگاتے ہوئے آنکھیں بند کر لی تھیں۔" تو کھولنا بھول گئی تھی جیسے ہی آنکھیں کھولیں کالا گندہ پانی دکھائی دیا جو بھوت پیتے ہیں۔"
یہ سوال جواب کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہا اور کئی روز بلکہ اب تک اس خیال سے سب ہی لرز جاتے ہیں کہ اگر پتا نہ چلتا کہ زینب نے مین ہول میں چھلانگ لگا دی ہے۔ پھر رب کا شکر ادا کرتے ہیں۔ کہ بچی کو معمولی خراش تک نہ آئی تھی۔ اور نہ ہی وہ گھبرائی تھی۔ بلکہ سوالوں کے جوابات جو زینب نے اس روز دیے وہ آج بھی سب ہی کو بہت محظوظ کرتے ہیں۔
بچے جب بھی سوال کریں انہیں مکمل اور درست جواب دینا چاہیے اور شریر بچوں کو ہر لمحہ کڑی نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے یہ پھول تو نجانے کیا کیا گل کھلا دیتے ہیں لمحہ بھر میں وہ تو فرشتے ہیں جو ان کی حفاظت کرتے ہیں۔"
آج بھی اس واقعے کو یاد کر کے ہم سب نم آنکھوں سے مسکراتے ہیں۔

ثمرہ احمد بٹ ـــــ پتوکی

1 ۔ کبھی کسی کے ہاں مہمان بن کر نہیں جاتی اور نہ ہی جانا پسند ہے خاص طور پر عید کے ایام میں نہ ہی کوئی آتا ہے۔

عیدالاضحیٰ پر عید جب چاپ آتی ہے اور جیسے سرما کی دھوپ تھوڑی دیر کھڑکیوں کے ذریعے کمرے میں آئی ہو بس اتنی ہی خاموش ہلکی سے آہٹ سے دبے پاؤں گزر جاتی ہے اور میں ثمرہ احمد سعید جو اپنی ذات میں ہی ایک انجمن کی طرح ہوں۔ سنہری شام کو الوداع کہتی ہوں اور خاموشی سے سونے کی تیاری کرتی ہوں' ہوتی ہیں کچھ لوگوں کی عیدیں ایسی ہی اتنے ہجوم میں تنہا تنہا!

3 ۔ آپ ہی اپنے مہمان' سادہ گوشت بغیر لہسن پیاز کے نمکین ذائقے دار ہمراہ سفید چاول۔ زیادہ سے زیادہ بغیر نمک مرچ کے گوشت کو اسی کی چربی ضائع کیے بغیر بھون لیا

کیونکہ بلڈ پریشر کی مریضہ ہوں لیکن پھر بھی خوش ہوں ہر گوشت میں گوبھی ڈال کر کھانا بہت اچھا لگتا ہے یا پھر شلغم ملا کر خاص طور پر کیونکہ میں سبزیاں بہت پسند کرتی ہوں اگر مٹر کا موسم ہو تو مٹر گوشت' تلی ہوئی اشیاء مجھے ذاتی طور پر پسند نہیں ہیں بیک شدہ اور ہلکی آنچ پر اپنے پانی میں پکی غذائیت سے بھرپور سبزیاں' گوشت' دال ہی میرے خصوصی پکوان ہیں اور دالوں میں ماش کی دال میں گوشت کے چھوٹے چھوٹے نرم ٹکڑے بہت بھلے لگتے ہیں۔

ساتھ نان والی خمیری روٹی گرما گرم + سفید نرم مگر کھلے کھلے ابلے چاول جو مزا سادہ غذا میں ہے۔ وہ الم غلم میں حقیقتاً" نہیں ہے۔ یہ بات نہیں کہ ہم نے کھانے بنائے یا کھائے نہیں ہیں۔ ہم کشمیری لوگ کھا کھا کر بیمار ہونے والی قوم ہیں ہاں اب چالیس سالہ زندگی میں رزق خالق کائنات نے کم کردی ہے اور اکیلے بندہ سونے کا نوالہ بھی گزارے حلق سے تو گزارنا مشکل ہوتا ہے۔ خاص خاص مواقع پر گھر' خاندان' اور علاقے میں بہت سی مماثلت پائی جاتی ہے کھانوں کے سلسلے میں دال چاول' گوشت' پلاؤ' شامی کباب' قورمہ' پائے' تکہ بوٹی' کچے قیمے کے کباب' سادہ گوشت' باربی کیو انگھیٹیوں پر ہواؤں کے ساتھ دور دور تک اڑتی خوشبوئیں (بھوک لگی ہو تو) بھوک کو بڑھاتی ہیں۔

ہمارے علاقوں میں اکثر عید کی دعوتیں' شام کے کھانے بڑے ذوق شوق سے عیدالاضحیٰ پر بنتے ہیں لیکن سسرال + میکہ دونوں میں آنا جانا دعوتوں پر اب ختم ہو چکا ہے۔ اتنے برسوں میں اب تھک چکی ہوں' اب آرام کرنے کو جی چاہتا ہے کہ کسی شام میں آرام کرنے لیٹوں تو لانگ ریسٹ یہ ہی چلی جاؤں یعنی سفر آخرت مبارک ہو (آمین)۔

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

خیال بڑے اونچے مثلاً" دنیاوی نہیں بلکہ اس دنیا سے بہت آگے کے ہیں مگر بندی بڑی سادی ہوں حلیہ بھی' مزاج بھی' انداز بھی' طبیعت بھی' عمل بھی' خیال بھی' چال ڈھال بھی۔ بہرحال اب زندہ دلی سے ایک پکوان تحریر کرنے لگی ہوں امید ہے کھانے میں مزا دے گا دعوت کے لیے جسے بنایا بھی کبھی اور کھایا بھی اور وہ دن یاد آگئے شکریہ آپ کا یادوں کے چراغ روشن کرنے کا۔

دہی مٹن اسپیشل۔

ضروری اجزا :

گوشت بکرے کا' چار یا پانچ کلو' دہی' ایک کلو' ہری مرچ کٹی' ایک پاؤ' لال مرچ' حسب ذائقہ' کالی مرچ' ثابت دو چمچہ' بڑی الائچی' بارہ عدد' دار چینی' بارہ عدد' ہرا دھنیا' ایک گٹھی' ادرک' کٹی ہوئی آدھا پاؤ' زیرہ ثابت' بڑے چھ چمچے' سوکھا دھنیا' بڑے چھ چمچے۔

ترکیب :

سوائے دھنیے کے تمام اجزاء گوشت + دہی میں ملائیں گوشت کے ٹکڑے مناسب ہوں' درمیانہ سائز کی بوٹی کھانے میں بھی آسان اور دیکھنے میں بھی اچھی لگتی ہے تمام اشیاء ککر میں ڈالیں (پانی سے ککر نہیں بھرنا ورنہ بوٹی قیمہ قیمہ ہو جائے گی اور مہمان خوب ہنسی محسوس کرائیں گے) گوشت کا اپنا پانی ہوتا ہے۔ گلاوٹ کے لیے اندازے سے بس ایک گلاس بھر کے ڈال دیں اور زیادہ سے زیادہ دس منٹ ویٹ دے لیں۔ کھولیں گوشت اپنی چربی + آدھ پاؤ گھی میں بھونیں۔ پانی خشک' گھی اوپر اور بھنائی میں بھی طویل وقت نہیں لگتا۔

پانچ' دس منٹ بھنائی کے بعد گوشت کی شکل اور ذائقہ قابل دید' لذیذ ترین ہو جاتا ہے اب اسی کو سرو کرنے سے پہلے باریک باریک انتہائی محنت سے کٹا ہوا دھنیا چھڑک کر اس کی اشتہا میں اضافہ کریں اور اسے گہرے ڈونگوں میں مت سرو کریں بلکہ کھلی گہری ڈشز خصوصاً" شیشے کی

بقیہ صفحہ نمبر 283

آمنہ ریاض

قلعہ فلک بوس کا آسیب آیوشمتی.... ایک بھٹکتی روح جس کے اسرار سے کوئی واقف نہیں ہے۔

معاویہ فلک بوس آتا ہے تو اسے وسامہ کی ڈائری ملتی ہے۔

فلک بوس میں وسامہ اپنی بیوی آئے کت کے ساتھ رہتا ہے۔ وسامہ بہت اچھا اور ذہین مصنف ہے۔ وہ باوقار اور وجیہہ شخصیت کا مالک ہے لیکن ایک ٹانگ سے معذور ہے۔ وہ غیر معمولی حساس ہے۔ اسے قلعہ فلک بوس میں کوئی روح محسوس ہوتی ہے۔ آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن کوئی نظر نہیں آتا۔ معاویہ' وسامہ کا پھوپھی زاد بھائی ہے' آئے کت اور وسامہ' معاویہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ قلعہ فلک میں آیوشمتی کی روح ہے لیکن معاویہ مضبوط اعصاب کا مالک ہے' اسے اس بات پر یقین نہیں آتا۔

کہانی کا دوسرا ٹریک جہاں تین بھائی جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت رہتے ہیں۔

صابر احمد سب سے بڑے بھائی ہیں۔ صابر احمد کی بیوی صباحت تائی جان ہیں اور تین بچے' رامین' کیف اور فہمینہ ہیں۔ رامین کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملائیشیا میں ہے۔

شفیق احمد کی بیوی فضیلہ چچی ہیں۔ مالی لحاظ سے وہ سب سے مستحکم ہیں۔ شفیق احمد نے ان سے پسند کی شادی کی تھی۔ دو بیٹیاں صیام اور منہا ہیں اور دو بیٹے شاہجہاں اور شاہ میر ہیں۔ بڑے بیٹے شاہ جہاں عرف مٹھو بھائی کا دماغ چھوٹا رہ گیا ہے۔

باسط احمد تیسرے بھائی کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی بیوی روشن امی اور دو بیٹیاں خوش نصیب اور ماہ نور ہیں.... خوش نصیب کو سب منحوس سمجھتے ہیں جس کی وجہ سے وہ تنک مزاج ہو گئی ہے۔ خوش نصیب کی نانی بھی ان کے ساتھ رہتی ہیں۔ خوش نصیب کو دونوں چچاؤں سے شکایت ہے کہ انہوں نے ان کا حق نہیں دیا ہے۔ گھر کا سب سے خراب حصہ ان کے پاس ہے۔ صباحت تائی جان اور روشن امی خالہ زاد بہنیں ہیں۔ صباحت تائی جان کے چھوٹے بھائی عرفات ماموں جو بہت نرم گفتار اور دل موہ لینے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے شادی نہیں کی۔ وہ کیف کے ماموں ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا آئیڈیل بھی ہیں۔

کہانی کا تیسرا ٹریک منفرا اور نیمی ہیں۔ منفرا امریکہ میں پڑھنے آئی ہے۔ ہاسٹل میں رہتی ہے۔ زیر زمین ٹرین میں ان کی ملاقات معاویہ سے ہوتی ہے۔ منفرا کی نظریں معاویہ سے ملتی ہیں تو اسے وہ بہت عجیب سا لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی سفاکی اور بے حسی ہے۔ منفرا چونک سی جاتی ہے۔

آٹھویں قسط

اور خوش نصیب بالکل ساکت سی ہو گئی۔

”تم مانو یا نہ مانو' یہ سب بابا جی کی کرامات کا نتیجہ ہے۔ مجھے پتا ہے تم اور تمہاری روشن امی پیروں فقیروں کو نہیں مانتیں لیکن ہمارے خاندان میں کئی سالوں سے پیروں فقیروں کی قدر کی جاتی ہے۔ ہم انہیں اللہ لوگ مانتے ہیں اور یہ بھی مانتے ہیں کہ اللہ ہمیں ان ہی کے فضل سے عطا کرتا ہے۔“ فریحہ بولتی جارہی تھی۔

”اللہ معاف.... “خوش نصیب ایک دم ہوش میں آکر بولی۔ ”کس قدر کمزور ایمان ہے تمہارے خاندان والوں کا.... میں مانتی ہوں' اس دنیا میں اللہ کے نیک بندے موجود ہیں لیکن ان ڈھونگی بابوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اگر جو میری روشن امی نے یہ بات سنی ہوتی تو ضرور تمہیں ایک زوردار تھپڑ لگاتیں۔“

”اور اگر میری اماں نے ان کے پیر کے بارے میں تمہارے خیالات سن لیے تو وہ صرف ایک تھپڑ نہیں لگائیں

گی۔ پاؤں سے چپل اتار لیں گی اور ایسی پٹائی کریں گی کہ ہمیشہ یاد رکھو گی۔" فریحہ بھی جذباتی ہو کر بولی۔

"آہاہ.... جیسے تمہاری اماں میری پٹائی کریں گی اور میں تو تمہیں بخش دوں گی؟.... یاد رکھنا میں پتھر کا جواب اینٹ سے دینے کی قائل ہوں۔" وہ بھی خوش نصیب تھی اور کبھی نہیں چوکتی تھی۔

فریحہ اس کی بچپن کی سہیلی تھی اور اس کی رگ رگ سے واقف تھی۔ جانتی تھی کہ کہہ رہی ہے تو بدلہ ضرور لے گی۔ سو دل میں ذرا سا سہم گئی پھر مصلحت آمیز لہجے میں بولی۔

"ایک تو تم کو غصہ بڑی جلدی آجاتا ہے۔"

"میں غصہ نہیں کر رہی.... لیکن مجھے واقعی حیرانی ہوتی ہے تم جیسے لوگ کیسے ان باباؤں پر یقین کر لیتے ہو۔"

"ہم یقین کیسے نہ کریں۔ کوئی پریشانی کوئی مسئلہ ہو ایک بار باباجی کے پاس آکر عرض کرنے کی دیر ہوتی ہے۔ وہ تعویذ لکھ دیتے ہیں یا گندم، چینی، نمک وغیرہ دم کر کے دے دیتے ہیں۔ دنوں میں مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔"

"مسئلہ اس لیے حل ہو جاتا ہے کیونکہ تم لوگوں کا اعتقاد بہت مضبوط ہے۔ یقین کرو یہی اعتقاد اگر اللہ سے رکھو اور صرف اسی سے مانگو.... تم دیکھنا کیسے تمہاری پریشانیاں، تمہارے مسائل حل نہیں ہوتے۔"

"اگر ایسی ہی بات ہے تو صرف اللہ سے دعائیں کر کر کے تمہارے مسائل ختم کیوں نہ ہو گئے خوش نصیب!" اچانک سے فریحہ نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آج تک تمہیں ماہ نور اور تمہاری امی کو جو بھی پریشانیاں لاحق رہی ہیں۔ ان کے لیے تم لوگوں نے دعائیں ہی کی ہیں.... وہ دعائیں قبول کیوں نہیں ہوئیں؟ اس لیے کیونکہ تم نے کسی نیک برگزیدہ بندے کو اللہ سے مانگنے کا وسیلہ نہیں بنایا...."

"نیک بندوں سے صرف دعا کرائی جا سکتی ہے۔" "لیکن ہم مانگتے تو اللہ سے ہی ہیں۔" منہ بنا کر بولی۔

"اور کیا پتا تمہیں دعا مانگنے کا سلیقہ ہی نہ آتا ہو۔" فریحہ بضد تھی۔

"مجھے نہیں آتا ہو گا لیکن کیا روشن امی اور نانی کو بھی نہیں آتا ہو گا؟ یہ کیسے ممکن ہے وہ دونوں تو تہجد گزار بھی ہیں۔"

"میں شاید اپنی بات تمہیں سمجھا نہیں پا رہی۔ یہ بڑی لمبی بحث ہے۔ ہمارے امی ابو نے تو ہمیں بچپن سے اب تک یہی سکھایا ہے کہ اللہ سے بھی مانگنا ہے تو نیک بندوں کے ذریعے سے مانگو۔ ان کی برکت سے ہی اللہ ہمیں نوازتا ہے.... لیکن تم نہیں سمجھو گی.... میں ابو سے کہوں گی کسی دن تمہیں سمجھائیں۔"

"معاف کر دو مجھے.... ایسی سمجھ اللہ تمہیں اور تمہارے خاندان والوں کو ہی مبارک کرے۔" خوش نصیب نے چڑ کر کہا۔ فریحہ برا مان گئی۔

"نہیں تو نہ سہی.... میں نے تو سوچا تھا اب تک زندگی میں تمہیں کچھ اچھا نہیں ملا تو کم سے کم تم اپنا مستقبل ہی محفوظ کر لو لیکن تم جیسے لوگ کبھی عقل سے کام نہیں لیتے خوش نصیب.... جا رہی ہوں میں اور خبردار، جواب دوبارہ ایک بھی لفظ تم نے ہمارے پیر صاحب کے بارے میں کہا.... اماں تو پٹائی بعد میں کریں گی پہلے میں ہی تمہیں سیدھا کر دوں گی۔" اس نے انگلی اٹھا کر دھمکی دی اور تن فن کرتی چلی گئی۔

خوش نصیب اس کی حرکت پر پہلے حیران ہوئی۔ پھر اسے آواز دے کر روکنے کی کوشش کی لیکن اگلے ہی پل اس کی بے نیازی عود کر آئی اور اس نے اپنے مخصوص انداز میں سر جھٹکا، پیر پٹخا اور فضل منزل کی طرف پلٹ گئی۔

☆ ☆ ☆

اس روز صبح بیدار ہوئی تو آسمان کے چہرے پر دھند کا عکس پھیلا تھا۔
یہ ڈوبتے ہوئے اکتوبر کے دن تھے اور درختوں کے پتے' تازہ سردی کے بوجھ سے اپنے آپ میں سمٹتے اور جھکتے تھے۔
مکان کے داخلی دروازے کی چوکھٹ پر کھڑے معاویہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ طالب ماموں کے اس دو منزلہ چھوٹے سے گھر پر اترنے والی آج کی صبح ہمیشہ جتنی روشن ہرگز نہیں تھی۔
اس کا بوجھل دل مزید اداسی سے بھر گیا۔ حلق میں آنسوؤں کا کڑواپن اترا تو اس نے دو تین گہرے سانس لیے۔ آنسوؤں کو اپنے دل میں اتارا اور خود کو جی بھر کر لتاڑا۔ وہ یہاں آنسو بہانے نہیں آیا تھا۔ ان پیارے لوگوں سے ملنے آیا تھا جو وسامہ سے وابستہ تھے۔ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے سے زیادہ ان کے دلوں کا بھاری پن اپنے کندھوں پر اٹھانے کا ارادہ کرکے نکلا تھا۔
لیکن عین اس وقت جب وہ دروازے پر پہنچ کر گھنٹی بھی بجا چکا تھا۔ تو اسے ادراک ہوا وہ اتنا بہادر ہرگز نہیں تھا۔ کسی کے آنسو صاف کرنے کے لیے اپنے آنسو پینے پڑتے ہیں۔ صبر کی تلقین کرنے سے پہلے خود صبر کرنا پڑتا ہے۔ اس بے چارے سے تو اپنا ہی غم نہیں سنبھالا جا رہا تھا' کسی کو کیا دلاسا دیتا۔ اس کا دل چاہا واپس پلٹ جائے اور اس نے ایسا کیا بھی۔ آنکھ میں آنسو لے کر جوں ہی واپسی کے لیے پلٹا' اسی وقت دروازہ کھل گیا۔
معاویہ کے پلٹتے قدم جیسے دہلیز نے جکڑ لیے تھے۔ آنسو اس کی آنکھ سے پھسل کر گال پر بہتے چلے گئے۔
آئے کت ششدر سی اسے دیکھے گئی۔ دونوں خاموش تھے۔ ان دونوں کے دل زخمی تھے۔ وسامہ کی موت کا زخم ایسا تھا جو شاید کبھی مندمل نہ ہوتا۔
لیکن یکایک آئے کت کی آنکھوں میں سرد مہری سی جاگ اٹھی۔ اس نے دروازے سے ہاتھ ہٹایا۔ واپسی کا قصد کیا ہی تھا کہ عقب سے صاعقہ ممانی کی آواز سنائی دی۔
"کون ہے آئے کت؟" وہ پوچھنے کے ساتھ ساتھ اس کے پیچھے بھی آکھڑی ہوئی تھیں۔
"معاویہ!" ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ سرعت سے آئے کت کے عقب سے نکلیں اور ننھے بچوں کی طرح معاویہ کو خود سے لپٹا لیا۔
"وسامہ بھی چلا گیا...... تم نے بھی آنا چھوڑ دیا۔" وہ اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹے بچوں کی طرح ہی سسک رہی تھیں۔
معاویہ بھی رونے لگا' یہ دیکھے بنا کہ آئے کت اس پر ایک زہر خند مسکراہٹ اچھال کر واپس مڑ گئی ہے۔ اس کے آنسوؤں کی بھی قدر بھی آئے کت کی نظر میں۔
"آؤ اندر آؤ...... ہم کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" ممانی اسے اندر لے آئیں۔ وسامہ کی موت کے تین مہینے بعد آیا تھا' وہ تین صدیوں بعد نہیں کہ گھر کے اندر تک بلانے کے لیے اسے باقاعدہ دعوت دی جاتی۔ اس گھر کے چپے چپے سے واقف تھا۔ بچپن کا بیشتر حصہ اس نے یہیں گزارا تھا۔ وسامہ کے ساتھ۔ طالب ماموں اور صاعقہ چچی کا بیٹا بن کر۔
لیکن اب وسامہ نہیں رہا تھا تو جیسے ہر چیز اس کے لیے اجنبی ہو گئی تھی۔
صاعقہ ممانی اسے لیے اندر آئیں۔ طالب ماموں ٹی وی کے سامنے چپ چاپ بیٹھے اس ٹاک شو میں دھیان لگانے کی کوشش کر رہے تھے جو اب تقریباً" ختم ہونے والا تھا اور ماموں کا چہرہ صاف بتا تا تھا کہ ایک بھی لفظ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا۔

معاویہ آگے بڑھا اور چپ چاپ ان کے قدموں کے پاس بیٹھ کر اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا۔
طالب ماموں چونکے اور پھر ساکت سے ہو گئے۔ چند لمحے بعد انہوں نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ معاویہ کے سر پر رکھا' آہستہ سے جھکے اور اس کے بالوں پر ایک شفقت بھرا بوسہ دیا اور پھر اپنے آنسوؤں کو بہنے سے روک نہیں سکے۔ بنا آواز روتے چلے گئے۔
اسی وقت آئے کت اندر آئی۔ اس کے انداز میں سرد مہری تھی لیکن طالب ماموں کو روتا دیکھ کر آنکھوں میں غصہ بھر گیا۔
"اس سے اچھا تھا تم یہاں کبھی نہ آتے۔۔۔" اس نے بنا اسے مخاطب کیے کہا۔ لہجہ پر تپش تھا۔ "ان تین مہینوں میں ہمیں وسامہ کے بغیر رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔ کچھ دن اور گزرتے تو سب تمہیں بھی بھول جاتے۔"
"اللہ نہ کرے۔۔۔ کیسی باتیں کر رہی ہو۔" صاعقہ ممانی دہل کر بولیں۔
"ٹھیک ہے تو کہہ رہی ہوں۔۔۔ یہ نہ آتا یہاں۔۔۔ کم سے کم آپ لوگوں کی آنکھوں میں آنسو تو نہ آتے۔" اس نے تلخی سے کہا تھا۔
"میں شرمندہ ہوں۔" معاویہ نے کہا۔
"کیا فائدہ اس شرمندگی کا۔۔۔ وسامہ تو واپس نہیں آ سکتا۔" اس نے کڑوے لہجے میں کہا' ایک سرسری سے نگاہ معاویہ پر ڈالی اور پلٹ کر سرعت سے باہر نکل گئی۔
کمرے میں موجود نفوس اس کی بات پر ساکت رہ گئے تھے۔ انہیں آئے کت کی بات کے اثر سے نکلنے میں چند سیکنڈ لگے۔ پھر صاعقہ ممانی نے اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا تو وہ چونکا۔
"مجھے بھوک لگی ہے۔" اس نے کسی بچے کی معصومیت سے کہا۔ ممانی مسکرا دیں۔
"تم فریش ہو جاؤ۔ میں کھانا لاتی ہوں۔"
وہ اٹھا اور خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆
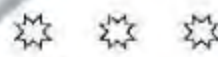
فضل منزل میں داخل ہوتے ہی اس کی مڈبھیڑ شامیر سے ہو گئی۔
شام کا قرمزی رنگ رات کی سیاہی میں گھلنے لگا تھا اور مسجدوں سے مغرب کی اذان کی صدائیں سنائی دینے لگی تھیں۔ سیاہ پڑتے آسمان پر سب ہی پرندے اپنی آخری اڑانیں بھر رہے تھے۔
خوش نصیب دبے قدموں اور احتیاط سے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ اتنی دیر سے واپس آنے پر ڈانٹ تو پڑنی ہی تھی (دیر سے واپس آنے پر نہ پڑتی تو کسی اور بات پر پڑ جاتی۔ اسے ڈانٹنے اور کوسنے کے لیے اب گھر والوں کو کسی بہانے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ خوش نصیب کو یقین تھا جب کسی کے پاس کرنے کے لیے کوئی کام نہیں ہوتا تو وہ اسے ڈانٹنا شروع کر دیتا ہے کہ چلو تھوڑی دیر کے لیے ٹائم ہی پاس ہو جائے گا۔ یوں ڈانٹ ڈپٹ اور کوسنے معمول کی بات تھی جو وہ بچپن سے سنتی آ رہی تھی اور جیسی اس کی حرکتیں تھیں' کوئی بھی مستقبل کی پیش گوئی کرنے والا بتا سکتا تھا کہ اگلے کئی سال بھی اس کے ساتھ یہی ہو گا) ہاں تو بات ہو رہی تھی کہ دیر سے گھر واپس آنے پر اسے ڈانٹ پڑ سکتی تھی۔ لیکن کیا پتا آج کوئی معجزہ ہو جائے اور وہ ڈانٹ کھانے سے بچ جائے۔ اس نے بڑی رجائیت سے سوچا۔ کبھی کبھی وہ ایسی رجائیت پسندی کا مظاہرہ بھی کر لیتی تھی۔
لیکن جوں ہی وہ بڑا دروازہ عبور کرکے اندر داخل ہوئی۔ شامیر اسے احاطے میں چہل قدمی کرتا ہوا نظر آ گیا۔ وہ

کوئی کتاب پڑھ رہا تھا اور اس کا رُخ مخالف سمت میں تھا۔ خوش نصیب نے موقع غنیمت جانا اور دبے قدموں وہیں سے بغلی گلی کا راستہ اختیار کیا جہاں سے بنا شامیر کی نظر میں آئے وہ اوپری منزل تک جاسکتی تھی۔ اسی وقت شامیر پلٹا اور خوش نصیب کو دیکھ کر اس کے لب مسکرا اٹھے۔

لیکن اگلے پل وہ ٹھٹکا۔ خوش نصیب کی گریہ پائی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اس نے چند لمحے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کی پھر زور سے گلا کھنکھار کر اسے متوجہ کیا۔ خوش نصیب اس آواز پر یوں بدک کر پلٹی جیسے بے دھیانی میں بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہو۔

"ہیلو۔" شامیر خوب صورتی سے مسکرایا۔

خوش نصیب نے سر کے اشارے سے اس کے ہیلو کا جواب دیا۔ اپنے ہونق تاثرات چھپانے کی تگ و دو میں اور بھی ہونق لگنے لگی تھی۔

"گڈ آفٹرنون!" وہ بات کرنا چاہتا تھا۔

خوش نصیب نے پھر سے سر کو خفیف سا جھکا دیا اور دانتوں کو یوں مضبوطی سے ایک دوسرے پر جمایا کہ غلطی سے بھی نہ کھلیں۔ شامیر اس کے تاثرات سے تھوڑا سٹپٹا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔

"آ...چائے پئیں گی آپ؟"

خوش نصیب نے اب غور کیا۔ وہیں برآمدے کی میز پر چائے کے برتن پڑے تھے اور یہ وہ ٹی سیٹ تھا جو فضیلہ چچی خاص الخاص مہمانوں کی آمد پر ہی نکالتی تھیں۔ ایک بار خوش نصیب کو کسی بات پر اتنا غصہ آیا تھا کہ اس نے اس ٹی سیٹ کی ایک ساسر نکال کر چھپا دی تھی۔ کئی دن تک وہ دل ہی دل میں پلان بناتی رہی کہ اس ساسر کو کس طرح توڑا جائے۔ سب سے بہترین طریقہ جو اس کی سمجھ میں آیا وہ یہی تھا کہ ساسر کو چھت پر لے جا کر اینٹ مار کر توڑ دیا جائے۔ اس سے اس کے جذبات کو بھی سکون ملتا۔ اس کے علاوہ بھی اس نے کئی پلان بنائے لیکن کسی بھی پلان پر عمل درآمد نہیں کیا جاسکا کیونکہ خوش نصیب ہمیشہ سے پلان بنانے میں ماہر رہی تھی ان پر عمل درآمد کرتے ہیں نہیں۔

ابھی بھی ٹی سیٹ دیکھ کر اسے وہ پچھلا واقعہ یاد آگیا تھا اور پچھلے سارے زخم ہرے ہوگئے۔

وہ برتنوں کو دیکھ کر دانت پیس رہی تھی اور شامیر بڑی گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

"آپ اگر میرا ساتھ دیں گی تو مجھے خوشی ہوگی۔"

"شکریہ...میں چائے نہیں پی..." بے ساختگی میں بولا گیا جملہ ابھی یہیں تک پہنچا تھا کہ سارے زخم ہرے ہوگئے۔ کیوں کہ عین اسی وقت فضیلہ چچی اور صیام کی انٹری ہوئی تھی اور فضیلہ چچی نے خوش نصیب کو دیکھتے ہی برا برا سا منہ بھی بنایا تھا۔

"خوش نصیب چائے نہیں پیتی۔" صیام نے جلدی سے کہا۔

"کیا واقعی؟" شامیر نے اسے دیکھا۔

اسی پل خوش نصیب کی انتقامی حس جاگ اٹھی۔ وہ ہونٹ پھیلا کر مسکرائی اور خوش اخلاقی کی حد پار کرتے ہوئے بولی۔

"چائے نہیں پیتی تو کیا ہوا؟ مہمان کو انکار تو نہیں کیا جاسکتا ناں۔" جہاں اس کی مسکراہٹ نے شامیر کے دل کو چھو لیا وہیں فضیلہ چچی اور صیام کی مسکراہٹیں غائب ہوگئیں۔ اس سے قبل کہ فضیلہ چچی اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں قتل کرتیں خوش نصیب بڑے اعتماد سے آگے بڑھی اور کرسی گھسیٹ کر شامیر کے مد مقابل بیٹھ گئی۔

ضد بعض اوقات انسان سے وہ کام بھی کرالیتی ہے جنہیں نہ کرنے کا وہ تہیہ کرچکا ہوتا ہے۔
"صیام! ایک کپ میرے لیے بھی بنا دینا' پلیز۔" بڑا مسکرا کر کہا۔ صیام کے پاس دانت پیسنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ لیکن شامیر کی موجودگی میں یہ نہیں کیا جاسکتا تھا سو اس نے مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق کپ میں چائے انڈیلنا شروع کی۔
دوسری طرف شامیر بچہ نہیں تھا کہ فریقین کے درمیان موجود کھینچا تانی کو سمجھ نہ سکے۔ صیام افضل منزل کی بیوٹی کوئین تھی اور خوش نصیب... وہ کیا تھی؟ اب تک شامیر فیصلہ نہیں کرسکا تھا۔ لیکن ہاں جب بھی وہ سامنے آتی شامیر مسکرانے لگتا تھا۔ خود کو پھنے خان سمجھنے والی یہ لڑکی دل میں گدگدی سی کرتی تھی۔
اور ایسی لڑکیاں ہمیشہ اس جیسے لڑکوں کو بڑا متاثر کرتی ہیں۔ جو آسانی سے بات کرنے پر راضی نہ ہوں۔ جب دیکھیں تو چیلنج کرتی ہوئی محسوس ہوں۔ اس کے مقابلے میں صیام تو بڑی عام سی لڑکی تھی۔ خزاں کے موسم میں سوکھے پتے کی طرح جھاڑ سے ٹوٹ کر گود میں آگرنے والی لڑکی۔
فضیلہ چچی سے جب کچھ نہ بن پڑا تو وہیں بیٹھ رہیں۔
خوش نصیب بھول گئی تھی کہ شامیر کو اگنور کرنے کا عہد کرچکی ہے اس وقت اس نے ساری خوش اخلاقی اور زمانے بھر کے موضوعات پر گفتگو کرنے کا تہیہ کرڈالا اور پھر جب بولنا شروع ہوئی تو اسے چپ کرانا مشکل ہوگیا۔
اور یوں ایک ڈھلتی ہوئی شام خوش نصیب کے انتقام کی پہلی قسط کی نذر ہوگئی۔

☆ ☆ ☆

کمرے کے دروازے پر وہ تھم سا گیا۔ اس گھر میں جگہ جگہ وسامہ کی یادیں بکھری ہوئی تھیں اور ان یادوں سے پیچھا چھڑانا ناممکن تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنا دل مضبوط کیا اور ہینڈل گھما کر کمرے میں داخل ہوگیا۔
کمرے میں دن کا اجالا نیم تاریکی کی شکل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ معاویہ نے آگے بڑھ کر کھڑکی کا پردہ ہٹایا تو صبح کی چمکیلی روشنی چھلانگ لگا کر اندر آئی اور سب طرف پھیل گئی۔ یہ طالب ماموں کے گھر میں اس کا اور وسامہ کا کمرہ تھا۔ ان دونوں کے سنگل بیڈ ساتھ ساتھ بچھے تھے۔ درمیان کی چھوٹی تپائی پر اب بھی وہی ٹیبل لیمپ رکھا تھا جو وسامہ کے زیر استعمال رہتا تھا۔ اس کی اسٹڈی ٹیبل' اس کی کرسی' اس کی الماری۔
معاویہ ایک ایک چیز کو ہاتھ لگاتے ہوئے اپنی سسکیاں روک رہا تھا۔ کتنی ہی یادیں ماضی کی کھڑکیوں سے جھانک رہی تھیں۔ اس سے قبل کہ وہ زمین پر بیٹھ جاتا اور آنسوؤں کو بہہ جانے دیتا' کمرے کا دروازہ کھلا۔ معاویہ نے جھٹکے سے گردن موڑ کر دیکھا۔ آئے کت اپنی جھونک میں اندر داخل ہو رہی تھی۔ جوں ہی اس کی نظر معاویہ پر پڑی اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔
"تم یہاں کیا کررہے ہو؟"
"یہ میرا کمرہ ہے۔" وہ اس سے نظریں ملائے بغیر بولا۔
"یہ وسامہ کا کمرہ تھا۔" غصے سے کہا گیا۔

"ہم دونوں کا تھا۔" وہ پھر تحمل سے بولا۔
"تھا... اب نہیں ہے۔" تلخی کچھ اور بڑھ گئی۔ "اس گھر پر' اس کمرے پر' وسامہ سے وابستہ کسی بھی چیز اور فرد پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔" اس نے ایک ایک لفظ چبا کر ادا کیا تھا۔
معاویہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آگے بڑھا اور الماری کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن اس سے پہلے کہ کھولتا

آئے کت نے الماری کے پٹ پر ہاتھ رکھ دیا۔
"ہٹو سامنے سے۔" وہ ذرا جھنجھلا کر بولا۔ "یہ میرے بھائی کا کمرہ ہے اور تم مجھے یہاں کسی چیز کو ہاتھ لگانے سے نہیں روک سکتیں۔"
"یہ تمہارے بھائی کا کمرہ تھا.... اب یہ میرا کمرہ ہے۔" وہ دانت کچکچا کر بولی۔
"اور اب یہ میرا بھائی میرا بھائی کرنا بند کرو.... اب تو وہ بے چارہ اس دنیا میں بھی نہیں رہا.... آخر کب تک یہ محبت کا ڈھونگ رچاتے رہو گے۔" اس نے جتنی نفرت سے کہا تھا اتنی ہی تیزی سے معاویہ کے ماتھے پر پڑے بلوں میں اضافہ ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ گئی تھیں۔ عین ممکن تھا اگر آئے کت عورت نہ ہوتی تو اب تک وہ ایک پنچ مار کر اس کے دو تین دانت تو ضرور توڑ دیتا۔
"تم کون ہوتی ہو یہ فیصلہ کرنے والی۔" اس نے تقریباً "غرا کر کہا تھا۔
"میرے سامنے اونچی آواز میں بات مت کرنا معاویہ! تمہاری اصلیت میں اچھی طرح جانتی ہوں۔" اس نے معاویہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بنا ڈرے کہا تھا۔ آئے کت کا اعتماد معاویہ کی آنکھوں میں ہراس بن کر پھیل گیا۔
یکا یک ان دونوں کے اردگرد سے ہر منظر غائب ہونے لگا اور کھڑکیاں دروازے سب اڑن چھو ہو گئے اور ان دونوں نے خود کو فلک بوس میں کھڑے پایا۔ وہی اسرار جو دھند کی مانند رگ و پے میں اترتا تھا اس وقت معاویہ کے خون میں دوڑنے لگا۔
"معاویہ....!" صاعقہ ممانی کی آواز ان دونوں کو فلک بوس سے کھینچ لائی۔ ان دونوں نے ہی جیسے اس لمحے کسی راز کی پاس داری کی تھی کہ اپنے اپنے تاثرات بدل لیے تھے۔
"معاویہ! کھانا کھالو۔" آواز دوبارہ آئی۔
"آرہا ہوں۔" اس نے اونچی آواز میں جواب دیا اور ایک تیز نظر آئے کت پر ڈالی اور انگلی اٹھا کر وارننگ دینے والے انداز میں بولا۔
"میری اصلیت کی بات دوبارہ مت کرنا.... تمہارا اصلی چہرہ تو میں سب کو دکھاؤں گا۔" آئے کت نے زہرخند نظر ڈال کر رخ بدل لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات کو سونے لیٹی تو گزری بات یاد کر کے خوش نصیب کو بڑا مزہ آیا۔ وہ خود بخود مسکرا رہی تھی بلکہ باقاعدہ ہنس رہی تھی۔
"تمہیں ہوا کیا ہے؟" ماہ نور نے چڑ کر پوچھا۔
"صیام اور فضیلہ چچی کی شکل دیکھنے والی تھی۔" اس نے ہتھیلی سے تالی بجائی اور خوب قہقہہ لگا کر بولی۔
"اب کیا نیا کارنامہ کر آئی ہو؟" ماہ نور اس کی رگ رگ سے واقف تھی۔
خوش نصیب کو ہمہ وقت کوئی نہ کوئی سامع درکار ہوتا تھا۔ منٹوں میں ساری روداد کہہ سنائی۔
ماہ نور نے ساری بات غور سے سنی اور زیرلب مسکراتی رہی۔
"اب دیکھنا.... اس پر بھی فضیلہ چچی ایک ہنگامہ کھڑا کر دیں گی۔" اس نے مسکرا کر پیش گوئی کی تھی۔
"نہیں اور آتا ہی کیا ہے۔" وہ لاپروائی سے بولی۔
ماہ نور کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔ "لیکن محتاط رہا کرو خوش نصیب! ان لوگوں کو ناراض کر کے ہم بھی مطمئن

نہیں رہ سکتے۔"
"نہیں ہم رہ لیں گے.... مطمئن اور خوش رہنے کا ایک نیا طریقہ پتا چلا ہے مجھے۔" وہ لحاف جھاڑتے ہوئے بولی۔ "سنا ہے بڑا کار آمد ہے۔"
"کون سا طریقہ؟" ماہ نور کون سا متجسس ہو کر بولی۔ خوش نصیب کی ہر نئی بات اسے کسی نئے اندیشے میں مبتلا کر دیتی تھی۔
"وہ فریحہ ہے ناں.... وہ کہہ رہی تھی، پیر صاحب سے تعویذ لے لو.... سارے مسئلے حل ہو جائیں گی۔"
"اب تم اس نئے جھنجھٹ میں مت پڑ جانا۔"
"لو جھنجھٹ کیسا؟" وہ کندھے اچکا کر بولی۔ "سارا زمانہ تعویذ لیتا ہے۔ ہم بھی لے لیں گے تو کون سی قیامت آجائے گی۔"
"ہمیں کیا پتا وہ پیر صاحب جو تعویذ لکھ کر دیں گے اس کے اندر کیا لکھا ہو گا۔" ماہ نور نے کہا۔
"ہاں تو تعویذ لیں گے تو پتا چلے گا نا۔"
"تم رہنے دو.... " اس نے مکھی اڑانے والے انداز میں ہاتھ لہرایا۔
"ایک بار تو میں ضرور لوں گی۔" وہ ماہ نور کو چڑانے کے لیے کہہ رہی تھی۔ "سنا ہے بڑے کار آمد ہوتے ہیں ایسے تعویذ۔ دشمن کا دل فوراً" نرم ہو جاتا ہے اور پتھر سے پتھر دل محبوب بھی موم بن جاتا ہے۔"
"میں صبح روشن امی کو بتاؤں گی۔"
"ایک تو میری کامیابی کے راستے میں تم سب سے بڑی رکاوٹ ہو۔" خوش نصیب نے چڑ کر کہا۔ "جب کوئی بہادری کا کام کرنے کا سوچوں تم جا کر مخبری کر دیا کرو۔"
"تم الٹے کام سوچتی ہی کیوں ہو؟"
"کیونکہ مجھ سے سیدھے کام سوچے ہی نہیں جاتے۔" اس نے بے بسی سے کہا۔ "اب یہی دیکھ لو۔ شام سے دل مچل رہا ہے کہ پیر صاحب کے آستانے پر جا کر حاضری دوں اور دو چار تیر بہدف تعویذ لکھوا کر لاؤں پھر انہیں فضیلہ چچی کے پورشن کی دہلیز میں چھپا دوں۔" وہ آنکھیں گھما گھما کر ماہ نور کا خون خشک کر رہی تھی۔
"اور اس سے ہو گا کیا؟"
"وہی ہو گا جو فضیلہ چچی کے چھپائے ہوئے تعویذوں سے ہوتا ہے۔ یعنی سب ہمارے اثر میں آجائیں گے اور سارے خاندان میں ہماری بات بھی ایسے ہی مانی جانے لگے گی جیسے فضیلہ چچی کی مانی جاتی ہے.... تم مانو یا نہ مانو' ماہ نور! کوئی نہ کوئی کرامت تو ہوتی ہے ان تعویذوں کی.... ایسے ہی تو سارا خاندان نہیں ڈرتا فضیلہ چچی سے۔"
"تو تم کیا چاہتی ہو؟ سب تم سے بھی ڈریں؟ ایسا مرتبہ کس کام کا خوش نصیب! جو صرف آپ کو آپ کے ڈر کی وجہ سے دیا جائے۔ ایسی عزت کا کیا کرنا کسی کو۔" وہ نرمی سے بول رہی تھی۔ "عزت ہو تو عرفات ماموں جیسی ہو.... دل خود بخود ان کی طرف مائل ہو.... یہ نہیں کہ کوئی ڈر خوف ان کے پاس جا کر بیٹھنے باتیں کرنے پر مجبور کر دے۔"
"بات تو صحیح ہے۔" وہ سوچنے لگی پھر ایک دم کوئی خیال آیا تو بولی۔
"ماہ نور! یہ شامیر تمہیں کیسا لگا؟"
"یہ کیسا بے تکا سوال ہے؟" ماہ نور نے گھور کر اسے دیکھا۔
"تم بتاؤ تو۔" وہ بضد ہوئی۔

"ٹھیک ہے... اچھا ہے' میرا مطلب..." وہ سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔ "ارے یار! میں نے اسے اتنے غور سے دیکھا ہی نہیں ہے کہ بتاؤں کیسا ہے... ویسے بھی فضیلہ چچی اسے اپنے پروں سے باہر نکلنے دیں گی تو پتا چلے گا کیسا ہے۔" وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگیں۔

"چار دن ہو گئے ہیں اسے آئے ہوئے... ہر وقت یا تو صیام اس کے ساتھ چپکی بیٹھی ہوتی ہے یا فضیلہ چچی اس پر پہرہ دے رہی ہوتی ہیں۔"

"پہرہ تو دینا ہی پڑے گا... صیام کے بجائے اگر اس نے کسی اور کو پسند کر لیا تو...؟" خوش نصیب مزہ لے کر بولی پھر ایک دم سے کچھ خیال آیا تو بولی۔

"ماہ نور! کتنا مزہ آئے۔ اگر واقعی شامیر صیام کے بجائے کسی اور کو پسند کرلے۔"

"اچھا... مثلاً "کسے؟" وہ بھی ذرا دلچسپی لے کر بولی۔

"مثلاً "تمہیں... یا مجھے۔" اس کے لہجے میں ذرا بھی سنجیدگی نہیں تھی۔

"اللہ نہ کرے۔" ماہ نور دہل کر بولی۔ "ایسا ہوا تو فضیلہ چچی کو ہم سب کے سر پر ایک اور طوفان اٹھانے کا موقع مل جائے گا۔"

"ارے ایسے کئی طوفان آئے اور گئے... یہاں پروا کسے ہے؟" وہ حسب سابق لاپروائی سے بولی تھی۔

"نہیں خوش نصیب! ایسا سوچنا بھی مت۔" ماہ نور فوراً" ہی سنجیدہ ہو گئی۔ "میرا دل چاہتا ہے روشن امی اور نانی اب ہر پریشانی سے دور رہیں۔ اور اگر خدانخواستہ شامیر نے ہم دونوں میں سے کسی کا نام بھی لیا تو ان کے لیے ایک نہ ختم ہونے والی پریشانی کا آغاز ہو جائے گا... بلکہ اچھا ہوا تم نے یہ بات کہہ دی... مجھے تو اب تک ایسا کوئی خیال بھی نہیں آیا تھا۔"

خوش نصیب چونکہ اس کی کسی بات سے متفق نہیں تھی سو برے برے منہ بنا کر اس کی بات سن رہی تھی۔ اس کے چپ ہوتے ہی بولی۔

"ہاں دراصل تم میرے جیسی ذہین نہیں ہو نا... اس لیے تمہیں ایسا کوئی خیال نہیں آیا۔" اس نے کروٹ لی اور سر تک لحاف تان لیا۔

ماہ نور اس کی بے ساختگی پر اپنی مسکراہٹ چھپا نہیں پائی۔ ایک چپت اس کے کندھے پر لگائی اور خود بھی سونے کے لیے لیٹ گئی۔

دوسری طرف لحاف کے اندر گو کہ خوش نصیب کی آنکھیں بند تھیں لیکن سونے سے پہلے دماغ بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اور ہر غلط کام کا آغاز کرتے ہوئے اس کا دماغ ایسے ہی تیزی سے کام کرنے لگتا تھا۔

☼ ☼ ☼

معاویہ بددلی سے کھا رہا تھا اور صاعقہ ممانی خاموشی سے بیٹھی اسے دیکھ رہی تھیں۔

"بہت کمزور ہو گئے ہو... کھانا نہیں کھاتے کیا؟" فکرمندی سے پوچھا۔

معاویہ ایک دم کھاتے کھاتے رکا۔ اس کا دل چاہا انہیں بتائے کہ اسے کھانے سے رغبت نہیں رہی۔

"بابا کا کک آپ کے جیسا اچھا کھانا نہیں پکاتا... میں سوچ رہا ہوں' کچھ دن کے لیے اسے آپ کے پاس بھیج دوں... دو چار اچھے کھانے ہی پکانا سکھا دیں اسے۔" صرف انہیں دکھانے کو وہ اب جلدی جلدی کھانے لگا تھا۔

"یہ چکن بہت اچھی بنی ہے... آپ شام میں میرے لیے اسپگیٹی بنا دیں گی؟ آپ جیسی اچھی اسپگیٹی

کوئی نہیں بنا سکتا۔۔۔ اٹلی کا کوئی ماہر شیف بھی نہیں۔"
صاعقہ ممانی اداسی سے مسکرائیں۔
"تمہاری یہ عادت بالکل وسامہ جیسی ہے۔۔۔ وہ بھی مجھے خوش کرنے کے لیے ایسے ہی میری جھوٹی تعریفیں کیا کرتا تھا۔"
"میں جھوٹ نہیں بول رہا۔۔۔ آپ واقعی۔۔۔"
"وسامہ بہت ناراض تھا ہم سے ناراض ہی دنیا سے چلا گیا۔" یکایک وہ رونے لگیں۔ معاویہ نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔
"وہ ناراض نہیں تھا۔"
"اگر ناراض نہیں تھا تو گھر واپس کیوں نہیں آیا؟"
"اسے تو ماموں نے گھر سے نکالا تھا۔۔۔ آپ سے ناراض ہونے کا تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا وہ۔"
"آجاتا۔۔۔ باپ کے پیروں میں گر جاتا۔۔۔ وہ معاف کر ہی دیتے۔۔۔ آئے کت کو بھی تو اب کیسے سینے سے لگا کر رکھا ہے۔"
وہ دکھی تھیں، نالاں تھیں اور اس لیے بھی زیادہ پچھتا رہی تھیں کہ اب جتنی مرضی کوشش کر لیتیں۔ وسامہ کو واپس نہیں لا سکتی تھیں۔ موت وہ آخری حد ہے۔ جس سے گزر جانے کے بعد کسی کے واپس آنے کی توقع ہی پاگل پن ہے۔
معاویہ کے تاثرات ایک دم سے سخت ہو گئے۔ اس نے ممانی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔
"اس سارے فساد کی جڑ ہی آئے کت تھی۔۔۔ نہ وہ وسامہ کی زندگی میں آتی۔ نہ ماموں وسامہ کو گھر سے نکالتے نہ اسے فلک بوس جا کر رہنا پڑتا اور نہ۔۔۔" ایک دم غصے سے بولتا ہوا وہ چپ ہو گیا۔ صرف شک کی بنیاد پر وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔
"اور نہ؟" ممانی اس کے لفظوں میں الجھ گئی تھیں۔
"کچھ نہیں۔۔۔" اس نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ "یہ سب ایسے ہی ہونا تھا ممانی! یاد ہے بچپن میں آپ نے ہی مجھے قسمت کا فلسفہ سمجھایا تھا۔"
انہوں نے روتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ معاویہ نے انہیں اپنے ساتھ لگا لیا۔ چند منٹ بعد صاعقہ ممانی کی حالت سنبھلی تو بولیں۔
"معاف کرنا۔۔۔ میں تمہیں بتانا بھول گئی۔۔۔ وہ کمرہ اب آئے کت کے زیر استعمال ہے۔"
"کوئی بات نہیں۔۔۔ لیکن آپ کو وہ کمرہ اسے نہیں دینا چاہیے تھا۔" معاویہ نے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔
"وسامہ چلا گیا لیکن مجھے تو واپس آنا ہی تھا۔"
"اس نے بہت منت سے کہا تھا معاویہ! میں انکار نہیں کر سکی۔"
معاویہ نے غور سے ان کی بات سنی اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔
"ہاں وہ منت سے ہی کہتی ہے۔" اس نے زیر لب کہا اور رغبت سے کھانا کھانے لگا۔

☼ ☼ ☼

صبح وہ دیر سے اٹھی۔ تھوڑی دیر چھت پر پھرتی ادھر ادھر کے گھروں میں جھانکتی رہی۔ پھر نیچے آئی تو شامیر کچن ٹیبل پر بیٹھا ناشتہ کرنے میں مشغول تھا۔ ساتھ ساتھ اخبار پڑھ رہا تھا۔

ماہ نور چولہے کے پاس کھڑی بدتمیزی کی حد تک سنجیدہ شکل بنائے دوپہر کے کھانے کی تیاری شروع کر چکی تھی۔

شامیر خوش نصیب کو دیکھ کر حسب عادت مسکرایا اور ساتھ ناشتے کی دعوت دی۔

"کیا وجہ ہے کہ ہمارے کھانے کے اوقات اکثر ہی ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے ہیں؟"

"محض اتفاق ہے... کوئی خاص وجہ نہیں۔" اس نے ہر لفظ پر زور دے کر کہا۔ اپنا آملیٹ پراٹھے میں رول کرتے ہوئے ماہ نور کو آنکھوں آنکھوں میں اشارہ کیا اور شامیر کو بری طرح نظرانداز کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔

شامیر نے زیر لب مسکراتے ہوئے آنکھیں سکیڑ کر اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ لڑکی دلچسپ تھی۔ اس نے سوچا اور یونہی گردن موڑتے ہوئے ماہ نور پر نظر پڑی تو وہ بغور اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ شامیر چونکا۔ ماہ نور نے سٹپٹا کر نظریں پھیرلیں اور جلدی جلدی سبزی کاٹنے لگی۔

"یہ آپ کی بہن!... سب کو ہی ایسے اگنور کرنے کی عادی ہیں یا یہ رویہ بطور خاص میرے لیے ہے؟"

ماہ نور کو بے حد شرمندگی ہوئی۔ پتا نہیں یہ خوش نصیب ہمیشہ شرمندہ کرنے والے کام ہی کیوں کرتی تھی۔

اور وہ بھی کیسا منہ پھٹ تھا۔ سیدھا منہ پر ہی سوال دے مارا۔ یہ نہیں کہ انسان مروتاً" ہی نظرانداز کر دے۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے... آپ کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"میں کوئی چھوٹا بچہ نہیں ماہ نور بی بی کہ رویوں کو محسوس نہ کر سکوں۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"لیکن خیر... آپ کہہ رہی ہیں تو غلط نہیں ہوگا... خوب صورت چہرے ویسے بھی جھوٹ کے فن میں طاق نہیں ہوتے۔" اس نے سادگی سے کہا' اخبار جھاڑا اور سرخیوں میں گم ہو گیا۔

ماہ نور بے چاری ہڑبڑاہٹ کے عالم میں پیاز کے ساتھ ساتھ اپنی انگلی بھی کاٹ بیٹھی۔

☆ ☆ ☆

کھانا کھا کر معاویہ اس کمرے میں آ گیا جو صاعقہ ممانی نے اس کے لیے تیار کیا تھا۔

وہ تھکا ہوا تھا اور ذہن پر بوجھ بھی تھا اسی لیے فوراً" ہی سونے کے لیے لیٹ گیا۔ لیکن نیند ابھی آنکھوں کی دہلیز پر اٹکی ہوئی تھی۔ وہ کروٹیں بدل بدل کر تھک گیا۔ تو یہ کوشش ہی ترک کر دی اور چت لیٹ کر چھت پر گول گول گھومتے پنکھے کو دیکھنے لگا۔ موسم بدل گیا تھا۔ اب پنکھا چلانے سے خنکی بڑھتی تھی لیکن معاویہ کو اس موسم کی عادت نہیں تھی۔ وہ آسائشات کا عادی تھا جو اس گھر میں ہرگز اسے میسر نہیں آسکتی تھیں۔

جہاں اسے آسائشات ملتی تھیں' وہ اس کے باپ کا گھر تھا اور جو چیز باپ کے گھر میں نہیں ملتی تھی وہ ذہنی سکون تھا۔ اسی ذہنی سکون اور محبتوں بھری فضا کی تلاش اسے اس گھر میں کھینچ لاتی تھی۔ لیکن اب یہاں بھی سکون نہیں تھا۔

وسامہ نہیں تھا تو جیسے کچھ بھی نہیں تھا۔

پنکھا سست روی سے چل رہا تھا۔ صاعقہ ممانی اس کی عادات سے واقف تھیں۔ اسی لیے پنکھا کھول گئی تھیں، انہیں پتا تھا اس کے بغیر وہ سو نہیں پائے گا۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھیں پنکھا چلا کر بھی اسے نیند نہیں آئے گی۔

جب پنکھے کو دیکھ دیکھ کر بھی وہ تھک گیا تو اس نے کروٹ بدل لی۔ مزید کچھ دیر کی تگ و دو کے بعد بالآخر اسے نیند آ گئی۔ کئی گھنٹے سونے کے بعد اس کی آنکھیں اپنے سیل فون کی مدھم بیپ سے کھلی تھیں۔ اس نے آنکھیں مسل کر سرہانے دائیں بائیں ہاتھ مار کر موبائل فون تلاش کیا۔ نیند بھری آنکھوں سے نمبر چیک کیا۔ اسکرین پر جو نمبر

چمک رہا تھا' وہ بابا کا تھا۔ معاویہ نے بیزاری سے منہ بنایا لیکن بابا کی کال کو نظرانداز بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس نے فون اٹھایا۔
"السلام علیکم بابا!"
"تم کہاں غائب ہو؟" اس کے سلام کا جواب دیے بنا انہوں نے رکھائی سے پوچھا اور اتنی رکھائی کو وہ ان کا حق سمجھتا تھا۔ انہیں بنا اطلاع دیے آگیا تھا اور ایسا کرکے بلاشبہ اس نے ان کی ناراضی میں اضافہ کیا تھا۔
"میں ماموں کے پاس آگیا ہوں....." اس نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ "مجھے کچھ دن یہیں رہنے دیں۔" وہ التجا کر رہا تھا۔
"تم لاہور میں ہو؟" انہیں سن کر اچنبھا ہوا۔ "اور تم نے وہاں جانے کے لیے مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔" اب ان کی آواز میں درشتی تھی۔
"میں پہلے بھی یہاں آتا تھا..... کوئی پہلی بار نہیں آیا کہ آپ سے اجازت لیتا۔"
"پہلے کی بات اور تھی..... اس وقت وسامہ تھا وہاں....."
"اب ماموں ہیں ممانی ہیں اور..... اور آئے کت ہے۔"
"اس کا نام نہ لو میرے سامنے۔" انہوں نے ڈپٹ کر کہا۔ "وہ کرپٹ لڑکی مجھے بالکل پسند نہیں ہے..... بہتر ہو گا تم جلد از جلد....."
معاویہ نے فون کاٹ دیا اور سرہانے ڈال دیا۔ بابا جب بھی آئے کت کو برا بھلا کہتے تھے۔ معاویہ چپ ہو جاتا تھا' اسے نہ اچھا لگتا تھا نہ برا۔ لیکن اس وقت اس سے سنا نہیں گیا تو اس نے بابا کے ردعمل کی پروا کیے بنا کال کاٹ دی۔
دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے اس نے آنکھیں مسلتے ہوئے سوچنے کی کوشش کی کہ وہ کتنی دیر تک سوتا رہا ہے' تب ہی کھڑکی کے باہر بادل زور سے گرجے تو وہ چونک گیا اور اٹھ کر کھڑکی کے پاس آگیا۔ پردہ ہٹایا تو آسمان گھرے کالے بادلوں کی زد میں تھا اور بارش تڑاتڑ برس رہی تھی۔ معاویہ نے وال کلاک میں ٹائم دیکھا۔ شام کے ساڑھے پانچ بجے تھے ابھی۔ اور باہر دیکھو تو لگتا تھا رات بس زمین پر اترنے کو ہے۔ اس نے پردہ برابر کیا اور کمرے سے باہر آگیا۔
صحن میں بارش خوب زور شور سے برس رہی تھی اور سارے گھر میں پکوڑوں کی خوشبو پھیلی تھی۔
معاویہ سیدھا کچن میں آگیا۔ صاعقہ ممانی پکوڑے تل رہی تھیں۔ جوں ہی وہ کچن میں داخل ہوا' اسے دیکھ کر مسکرائیں۔
"میں بس تمہیں جگانے ہی آرہی تھی۔"
"آپ کے پکوڑوں کی خوشبو نے جگا دیا۔" وہ پاس آیا اور پلیٹ سے اٹھا کر پکوڑا کھانے لگا۔ "ساتھ چائے بھی مل جائے تو کیا بات ہے۔"
"بیٹھو..... میں بنا رہی ہوں۔"
وہ پکوڑوں کی پلیٹ اور رائتہ لے کر کچن ٹیبل پر بیٹھ گیا اور مزے سے کھانے لگا۔ یکایک اسے احساس ہوا' کھانے سے بے رغبتی کی ایک وجہ واقعی یہ بھی تھی کہ بابا کے خانساماں کے ہاتھ میں صاعقہ ممانی کے ہاتھ والا ذائقہ ہی نہیں تھا۔
"ماموں کہاں ہیں؟"
"عصر کی نماز پڑھنے مسجد گئے تھے۔ اب میرا خیال ہے بارش کے رکنے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"اور۔۔۔ آئے کت کہاں ہے؟" وہ پوچھنا نہیں چاہتا تھا مگر نہ جانے کیوں پوچھ بیٹھا۔
"یہیں کہیں ہوگی۔۔۔ وہ کہاں جائے گی۔" وہ گہری دکھ بھری سانس بھر کر بولیں۔ "بڑی مشکل سے اس نے اس حقیقت کو قبول کیا ہے کہ وسامہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ مجھے افسوس ہوتا ہے یہ سوچ کر کہ ہم اس لڑکی کو پہچان کیوں نہیں سکے۔ آئے کت تو بہت اچھی ہے معاویہ! وسامہ سے بہت محبت تھی اسے۔" وہ بڑے دکھ سے بول رہی تھیں۔
معا" وہ معاویہ کو کچن کے دروازے سے باہر ذرا فاصلے پر برآمدے میں کھڑی نظر آگئی۔ اسکن کلر کے سادہ سوٹ پر اس نے کالی چادر اس طرح اوڑھی ہوئی تھی جیسے خود کو چھپانا چاہتی ہو۔
معاویہ بلاوجہ اسے دیکھتا چلا گیا۔
"میرا خیال تھا' یہ اپنی ماما کے پاس چلی گئی ہوگی۔" اچانک اس نے کہا۔
"تمہیں نہیں پتا۔۔۔ آئے کت کی ماں کا تو چند مہینے پہلے ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو چکا ہے۔"
معاویہ نے حیرت سے ممانی کو دیکھا۔ "یہ کب کی بات ہے؟ مجھے اس بارے میں بالکل نہیں پتا۔"
"افسوس کی بات تو یہ ہے کہ آئے کت کو بھی اس بارے میں نہیں پتا تھا۔" ممانی چائے لے کر دوسری کرسی پر آبیٹھیں۔
"جب ہم بشام سے واپس آئے تو تمہارے ماموں نے آئے کت کی ماں کو فون کیا تھا۔ لیکن وہ ٹریس نہیں ہو پا رہی تھیں۔ بڑی کوشش کے بعد کسی پرانی لینڈ لیڈی نے بتایا کہ ان کا تو انتقال ہو چکا ہے۔"
"اوہ۔۔۔ افسوس ہوا۔"
"آئے کت کی حالت بہت بری تھی۔۔۔ پہلے شوہر اور پھر ماں کی ایسی ناگہانی موت کی اطلاع۔ نقصان ہمارا بھی چھوٹا نہیں ہے لیکن آئے کت کی تو پوری دنیا ہی ویران ہو گئی ہے۔۔۔ وہ ابھی تک سنبھل نہیں پائی۔"
معاویہ نے تاسف سے اسے دروازے کے باہر دیکھا۔
اس کے چہرے کا ایک رخ بتاتا تھا کہ وہ ابھی بھی رو رہی ہے لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔ کچھ لوگوں سے ہمیں جتنی چاہے ہمدردی محسوس ہوتی رہے ان کے دکھ دور کرنے کے لیے ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

☼ ☼ ☼

خوش نصیب ایسے ہی پوری فضل منزل میں گھومتی گھامتی فضیلہ چچی کے پورشن میں آنکلی۔ برآمدے میں ٹیلی فون سیٹ پڑا ہوا نظر آرہا تھا۔ ایک ہاتھ سے پراٹھا رول کھاتے ہوئے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی میں کھجلی ہونے لگی۔ اس نے احتیاط سے گردن گھما گھما کر سب طرف دیکھا۔ جب یقین ہو گیا کہ کوئی بھی موجود نہیں ہے تو جست لگا کر فون تک پہنچی۔ فون سیٹ اٹھا کر گود میں رکھا اور وہیں برآمدے کے فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔
جلدی جلدی فریحہ کا نمبر ڈائل کیا اور کال اٹینڈ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ رات بھر فریحہ کی ناراضی کے خیال سے اسے عجیب عجیب خواب آتے رہے تھے۔ کبھی ایسا لگتا فریحہ اس کے ساتھ ناراض ہو کر کسی پل سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر رہی ہے۔ خوش نصیب اسے بچانے بھاگتی ہے لیکن تب تک فریحہ چھلانگ لگا چکی ہوتی ہے۔
کبھی فریحہ کو ناراض شکل کے ساتھ بیری پیپر کے درختوں پر مرے ہوئے کوے کی طرح الٹا لٹکا ہوا پایا۔ اور چونکہ یہ خوش نصیب کے خواب تھے تو ان سے کسی قسم کی سنجیدگی کی توقع فضول ہی تھی۔
خیر گھنٹی بجتی رہی لیکن فون اٹینڈ نہ ہوا تو خوش نصیب نے مایوس ہو کر ریسیور رکھ دیا۔ "لو بتاؤ۔ اتنا رسک بھی لیا اور فائدہ بھی کوئی نہ ہوا۔" ابھی فون سیٹ واپس رکھ کر اٹھنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

خوش نصیب ایسے سٹپٹائی جیسے وہ چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی ہو۔ اس نے جلدی سے ریسیور اٹھا کر کان سے لگالیا۔

"ہیلو....!"

"آہا.... کیا بے سری آواز ہے' لیکن یقین کرو۔ کال ملانے سے پہلے میں سوچ ہی رہا تھا کہ کتنا مزہ آئے اگر آج کی تاریخ میں تمہاری آواز سننے کو مل جائے۔"

"اوہ.... تم۔" اس نے پہچان کر برا سامنہ بنایا۔ "تمہیں یہاں سے جاکر بھی سکون نہیں آیا؟"

"سکون تو شاید مرتے دم تک نہ آئے.... بشرطیکہ تم میرے ساتھ نہ ہوئیں تو...." وہ کیف تھا چوک جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

"مجھے پتا ہے تم ہمیشہ یہ مرنے مارنے کی باتیں اس لیے کرتے ہو.... تاکہ میں فلمی ہیروئنوں کی طرح دہل کر کہوں.... ہائے اللہ نہ کرے.... کیسی باتیں کرتے ہو۔ وغیرہ وغیرہ.... اور تمہیں میرا مذاق اڑانے کا موقع مل جائے۔"

وہ سن کر زیر لب مسکرانے لگا۔

"تم کہہ کر تو دیکھو.... کیا پتا میں مذاق نہ اڑاؤں۔"

"لو اور سنو...." اس نے صاف مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ "قیامت کا دن ہی ہو گا وہ...."

"تم مجھ سے اتنی بدگمان کیوں رہتی ہو۔" وہ ہنس کر پوچھ رہا تھا۔

"نہیں بدگمانی کیسی۔" وہ لاپروائی سے بولی پھر سوچا اور بولی۔ "اچھا سنو کیف! تمہارا کیا خیال ہے.... یہ جو پیر فقیر ہوتے ہیں.... یہ کتنے سچے ہوتے ہیں؟"

"ہیں' ہیں.... تم کیا کسی پیر کے ہاتھ پر بیعت کرنے والی ہو؟"

"پہلے میرے سوال کا تو جواب دے دو۔" وہ چڑ کر بولی کیونکہ کیف کا لہجہ اس کا سوال سنتے ہی غیر سنجیدہ ہو گیا تھا اور اسی بات سے خوش نصیب کو چڑ تھی۔

"دیکھو' میں پیروں فقیروں کو نہیں مانتا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندے ہوتے ہیں' ان کا احترام کرنا چاہیے لیکن یہ درباروں پر حاضری دینا' قبروں پر چادریں چڑھانا اور جھولیاں پھیلا پھیلا کر ان سے مدد کی درخواست کرنا میرے نزدیک کفر ہے۔" اس نے ذرا سنجیدہ ہو کر دوٹوک کہا۔

"لیکن کیف!.... جو اتنے لوگ ان پیروں' فقیروں کو مانتے ہیں.... آخر کچھ نہ کچھ تو ہو گا ناں ان کے پاس.... کوئی تو ایسی کرامت ہو گی جو انہیں بھاگ بھاگ کر ایسے بابوں کے پاس لے جاتی ہے۔" وہ الجھن بھرے انداز میں بول رہی تھی۔

"تم نے دیکھا ہے کبھی' ایسے عاملوں نے اپنے بڑے بڑے بورڈ بنا رکھے ہوتے ہیں اور ان پر کیسی کیسی باتیں لکھی ہوتی ہیں.... سخت سے سخت دل دشمن بھی آپ کے آگے جھک جائے گا' محبوب آپ کے قدموں میں اور..."

"یار! میں تو پہلے ہی اپنے دل سمیت پورے کا پورا تمہارے قدموں میں ہوں اور کسی کو جھکا کر کیا کرو گی؟" اس نے ایک دم سے بہت سنجیدگی سے کہا اور ساتھ ہی بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ یہ ہنسی ایسی تھی جیسے وہ اپنے قہقہے کو روک نہ پایا ہو۔

خوش نصیب حسب معمول فوری طور پر تو سمجھی نہیں اور جب سمجھی تو اس کا پارہ ایک دم سے سوا نیزے پر پہنچ گیا۔

"کیف کے بچے! تم... تم..." ایسا لگتا تھا اس کا نام نہیں اس کی گردن دانتوں سے چبا رہی ہو۔
"ارے کیوں ان معصوموں کو کوس رہی ہو... کیسی ظالم ماں ہو یار!" اس نے پھر سابقہ انداز میں کہا۔
اور عین اس وقت جب خوش نصیب غصے سے لال پیلی ہو رہی تھی' صیام وہاں آگئی۔
"یہ تم ہمارے فون کے ساتھ کیا کر رہی ہو؟" اس نے چیخ کر کہا۔
خوش نصیب کھڑی ہوئی اور صیام کا ہاتھ پکڑ کر ریسیور اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔
"کیف کی کال ہے... مبارک ہو صیام! کیف نے تم سے اظہار محبت کرنے کے لیے فون کیا ہے۔"
صیام کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ دوسری طرف کیف کے سر پر جیسے پہاڑ گرا تھا۔ وہ ہیلو ہیلو کرتا رہ گیا اور خوش نصیب مزے سے کھسک لی۔

☆ ☆ ☆

اس روز رات گئے تک بارش برستی رہی۔
اتنا سو لینے کے بعد اب نیند معاویہ کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ذہن مختلف سوچوں کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔
وہ آنکھیں بند کرتا تو ایسا لگتا وسامہ اسے مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ معاویہ بے چین ہو کر آنکھیں کھول دیتا۔
جب کروٹیں بدل بدل کر تھک گیا تو اٹھ بیٹھا اور ٹی وی کھول کے ایک فضول سا ٹاک شو دیکھنے لگا۔ ٹی وی دیکھتے ابھی اسے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا جب ایسا لگا دروازے پر دستک ہوئی ہے۔
"کون ہے...؟ آجاؤ۔" معاویہ نے ٹی وی کی آواز کم کرتے ہوئے دروازے کی طرف منہ کر کے کہا۔ اس کی آواز اتنی بلند تو ضرور تھی کہ باہر کھڑا ہوا فرد بہ آسانی سن کے لیکن دروازہ کھولنے کے بجائے ایک بار پھر دستک دی گئی اور اس بار آواز زیادہ واضح تھی۔
معاویہ قدرے حیران ہوا اور اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔
"کون ہے بھئی' آجاؤ۔" اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ ٹیرس کا اندھیرا منہ کھولے اسے تک رہا تھا۔ معاویہ بے ساختہ تھوڑا آگے ہوا اور اس نے ذرا دروازے سے باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھا۔ ٹیرس دور تک سنسان اور رات کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔
بارش رک چکی تھی لیکن ٹیرس پر جگہ جگہ بارش کا پانی کھڑا تھا جبکہ آسمان ابھی بھی بادلوں کی تہ تلے دبا تھا۔
گیلی ہوا کی سائیں سائیں معاویہ نے اپنے کانوں میں محسوس کی تھی۔
"مجھے غلط فہمی ہوئی ہوگی۔" اس نے دل میں خود سے کہا اور واپس کمرے کی طرف مڑا' اسی وقت اسے سیڑھیوں کی جانب سے کوئی چیز گرنے کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی سیڑھیوں پر کسی نے تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا۔
معاویہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' سرعت سے سیڑھیوں کی طرف دوڑا۔ سیڑھیاں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں لیکن نیچے والے لاؤنج کے زیرو پاور بلب کی روشنی اتنی تو تھی کہ سیڑھیوں کے اختتام پر اس نے کسی کو مڑتے ہوئے اور دوسری طرف غائب ہوتے دیکھا۔ وہ دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے آیا اور باہر گیٹ کی طرف بھاگا لیکن یہ دیکھ کر وہ شاکڈ ہی رہ گیا کہ گھر کا داخلی دروازہ بند تھا۔ اسے پار کیے بغیر کوئی گیٹ تک نہیں جا سکتا تھا اور نہ اس دروازے کو اندر سے لاک کیا جا سکتا تھا۔
اس کا مطلب جو کوئی بھی تھا ابھی گھر سے باہر نکل نہیں پایا تھا وہ اسی گھر میں اور وہیں کہیں موجود تھا۔
معاویہ چوکنا ہو کر مڑا اور اس نے ہوشیاری سے بنا گردن گھمائے ادھر ادھر نظر ڈالی۔ ساتھ ہی اس نے کارنس

پر پڑا لوہے کا ایک قدیم گل دان بھی اٹھا لیا تھا۔
گلدان پر اپنی گرفت مضبوط کیے وہ چوکنا انداز میں آگے بڑھنے لگا' ساتھ ساتھ ادھر ادھر کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا تاکہ پورے گھر میں جہاں بھی کوئی مشکوک انسان نظر آئے فوراً" اسے دبوچ لے۔
معاً" ایک وجود اسے کچن کے ادھ کھلے دروازے سے اندر حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا۔ بلکہ وہ حرکت نہیں کر رہا تھا اس نے جیسے دروازے کی اوٹ لی تھی۔
معاویہ نے دونوں ہاتھوں کی گرفت اور مضبوط کی اور محتاط قدموں سے چلتا ہوا دروازے تک آیا۔ اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ آہستہ سے دروازے کو دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا' سلیب کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ اس کے اتنے پرسکون انداز پر معاویہ کو ذرا دیر کے لیے تعجب ہوا۔ وہ اگر کوئی چور اچکا ہوتا تو اسے یہاں سے بھی فرار ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن اس کا پُرسکون انداز معاویہ کو کشمکش میں مبتلا کر رہا تھا۔ بہر حال اس نے گلدان پر گرفت مضبوط کی اور دبے پاؤں اس کی طرف چلنے لگا۔
اس دوران اس کا ذہن مختلف وسوسوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ گل دان اسے مارتا۔ آئے کت اپنی جھونک میں اس کی طرف پلٹی اور معاویہ کو یوں اپنے اتنے قریب کھڑا دیکھ کر اس نے چیخ مار دی۔
معاویہ نے بوکھلا کر اس کے منہ پر سختی سے ہاتھ رکھ دیا۔ اپنی اپنی جگہ وہ دونوں ہی گھبرا بلکہ سٹپٹا گئے تھے۔
معاویہ کو فکر تھی کہ آئے کت کی چیخ سن کر ماموں یا ممانی جاگ نہ جائیں۔ اور آئے کت کو ڈر تھا معاویہ ہاتھ میں پکڑا گلدان اسے نہ کھینچ مارے۔ وہ بند منہ کے ساتھ پھٹی پھٹی آنکھوں سے معاویہ کو دیکھ رہی تھی۔
چند منٹ بعد صورت حال واضح ہوئی تو معاویہ نے اس کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹا دیا لیکن اس سے پہلے دھمکانا ضروری سمجھا۔
"میں ہوں.... آواز مت نکالنا۔"
اس کا ہاتھ منہ سے ہٹتے ہی آئے کت بدک کر پیچھے ہٹی اور اپنا تنفس بحال کرنے کو چند گہرے سانس لیے۔
اس دوران وہ معاویہ کو بڑی تنفر نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
"تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟" معاویہ نے ناراضی سے اور الجھن بھرے انداز میں پوچھا۔
"اپنے لیے کافی بنانے آئی تھی.... لیکن "تم" اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے معاویہ کے ہاتھ میں پکڑے گلدان کی طرف دیکھتے ہوئے مزید ناراضی سے پوچھا۔ اس کے پوچھنے پر ایک دم معاویہ کو احساس ہوا اگر بروقت آئے کت نہ پلٹی ہوتی تو یقیناً" معاویہ وہ گلدان اس کے سر پر مار چکا ہوتا۔ اپنی حماقت کا احساس ہوتے ہی اس نے گلدان کچن سلیب پر رکھ دیا تھا۔
"کچھ نہیں' وہ بس۔"
"ہوں۔" آئے کت نے ایک تیکھی نظر اس پر ڈال کر اپنا مگ اٹھایا اور جانے لگی۔ معاویہ کو ایک دم سے کچھ خیال آیا تو اسے پکار بیٹھا۔
"اوپر میرے کمرے کے دروازے پر کیا تم نے دستک دی تھی؟"
آئے کت نے اس سوال پر ایسے اسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو یہ کیسا سوال ہے۔
"کس قدر احمقانہ سوال ہے۔ رات کے اس پہر میں تمہارے دروازے پر کیوں دستک دوں گی؟"
"لیکن دستک کی آواز بہت واضح تھی.... میں نے سیڑھیوں پر کسی کو بھاگتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔" معاویہ نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔
"ضرور فلک بوس کا آسیب ہو گا.... وہ بد روح.... وسامہ کے بعد ممکن ہے اب وہ تمہارے پیچھے پڑ گئی ہو۔"

آئے گت نے طنز سے کہا، سر جھٹکا اور کچن سے باہر نکل گئی۔ معاویہ کے ماتھے پر ان گنت الجھنیں تھیں جو تہہ در تہہ بچھی تھیں۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح وہ بیدار ہوا تو ناشتے سے پہلے وہ سارے گھر میں پھرتا رہا۔
طالب ماموں کا گھر کچھ زیادہ وسیع و عریض نہیں تھا، مشکل سے پندرہ مرلے کا ہوگا۔ فلک بوس کی طرح نہیں کہ شروع ہو تو ختم ہونے کا نام ہی نہ لے۔ لہٰذا یہاں کوئی ایسا کونا بھی نہیں تھا جو اس کی نظروں سے پوشیدہ ہو۔ ویسے بھی اس کا بیشتر بچپن یہیں گزرا تھا۔ وہ اس گھر کے چپے چپے سے واقف تھا۔ ایسے میں اس کی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ رات کو اگر گھر میں کوئی داخل ہوا اور اس نے معاویہ کے دروازے پر دستک بھی دی تو پھر وہ اچانک غائب کہاں ہو گیا۔
گھر میں داخل ہونے کا راستہ بھی ایک ہی تھا۔ جو پوری رات مقفل رہتا تھا۔
پورے گھر کا تین بار جائزہ لینے کے بعد وہ اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ تھی ضرور۔ لیکن کیا۔۔۔؟ یہ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔
"رات مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے دروازہ ناک کیا ہو۔ لیکن جب میں باہر نکلا تو باہر کوئی بھی نہیں تھا۔" ناشتے کی میز پر بیٹھتے ہوئے اس نے طالب ماموں اور صاعقہ ممانی کو بتایا۔
"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔" ماموں نے کہا۔
"میں بھی غلط فہمی سمجھتا اگر میں نے کسی کو سیڑھیوں پر بھاگتے ہوئے نہ دیکھ لیا ہوتا۔"
"کیا کہہ رہے ہو؟" صاعقہ ممانی ایک دم سے پریشان ہو گئی تھیں۔ "اس کا مطلب رات کو کوئی گھر میں گھسا تھا۔۔۔ یہ تو بہت پریشانی کی بات ہے۔"
"پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے ممانی! میں سارا گھر چیک کر چکا ہوں۔ نہ تو چوری کے آثار ہیں نہ کسی کے بھاگ نکلنے کے۔۔۔ باہر کے دروازے کو ویسے ہی لاک لگا ہوا ہے جیسا رات آپ نے لگایا تھا۔"
"تو پھر کون ہو سکتا ہے؟" طالب ماموں فکر مندی سے بولے ان کے لہجے میں الجھن تھی۔
"ہو سکتا ہے آدم شمتی ہو۔" آئے گت نے آملیٹ کی پلیٹ میز کے درمیان رکھتے ہوئے کہا۔
"سنا ہے آسیب بہت تیزی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔۔۔ کیا پتا وہ بھی فلک بوس سے یہاں آ گئی ہو۔"
معاویہ نے اسے گھور کر دیکھا۔ آئے گت کو یہ بات ماموں اور ممانی کے سامنے نہیں کرنی چاہیے تھی۔ کم سے کم معاویہ کا یہی خیال تھا۔
"وسامہ کے بعد اب وہ معاویہ کے پیچھے ہوگی۔ آئی تھنک معاویہ! تمہیں کسی عامل کے پاس جانا چاہیے۔" وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ طنز کر رہی ہے یا نہیں۔
"تم تھوڑی دیر کے لیے خاموش رہو گی؟" معاویہ نے سختی سے کہا۔
"نہیں۔" چائے کا کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے آئے گت نے ترنت کہا۔
"فلک بوس تمہارا ہے تو وہاں رہنے والے آسیب کا سب سے زیادہ حق بھی تم ہی پر ہے۔۔۔ وسامہ بے چارا تو غلط فہمی میں مارا گیا۔"
"آئے گت! اس طرح کی باتیں مت کرو۔" صاعقہ ممانی اس کے تیور پہچان کر منت سے بولی تھیں۔

"میں اس طرح کی باتیں کیوں نہ کروں۔ آپ اس دن پوچھ رہی تھیں نا؟ وسامہ کیوں چلا گیا دنیا سے... میں بتاتی ہوں آپ کو۔ وہ اس لیے چلا گیا کیونکہ معاویہ نے اسے موت کے منہ میں دھکیلا۔" وہ ایک دم سے پھٹ پڑنے کے انداز میں بولی۔

معاویہ کے سر پر جیسے آسمان آگرا تھا۔

"کیا بکواس کر رہی ہو۔" وہ غضب ناک ہو کر گرجا۔

"کاش یہ بکواس ہوتی... کاش میں بکواس ہی کر رہی ہوتی لیکن یہی سچ ہے مسٹر معاویہ شیرازی! ایسا سچ جو تم کبھی کسی کے سامنے آنے نہیں دو گے۔ تم اچھی طرح جانتے تھے فلک بوس آسیب زدہ ہے۔ اس کے باوجود آپ کے باوجود تم نے مجھے اور وسامہ کو وہاں جانے دیا۔ تم نے ہمیں مجبور کیا کہ وہاں جا کر رہیں جہاں کوئی انسان محفوظ نہیں رہ سکتا۔"

"یہ سچ نہیں ہے۔" وہ زور دے کر بولا۔

"یہ سچ ہے۔" وہ چلائی۔ "تم جلتے تھے وسامہ سے ہم ہمیشہ اس جیسا بننا چاہتے تھے... یاد کریں انکل! یہ بات آپ نے خود مجھے بتائی تھی کہ معاویہ بہت چھوٹی عمر سے وسامہ کو فالو کیا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ کہتا تھا میں وسامہ جیسا بننا چاہتا ہوں اور جب یہ ویسا نہیں بن سکا... ویسا ہر دل عزیز نہیں بن سکا تو اس نے وسامہ کو فلک بوس بھجوا دیا... کیونکہ یہ جانتا تھا وہ آسیب کسی کو بھی وہاں ٹکنے ہی نہیں دے گا۔"

"اپنے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لیے وسامہ کی موت کا ذمہ دار مجھے مت ٹھہراؤ۔" معاویہ چیخ کر بولا تھا۔ "سچ تو یہ ہے کہ وسامہ کی موت کی ذمہ دار تم ہو... محبت کی شادی کرنے کے باوجود تم کبھی اسے وہ خوشی دے ہی نہیں پائیں جو اس جیسا اچھا انسان ڈیزرو کرتا تھا۔"

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

"اچھا...؟ میں اسے خوشی نہیں دے پائی اس لیے میں نے وسامہ کو... اپنے شوہر کو قتل کر دیا...؟ واؤ...!! اس قدر بے تکا الزام ہے۔" آئے کت نے سلگ کر کہا۔

"مجھے نہیں پتا کیا ہوا کیا نہیں... میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس کی موت میں کہیں نہ کہیں تمہارا ہاتھ ہے۔"

"ٹھیک ویسے ہی جیسے میں مانتی ہوں وسامہ کے اس دنیا سے چلے جانے کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے۔" وہ سابقہ انداز میں بولی۔

"تم نے محبت کے نام پر اسے موت کے گھاٹ اتارا..." وہ غرّایا۔

"اور تم نے بھائی بن کر۔" وہ بھی چلائی۔

کچھ دیر کے لیے ڈائننگ روم میں سناٹا چھا گیا پھر طالب ماموں نے شاک سے نکلتے ہوئے کہا۔

"تم دونوں کو کیا ہو گیا ہے؟ کیوں ایک دوسرے پر کیچڑ اچھال رہے ہو۔"

"کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں... جب تک زندہ رہیں گے اسی طرح ایک دوسرے کو ذلیل کرتے رہیں گے۔" آئے کت نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ایک چھچھلتی ہوئی نگاہ معاویہ پر ڈالی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

معاویہ نے اپنا غصہ دبانے کے لیے دانت بھینچ لیے۔ مٹھیاں کس لیں۔ اس کی کنپٹی کی ایک رگ مسلسل پھڑک رہی تھی۔ اس نے ایک نظر صاعقہ ممانی اور طالب ماموں پر ڈالی۔ وہ دونوں ہی عجیب طرح کے تاثرات کا شکار ہو گئے تھے۔

"میں اسے قتل کر دوں گا۔۔۔ میری بات لکھ کر رکھ لیں۔۔۔ میں واقعی اسے قتل کر دوں گا۔" اس نے ہاتھ مار کر میز پر پڑے برتن گرا دیے اور تن فن کرتا باہر نکل گیا۔

"معاویہ!۔۔۔ معاویہ! میری بات سنو۔" طالب ماموں اپنی جگہ سے اٹھے لیکن گھبراہٹ میں فوری طور پر ان سے اٹھا نہیں گیا۔

"اسے روکیں۔۔۔ کہیں غصے میں کچھ کر نہ بیٹھے۔" صاعقہ ممانی حواس باختہ اس کے پیچھے دوڑی تھیں۔

معاویہ سیدھا کچن میں آیا۔ اسے تیز دھار چھری یا کسی ایسی چیز کی ضرورت تھی جس سے آئے کت کو قتل کر سکے۔ اس نے ہیجانی انداز میں الماریاں اور درازیں کھولنا شروع کر دی تھیں۔ لیکن فوری طور پر اسے کچھ بھی نہیں مل رہا تھا۔

اسی اثنا میں صاعقہ ممانی اور طالب ماموں تقریباً دوڑتے ہوئے اس کے پیچھے آئے۔

"معاویہ۔۔۔ بیٹا! تم یہ کیا کر رہے ہو؟" صاعقہ ممانی کی آواز گھبراہٹ کے مارے کپکپا رہی تھی۔

"میں آئے کت کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" وہ غصے سے یہاں وہاں ہاتھ مار رہا تھا۔

"غصہ تھوک دو معاویہ! وسامہ جا چکا ہے۔۔۔ اس طرح جذباتیت کا مظاہرہ کر کے وہ واپس نہیں آ جائے گا۔" طالب ماموں نے اسے پکڑ کر روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ معاویہ نے زبردستی اپنا آپ ان سے چھڑا لیا۔

"مجھے چھوڑ دیں ماموں! مجھے روکنے کی کوشش مت کریں۔۔۔ آپ صحیح کہتے تھے "آئے کت اس قابل نہیں تھی کہ وسامہ جیسا لڑکا اس سے شادی کرتا۔ ہم اسی وقت روک لیتے وسامہ کو تو آج وہ ہمارے درمیان ہوتا۔" وہ ہیجانی انداز میں زور زور سے بول رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے آپ میں نہیں ہے۔ اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں اور ان سے آنسو بہہ رہے تھے۔ لیکن ایسا لگتا تھا معاویہ کو اس بارے میں علم نہیں ہے۔

وہ غم و غصہ سے پاگل ہو رہا تھا۔ اسے تیز دھار چھری مل گئی تھی۔ اسے لیے وہ باہر کی طرف لپکا۔

طالب ماموں نے اسے زبردستی پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا۔

"تمہارے پاس ثبوت ہے؟" وہ اسے باہر نکلنے سے روکنے کی تگ و دو کر رہے تھے اور ہلکان ہو رہے تھے۔

"تمہارے پاس ثبوت ہے معاویہ کہ وسامہ کو آئے کت نے قتل کیا ہے؟"

شور کی آواز سن کر آئے کت دوڑی چلی آئی۔ اور یہاں کا منظر دیکھ کر اس کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔

"مجھے چھوڑیں ماموں! میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" ان کی بات سنے بغیر وہ خود کو چھڑا کر تیزی سے آئے کت کی طرف بڑھا۔ عین ممکن تھا وہ اسے چھری سے زخمی کر دیتا کہ طالب ماموں نے سرعت سے اسے پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف موڑا اور ایک زور دار تھپڑ اس کے چہرے پر مارا۔ اس ایک تھپڑ نے جیسے ساری کائنات کو ساکت کر دیا تھا۔

آئے کت نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی چیخ کو روکا۔ صاعقہ ممانی الگ صم بکم کھڑی تھیں۔ جبکہ معاویہ کے ہیجان کا غلبہ ٹوٹ چکا تھا۔ وہ ایک تھپڑ کھا کر پتھر کا مجسمہ بن گیا تھا۔

"تمہارے پاس گواہ ہے جس کی گواہی یہ ثابت کرے کہ آئے کت وسامہ کی قاتل ہے؟ کوئی ایسا ثبوت جو آئے کت کو سزا دلانے کا سبب بن سکے؟ نہیں۔۔۔ کچھ نہیں ہے تمہارے پاس۔۔۔ صرف شک کی بنیاد پر دوسروں کو سزائیں نہیں سنائی جاتیں معاویہ' اور اگر صرف شک کی بنیاد پر کوئی فیصلہ صادر کرنا ہے تب تو ہمیں آئے کت کی بات بھی مان لینی چاہیے۔۔۔ وہ سمجھتی ہے وسامہ کو تم نے موت کے منہ میں دھکیلا تھا۔ اس حساب سے کوئی نہ کوئی فرد جرم تو تم پر عائد ہوتی ہے۔۔۔ ایک کے شک کو سچ ماننے کا مطلب ہے' دوسرے کے شک کو بھی سچ مان لیا جائے۔ تمہیں شک ہے تو ثبوت لے کر آؤ۔۔۔ اس کے جرم کو ثابت کرو۔ اس کے گناہ پر سے پردہ اٹھاؤ۔۔۔ یہ نہیں کہ

خود سے سزا دینے نکل کھڑے ہو۔" وہ جیسے غصے سے بولتے بولتے ہانپنے لگے تھے۔ ذرا غصہ ماند پڑا تو انہوں نے ایک نظر معاویہ اور آئے کت پر ڈالی اور بولے۔

"میں اور صاعقہ کوئی دودھ پیتے بچے نہیں ہیں کہ سمجھ نہ سکیں۔۔۔ صاف نظر آرہا ہے تم دونوں کے درمیان وجہ اختلاف صرف وسامہ کی موت نہیں ہے۔۔۔ جھگڑے کی بنیاد کچھ اور ہے۔۔۔ تم دونوں لڑو۔ ایک دوسرے کے سر پھاڑ دو یا ایک دوسرے کو قتل ہی کر دو۔۔۔ گزارش صرف اتنی سی ہے کہ ہماری زندگیوں میں اپنے بیٹے کے بعد کچھ بھی نہیں بچا۔ ہم پہلے ہی غم سے نڈھال ہیں ہمیں اور پریشانیوں میں مت دھکیلو۔۔۔ سکون دے نہیں سکتے تو رہا سہا سکون برباد بھی مت کرو۔" آخری جملہ بولتے بولتے ان کی آواز آنسوؤں سے رندھ گئی تھی۔

انہوں نے صاعقہ ممانی کا ہاتھ پکڑا اور کچن سے باہر نکل گئے۔

معاویہ ایسے ہی سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کا چھری والا ہاتھ پہلو میں تقریباً" بے جان سا گرا ہوا تھا۔

آئے کت نے معاویہ کو دیکھا اور سر جھکا کر' نظریں چرا کر پلٹ گئی۔

معاویہ نے ہاتھ اٹھا کر اس تیز دھار چھری کو دیکھا۔ بے بسی کا احساس اس کے رگ و پے میں سرائیت کر گیا۔ اس نے چھری کو فرش پر پھینک دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

شام ہونے تک خوش نصیب ذہنی طور پر اتنا تھک چکی تھی کہ ساری خودداری ایک طرف رکھ کر فریحہ کے گھر پہنچ گئی۔ دل کو یہ کہہ کر سمجھا لیا کہ بچپن کی سہیلی کو ناراض نہیں رکھا جا سکتا۔ دوسری بات یہ تھی کہ فریحہ کے چھوٹے بھائی کو گول گپے لے جاتے دیکھ لیا تھا۔ اب تو جب تک پوری پلیٹ نہ ہضم کر لیتی' ناراض رہا جا ہی نہیں سکتا تھا۔ سو پہنچ گئی فریحہ کے گھر اور خوب باتیں پھیلا کر لاڈ جتا کر فریحہ کی ناراضی دور کرنے کی کوشش کی۔

"تم ایسے ہی منہ پھلا کر بیٹھی ہوئی ہو ورنہ سچ بات تو یہ ہے کہ میں تمہارے پیر صاحب کے خلاف نہیں ہوں۔"

"لیکن تم انہیں مانتی بھی نہیں ہو۔" فریحہ ناراضی سے بولی۔

"جیسی ان کی شکل ہے وہ خود اپنے آپ کو مان لیتے ہیں' یہی بڑی بات ہے۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی پھر جلدی سے بولی۔

"دیکھو میں انہیں پیرو مرشد نہیں مان سکتی۔ مر جاؤں گی لیکن ان کے ہاتھ پر بیعت نہیں کروں گی۔ لیکن تم کہو گی تو ان کے آستانے پر چلی جاؤں گی۔ ان سے تمیز سے بات بھی کر لوں گی۔۔۔ لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔" اس نے دوٹوک کہا۔ اور ایک بڑا سا گول گپا چٹنی کر پانی سے بھرا اور منہ میں ٹھونس لیا۔

"تم تو ایسے شرطیں گنوا رہی ہو جیسے پیر صاحب سے شادی کرنے کی بات کر دی ہو میں نے۔" فریحہ منہ بنا کر بولی۔

"توبہ۔۔۔ میں کیوں کروں تمہارے پیر صاحب سے شادی' میرے لیے تو کوئی شہزادہ آئے گا۔" وہ اترا کر بولی۔

"فکر نہ کرو۔۔۔ وہ شہزادہ بھی آتے ہی' تمہیں دیکھ کر بھاگ جائے گا۔" فریحہ نے دانت نکال کر کہا۔

"ارے وہ تو شکرانے کے نفل پڑھے گا کہ مجھ جیسی لڑکی اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو گئی ہے۔۔۔ ابھی بھی بے چارہ پتا نہیں کہاں بیٹھا میرے لیے دن رات وظیفے کرتا ہو گا۔" اس نے تصور کی آنکھ سے اس شہزادے کو دیکھا' جو ابھی پتا نہیں کہاں تھا۔

"تمہاری یہ خوش فہمیاں ہیں ناں۔۔۔ دیکھ لینا ایک دن مروائیں گی تمہیں۔" فریحہ نے کہا۔

"اچھا بابا، ناراض ہو کر بددعائیں تو مت دو۔"
"نہیں دیتی... لیکن خدارا! تم یہ گول گپے کھانا تو بند کرو... میں نے اپنی لیے منگوائے تھے، سارے تم ہڑپ کر گئی ہو۔"
"ارے اگر دو چار کھا ہی لیے تو کون سی قیامت آگئی... آخر میں تمہاری دوست ہوں اور..."
"اور میں کھاؤں یا تم ایک ہی بات ہے۔" فریحہ نے اس کا جملہ اچک کر لقمہ دیا۔ بجائے شرمندہ ہونے کے خوش نصیب مسکرانے لگی اور بولی۔
"کیا ہوا جو تم بدصورت ہو... لیکن ہو ذہین۔" ایسی تعریف خوش نصیب ہی کر سکتی تھی۔
"ہونہہ..." فریحہ نے ناک چڑھائی۔
"تم ایک بار پیر صاحب کے پاس چلو تو سہی۔ ایسی اچھی باتیں کرتے ہیں کہ تم اگلی بار خود کھنچی جاؤ گی۔" فریحہ خوش ہی ہو گئی تھی۔ دراصل عام انسانی نفسیات ہے، ہم جسے عزت دیتے ہیں، جس کی عقیدت میں مبتلا ہوتے ہیں، چاہتے ہیں دوسرے بھی اس کی چاہ میں مبتلا ہو جائیں۔ عشق میں دوئی کا تصور نہیں ہے لیکن عقیدت میں ہے۔ تو خوش نصیب نے اطمینان سے گول گپے کھائے اور فریحہ کے ساتھ بیری پیر کے آستانے پہ آ گئی۔
گھر سے نکلتے ہوئے فریحہ نے اپنی اماں کو اطلاع دینا ضروری سمجھا۔
"ہم مزار پر جا رہے ہیں... تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔"
"ہاں ہاں ضرور جاؤ... لیکن آدھ گھنٹہ رک جاتیں تو میں بھی کاموں سے فارغ ہو کر تمہارے ساتھ ہی چلتی۔"
"مجھے مغرب سے پہلے گھر واپس جانا ہے خالہ جی!" خوش نصیب نے کہا۔
"آپ بعد میں آجانا اماں! یہ تو گھر ہی ہے مزار۔ ہم چلے جاتیں گے۔" فریحہ نے کہا۔
"اچھا چلو ٹھیک ہے۔" وہ راضی ہو گئیں۔
"وہ... خالہ جی!" خوش نصیب نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "اگر میرے گھر سے کوئی مجھے پوچھنے آئے تو انہیں یہ مت بتائیے گا میں مزار پر گئی ہوں... میری روشن امی کو پسند نہیں ہے۔"
"ہاں جانتی ہوں... تمہاری اماں کو ہر وہ کام ناپسند ہے جو سارا زمانہ کرتا ہے... صحیح کہتی ہے تمہاری چاچی اسے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کا شوق رہتا ہے۔" ناک چڑھا کر بولیں لیکن اس سے زیادہ ناک خوش نصیب نے چڑھالی۔ غلط خیالات تھے یا صحیح۔ اسے اپنی روشن امی کے خلاف کچھ بھی سننا ناپسند تھا۔
فریحہ اگر اپنی اماں کی بیٹی تھی تو خوش نصیب کی سہیلی بھی تھی۔ فوراً صورت حال بھانپ گئی۔
"ہم جا رہے ہیں... چلو خوش نصیب۔" جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆
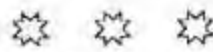
"اچھا سنو..." اچانک ساتھ ساتھ چلتے خوش نصیب نے کہا۔
"اپنی اماں سے کہنا، میری روشن امی کے بارے میں اس طرح بات نہ کیا کریں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ہم پیروں فقیروں کو نہیں مانتے تو بس نہیں مانتے۔" اسے بہت ہی برا لگا تھا۔
"چھوڑو اس بات کو... تمہیں پتا ہی ہے میری اماں کا۔" فریحہ نے ناک سے مکھی اڑائی۔ "ویسے تو تمہاری امی کی پکی سہیلی ہیں لیکن تمہاری فضیلہ چچی کو پیر بہن مانتی ہیں اور ہمارے ہاں سگے رشتوں کے ساتھ ساتھ پیروں سے وابستگی کی بنا پر بننے والے رشتوں کو بھی بہت اہمیت دی جاتی ہے۔"
"ہائیں... اب ان رشتہ داریوں کا کیا مطلب ہے؟" اس نے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔ اسی اثنا میں وہ دونوں مزار کے

قریب پہنچ گئیں۔
"بیری پیر کے مجاور بڑے پیر صاحب ہیں۔ ان کا گاؤں ساہیوال سے آگے ہے۔ کبھی کبھار وہ بیری پیر بھی تشریف لاتے ہیں تو ہم لوگ اماں ابا کے ساتھ ان کی خدمت میں سلام پیش کرنے جاتے ہیں۔۔۔ ابھی تم باباجی سے ملو۔۔۔ کبھی بڑے پیر صاحب تشریف لائے تو میں تمہیں ان سے ملوانے بھی لے جاؤں گی۔" دربار میں داخل ہوتے ہوئے فریحہ اسے بتارہی تھی۔
"اگر ایسی بات ہے تو اپنے باباجی سے کہنا' مزار کے کسی فقیر سے سر کے بل رقص کروا کر دکھائیں۔"
فریحہ نے آنکھیں نکال کر اسے گھورا۔ تو جلدی سے بولی۔
"نہیں۔۔۔ میرے کہنے کا مطلب تھا سر کے بل رقص کرنا بھی کسی کرامت سے کم تو نہیں ہے۔" فریحہ مسلسل اسے غضب ناک نظروں سے گھور رہی تھی۔ خوش نصیب نے جلدی سے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔
مزار پر زائرین کا معمول کا رش لگا ہوا تھا۔ پیر صاحب کے آستانے کے بالکل سامنے وہ باباجی براجمان تھے جن کی فریحہ اور اس کی اماں معتقد تھیں۔ سادھوؤں والا چولا گندے میلے کچیلے بال۔
خوش نصیب کو دیکھ کر باباجی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ دوسری جانب خوش نصیب کو ابکائی سی آنے لگی۔ بابے کا حلیہ تھا ہی اتنا گندا۔
اگر فریحہ ساتھ نہ ہوتی تو خوش نصیب برملا اس بات کا اظہار کرتی۔
"السلام علیکم باباجی!" فریحہ نے حسب عادت گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔ ساتھ ہی ٹھوکا خوش نصیب کو بھی دیا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی البتہ داہنا ہاتھ ماتھے تک لے جاکر اور سر کو ذرا سا خم دے کر باباجی کی خدمت میں سلام پیش کرنے کی ذمہ داری ادا کردی تھی۔
"اللہ تمہارا مالک ہے۔۔۔ اللہ تمہاری حفاظت کرے۔۔۔ اللہ ہو' حق اللہ۔"
"سادھو بابا نے اس کے سلام کا جواب کچھ اس طرح دیا کہ دعاؤں کا انبار لگا دیا اور سر کو اتنی زور سے جھٹکا دے دے کر "اللہ" بول رہے تھے کہ ایک لمحے کو خوش نصیب کو شک گزرا کہ باباجی چکر کھا کر اب گرے تو تب گرے۔
"آپ نے خوش نصیب کو بلایا تھا نا بابا!۔۔۔ میں اسے لے آئی ہوں۔" فریحہ نے اپنی کارکردگی سے آگاہ کیا۔
"کوئی اپنی مرضی سے نہیں آتا۔ بندے کی ضرورت اسے کھینچ لاتی ہے۔۔۔ اللہ کھینچ لاتا ہے۔" باباجی نے ایک بار پھر سر دھنتے ہوئے جیسے اپنی طرف سے بڑی "پہنچی ہوئی بات" کی تھی۔
خوش نصیب نے بابا کو پرکھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اور اپنی اس "پرکھ" پر اسے ہمیشہ سے ہی بڑا اعتماد رہا تھا۔ دوسرے اسے ہمیشہ سے ایسا سچ بولنے کا شوق رہا تھا جو اگلے بندے کو شرمندہ کرکے رکھ دے۔ تو اس وقت پیر صاحب کے آستانے کے صحن میں کھڑے ہو کر اس نے عہد کیا وہ پیر صاحب کا راز فاش کرے گی اور فریحہ اور اس کی اماں کو ان باباجی کی عقیدت کے چنگل سے آزادی دلائے گی۔ سو وہ باباجی کے سامنے سر اٹھا کر بیٹھ گئی اور ایسے باباجی کی طرف دیکھا جیسے آنکھوں سے ان کی حقیقت کا پتا چلانا چاہتی ہو۔
"بول بچی! کیا چاہتی ہے۔۔۔ بابا تیرے من کی ہر مراد پوری کرے گا۔" بابا نے اپنی چنی منی سی آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑدیں اور ایک پل میں خوش نصیب اس دنیا سے غافل ہوگئی۔ اسے لگا جیسے وہ خلا میں بھٹک رہی ہو۔ بظاہر وہ وہیں بیٹھی تھی۔ سب سن رہی تھی' دیکھ رہی تھی۔ مگر اس کے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔
وہ جو خود کو تیس مار خان' ذہین و فطین اور پتا نہیں کیا کیا سمجھتی تھی' اس وقت ایک بے جان مورت بن گئی تھی۔
بات یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ اعتماد بھی انسان کو لے ڈوبتا ہے اور شاید خوش نصیب بھی ڈوبنے کو تھی۔
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نازیہ جمال

"کل جج... اج بوٹیوں کا رج..."
"یک ہا..." بچپن کی بقر عیدیں بھی واقعی عیدیں ہوتی تھیں۔ خوشی، مستی، ترنگ سے بھرپور... دس ذی الحج کی پالے پڑتی ٹھنڈی یخ صبح میں اس کے ننھے مہندی رچے ہاتھ انگڑائی لیتے ہوئے گرم گرم رضائی سے باہر آتے تو بھینچی ہوئی مٹھیوں سے بھر بھر خشک مہندی نیچے گرنے لگتی تھی۔
"اونہوں... اٹھو، جاکر پہلے کیاری میں ہاتھ دھو آؤ... جگہ جگہ مہندی جھڑنے سے گناہ ہوتا ہے۔"
ساتھ چارپائی پہ رضائی ٹانگوں پہ ڈالے ہل ہل کر تسبیح

پڑھتی دادی بے ساختہ اسے ٹوکتیں۔

"جی دادی!" وہ تابع داری سے رضائی چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوتی۔ خالص دیسی مہندی کی بھینی بھینی خوشبو دل و دماغ کو سرور آمیز احساس بخش رہی ہوتی۔

"اور ادھر آ' ہاتھوں پہ سرسوں کا تیل مل دوں۔ دیکھنا رنگ کیسا گہرا ہوتا ہے۔" اور پھر واقعی تیل ملنے سے ہتھیلیاں رچ کے شوخ شوخ ہو جاتیں اور وہ سب بہن' بھائیوں کا پھر سیخوں میں بھر بھر کے کلیجی کے ٹکڑے پرو کر چولہے پہ رکھنا۔ گوشت کے حصے ــــ کرتے ہوئے اماں چیخ چیخ کر کہتیں۔

"میری بے صبری اولاد! سالن کے لیے تو کچھ کلیجی چھوڑ دو.... "مگر ناں' کچی بھنی نمک چھڑکی کلیجی کا مزا' رات کی کڑاہی میں کہاں۔

اور وہ کیمرہ! ہاں ہاں وہ ڈبا پیک یاشیکا کا کیمرہ۔ جو ابا کے دوست سعودی عرب سے تحفہ لائے تھے۔ چکنی مٹی کی لپائی والے پرانے سازو سامان سے بھرے صاف ستھرے کمرے میں ان سب کے لیے بے حد خوشی' اشتیاق اور فخر کا سامان جستی ٹرنک میں رکھا وہ کیمرہ تھا جسے وہ اکثر اسکول کی دوستوں اور کزنز کے سامنے کھول کے بیٹھی ہوئی تھی۔

"بالکل نیا نکور ہے۔ میرے ابا کے دوست لائے ہیں۔ پوری بتیس تصویروں والا رول لیتا ہے یہ۔" اس کے انداز سے شیخی جھلکتی ــــ تھی۔ مگر یہ بتیس تصویریں کس کس کی ہوں گی اور کب بنیں گی؟ وہ یہ سوال اکثر دلار سے ابا کے گھٹنے پہ سر رکھ کر کیا کرتی تھی۔

"ہاں میرا پتر! بس یہ بڑی عید آنے والی ہے نا۔ اس پہ تم سب کی تصویریں بناؤں گا؟" خود ابا کو بھی اس کیمرے سے بے حد لگاؤ تھا۔ نئی چیز۔ انوکھا تجربہ.... ذی الحج کا چاند نظر آتے ہی کیمرے میں رول ڈلوا کر لے آئے۔

نئے کپڑے' جوتے' ہار' کنگن' رومال' سوئیاں' پرائس ٹیگ لٹکاتے نئے کالے چشمے' خوشی خوشی کھلکھلاہٹیں' بڑی عید اپنے تمام تر رنگوں اور لوازمات کے ساتھ ان کے کچے آنگن میں اتری تھی۔

سب ایک دم سے ریڈی۔ آخر کو ابا نے کھٹا کھٹ تصویریں جو بنانی تھیں۔ تصویریں بنانے کی جگہیں تو بہت پہلے سے منتخب کرلی تھیں۔ اناروں کے جھنڈ کے نیچے' پھولوں کے پاس.... کمرے کے ساتھ لگی بیل سے لگ کر.... کبھی سنجیدہ' تو کبھی باچھوں تک چری مسکراہٹ والے پوز' مگر اماں کا موڈ بے حد خراب تھا۔

"ساری زندگی قربانی قصائی کے ہاتھوں کروائی۔ اب چلے ہیں خود براق گلا کاٹنے' نہ صاحب! ہمیں نہیں پسند یہ غیر ضروری اعتماد.... اور شو بازی...."

"شو بازی کیوں؟" ابا بھڑکے۔ "کیا میں کسی جانور کو ذبح نہیں کر سکتا؟ مرحوم ابا میاں کا بڑا سا ریوڑ ہوا کرتا تھا ان بکریوں اور بھیڑوں کا۔ رات کے کسی بھی پہر جانور کی طبیعت بگڑتی تو ابا میاں کے ساتھ مل کر میں ہی چھری پھروایا کرتا تھا اور اب گھر کا پلا پلایا بکرا۔ اوپر سے بھلا ہو حاجی رفیق کا' جس کے طفیل آج ایک قیمتی اور اعلا درجے کے کیمرے کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ موقعے کو خود ہی خوب صورت اور یادگار کیوں نہ بنایا جائے اور یہ بات کرتی ہیں اجرت کے قصائی کی۔" اور پھر فوٹو سیشن کا آغاز ابا نے خود سے شروع کیا تھا۔ بکرے کے گلے پر چھرا پھیرتے ہوئے' دھریک کے درخت کی موٹی تو انا شاخ پر بکرے کو لٹکا کر کھال اتارتے ہوئے۔ غرض قربانی کے تمام مراحل کی تصاویر' عبدل نے ابا کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق بنائیں اور جب کھال اتارتے ہوئے ابا سے تیز دھار چھری سے کھال پہ ہاتھ جتنا کٹ لگ گیا تو اماں جل کر بولے بنا رہ نہ پائی تھیں۔

"ہمیں نہ راس آئیں اس آدمی کی شوخیاں.... اچھی بھلی کھال کی قیمت گھٹا دی۔ بھلا کٹ لگی کھال کی کیا قیمت وصول پائیں گے مدرسے والے؟" مگر دبوں والی دھوتی اور نئی سفید بنیان میں ملبوس یکسر بے نیاز اور مدبر بنے ابا پر بکرا ذبح کرنے سے لے کر گوشت کے حصے کرنے تک کیمرے کا فلیش مسلسل پڑتا رہا اور ادھر ـــ یہ سب اس سوچ سے ہلکان کہ....

"ابا تو دھڑا دھڑ اپنی تصویریں بنائے جا رہے ہیں۔ رول ختم ہو گیا تو ہم سب تو ایسے ہی رہ جائیں گی۔" مگر

شام ڈھلنے سے قبل ابا نے ان تمام بچوں کی ڈھیروں تصاویر بنائیں اور بچپن کی بے شمار عیدوں میں یہ کیمرے والی عید سب سے نمایاں اور یادگار تھی اور اب بھی مصروفیت بھرے ایام میں کبھی کوئی چیز ڈھونڈتے ہوئے یہ پرانا' پیلاہٹ والا فوٹو البم ہاتھ لگتا تو چھم سے یہ عید مکمل تابناکی کے ساتھ ذہن کے پردے پر نقش ہو کر دل و دماغ کو ناقابل بیان سرور سے ہم آہنگ کر دیتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"دھڑاززز...!" باہر کوئی چیز قوت سے گری تھی۔ وہ جو ہاتھ میں شیشے والا پٹا اور پھندے والی زنجیر ہاتھوں میں تھامے سرشاری دھیان کی کھڑکی سے ماضی میں جھانک رہی تھی۔ چونک کر حواسوں میں پلٹی۔ یہ پٹا اور زنجیر اسے عبدل کچھ دیر پہلے دے گیا تھا کہ شام کو بکرا آنے پر اس کا سنگھار مکمل کیا جائے گا۔ وہ ہاتھ میں پکڑی چیزیں ایک طرف رکھ کر فطری تجسس کے مارے باہر نکل آئی۔ ستمبر کی چمکیلی اور چبھتی دھوپ نے لمحہ بھر کو اس کی آنکھیں چندھیا دی تھیں۔ سامنے صحن میں برتن دھرے ہوئے تھے۔ جو ابھی کچھ دیر پہلے اس نے دھو چمکا کر ٹوکرے میں منڈیر پر رکھے تھے۔ اس کے اندر سے طیش کی ایک تیز لہر ابھری تھی۔ صحن میں ٹوئنٹی ٹوئنٹی کا میدان سجا تھا۔ گھر کے سارے بچے اپنی اپنی پوزیشنز پر مستعد کھڑے تھے۔

وہ دانت پیستی ہوئی آگے بڑھی اور اونچے اونچے شاٹس لگاتے وکی کا کان پکڑ کر زور سے مروڑ دیا۔

"بدتمیزوں۔۔۔! یہ گھر ہے یا کوئی پلے گراؤنڈ' ابھی برتن دھو کر فارغ ہوئی ہوں۔ اب پھر سے سمیٹوں اور دھوؤں؟ اتنا فارغ سمجھ رکھا ہے مجھے؟" غصے سے اونچا اونچا بولتے ہوئے وہ ایک ہاتھ سے وکی کا کان پکڑے اور دوسرے سے اس کی پشت پہ دھمو کے جڑتی جارہی تھی۔

"اوئی آپا! قسم سے میری شامت سے تو کرا نہیں گرا! میں تو ابھی ابھی بیٹنگ پر آیا ہوں۔ مجھ سے پہلے صفی بیٹنگ کر رہا تھا۔ اف۔۔۔ میرا کان۔۔۔" کان چھڑانے کی سعی میں مصروف وکی درد کے مارے دہرا ہوا جارہا تھا اور خوب واویلا کر رہا تھا۔

"چھوڑو وکی کو۔۔۔ کیا اس کا کان اکھاڑ کر دم لوگی؟" پشت پر ایک جان دار اور دبنگ آواز ابھری تھی۔ وہ بل کھا کر پلٹی۔ سامنے ارتضیٰ فہمائشی نظروں سے کھڑا گھور رہا تھا۔

"نہیں۔۔۔ اتنے سستے میں نہیں چھوڑوں گی۔ صرف کان نہیں اکھاڑوں گی' ساتھ میں اس کی ٹانگیں' ہاتھ' پاؤں سب توڑوں گی۔" غضب سے کھولتے ہوئے اس نے وکی کے ہاتھ سے بلا چھینا اور اس سے پہلے کہ وہ دو تین بلے خوب جما کے اسے لگاتی' ارتضیٰ نے اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے جست لگا کر بلا اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

"پاگل ہوئی ہو؟ کیا جان لوگی اب؟ ذرا سے برتن ہی تو بکھرے ہیں۔ سمیٹ کر پھر سے دھو لو۔"

"اچھا۔۔۔ اتنا فارغ سمجھ لیا ہے کہ کیے ہوئے کام کو پھر سے کروں۔۔۔ دھونے کی خوب کہی۔ یہ جو اتنے کپ ٹوٹے اور پلیٹیں تڑخی ہیں ان کا حساب کون دے گا؟" نازک کمر پہ دونوں ہاتھ جمائے وہ گہرے طنز سے بولی۔

"اچھا برتنوں کا تاوان؟ تو چلو اس سولر پلیٹ کا حساب نکالو۔ جو دو دن پہلے صفی نے سائیکل کی ٹھوکر سے توڑ دی تھی۔" وہ بھی فوراً "حساب کتاب" پہ اتر آیا تھا۔ آخر کو اکنامکس میں ماسٹرز تھا۔ جمع و تفریق کا ماہر۔۔۔

"ایسی ہی بیٹنگ کرتے ہوئے رزم نے ہمارے برآمدے کا سیور توڑ دیا تھا۔ روشان میری پرفیوم کی شیشی لگانے کے لیے لے گیا اور ابھی تک واپس نہیں کی۔"

"کیا کیا؟ تم میرے بھائیوں کی معصومیت اور بھلکڑپن کو اپنی منفی ذہنیت سے ندیدے پن میں لا رہے ہو؟" وہ اس الزام پر جیسے غصے سے تھرا اٹھی تھی۔ "ایسے تو بیسیوں نقصان تمہارے بہن' بھائی ہماری طرف آکر کر جاتے ہیں۔ ابھی کل ہی تو شمہ نے فریج سے کھیر کا ڈونگا نکالتے ہوئے ساری کھیر گرادی۔

کتنی محنت اور شوق سے بنائی تھی۔ پیسے الگ ضائع ہوئے۔"

"ہاں تو خود اٹھنے کی زحمت کرلیتیں۔ میری معصوم ننھی سی بہن اتنا بھاری ڈونگا اپنے قد سے اونچے فریج سے نکال سکتی تھی؟" وہ آرام سے دفاعی انداز میں بولا تھا۔

"بس بہت ہوگیا۔ تم ارتضیٰ امین! اپنے بہن' بھائیوں کو اچھی طرح سمجھا لو اگر آج کے بعد یہ ہماری طرف بھٹکے' کوئی نقصان کیا' یا میرے کیے ہوئے کاموں کو خراب کیا تو اپنی شامت کے یہ خود ذمہ دار ہوں گے۔" انگلی اٹھا کر دھمکی دینے کے انداز میں وہ چباچبا کر بول رہی تھی۔

"او کے ڈن خوباں رحیم! اپنے بہن' بھائیوں کو تو میں سمجھا لوں گا۔ مگر اس بات کی یقین دہانی کون کرائے گا کہ تمہارے بہن' بھائی بھی ادھر ہماری سائیڈ پہ آکے شور شرابا نہیں کریں گے۔ گھر کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ میرے نیٹ سسٹم کو استعمال نہیں کریں گے۔ فریج سے چیزیں نکال کر مزے سے نہیں کھائیں گے۔ میری امی سے فرمائشی کھانے نہیں بنوائیں گے۔ نہ مجھ سے آؤٹنگ پہ لے جانے کی ضد کریں گے' ہوں بولو؟ منظور ہے؟" ایک بھرپور جتانے والی مسکراہٹ لبوں پہ سجائے وہ چیلنجنگ انداز میں پوچھ رہا تھا اور خوباں زمین پہ پڑے بیٹ کو اٹھا کر اس کے لمبے چوڑے وجود پہ دے مارنے کی خواہش کو بدقت دل میں دباتے ہوئے خون کے گھونٹ بھر کر رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

بادل صبح سے کسی پرانے قرض خواہ کی طرح ڈٹ کر کھڑے تھے۔ سہ پہر کے وقت شمال کی جانب سے آنے والی ہواؤں نے ذرا سا گدگدایا تو کھلکھلا کر برس پڑے۔ موسم ایک دم دلفریب اور سہانا ہوگیا تھا۔ معاً" چاچا امین والی سائیڈ سے اشتہا آمیز خوشبوئیں آنے لگیں۔

"آخاہ! چاچی تو سوجی کا حلوہ بھون رہی ہیں۔" رزم نے ایک لمبی سانس کھینچی' پھر مزے سے بولتے ہوئے باہر کی جانب لپکا۔

"کوئی ضرورت نہیں چاچی کی طرف جانے کی۔" کڑک آواز میں بولتے ہوئے اس نے رزم کو ٹھٹک کر رک جانے پر مجبور کردیا تھا۔

"میں خود تمہیں سوجی کا حلوہ بنا کر کھلاتی ہوں۔" وال کلاک میں سیل لگاتے ہوئے وہ حتمی انداز میں بولی تھی۔

"مگر آپی! حلوہ کھانے کا مزا تو بلال' مغیث لوگوں کے ساتھ آتا ہے۔" رزم منہ بسور کر بولا۔

"میں نے کہہ دیا نا' حلوہ تو کیا پانی کا گھونٹ بھرنے بھی ادھر نہیں جاؤ گے۔ صرف تم نہیں بلکہ صفی' شایان' وردہ' حسن کوئی بھی ادھر گیا تو گردن مروڑ دوں گی میں سب کی۔" کہتے کہتے دانت کچکچائے تھے۔

"کیسے جتا جتا کے موصوف کہہ رہے تھے نہ آئیں گے' نہ کھائیں گے' نہ کھیلیں گے۔" اس کے حلق تک کڑواہٹ بھری ہوئی تھی اس دن کے ٹاکرے کے بعد۔

"دماغ تو نہیں چل گیا تمہارا! کیوں بھائی کو روک رہی ہو۔" اماں نے اسے گھرکا۔ "نہ فرق' نہ تمیز' تو پھر کیوں نہ چاچے کے گھر جا کر سوجی کا حلوہ کھائے۔ تم پیڑے بنالو۔ ابھی ان کے بچے ادھر آکے کھالیں گے۔ کوئی تفریق تھوڑی ہے۔ ایک ہی گھر کے پلے بچے تمہاری دھونس میں آکر بھلا بیٹھ جائیں گے۔"

"وہی تو اماں! نہ یہ جائیں نہ وہ آئیں۔ ان کی آنی جانیوں سے میری جان عذاب میں پڑی ہوئی ہے۔ صبح رگڑ رگڑ کر پونچھا مارا' مگر چاچا کے ارسلان نے آئس کریم کھاتے ہوئے سارا فرش گندا کردیا۔ دوپہر کا کھانا اپنے حساب سے بنایا' مگر ان سب کو قورمہ پسند آیا تو روٹیاں کم پڑ گئیں۔ مجھے پھر سے آٹا گوندھ کر پھر روٹیاں بنانی پڑیں۔ کتنے خوب صورت لگ رہے تھے گملے میں پھول۔ اس وکی کے بچے نے گملا توڑ دیا۔ اماں میں تھک گئی ہوں۔ ان شیطان بچوں کے بکھرے کام سمیٹ سمیٹ کر۔" بولتے بولتے وہ روہانسی ہوگئی تھی۔

"تو بیٹا! تو نہ کڑھا کر۔۔۔ تیرے بہن' بھائی بھی تو تیرے چاچا والی سائڈ پہ یہ ہی کچھ کرتے ہیں۔ تیری چاچی تو پیار محبت سے سب کچھ سمیٹ لیتی ہے۔ کبھی غصہ 'نہ شکایت۔۔۔"

"وہ کیا شکایت کریں گی۔ ان کے صاحب زادے جو ہیں جتانے اور سنانے کے لیے۔" وہ کلس کر بولی۔

"ہاں ارتضیٰ' جیتا رہے۔ گھر کے بچوں میں محبت اور دوستی اسی کے دم سے تو ہے۔" اماں کے لہجے میں اس کے ذکر پہ شیرینی سی گھل گئی تھی۔

"گھر میں جو چیز لا رہا ہے۔ سب کے لیے ایک جیسی' کہیں سیر کرانے لے جا رہا ہے تو اپنے بہن' بھائیوں کے ساتھ ہمارے بچے بھی ساتھ میں لے لیے۔ اسکول کے استادوں سے ملنا' پڑھائی کی رپورٹ لینا' جیتا رہے' ورنہ تو کون سی دیورانیوں' جٹھانیوں کے بچے ہیں جو آپس میں لڑ جھگڑ کر بڑوں کے درمیان کشیدگی پیدا نہیں کر رہے۔ جس مشترکہ گھر میں جاؤ بچوں کی وجہ سے ناراضی' غصہ' قطع رحمی' اکثر گلی محلے میں سیانے' سمجھ دار محض بچوں کی وجہ سے باہم دست و گریباں ہیں اور ایک ہمارا گھر ہے۔ مثالی اور قابل تعریف جو سراسر ارتضیٰ بچے کی محبتوں اور دوستانہ رویے کی مرہون منت ہے۔" اماں کو موقع ملے اس کی تعریف کرنے کا۔ دو تین گھنٹے تو آرام سے کہیں نہیں جاتے پھر۔۔۔

"ہاں وہ ہی ہے میری تمام دردسری کا باعث۔۔۔ ورنہ میرے بس میں ہوتا تو کب کا یہاں کا یہاں اور وہاں کا وہاں کر چکی ہوتی۔" ہتھیلی پہ مکا مارتے ہوئے وہ بے بسی سے بولی۔

"کیا مطلب۔۔۔؟ تو بیچوں بیچ دیوار اٹھاتی؟ گھر کے دو ٹکڑے کرتی؟" اماں کی تیوری چڑھی تھی۔

"ہاں بالکل۔۔۔ جب چولہے دو جل رہے ہیں تو صحن بھی تو دو ہو سکتے ہیں۔" وہ بے خوفی سے بولی۔

"ناممکن' ایسا۔۔۔ کبھی نہیں ہو سکتا۔ تیرا ابا اور چاچا بس دو ہی بھائی۔۔۔ ان میں بھی تفریق ہو؟ دلوں میں محبتیں ہوں' رویوں میں عزت ہو' تو ایسی خواہش کوئی بدخواہ بھی نہ پالے جو تو پال رہی ہے اور تو بھی اپنے دل میں وسعت پیدا کر۔۔۔ مزاج میں نرمی لا۔۔۔ زبان کو مٹھاس سے تر کر۔۔۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جلنا کڑھنا چھوڑ دے۔ ساری زندگی تو نے یہیں بتانی ہے۔ اسی گھر میں۔ ان ہی رشتوں کے درمیان۔۔۔"

وہ جو جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی' اماں کی بات پہ تھم سی گئی۔

"کیا مطلب اماں!" اور پھر لمحوں میں ان کی بات کی تہ میں چھپے مفہوم کو سمجھتے ہی اس کے سارے حواس جھٹکا کھا کر رہ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼
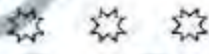
ماہی آوے گا' تے پھلاں نال دھرتی سجاواں گی
اونوں دل والے رنگلے پلنگ تے بٹھاواں گی

شوخ گنگناہٹیں لبوں پہ سجائے خوباں نے گھر کے کونے کونے کو خوب رگڑ کر چمکایا تھا۔ ساتھ میں اپنا چہرہ بھی۔۔۔ بھنوؤں کی کمانیں تیکھی کیں۔ شوخ گلابی ڈیزائنر کاٹن کے سوٹ کے ساتھ گلابی گلوس سے لبوں کو تر کیا۔ آخر کو اماں کی امیر کبیر کزن قندیل آنٹی اپنے دیور کے لیے اس کا رشتہ لے کر آ رہی تھیں۔ پسند تو اسے خاندان کے کسی فنکشن میں کر چکی تھیں' مگر آج تو باقاعدہ طور پر رشتہ لے کر آئی تھیں۔ یہ لمبی سیاہ چمکتی کار میں۔۔۔ کیا کیا اہتمام نہیں کر ڈالا تھا خوباں نے۔۔۔ قورمہ' بریانی' مکھن چکن' کسٹرڈ سب کچھ دل اور لگن سے بنایا اور شرمگیں اداؤں سے قندیل آنٹی کے پہلو میں بیٹھ کر ایک ایک چیز بڑے اصرار و محبت سے انہیں پیش کی۔

"آنٹی! یہ سب کچھ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے آپ کے لیے تیار کیا ہے؟" اماں کو اس موقع پر اس کے سگھڑاپے و ہنرمندی پر روشنی ڈالنی چاہیے تھی' مگر کیا کیجیے وہ ایسی بے نیازی بنی بیٹھی تھیں کہ ناچار اسے ہی اپنے لیے تعریفی پیراگراف پڑھنا پڑ گیا تھا۔ قندیل

آنٹی کی خوش اخلاقی تو دل کی خوش فہمی کو پنکھ لگا کر اڑائے جارہی تھی مگر کھانا کھاتے بلکہ چکھتے ہوئے ان کے تاثرات ہرگز بھی حوصلہ افزا نہ تھے۔ خیر الوداعی مصافحہ خوب بھینچ بھینچ کر کیا گیا۔ (صرف اس کے ساتھ) مگر دروازے پہ کھڑی اپنی سیاہ چمکتی کار کا حشر دیکھ کر قندیل تو قندیل خود خوباں بھی چکرا کر رہ گئی تھی۔ کار کے بونٹ پر لمبی لمبی کھرونچیں پڑی ہوئی تھیں۔

"گاڑی کے ساتھ کس نے اتنا بہیمانہ سلوک کیا ہے؟ کس نے اپنی موت کو آواز دی ہے؟" دو چار تھپڑوں سے اس نے لمحوں میں بچوں سے سچ اگلوالیا۔

"ارتضیٰ بھائی جان نے کہا تھا کہ تم لوگوں کی ڈرائنگ بہت اچھی ہے۔ سادہ پیپر پر تو کچھ بھی بنانا آسان ہے۔ بونٹ پہ کچھ تخلیق کرکے دکھاؤ تو مانیں۔" صفی نے دہکتے گال پر ہاتھ رکھ کر روتے روتے کہا تھا۔

"ارتضیٰ امین! آئی ول کل یو...." غصے سے کھولتے ہوئے وہ اس کی تلاش میں چاچا والی سائڈ پہ آئی جہاں وہ بریانی کے بڑے بڑے لقمے مزے سے لیتا نظر آگیا۔

"واہ کزن! تمہارے ہاتھوں کے سواد کا جواب نہیں۔ واللہ مہمانان گرامی یقیناً" خوب سیر ہو کر کھانے کے بعد کچھ کھانا ساتھ میں بھی لے گئے ہوں گے۔" وہ اس کے غیظ سے سرخ پڑتے چہرے کو محظوظ کن انداز سے دیکھتے ہوئے تعریفی انداز میں بولا۔

"ہائیں! اسے کیسے پتا چل گیا کہ مہمانوں نے کھانا اچھی طرح نہیں کھایا۔ صرف چکھ کر چھوڑ دیا اور یہ اس وقت کھا بھی میرے ہاتھوں کی پکی بریانی رہا ہے۔" اس کے ذہن میں کچھ غلط ہونے کا سگنل بجا تھا۔ فوراً" الٹے قدموں کچن میں لوٹی۔ چپ چاپ پرسکون تاثرات کے ساتھ سارے کھانے چکھے 'نمکین فروٹ کسٹرڈ' مٹھی بھر نمک سے زہر بنا قورمہ.... "اخ تھو...." "یہ کھانا تو اس نے نہیں بنایا تھا۔"

"اماں!" وہ حلق پھاڑ کر چلائی تھی۔ "آج فیصلہ ہو کر رہے گا کہ اس گھر میں یہ ذلیل شخص رہے گا یا پھر میں۔" مارے غضب کے اس کے سرخ چہرے سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔

"اس کڑکتی دوپہر میں تم کہاں جاؤ گی؟" اماں کو یوسفی صاحب بروقت یاد آئے تھے۔ ادھر خوباں نے اپنے بال دونوں مٹھیوں سے بھینچ ڈالے' حالانکہ خواہش اس وقت ارتضیٰ کے بال کھینچنے کی ہو رہی تھی۔

"قندیل آنٹی نہیں تو نا سہی۔ امید پر دنیا قائم ہے۔ خوش شکل ہوں۔ اچھا پکا لیتی ہوں۔ بچپن سے گھر سنبھالتی آئی ہوں۔ اپنے مستقبل کی چنداں فکر نہیں' بس اس منحوس انسان کی شکل مجھے نہیں دیکھنی۔ قندیل آنٹی! بے چاری کا اتنا نقصان کردیا اس گھٹیا انسان نے۔" بولتے بولتے اس کے گلے کی رگیں پھول گئی تھیں۔

"قندیل کے ساتھ تو خوب ہوا۔ بڑی آئی شوباز.... ہماری ایسی گاڑی' ہماری ویسی گاڑی۔ جیسے ہم نے تو کبھی گاڑی دیکھی نہ ہو.... ہونہہ...." اماں نے نخوت سے سر جھٹکا تھا۔

"ہاں تو کہاں سے دیکھ لی آپ نے ایسی سپر لگژری کار؟ ساری زندگی تو ابا کے ساتھ اسکوٹر پر سفر کیا۔" اسے اماں کی یہ بے نیازی پسند نہ آئی۔

"اتنی لمبی حیاتی میں کوئی گاڑی نہیں دیکھی۔ گھر کے سامنے' بازاروں میں' ٹی وی میں ہزار دفعہ گاڑیاں دیکھی ہیں اور تو کس خوشی میں دوڑ دوڑ کر قندیل کی خاطر تواضع کررہی تھی۔ ہماری طرف سے صاف انکار ہے۔ بقرہ عید کے تیسرے دن تیرے ابا کا تجھے ارتضیٰ کے ساتھ وداع کرنے کا ارادہ ہے۔ تو اپنا ذہن بنالے۔" اماں کا انداز حتمی اور دو ٹوک تھا۔

"اماں! تیری اور چاچی کی پلٹن کی غلامی مجھ سے ساری عمر نہیں ہو گی۔ ہر وقت چخ چخ' شور' ہنگامہ' زندگی میں ایک لمحہ یاد نہیں جو میں نے سکون سے گزارا ہو۔ ایک پرسکون' خاموش' قرینے اور سلیقے والا خوب صورت سا گھر میرا خواب ہے۔ جہاں کوئی ڈسٹربنس نہ ہو۔ کوئی اٹھا پٹخ نہ ہو۔ آپ اور ابا کا بکرے کے ساتھ ساتھ میری بھی قربانی کا ارادہ ہے گویا۔" وہ

نروٹھے پن سے بولی۔

"چلو یہ ہی سمجھ لو۔" اماں کا انداز ہنوز سابقہ تھا۔

☆ ☆ ☆

قندیل آنٹی اگلے ہفتے پھر ایک چمکتی دمکتی گاڑی کے ساتھ ان کے گھر آپہنچیں۔ اس دفعہ گاڑی کا رنگ سفید اور ہمراہ آسٹریلیا پلٹ اکلوتی نند شیریں تھی' جو دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کے چھوٹے لاڈلے بھائی کے لیے کون ساجوہر خاص تلاش کیا گیا۔"

"پچھلی بار کی اتنی عزت افزائی کے باوجود بھی دوبارہ آمد کی وجہ۔۔۔؟" اماں کو اچنبھا ہوا۔

"ڈیئر اماں! اسے کہتے ہیں دل کی سچی لگن اور مراد کو پانے کی جستجو۔ میں انہیں پسند آئی ہوں تب ہی تو سابقہ ہزیمت کا خیال دل میں لائے بغیر پھر آپ کی چوکھٹ پہ حاضر ہیں۔" اس نے خوشی سے جھومتے ہوئے اماں کو کندھوں سے تھام لیا تھا۔ فوراً" خوب صورت اور اسٹائلش سا نیلا اور گلابی کنٹراسٹ سوٹ نکال کر زیب تن کیا۔ غسل کے بعد لمبے سلکی گیلے بال سلجھا کر یوں ہی کھلے چھوڑ دیے تھے۔ ہلکی سی خوشبو میں خود کو بھگویا۔

"کوئی اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں۔ خواہ مخواہ کا خرچا۔ آج ذرا انکار کھل کر اور واضح طریقے سے کرتی ہوں۔" اس کی تیاریوں پہ چیں بہ چیں ہوتی' اماں نے رکھائی سے کہا تھا۔

"ہاں آج خود کچھ کک نہیں کرتی۔ بازار سے کچھ منگوالیتی ہوں۔ وہ خبیث انسان گھر پہ موجود ہے۔ نظر بچا کے کوئی بھی کمینگی کر سکتا ہے۔" صد شکر بچے اکیڈمی پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ سو ان کی طرف سے اطمینان تھا۔ مگر سامان منگوانے کے لیے بھی تو کوئی بندہ درکار تھا نا۔ وہ متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی ہوئی چاچا کے پورشن کی طرف چلی آئی۔ ارتضیٰ کہیں جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ کف کا بٹن بند لگاتے ہوئے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"وہ ہمارے کچھ گیسٹ آرہے ہیں۔ کچھ بیکری کا سامان اور پھل لادو۔" اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے سامنے دیوار پہ نظریں جما کے وہ بیگانگی سے بولی تھی۔

براؤن شلوار سوٹ میں ارتضیٰ کی بلند قامتی نمایاں ہو رہی تھی۔ سلیقے سے جمے بال' لباس سے اٹھتی مسحور کن خوشبو اور اس پہ مستزاد اس کی گھور سیاہ آنکھوں میں اس کے لیے جمع ہوتی توجہ و دلچسپی۔۔۔

"اچھا تو مہمانان گرامی کیا چیز شوق سے کھانا پسند کریں گے۔ وہ بھی بتا دو' تاکہ لینے میں آسانی رہے۔" خوش دلی سے بولتا ہوا وہ دو قدم آگے آیا۔ نظریں اس کے ترو تازہ صاف ستھرے مہکتے سراپے پہ جمی تھیں۔

وہ ہمیشہ اسے ایک ہی حلیے اور ایک ہی سراپے میں صبح شام نظر آتی تھی۔ میلے کچیلے کپڑے' الجھے بکھرے بال' ابھی ہاتھ میں جھاڑو' اور اگلے لمحے وائپر شڑاپ' شڑاپ' فرش کے ساتھ ساتھ بچوں کی بھی خوب دھلائی کرتی۔ ان کی شرارتوں پہ جلتی' کلستی' بڑبڑاتی' آرام سکون کی کمی' ہر وقت شور ہنگامے اور کام کی زیادتی پہ نالہ و فریاد بلند کرتی۔ مگر آج معمول سے ہٹ کر اتنی مختلف' منفرد اور دل آویز لگ رہی تھی کہ ایک اچھوتے' انوکھے اور دلفریب احساس نے ارتضیٰ کے دل و محسوسات کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ دل کی دھڑکنوں سے اٹھتی دھیمی دھیمی میٹھی سی تال ایک عجیب سی خواہش اس کے من میں جگائے جا رہی تھی کہ وہ اس سامنے کھڑے سراپا دل نواز کو کچھ دیر اور دیکھے۔۔۔ دیر تک دیکھے۔۔۔ اور وہ اس کے دیکھنے پہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتی ہوئی واپس چلی گئی۔

شام کے چار بجتے ہی بچوں کا ریلا ایک ساتھ گھر میں داخل ہوا تو گیٹ زور سے دھڑ دھڑایا تھا۔ جیسے بنیاد سے اکھڑنے کو ہو۔

"یا وحشت' بچے ہیں یا طوفان۔۔۔" کوفت سے بڑبڑاتے ہوئے اس نے خشک ہوتے بال پونی میں باندھے اور باہر نکل آئی۔ مہمان ابھی تک نہیں آئے تھے۔ اسے عجیب سی بے چینی نے آن گھیرا۔ باہر کے

منظر نے تو لمحہ بھر کے لیے اس کی بصارت اچک لی تھی۔ سارے بچے کچن سے برآمد ہو رہے تھے اور ہر بچے کے ہاتھ میں کھانے پینے کی کوئی نہ کوئی چیز تھی۔ کسی کے ہاتھ میں کولڈ ڈرنک کاٹن تو کسی کے ہاتھ میں برگر۔۔۔ ارتضیٰ نہ جانے کب سامان لے آیا تھا جس پہ بچوں نے ہلا بول دیا تھا۔

"کمینے، ذلیل، ناہنجار!" مارے دکھ کے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔ "تم لوگوں نے میرے مہمانوں کی خاطر کا سامان نہیں اڑایا، بلکہ اپنی شامت کو آواز دی ہے۔" غصے کی آندھی نے اسے بگولے کی طرح گھما دیا تھا۔ بھاگ بھاگ کر بچوں کو پکڑا۔ خوب تھپڑ جڑے، بال نوچے۔۔۔

"تا یہ ہم لوگوں کی دعوت کے لیے میں نے منگوائے تھے۔" وکی جس کے منہ میں برگر پھنسا ہوا تھا۔ خونخوار تیوریوں کے ساتھ اسے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر گھگھیاتا ہوا پیچھے ہٹا۔

"آپا! ہمیں تو ارتضیٰ بھائی نے کہا تھا کہ آپ کی اور ان کی شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی ہے۔ اس خوشی میں وہ یہ سارا سامان ہم بچوں کے لیے لائے ہیں۔" اس کی بے رحمانہ تاثرات والی آنکھوں میں سہمے سہمے انداز سے دیکھتے ہوئے وکی دیوار کے ساتھ لگی بانس کی سیڑھی سے جا لگا تھا۔

"ٹھہر تجھے بتاتی ہوں یہ کسی کی منگنی کی ضیافت تھی یا تمہاری موت کا اہتمام۔۔۔" دانت کچکچاتے ہوئے وہ وکی پر جھپٹی۔۔۔ وکی سیڑھی پہ چڑھا اور چڑھتا گیا۔ جان کو لالے جو پڑ چکے تھے۔ وہ بھی اس کے پیچھے لپکی۔ سر پہ خون سوار ہو چکا تھا۔ پاؤں سے دوپٹی چپل کب کی نکل چکی تھی۔ چوتھے قدمچے پر وکی تو نہیں البتہ اس کی ایک ٹانگ ضرور اس کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ ایک کندھے پہ ڈالا ہوا ریشمی سبک دوپٹا ہوا کی تندی سے پھڑپھڑاتا ہوا اڑا اور ساتھ والی منڈیر پر جا کر اٹک گیا۔

"اب بول۔۔۔ کس کی منگنی کی دعوت اڑائی ہے تم نے؟" زور سے ٹانگ کھینچتے ہوئے وہ زور سے چلائی تھی۔ وکی خود کو چھڑانے اور وہ کھینچنے میں مصروف۔۔۔

"خوباں!" ایک میٹھی، دھیمی اور دل نشین آواز اس کی پشت پہ ابھری تھی۔ بالکل میکانکی انداز میں پیچھے مڑ کر دیکھا۔ قندیل آنٹی میٹھی مسکان چہرے پہ سجائے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک بے حد قیمتی شارٹ امبر ائیڈڈ کرتے اور پینٹ میں ملبوس کوئی بے حد ماڈرن خاتون تھیں۔ جن کے چھوٹے چھوٹے بال سرخ رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ رنگ بے حد گورا اور چنی چنی آنکھوں میں حیرت ہلکورے لے رہی تھی۔

"ہاہ! یہ لوگ آ بھی گئے۔" حیرت، صدمہ، دکھ نہ جانے کون کون سی کیفیات نے اسے سیڑھی پہ کھڑے کھڑے منجمد کر دیا تھا۔ نہ سر پر دوپٹا، نہ پاؤں میں چپل، ہوا سے الجھے بکھرے بال، پسینے سے تر بتر سرخ چہرہ۔۔۔ اماں مہمانوں کو اندر لے گئیں اور پھر شیالی دوپہر میں شام کا سلونا رنگ گھلا تو وہ بے جان قدموں سے چلتی ہوئی آئی اور عین صحن کے بیچ پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ چند لمحوں بعد چاروں اطراف میں مصروف عمل افراد خانہ نے خوباں رحیم کو زار و قطار روتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہتھیلیاں سرخ فرش پہ جمائے، سر جھکا کر وہ ٹپ ٹپ آنسو بہا رہی تھی۔ کسی میں اس کے قریب آنے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ ماسوائے دو مضبوط پیروں کے جو مضبوط چال چلتے ہوئے اس کے قریب آئے اور آ کر رک گئے۔

"اٹھو شاباش۔۔۔ جا کر منہ دھو لو۔۔۔ بچے تو بچے قربانی کے بکرے بھی تمہیں حیرانی سے دیکھ رہے ہیں۔" پچکارتا ہوا نرم، دوستانہ انداز۔۔۔ آنسو تو تھم گئے، مگر وہ ہنوز ساکت بیٹھی براؤن لیدر چپلوں میں مقید صاف ستھرے پیروں کو گھورتی رہی۔

"یقیناً" تمہارا دل اس وقت میرے سر کے گھنے بال نوچنے کو چاہ رہا ہو گا۔ اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے میرا چہرہ کھسوٹنے کی خواہش دل میں مچل رہی ہو گی۔ تو چلو پوری کر لو اپنی خواہش۔۔۔ کہتے ہوئے وہ سامنے جم کر بیٹھ گیا۔ نکالو اپنی کھولن، دکھاؤ اپنا غصہ۔۔۔" وہ چپ رہی تھی۔ "تمہاری قندیل آنٹی کی بدلی نند شیریں

صاحب کو ایسی لڑکی اپنے بھائی کے لیے بالکل پسند نہیں آئی جو محض کھانے پینے کی اشیا کی خاطر اپنے بہن بھائیوں اور کزنز کی پٹائی کر ڈالے.... ایسی لینگویج' ایسے ورڈز' نو نو بچوں کے سامنے بالکل یوز نہیں کرنے چاہئیں۔ ایسی لڑکی ہماری جنریشن کو کیا سکھائے گی جو گھر کے بچوں کو ایسے نیگیٹولی ٹریٹ کر رہی ہو۔" وہ شیریں کے الفاظ ... دہرا رہا تھا۔

"بس لڑکی نے تھپڑ مار دیا' بھاگم دوڑ میں دوپٹا و جوتی گم ہوئے تو لڑکی ٹوٹلی ریجیکٹڈ.... چہ چہ' پسند کا دائرہ اتنا سطحی اور محدود.... اور ایک ہم محبت کرنے والے..... ہماری محبتوں کی وسعتوں کو بھلا کون ناپ سکا ہے۔"

"محبت؟" خوباں نے چونک کر کافی دیر سے جھکا ہوا سر جھٹکے سے اٹھایا تھا۔

"ہاں محبت' جو میں نے تم سے بے حد و بے حساب کی ہے۔ آج سے نہیں روز اول سے....." وہ اس کی سُرخ شناک آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گہرے لہجے میں بولا تھا۔ "بڑوں کی خواہش اور ارادے سے قبل ہی مجھے محبت کی دلفریب خوشبو نے اپنے حصار میں لینا شروع کر دیا تھا۔ ہاں البتہ اس خوشبو کی لپٹیں تم تک کبھی شاید اس لیے نہ پہنچ سکیں کہ تم بچوں کی شرارتوں' کام کے بکھیڑوں کی دھن کے دھوئیں میں ہی چھپی رہتی تھیں۔"

ایک تو لفظ محبت اور سامنے والے کا جان لیوا حد تک دل نشین اظہار' وہ دل کو بگٹٹ بھاگنے سے کیسے روکتی۔ کم بخت پہلے جو اظہار محبت کرتا تو کم از کم بچوں کے دیے دکھ تو جھیلنے میں آسانی ہوتی۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔

"اور قربان جائیے اس محبت کے' جس کے صدقے محبوب کے سب ظلم وجود معاف' ہر خطا سر آنکھوں پہ.... جان سے عزیز بہن' بھائی پٹ رہے ہیں۔ ان کے معصوم سے گال سُرخ کیے جا رہے ہیں۔ بال نوچے جا رہے ہیں' مگر کوئی حرف شکایت زبان پہ نہیں۔" بولتے بولتے ارتضیٰ شریر ہوا تھا۔

"ہونہہ معصوم! مجھ سے پوچھو ان معصوموں نے میری زندگی کس حد تک اجیرن کر رکھی ہے۔ ناک تک عاجز کر رکھا ہے مجھے۔" وہ ایک دم سے تڑخ کر بولی تھی۔ "آخر ہونا ان شیطانوں کے ٹولے کے بڑے بھائی' سائیڈ بھی ان ہی کی لو گے۔" ارتضیٰ بے ساختہ ہنس دیا تھا۔

"یار! کیوں ان بچوں کی شرارتوں کو دل پہ لیتی ہو۔ ہنستے بستے گھروں میں سو بکھیڑے ہوتے ہیں' پھر انہیں ہنسی خوشی سمیٹ بھی لیا کرو۔ ہم دونوں کے مشترکہ بہن بھائی ہیں۔ ذرا پیار و محبت سے ڈیل کرو تو دیکھو میری طرح یہ تمہارے بھی گن گاتے نظر آئیں گے اور ویسے بھی تمہاری یہ ٹینشن بالکل بے جا ہے کہ بچے ساری زندگی یوں ہی بچے بنے تمہارے لیے پرابلمز کھڑی کرتے رہیں گے۔ نہیں' یہ بھی ایک دن بڑے ہوں گے۔ سمجھ اور شعور آ جائے گا۔ پھر کاہے کی پریشانی....." وہ بڑے میٹھے اور دلنشین انداز میں اسے سمجھا رہا تھا' قائل کر رہا تھا۔ خوباں کا سر بے توجہی میں اثبات میں ہل گیا تھا۔

"ویسے ایک ٹینشن اور بھی ہے...." کان کی لو کھجاتے ہوئے وہ بولا۔

"وہ کیا؟" خوباں کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"تمہیں بچوں کی شرارتیں بری لگتی ہیں' مگر جب میرے اور تمہارے اماں ابا کی اولاد جوان ہو رہی ہو گی تو اس وقت تو ہمارے اپنے ذاتی بچے بھی تو اس گھر میں ان ہی چاچاؤں اور ماموؤں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ضرور تمہیں دق کریں گے۔" بولتے بولتے ارتضیٰ کا لہجہ گمبھیر اور شریر ہوا تھا۔ نظریں اس کے سُرخ چہرے پہ ٹکی تھیں۔

"بدتمیز نہ ہو تو... بے شرم..." چہرے پہ اچانک در آنے والی حیا کو چھپانے کی خاطر خوباں نے رُخ دوسری طرف موڑ لیا۔ پھر چلا کر بولی۔ "رزم! اس بکرے کو روکو' جو رسی تڑوا کر گھاس گھسیٹتے ہوئے ہماری سائیڈ پہ آ رہا ہے۔ اف اس کی مینگنیاں...."

سویرا فلک

دماغ پر لاکھ زور دینے کے باوجود بھی اسے خاک بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر عمو آپا کو اس سے یہ ازلی قسم کا بیر کیوں تھا اور وہ اس سے پورے پانچ سال بڑی ہونے کے باوجود اس بڑے پن کا عملی ثبوت دینے کے بجائے نا صرف اپنے بڑے ہونے کا اسے خوب احساس دلاتیں بلکہ مکمل فائدہ بھی اٹھاتیں۔ کبھی کبھی عمو آپا اسے کسی سیاست دان کی طرح دکھائی دیتیں جو انتہائی مہارت سے اپنے مہرے چلتے ہیں اور پھر بھی اپنے اوپر معصومیت کا خول چڑھائے رکھتے ہیں۔ قلق تو اسے یہ بھی تھا کہ اماں جان صحیح اور غلط کا فرق جانے کی تصدیق کیے بنا صرف عمروں کے فرق کے باعث عمو آپا کو سچا اور درست اور اسے جھوٹا اور غلط ثابت کر دیتیں اور کبھی جو وہ احتجاجاً "آوازِ حق بلند کرنا بھی چاہتی تو اماں اپنا خالص اماں پن دکھاتے ہوئے یا اسے گھوریوں سے نوازتے ہوئے صاف صاف کہہ دیتیں۔

"بات سنو فاریہ بی بی! مجھے نہ سکھاؤ کیا غلط ہے کیا صحیح۔ میری بھی آنکھیں ہیں۔ عمارہ گھر کی بڑی بیٹی ہے اور وہ عمر میں بھی تم سے بڑی ہے۔ اس لیے اس کی بات ماننا اور اس پر عمل کرنا تم پر فرض ہے۔"

"لو جی کر لو گل!" اور جو کبھی اماں کی ممتا اس کے آنسو دیکھ کر جاگ جاتی تو وہ اسے سینے سے لپٹا کر جسمانی طور پر اپنے قریب تو کر لیتیں، مگر دل ان کا عمو آپا کی حمایت میں دھڑکتا رہتا۔

"ارے میری گڑیا رانی۔۔ نہ میں تمہاری دشمن ہوں، نہ وہ۔ اب دیکھو وہ تم سے بڑی ہے۔ سمجھ دار ہے جو کہتی ہے تمہارے بھلے کے لیے ہی کہتی ہے تم ہی بلاوجہ دل میں بغض لیے بیٹھی ہو۔"

اور وہ چاہ کر بھی اماں کو سمجھا نہیں پاتی کہ دل اور دماغ تو اللہ نے اسے بھی عطا کیے ہیں، جب ہی تو وہ عمو آپا کی دہری چالوں کو سمجھ جاتی ہے، بس اس کا مزاج عمو آپا کی طرح دو دھاری تلوار نہیں تب ہی تو وہ عمو آپا کے تابڑ توڑ حملوں کا جواب نہیں دے پاتی، مگر اس نے خود کو "رانی" جان کر اور اماں کی عدالت کو "نقار خانہ" تسلیم کر کے خاموشی کا سبق یاد کر لیا۔ مگر عمو آپا نے اپنی روش نہیں چھوڑی تھی۔ کیونکہ وہ کسی موقع کو ہاتھ سے گنوا کر اس کی نظروں میں چھوٹی بننا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ لاکھ دامن بچا کر نکلنا چاہتی، مگر عمو آپا کا نشانہ تھا کہ چوکتا ہی نہیں تھا۔ ابھی کچھ دن پہلے کی بات ہے وہ ٹی وی پر کوئی من پسند ڈراما دیکھنے میں مگن تھی کہ عمو آپا اس کے سر پر آپہنچیں۔

"فاریہ! ابا آگئے ہیں۔ ذرا ان کو دو گرم روٹیاں تو ڈال دو۔"

"آپا تمہیں پتا ہے میں بس یہ ہی ایک ڈراما دیکھتی ہوں۔ یہ میری پسندیدہ ڈائجسٹ رائٹر کا ڈراما ہے۔ تم ابھی روٹی ڈال دو۔ وعدہ۔ تمہارے رات کے برتن بھی میں دھو دوں گی۔" اس نے ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے لجاجت بھرے لہجہ میں منت کی۔

"میں ضرور ڈال دیتی، مگر اماں کا ذرا بی پی ہائی ہو رہا ہے تو میں ان کے سر میں تیل ڈالنے جا رہی ہوں۔ تم ریپیٹ میں دیکھ لینا۔" عمو آپا تو عمو آپا تھیں۔ کہہ کر نکل گئیں اور وہ لب بھینچتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور بجھے دل کے ساتھ روٹی ڈالنے کچن میں چلی آئی۔ اسے قسط نکل جانے کا افسوس تو تھا کیونکہ جب دوبارہ قسط نشر ہوتی تو اس وقت وہ خود کالج میں ہوتی تھی۔ ساتھ ہی

یہ دکھ بھی تھا کہ ہر بار اسے عمو آپا کی ہی کیوں ماننی پڑتی تھی۔ اسی سوچ کے ساتھ اس نے ایک چولہے پر لوکی گوشت کا سالن گرم کیا اور جلدی جلدی دو روٹیاں ڈال کر چنگیری میں رکھیں اور پھر کھانا ٹرے میں لگا کر تخت پر بیٹھے ابا کے پاس چلی آئی۔
"جیتی رہو میری پیاری بیٹی۔۔۔" ابا نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی تو اسے لگا کہ اس کے دل کی ساری کلفت دھل گئی اور اس نے دل ہی دل میں خود کو گھُرکا۔ ڈرامے کا کیا ہے۔ وہ تو آتے ہی رہتے ہیں، مگر ابا کی یہ دل سے نکلی دعا کس قدر انمول ہے، شکر خدا کہ وہ اس دعا سے محروم نہ تھی۔ پھر اسے اماں کا خیال آیا تو وہ اٹھ کر اوپر کی منزل کی جانب چلی گئی،

جہاں اماں اور ابا کا مشترکہ کمرے تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو حیران رہ گئی۔ اماں سلائی کر رہی تھیں۔

"اماں! آپ کی طبیعت خراب تھی تو آپ آرام کرتیں نا۔" وہ ان کے برابر میں جا بیٹھی تھی۔

"ائے ہائے مجھے کیا ہو گیا۔ میں ٹھیک ہوں اللہ کے کرم سے.... یہ عمو کی قمیص سی رہی تھی۔ اس کی دوست فرح کی بہن کی شادی ہے نا پرسوں' تو فرمائش کر کے خاص ڈیزائن بنوایا ہے مجھ سے.... کوئی رسالہ لائی تھی۔ وہاں الماری میں رکھا ہے۔ تم بھی دیکھ لو کوئی پسند ہو تو تمہارا ابھی سی دوں۔" اماں نے حسب عادت بنا پوچھے ہی سب تفصیل بتا دی۔ وہ یوں ہی تفصیلی گفتگو کرنے کی عادی تھیں۔

"آپا کہاں ہیں؟" اس نے دل میں آئے شبہے کی تصدیق کرنا چاہی۔

"وہ فرح کے ہاں ڈھولکی ہے وہاں گئی ہے اور وہاں اسے دیر ہو جائے گی۔ تم ذرا برتن دھو لینا رات کے۔ میں یہ سلائی ختم کر کے نماز پڑھ کر سو جاؤں گی۔ فرح اور اس کا بھائی چھوڑ جائیں گے عمو کو۔" اماں اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے واپس سلائی میں جت گئیں' وہ ہمیشہ کی طرح صرف کلس کر رہ گئی۔ کیونکہ اماں کے آگے دکھڑا رونا بے سود تھا' وہ اسے کام چور کے القابات سے نواز دیتیں' سو وہ چپ چاپ اٹھ کر واپس کچن میں آ گئی اور سنک میں بھرے برتن دھونے لگی۔

☼ ☼ ☼

موسم بدل رہا تھا۔ اماں کے جوڑوں کا درد بھی زور پکڑ رہا تھا۔ شام کی خنکی سرما کی آمد کا پتا دے رہی تھی۔ ایسے میں اماں نے دونوں بہنوں کو موسم کے حساب سے کپڑوں کی شاپنگ کے لیے بھیج دیا۔ عمو آپا تو ویسے بھی شاپنگ کی دلدادہ تھیں۔ البتہ اسے افسوس ہوا کہ وہ کیوں چلی آئی' کیونکہ ہمیشہ کی طرح اور ہر بار کی طرح عمو آپا کو اس کی پسند کی ہوئی ہر شے عیب دار نظر آ رہی تھی۔

"خدا کو مانو فاریہ.... تمہیں تو بالکل کپڑے کی پہچان نہیں۔ اف کس قدر واہیات کلر ہے یہ اور فلاں رنگ تو تم پر سوٹ ہی نہیں کرے گا۔" جیسے جملے کہتے کہتے آخر انہوں نے اس کی پسند کو سرے سے پس پشت ڈال دیا اور اپنی پسند کی شاپنگ سے شاپنگ بیگز بھر لیے۔

"ارے عمو بیٹا یہ تو بہت مہنگے کپڑے ہیں۔ کراچی میں کون سا پورا سال سردیاں رہتی ہیں اور اتنے سوئیٹر کیوں لے لیے' اتنے تو تم لوگ استعمال کرنے والے بھی نہیں۔" ابا نے تین تین سوئیٹر اور دو دو سوٹ دیکھ کر استفسار کیا تو وہ بول اٹھی۔

"میں نے آپا سے کہا تھا کہ اتنے مہنگے کپڑے نہ لیں' مگر آپا کو تو ڈیزائنر سوٹوں اور کپڑوں کے علاوہ کچھ پسند ہی نہیں آ رہا تھا۔ جبکہ ایسے ہی کپڑے اور سوئیٹر عام دکانوں پر نسبتاً سستے تھے۔ ہم چاہتے تو پیسے بچا سکتے تھے۔" اس کا لہجہ گو کہ مدھم تھا' مگر جواباً عمو آپا کا وار کاری تھا۔

"رہنے دو فاریہ! تمہیں ابھی کپڑے کی کوالٹی کا پتا نہیں۔ ارے یہ سستے اور عام دکانوں والے سوئیٹر ایک سال بھی ساتھ نہیں دے پاتے۔ ارے ڈیزائنر سوٹ اسی لیے تو مہنگے ہوتے ہیں کہ کافی عرصہ چلتے ہیں۔ قیمت کی بھی خوب وصولی ہو جاتی ہے۔"

"بیٹا کیا ڈیزائنر سوٹ سونے کے تاروں کے بنے ہوتے ہیں جو ری سیل ہو کر قیمت کی وصولی ہو جاتی ہے۔" ابا نے مضحکہ خیز انداز میں عمو آپا کی تصحیح کرنا چاہی۔

"ارے میری عمو سمجھ دار ہے۔ وہ بڑی ہے۔ فاریہ ابھی کم عمر ہے' اسے ایسی باتوں کی سمجھ کہاں۔ لاؤ بیٹا' واقعی رنگ تو بڑے شان دار ہیں۔" اماں نے حسب روایت عمو آپا کو حق کی سند جاری کر دی تو ابا نے اور اس نے کھسک جانے میں ہی عافیت جانی اور عمو آپا فاتحانہ انداز میں پورے تفاخر کے ساتھ اماں کے پہلو میں جا گزیں ہو کر اپنی شاپنگ دکھانے لگیں۔

✡ ✡ ✡

"اللہ کا بڑا کرم ہے' اس نے میری عمو کو اتنا اچھا بر دیا۔" عمو آپا کے لیے ابا کے کزن کے بیٹے علی کا رشتہ آیا۔ جو اعلا تعلیم یافتہ تھا۔ صورت شکل میں بھی ہیرو سے کم نہ تھا اور اوپر سے ماں' باپ کا اکلوتا بیٹا اور ماں' باپ سال بھر قبل یکے بعد دیگرے گزر گئے تھے۔ اماں تو شکرانے کے نوافل ادا کرتے نہ تھکتی تھیں۔ عمو آپا بھی تقدیر کی اس مہربانی پر خوشی کے مارے کھلی جارہی تھیں۔ وہ بھی آپا کی خوشی میں بہت خوش تھی اور دل سے انہیں خوش رہنے کی دعا بھی دیتی تھی اور کیونکہ شکرانہ اللہ کو پسند ہے تو اماں کے نوافل اللہ نے ایسے قبول کیے کہ آپا کی رخصتی سے بھی پہلے ان کی منگنی میں ہی فاریہ کو اماں کی ایک پرانی عزیزہ نے پسند کرلیا۔ مگر وہ عمو آپا جتنی خوش نہیں تھی۔

"دیکھو فاریہ اب ہر ایک کی میری جیسی قسمت نہیں ہوتی کہ سسرال کے نام پر فقط ایک شوہر ہی ہو۔" ویسے تو عمیر بھی پڑھا لکھا بر سر روزگار ہے' اب تم سسرالیوں سے گھبرا کر انکار کروگی تو اماں' ابا کا موڈ تو خراب ہوگا۔ ساتھ میرے جیسی سسرال کے ارمان میں بیٹھی رہ جاؤ گی۔" جانے عمو آپا اسے سمجھا رہی تھیں یا ڈرا رہی تھیں۔ وہ بس اپنی بڑی آپا کو دیکھ کر اتنا ہی کہہ سکی۔

"میں جانتی ہوں آپا جس کی قسمت میں جیسا اور جتنا ہوتا ہے اسے اتنا ہی ملتا ہے۔ اس لیے میں ہرگز اپنے سسرالیوں کی موجودگی کی وجہ سے انکار نہیں کررہی' بلکہ میں دور نہیں جانا چاہتی اماں' ابا سے....."

"اوہو..... آج کل کے دور میں کراچی سے اسلام آباد کی دوری ہی کتنی ہے اور بے وقوف لڑکی اسکائپ اور وائبر کے دور میں تم کیا یہ بودے بہانے تراش رہی ہو۔"

"ارے ٹھیک تو کہہ رہی ہے عمو۔ روز بات کرلینا' دیکھ لینا ہمیں۔" اماں نے عمو آپا کی دلیل کو مضبوط لہجے میں مدلل ثابت کیا۔

"مشینیں کبھی بھی انسانی لمس و جذبات کا نعم البدل نہیں ہو سکتیں' مگر میں آپ کی خوشی میں خوش ہوں اماں۔ کیونکہ والدین کی رضامندی میں ہی اللہ کی خوشنودی ہے۔" وہ سر جھکا کر کہہ کر چلی گئی اور عمو آپا نے فخر سے گردن اکڑالی' کیونکہ دراصل ان کی دانست میں انہوں نے اپنے بڑے پن سے مسئلہ حل کردیا تھا۔

✡ ✡ ✡

سب سے بڑا استاد وقت ہے جو بڑے بڑے استادوں کو سکھلا دیتا ہے۔ سچا' جھوٹا' کھرا' کھوٹا سب سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔ یہی سب اس کی زندگی میں بھی ہوا۔ جب وہ پورے ڈیڑھ سال بعد اماں سے ملنے آئی۔ کیونکہ منے کی آمد کی خوش خبری دیتے ہوئے اسے ڈاکٹر نے یہ تاکید بھی کردی تھی کہ وہ سفر سے پرہیز کرے ورنہ اس کے سسرالی' ماں بیٹی کے رشتے

میں فاصلہ پیدا کرنے کے حق میں نہ تھے۔

اماں اتنے عرصے بعد بیٹی اور نواسے کو دیکھ کر بہت خوش تھیں۔ ابا کا بھی بس نہ چل رہا تھا کہ اتنی دور سے اتنے عرصے بعد آنے والی بیٹی اور نواسے پر اپنی محبت کے ساتھ اور کیا کیا نچھاور کر ڈالیں۔ اماں بھی اسے یوں خوش دیکھ کر سدا خوش رہنے کی دعا دے رہی تھیں۔

ایسے میں عمو آپا بھی اس کے آنے کی خبر سن کر دوڑی آئیں۔ آخر کو خون کا رشتہ تھا اور پھر اس سے لپٹ کر یوں روئیں کہ وہ انہیں سنبھالتے سنبھالتے خود بھی ہلکان ہو گئی، پھر جب ذرا دل کا غبار چھٹا تو دونوں مل کر بیٹھے اور وہ قدم قدم پر حیران ہونے لگی کیونکہ یہ وہ عمو آپا تھیں ہی نہیں جنہیں وہ چھوڑ کر گئی تھی۔

عمو آپا کا بدلا ظاہر، باطن اور خالی گود اسے بے حد متفکر کر رہی تھی اور آخر کار جب کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر اسے آپا کے ہمراہ اکیلے بیٹھنے کا وقت ملا تو منے کو گود میں سلاتے سلاتے اس نے پوچھ ہی ڈالا۔

"آپا! کیا بات ہے۔ آپ نے ڈاکٹر کو دکھایا۔ کیا حالت ہو رہی ہے آپ کی..... آپ خوش تو ہیں نا۔ اس قدر چپ چپ کیوں رہنے لگی ہیں؟" وہ ان کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ بہن کی محبت پر عمو آپا کی آنکھیں جھلملا گئیں اور وہ بھی شاید دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھیں سو بنا کچھ چھپائے اپنی ماں جائی سے دل کا تمام حال کہہ ڈالا۔

"فاریہ! ڈاکٹر کے مطابق مجھ میں کوئی فالٹ نہیں۔ لیکن علی کی نظروں میں عیبوں کا مجموعہ ہوں میں، کیونکہ علی جیسے پرفیکٹ دکھتے ہیں اسی قدر پرفیکٹ وہ اپنے اردگرد موجود ماحول کو بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ پھر چاہے وہ چیزیں ہوں یا انسان۔ انہیں ہر چیز جگہ پر چاہیے۔ وہ اپنے آگے کسی کی رائے کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ گھر میں ملازم ہونے کے باوجود وہ چاہتے ہیں کہ میں ان کا ہر کام خود کروں اور اتنے بڑے گھر کو جب میں ان کی مرضی کے مطابق نہیں رکھ پاتی تو انہوں نے کہہ دیا کہ جب میں چیزیں ڈھنگ سے نہیں برت سکتی تو ان کا بچہ بھی ڈھنگ سے نہیں پال سکوں گی۔ بہت چھوٹا کر دیا ہے انہوں نے مجھے اپنی نظروں میں اور شاید میں اسی قابل ہوں، کیونکہ اسی بڑے پن کے گھمنڈ میں، میں کیسے تمہیں ہر موقع پر نیچا دکھانے کی کوشش کرتی تھی۔" ندامت اور شرمساری سے ان کی آنکھیں اور چہرہ تر تھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ عمو آپا سے کچھ کہتی اماں جو عشاء کی نماز پڑھ کر سونے سے پہلے ایک نظر اپنے نواسے کو دیکھنے آئی تھیں اور آج پہلی بار عمو آپا کے دل کا حال فاریہ کی بدولت جان پائی تھیں، تڑپ کر اندر آئیں اور عمو آپا کو گلے لگا لیا۔

"میری بچی تو نے مجھ سے کیوں نہ کہا بیٹا..... کتنا پوچھا میں نے اس سے فاریہ۔ اگر یہ ہر وقت ایک جملہ کہہ کر مجھے چپ کرا دیتی کہ آپ کا وہم ہے۔ غلطی تیری نہیں میری بچی، میری ہے جو تجھے غلط صحیح کا فرق بتانے کے بجائے صرف تائید کو ہی صحیح عمل سمجھ کر کرتی رہی۔"

اماں کو اور بہن کو یوں تڑپتے دیکھ کر اس کا دل بری طرح بیٹھنے لگا، اس نے بیک وقت دونوں کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

"اماں یہ وقت غلطیوں کے اعتراف کا نہیں۔ ان غلطیوں سے سبق حاصل کرتے ہوئے ان کا نشان مٹانے کا ہے۔ میری آپا! عورت کا اصل مقام اس کے شوہر کا گھر ہی ہوتا ہے اور یہ گھر عورت کی قربانیوں سے ہی بنتا اور قائم رہتا ہے۔ تم خود کو بدل لو آپا! محبت کی خاطر، علی بھائی جیسا کہتے ہیں ویسا ہی کرو۔ تم یوں خود سے لاپروا ہو کر ان کے دل میں بچا کچھا مقام بھی کھو دو گی۔ یاد رکھو آپا! قربانی کا عمل صرف عورت کے حصے میں ہی آتا ہے اور میرا دل کہتا ہے کہ اس ایثار کا بدلہ تمہیں ضرور ملے گا۔" عمو آپا اور اماں حیرت سے اپنے سے چھوٹی فاریہ کو اتنی بڑی باتیں کرتے دیکھ رہے تھے۔

اسمل عزیز شہزاد

"دو دل مل رہے ہیں.... مگر چپکے چپکے...."

لاؤنج کے سفید اور کتھئی پرنٹڈ صوفے پر اطمینان سے براجمان ' ایک عالم جذب میں ڈوبا ' بے ڈھنگے انداز سے گٹار پکڑے ' وہ اپنی بے سُری اور بھونڈی آواز کا سُر بکھیرنے کی ناکام کوشش میں ہلکان تھا۔

ٹھیک اس کے سامنے والے سنگل صوفے پر

ناولٹ

بظاہر دلچسپی مگر درحقیقت کوفت زدہ سے انداز میں ہاتھوں کے پیالے میں اپنا خوب صورت چہرہ گرائے ایمن بڑے ضبط سے بیٹھی تھی۔

"سب کو ہو رہی ہے.... ہاں سب کو ہو رہی ہے خبر۔" آنکھیں بند کیے وہ جھوم رہا تھا تب ہی وہ اپنے کمرے سے خونخوار تاثرات سمیت برآمد ہوتی اپنی دادی محترمہ سلطانہ بانو کو نہ دیکھ پایا۔

انہیں اپنی جانب آتا دیکھ کر ایمن ہڑبڑا کر الرٹ ہوئی اور اس نے جھومتے جھامتے ایان کو متوجہ کرنے کی اپنی سی کوشش بھی کی تھی مگر بے سود.... کہ وہ "اور یجنل فنکار" دکھائی دینے کی کوشش میں نہ جانے سُرسنگیت کے کون سے بحر میں ڈوبا ہوا تھا۔

سلطانہ آئیں.... ایک ناراض سی نگاہ ایمن پر ڈالی اس سے قبل کہ آنکھوں کی ناراضی زبان تک پہنچ پاتی.... آن واحد میں ایمن وہاں سے کھسک لی۔ اب ان کا روئے مبارک اس عظیم فنکار کی جانب ہوا۔

"دو دل.... ہاں دو دل...."

"بھاڑ میں گئے دو دل۔" وہ دہاڑیں۔ "غضب خدا کا.... میں پوچھتی ہوں آخر کب ختم ہوگا تمہارا یہ بچپنا۔" وہ شدید طیش میں تھیں۔ دوپہر کا وقت ان کے آرام کرنے کا تھا اور اس وقت ایان کی تانیں....

"ارے! دادی آپ۔" جھٹ سے بڑی بڑی ساحر آنکھیں کھل گئیں ' کچھ بوکھلایا بھی ' مگر خود پر قابو پا کر گٹار کو سینے سے لگا ' بڑی متاثر کن جذباتیت سے گویا ہوا تو آواز سے عزم جھلکتا تھا۔

"یہ بچپنا نہیں.... میرا شوق.... میرا جنون ہے اور میں اسی شوق کو مستقبل میں اپنا پروفیشن بنانے کا ارادہ

رکھتا ہوں۔"

"بہت خوب۔۔۔ اور تمہارے باپ کا چھوڑا ہوا بزنس، اسے کون سنبھالے گا۔" وہ طنزیہ نگاہوں سے اسے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

"اُوفوہ دادی۔۔۔ مام ہیں نا۔" اس نے جیسے انہیں نا سمجھ جان کر اطلاع دی۔

"لیجیے دادی۔۔۔ یہ ٹھنڈا ٹھنڈا شربت صندل پیجیے۔۔۔ میں نے خاص آپ کے لیے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔" ایمن نے دادی کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی سعی کی۔

"ہاہاہا۔۔۔ شربت ہاتھوں ہی سے بنایا جاتا ہے۔۔۔ پیروں سے تو بننے سے رہا۔" ایان نے موقع کی نزاکت دیکھے بغیر اپنی علمیت جھاڑنی ضروری سمجھی۔ جواباً ایمن نے اسے سخت ملامتی گھوری سے نواز کر سر کے اشارے سے وہاں سے جانے کے لیے کہا تو جیسے وہ سب سمجھ کر وہاں سے کھسک لیا۔

سلطانہ جو "جیتی رہو میری بچی" کہہ کر شربت کا گلاس لبوں سے لگا چکی تھیں، شربت کا خالی گلاس ایمن کو تھما کر چونکیں۔

"چلا گیا؟" پھر کسی قدر سنجیدگی سے بولیں۔

"آج آنے دو اس کی ماں کو۔ کرتی ہوں اس کا کچھ علاج۔" اور ایمن نے معصومیت سے سر اثبات میں ہلا دینے پر اکتفا کیا۔ ایک مرتبہ پھر ایمن نے اسے بچا لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

مگر رات ڈائننگ ٹیبل پر پھر وہی موضوع اتفاقاً چھڑ گیا۔ اور ایمن چاہنے کے باوجود بھی موضوع تبدیل نہ کر سکی۔ بس یونہی ذرا سے چاول اپنے آگے رکھے، انہیں چمچے سے آگے پیچھے کرتی رہی۔

"بھئی ایان کو تو بلاؤ۔ کیا وہ کھانا نہیں کھائے گا؟" یہ سنجیدہ و بردبار شخصیت امجد علی تھے۔ ایمن کے والد۔ ایان کے تایا۔

"جو دن کے ایک بجے ناشتا کرتا ہو۔ اس کی تو ابھی دوپہر ہی سمجھو وہ کیا خاک رات کے آٹھ بجے کھانا کھائے گا۔ بس اٹھنے کے بعد سارا دن اول جلول حلیے میں وہ موا گٹار پکڑے، ہماری سماعتوں کا امتحان لیتا رہتا ہے۔ تابندہ میں تم سے پوچھتی ہوں آخر تم اپنے بیٹے کو اس کی ذمہ داریوں کا احساس کب دلاؤ گی؟" سلطانہ تو صبح سے منتظر ہی تھیں۔ تابندہ ازحد شرمندہ سی ہو کر وضاحت پیش کرنے لگیں۔

"اماں سب کچھ آپ کے سامنے ہی تو ہے۔ میں تو خود پچھلے ڈیڑھ سال سے اسے مسلسل سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اب تو میں خود اس کی لاابالی طبیعت سے عاجز آ گئی ہوں۔ آپ ہی بتائیں کیا کروں۔" وہ چمچہ چھوڑ کر سلطانہ کی شکل دیکھنے لگیں۔

"برا مت مانیے گا بھابھی۔ (تابندہ تھیں تو رشتے میں ان سے چھوٹی مگر وہ انہیں بصد احترام بجائے نام لینے کے بھابھی ہی بلاتے تھے) مگر اب اسے مزید ڈھیل دینا کسی طور مناسب نہیں۔ وہ جوان ہے۔ اپنی تعلیم مکمل کیے بھی اسے دو سال گزر چکے ہیں۔ پھر یہی تو مناسب ترین وقت ہے اپنا کاروبار سنبھالنے کا۔ ابھی سے کام شروع کرے گا تب ہی تو دو تین سال میں اسٹیبلش ہو سکے گا وہ۔" امجد سلاد کا پیالہ اپنے قریب کھسکاتے ہوئے اپنے مخصوص سنجیدہ و متین لہجے میں بولے۔ ماحول ۔۔۔ کچھ ناخوشگوار سا ہو چلا تھا تب ہی۔

"نام عبدل ہے میرا، سب کی خبر رکھتا ہوں۔" ہاتھ میں گرما گرم چپاتیوں کی چنگیر اٹھائے لہک لہک کر گنگناتا ہوا عبدل المعروف معصوم کچن سے نمودار ہوا۔ جس نے ہمیشہ کی طرح اپنے اچھے خاصے سراپے کی "درگت" بنا رکھی تھی۔ کاسنی موری بند جینز، پیلی ٹی شرٹ کہ جس پر بنے چاقو کی نوک سے لہو ٹپکتا تھا اور ٹپکتے لہو سے لکھا تھا "Kill Me"۔ کندھوں تک آتے تیل میں چپڑے بال (کہ جیل وہ افورڈ نہ کر سکتا تھا)۔ ہاتھوں کی کلائیوں میں سجے رنگ برنگے بینڈز۔ گلے میں موٹی سی کالی ڈوری سے لٹکتا نقلی نگینے جڑا دل کی شکل کا پینڈنٹ۔ وہ ان کے پرانے نوکر اشرف

الدین کا بیٹا تھا۔ بچپن سے یہیں تھا۔ اب شرف الدین تو ریٹائر ہو چکا تھا اس کی جگہ معصوم نے چارج سنبھال لیا تھا۔ اس نے لا کر بڑے اسٹائل سے چنگیر میز پر امجد کے عین سامنے رکھی۔

"میاں عبدل" امجد نے ایک روٹی چنگیر سے اٹھا کر بغور دیکھی "بہتر ہے کہ تم سب کی خبر رکھنے کے بجائے اپنے کاموں پر دھیان رکھا کرو۔" اور واپس چنگیر میں رکھ کر چاولوں کی جانب متوجہ ہو گئے۔

"سب کی خبر گیری بھی تو میرے فرائض منصبی میں داخل ہے حضور۔" وہ جھک کر ادب سے بولا۔ تو اس کے لب و لہجے پر نہ چاہتے ہوئے بھی سب کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

☼ ☼ ☼
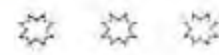
"وہ تو میں نے بروقت انٹری مار کر سب کی توجہ آپ پر سے ہٹا دی نہیں تو آپ کی پیشی ہو جانی تھی آج۔" اور اب وہ اپنی کار گزاری اپنے "پیر و مرشد" کے ساتھ ٹیرس پر پھسکڑا مارے ان کے گوش گزار رہا تھا۔ ایان نے اپنا گٹار پاس ہی لٹا رکھا تھا۔ رات بھیگ رہی تھی۔ شفاف چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ ماحول میں بھیگی گھاس کی باس رچی تھی۔

"کوئی بات نہیں۔" معصوم کی ساری بات سن کر اس نے تمکنت سے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے شاہانہ انداز سے کہا۔

"پہلے پہل دنیا عظم فنکاروں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا کرتی ہے۔ مگر تم دیکھنا۔ وہ دن دور نہیں جب یہی لوگ فخریہ ہر جگہ میرا حوالہ دیا کریں گے۔"

"اور وہ دن کم از کم تمہاری زندگی میں تو ہرگز نہیں آئے گا۔" عقب سے ایمن کی غصیلی آواز سنائی دی تھی وہ دونوں اچھل پڑے۔

"اور تم!" اس نے سامنے آ کر کڑے تیوروں سے یہاں وہاں "معصومیت" سے دیکھتے معصوم کو دیکھ کر دانت پیسے۔

"ڈیڈ ٹھیک ہی کہتے ہیں تم صرف نام کے ہی معصوم ہو۔ شکل سے پورے خبیث اور حرکتوں میں کسی پھاپھا کٹنی سے ہرگز کم نہیں ہو۔"

"میری تو کسی کو قدر ہی نہیں ہے یہاں۔ جا رہا ہوں میں کچن کی صفائی کرنے۔" وہ منہ بسورتے ہوئے اٹھ کر چمپت ہو گیا۔

"اور تم؟" اب وہ اس کی جانب متوجہ ہوئی جس کی خاطر یہاں چل کر آئی تھی۔

"ایان میں تم سے پوچھ رہی ہوں' آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

"مجھ سے پوچھتی ہو کہ کیا چاہتا ہوں؟" ایان نے بڑی گہری نظروں اور جان دار مسکراہٹ سے اسے دیکھا تھا۔

ایمن اس کے آن واحد میں بدلتے لہجے سے کچھ گڑبڑا سی گئی۔ سنجیدہ تاثرات کی جگہ کچھ گھبراہٹ، کچھ حیا نے لے لی۔

"ہم تمہیں چاہتے ہیں ایسے۔" وہ لیک جھپک اپنا گٹار سینے سے لگا کر شروع ہو چکا تھا۔ ایمن نے سخت بے بسی محسوس کی۔

☼ ☼ ☼

"اے موئے یہاں پڑی مٹی تجھے دکھائی نہیں دے رہی کیا؟" سلطانہ نے بے دلی سے فرش پر جھاڑو پھیرتے معصوم کو گھرکا۔

دن کی مخصوص مصروفیات جاری تھیں۔ امجد اور تابندہ آفس جا چکے تھے۔ ایمن چونکہ اپنا ماسٹرز مکمل کر چکی تھی اس لیے آج کل دوپہر کے کھانے بنانے کی ذمہ داری سلطانہ نے اسے سونپ رکھی تھی اور وہ یہ ذمہ داری بخوشی نبھا رہی تھی۔ ان کی جز وقتی ملازمہ زری نہیں آئی تھی سو آج معصوم کی ڈبل شامت آئی ہوئی تھی۔

"کہاں ہے مٹی؟۔ لگتا ہے آپ نے اپنی آنکھوں پر خورد بینی شیشے لگوا رکھے ہیں۔" وہ از حد بیزاری اور ناراضی سے بولا تو سلطانہ نے اسے جھاڑ کر رکھ دیا۔

"میری آنکھوں کو نظر مت لگا۔ گھر کا بنا خالص

سرمہ لگاتی ہوں اور تیری طرح آدھی آدھی رات جاگ کر فلمیں دیکھ کر اپنی آنکھیں نہیں پھوڑتی۔ چل، جلدی جلدی جھاڑو لگا۔ پھر میرے کمرے کی تفصیلی صفائی بھی کروانی ہے میرے ساتھ مل کر۔"

"دادی!" معصوم صدمے سے چور آواز میں احتجاجاً" چلایا۔ تب ہی اپنے مخصوص حلیے یعنی بدرنگی جینز جو بڑے اہتمام سے گھٹنوں سے پھاڑی گئی تھی۔ ٹی شرٹ کی آستینیں تقریباً" ندارد تھیں جس سے اس کے کسرتی بازو جھلکتے تھے۔ گلے میں وائٹ گولڈ کی موٹی سی زنجیر ہاتھ میں اسٹیل کا کف۔ جس پر اس کا نام کندہ تھا۔ کندھوں پر لہراتی زلفیں جنہیں ماتھے پر بینڈ لگا کر قابو کیا گیا تھا۔ سمیت ایان منظر کا حصہ بنا۔ منہ بسورتے معصوم نے ازحد متاثر نگاہوں سے اسے بغور دیکھا (کہ خود اس کا حلیہ ایان ہی سے مستعار لیا گیا تھا)۔

"خیر تو ہے، یہ آج سورج کدھر سے نکل آیا؟" سلطانہ بھی چونک گئیں۔

کہ وہ سحر خیز نہ تھا اور اس کی صبح بیداری عموماً" اس کے اپنے کسی کام سے ہوا کرتی تھی۔ پوچھنے کی دیر تھی وہ ایسے شروع ہوا جیسے اسے دعوت خطاب دیا گیا ہو۔

"آج کا دن میری زندگی کا یادگار دن بننے والا ہے۔ اس وقت تمہارے سامنے کھڑا ایان علی ایک عام انسان ہے۔ مگر میرا دعوا ہے کہ آج شام میں جب لوٹوں گا تب دنیائے میوزک کے افق پر میرا نام کسی روشن ستارے کی مانند جگمگا رہا ہو گا اور میں ایک راک اسٹار بن چکا ہوں گا۔"

"ارے واہ اچھا۔" معصوم کو بڑی معصوم سی خوشی ہوئی۔

"مگر ایان بھائی، رات میں آپ مجھے پہچان تو لیں گے نا؟ ایسا نہ ہو کہ آپ اسٹار بنتے ہی مجھ جیسے کم حیثیت آدمی کو بھول جائیں اور آپ اسٹار بن کر بدل جائیں۔" ہاتھ میں جھاڑو پکڑے وہ بہت تشویش سے پوچھ رہا تھا۔

"او پیدائشی کام چور۔" سلطانہ نے ایان کی بات کا تو کچھ خاص نوٹس نہ لیا البتہ معصوم کو لتاڑنا ضروری سمجھا۔

"تیرے خدشات ختم ہو گئے ہوں تو میرے کمرے میں چلا چل۔ یہاں کی جھاڑو تو دل چکی۔" وہ آگے بڑھنے لگیں۔

ایان ایک بردبار مسکراہٹ اپنے لبوں پر سجا کر متانت سے بولا۔

"فکر مت کرو معصوم۔ میں تمہیں کیسے فراموش کر سکتا ہوں۔ ایک تم ہی تو میرے فن کے قدردان، میرے برے دنوں کے ساتھی ہو۔ یہ تم ہی تو ہو جسے میری...."

"ختم کر دو اپنی تقریر میاں۔ ایسا نہ ہو کہ تم یہاں خالی خولی تقریریں کرتے رہ جاؤ اور وہاں تمہارے انتظار میں بیٹھے لوگ اٹھ کر چل دیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اسے ٹوک کر اندر بڑھ گئیں۔ معصوم نے ہڑبڑا کر تقلید کی۔ وہ کندھے پر گٹار لٹکائے باہر نکل گیا۔

پھر وہی ہوا جو آج تک ہوتا آیا تھا۔ جس لمحے وہ منہ اور کندھے لٹکائے لاؤنج میں داخل ہوا تمام افراد خانہ وہاں بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

اس کا بجھا انداز دیکھ کر سمجھ گئے کہ آج پھر اس کا دل ٹوٹ چکا ہے۔ جو بھی تھا اسے یوں اداس، ملول اور ہارا ہوا دیکھ کر سب ہی کو دکھ ہوا تھا۔ کیسے نہ ہوتا؟ وہ ان سب کے دل کی دھڑکن تھا۔ سلطانہ کے بہت پیارے چھوٹے بیٹے ساجد علی کی اکلوتی نشانی، جو بھری جوانی میں انہیں داغ مفارقت دے گیا تھا۔ وہ ہو بہو ان کی کاپی تھا۔ نہ بھی ہوتا تب بھی انہیں اتنا ہی پیارا تھا کہ جگر گوشہ تو بہرحال وہ ساجد علی ہی کا تھا نا۔

امجد علی اس کی پیدائش پر اپنی سات سالہ بے اولادی کا دکھ بھول گئے تھے۔ یہ الگ بات کہ چند سال بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں ایمن کی صورت رحمت سے نواز دیا تھا۔ مگر ایان کی حیثیت نہ بدلی تھی۔ ان کی بیگم فرحانہ بھی اسے سگی اولاد ہی کی طرح چاہتی، اس کے لاڈ اٹھاتی تھیں۔ پھر ساجد کے بعد تو جیسے امجد ہی کو اس کی براہ راست سرپرستی کرنا تھی اور انہوں نے کی

بھی۔ اور رہیں تابندہ۔ اس کے محبوب شوہر جب ان سے بچھڑے تو ایان ہی وہ سہارا تھا وہ جینے کا آسرا تھا کہ جس کی صورت دیکھ کر ان کے دل کی دھڑکن نے دوبارہ رفتار پکڑی تھی۔

اور ایمن۔

اسے خود ساجد نے ایان کے لیے مانگا تھا۔ شعور کی منازل طے کرتے ہوئے وہ دونوں اپنے مابین رشتے سے آگاہ ہوتے گئے۔ اور یہ رشتہ دل کے تاروں سے کب جڑا کچھ خبر نہ ہوئی بس خبر تھی تو اتنی کہ ایک دوسرے کے سنگ زندگی بتانے کا خواب دل کے ان ہی تاروں کو چھیڑ دیتا تھا اور ایک ایسا مدھر نغمہ تخلیق پاتا کہ دونوں مسحور رہ جاتے۔

☆ ☆ ☆

"گویا تم پھر مسترد کر دیے گئے؟"

ایمن اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلی آئی تھی۔ ایان جو گٹار کو غصے سے بیڈ پر پھینک کر خود بھی بیڈ پر اپنے لمبے بالوں میں انگلیاں پھنسائے بیٹھا تھا اس کے دلسوزی سے پوچھنے پر بھڑک اٹھا۔

"ہاں۔ انہوں نے میرا پورا گانا سنے بغیر ہی مجھے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ مجھ میں Singing (سنگنگ) کا ٹیلنٹ ہی نہیں۔ اور ساتھ ہی مفت مشورے سے بھی نواز دیا کہ بہتر ہے میں کوئی اور کام کروں۔"

"کہتے تو وہ ٹھیک ہی ہیں۔" بے ساختہ ہی ایمن کے لبوں سے نکلا تھا مگر دوسرے ہی پل اس کی خفگی سے گھورتی نگاہوں سے گھبرا کر وہ بات بدل کر بولی۔

"کہتے تو سب ٹھیک ہی ہیں کہ یہاں بنا سفارش کے کوئی کام نہیں بنتا۔ خیر دفع کرو ان قدر ناشناسوں کو۔ اور بتاؤ۔ تم نے آگے کا کیا سوچا ہے۔" وہ سامنے کرسی پر بیٹھ کر پوچھنے لگی۔ دل کو امید تھی لوہا گرم ہے۔ موقع بھی ہے اور محل بھی آج تو وہ اسے قائل کر کے ہی اٹھے گی کہ اب بہت ہو گیا آخر کب تک وہ اپنا قیمتی وقت بے کار ضائع کرتا رہے گا مگر۔

"سوچنا کیا ہے۔" اس نے ایک انداز بے نیازی سے ہیئر بینڈ بالوں سے نکال کر ان میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔

"اب میں ان سارے لوگوں کو اپنی Rejection (ریجکشن) کا جواب مارکیٹ میں دوں گا۔"

"کیا مطلب؟" وہ اچنبھے سے پوچھنے لگی۔

"مطلب یہ ڈیئر کزن کہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اب خود اپنی میوزک البم لانچ کروں گا۔" اس نے پراسراریت سے مسکرا کر کہا۔

"کیا؟" اور ایمن نئے صدمے سے دوچار ہو کر چلائی تھی۔

☆ ☆ ☆

زندگی اپنی مخصوص ڈگر پر رواں دواں تھی۔ گھر کے مکین اور ان کی روز کی مخصوص مصروفیات میں خلل انداز ہوا تھا واشنگٹن سے آنے والا وہ فون۔

جو ظاہر ہے وائٹ ہاؤس سے تو خیر نہیں آیا تھا مگر سلطانہ نے گھر میں کچھ ایسی ہی ایمرجنسی نافذ کر رکھی تھی گویا کہ امریکی صدر ان کے ہاں قیام کرنے کے ارادے سے آ رہا ہو۔

قصہ کچھ یوں تھا کہ سلطانہ خاتون کی بھانجی نمبر تین امریکہ بیاہی گئی تھیں۔ جب بچہ چھوٹا تھا تو پاکستان کے چکر بھی لگ جایا کرتے تھے بعد میں اس کی تعلیمی مصروفیات نے ان متواتر لگتے چکروں کو توڑا۔ بعد میں جب ان کی والدہ دردانہ بانو اس دنیا سے کوچ کر گئیں تب وہ پاکستان کو جیسے بھلا ہی بیٹھی تھیں۔ کچھ سال پہلے آئیں تو سلطانہ بانو ہی کے ہاں ٹھہری تھیں۔ اور اب ان کا بیٹا داؤد ابراہیم ان کے گھر کو رونق بخشنے آ رہا تھا۔ کہ اچانک ہی اس کے دل میں بقرعید پاکستان میں منانے کا خیال در آیا تھا۔ خیال اسے آیا تھا اور جان معصوم کی عذاب ہوئی تھی۔

"دیکھ معصوم۔ اگر تو نے مہمان خانے کی صفائی میں ذرا جو ڈنڈی ماری نا، تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔"

سلطانہ لاؤنج کے صوفے پر براجمان تسبیح پڑھتے ہوئے مہمان کی آمد کی تیاریوں کے سلسلے میں کیے جانے والے کاموں پر نظر رکھے ہوئے تھیں۔ معصوم جو جھاڑن اٹھائے گیسٹ روم کی جانب بڑھ رہا تھا' منہ بسور' پیر پٹخ کر بولا۔

"کیا ہے دادی۔ آپ نے تو سب کو ایسے الرٹ کر رکھا ہے جیسے امریکہ سے بش تشریف لا رہا ہو۔"

"اوفوہ۔" کچن سے نکلتی ہوئے ایمن اس کی بات پر بے ساختہ ہنس کر بولی۔

"امریکہ کا صدر اب بش نہیں' اوبامہ ہے اور اس بات کو بھی زمانے گزر چکے ہیں۔"

"بش ہو یا اوباما۔ ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو دادی کو کہہ رہا ہوں کہ ہتھ ذرا ہولا رکھیں' کام کروا کروا کے جان نکال دی ہے۔" وہ روہانسی آواز میں بولا۔

"تو ہے ہی سدا کا کام چور۔ کام کا نام سنتے ہی تجھے موت پڑنے لگتی ہے۔" سلطانہ ناراضی سے بولیں تو وہ پیر پٹخ کر اندر چل دیا۔

"اور ایمن بیٹا" اب وہ ایمن کی جانب متوجہ ہو کر بولیں۔

"تم ذرا وہ کیا بناتی ہو چائنیز وائینیز۔ وہ بنا لینا۔ کیا پتا اسے ہمارے مرغن کھانے پسند نہ آئیں۔"

"دادی جان۔ آپ کیوں فکر کر رہی ہیں۔ اطمینان رکھیں میں پہلے ہی دو تین چائنیز ڈشز بنا چکی ہوں۔ بعد میں جو اسے پسند ہو گا اسی حساب سے مینو ترتیب دے لیا کریں گے۔" وہ انہیں مطمئن کرنے کو تفصیلی انداز میں بولی۔

"جیتی رہ' میری بچی" سلطانہ کو اس کی ذہانت نے خوش کر دیا۔ "ماشاء اللہ بڑی سمجھداری کی بات کی تم نے۔ ایک تم ہو۔ اور ایک وہ ایان ہے۔ نجانے بے عقلے کو کب عقل آئے گی؟" آخر میں وہ کچھ افسردگی سے بولیں۔ اور اس سوال کا جواب تو خود ایمن کے پاس بھی موجود نہ تھا سو ڈھیلے ڈھالے انداز میں لاعلمی سے سر نفی میں ہلا کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

گورا چٹا۔ چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی۔ آنکھوں پر لگی نفیس سی عینک لمبا قد۔ چوڑے شانے۔ براؤن آرام دہ پینٹ اور نیلی شرٹ میں ملبوس' وہ داؤد ابراہیم تھا۔

سب ہی سے بڑے تپاک' احترام اور وضع داری سے ملا۔ لمبے سفر کی تکان کے باوجود وہ ان کے درمیان بیٹھا رہا۔ کھانا لگا تو اس نے دیسی کھانے کو ترجیح دی اور خوب خوب تعریف کر کے کھانا کھایا۔

جو بھی تھا۔ وہ سادہ دل نوجوان سب ہی کو پسند آیا تھا۔ سوائے ایان کے۔ جو نجانے کیوں اس کی آمد پر کچھ بے چین سا ہو گیا تھا۔

دوسرے دن وہ تازہ دم سا' سلطانہ بانو کے کمرے میں بیٹھا سب کے لیے لائے تحائف ان کے حوالے کر رہا تھا۔ سب اس کے خلوص پر شرمندہ ہوئے جا رہے تھے۔ سلطانہ بانو کے لیے وہ بڑا خوب صورت ڈیجیٹل قرآن' ڈیجیٹل تسبیح' خوب صورت ترین پیٹی میں موجود خالص صندل کا عطر' لیدر کے آرام دہ نفیس جوتے لے کر آیا تھا۔ اسی طرح تابندہ اور امجد صاحب کے لیے بھی تحائف ان کے مزاج اور عمر کو سامنے رکھ کر خریدے گئے تھے اور اب وہ لوگ بیٹھے اس کی سمجھ داری کو بے ساختہ سراہ رہے تھے۔ ایمن بھی ڈھیروں امپورٹڈ جیولری' کاسمیٹکس' خوب صورت ٹاپس' پرفیوم وغیرہ پا کر از حد خوش تھی اور تو اور جب اس نے معصوم کے حوالے دو شاپر اور گفٹ پیکٹ کیا تو معصوم کی شکل دیدنی تھی۔ وہ آبدیدہ سا ہو کر بولا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا داؤد بھائی کہ آپ نے وہاں سے میرے لیے چیزیں خریدی ہیں۔" سب ہی اس کے جذبات کو سمجھ کر مسکرا دیے۔

"یقین کر لو یار۔ امی سے یہاں کے افراد خانہ کے متعلق کافی معلومات ملتی رہی تھیں۔ کچھ اپنی سمجھ اور امی کے مشوروں سے میں نے سب کے لیے خریداری کی ہے۔" اس نے معصوم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"مگر اتنا سب لانے کی کیا ضرورت تھی بیٹا۔ تم خود جو آ رہے تھے' ہمارے لیے یہی تحفہ بہت تھا۔" تابندہ

نے وضع داری سے کہا تو وہ بولا۔

"تحفے مروتاً نہیں دل کی خوشی کے لیے اور محبت بڑھانے کی خاطر دیے جاتے ہیں۔" اس کے مدلل جواب پر امجد نے بے ساختہ اسے پسندیدگی سے دیکھا تھا۔ سلطانہ بھی اس سے اتفاق کرتے ہوئے گردن ہلا رہی تھیں۔

"یہ بات ہے تو پھر ہم بھی اپنی دلی خوشی پوری کرنے کے لیے آپ کو تحائف دیں گے تب پھر آپ انکار مت کیجیے گا۔" ایمن شریر انداز میں بولی تو وہ ہنس پڑا۔

"ہوں۔ بہت شارپ ہو مگر فی الحال تو اپنے ہاتھ کی بنی مزیدار سی چائے پلا دو۔ میرے لیے یہ بھی کسی تحفے سے کم نہیں ہوگی۔" وہ بولا۔

"کیوں نہیں ضرور۔ ابھی لیجیے۔" ایمن اٹھنے لگی۔ سب پھر باتوں میں مشغول ہو گئے۔ معصوم بھی کمرے سے باہر چل پڑا۔

"یہ دیکھیے ایان بھائی۔ وہ داؤد ابراہیم میرے لیے بھی امریکہ سے تحفے خرید کر لایا ہے۔" معصوم وہاں سے سیدھا ایان کے کمرے میں چلا آیا اور بے حد مسرت سے اسے ملے جانے والے تحائف دکھانے لگا۔

"نمک حرام۔" ایان نے سرعت سے اس کی گردن دبوچی۔

"دو تحفے کیا مل گئے تو نے اپنی وفاداری تبدیل کرلی۔"

"ارے۔ ارے چھوڑیں میری گردن ایان بھائی قسم لے لیں۔ میں تو آپ ہی کے حکم کے مطابق دادی کے کمرے میں ٹوہ لینے کے لیے گیا تھا۔ اور انہوں نے مجھے تحفہ پکڑا دیا تو کیا میں اب تحفہ بھی نہ لیتا۔" وہ اپنی گردن چھڑانے کے لیے دہائی دینے لگا۔

"اچھا تو کیا ہو رہا تھا وہاں؟" اس نے گردن چھوڑ کر خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورا۔ اور معصوم فر فر شروع ہو گیا۔ اور آخر میں اس نے اپنا۔ بے لاگ تجزیہ بھی پیش کرنا ضروری سمجھا۔

"میں کہے دیتا ہوں ایان بھائی ان کی یوں اچانک آمد بے وجہ نہیں۔ پھر میں نے خود دیکھا وہ ایمن باجی سے خوامخواہ فری ہونے کی کوششوں میں ہیں۔"

"کیا مطلب؟" ایان نے سوچتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"مطلب یہ کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ایمن باجی کو پسند آجائیں اور آپ۔" مگر اس کی بات مکمل ہو پاتی اس سے قبل ہی ایک مرتبہ پھر اس کی پتلی گردن ایان کے ہاتھوں میں تھی۔

☼ ☼ ☼

پھر اس کے بعد تو داؤد نے ایسا رنگ جمایا کہ جسے دیکھو داؤد کی تعریف میں رطب اللسان نظر آیا۔

"ماشاء اللہ کیسا نیک اور سعادت مند بچہ ہے صوم و صلوٰۃ کا پابند، مشرقی روایات کی پاسداری کرنے والا۔" یہ سلطانہ بانو تھیں۔

"پڑھا لکھا، مہذب، ذمہ دار، بردبار، دوسروں کا احساس کرنے والا۔ مجھے کہنے لگا کہ "آنٹی اگر میں آپ کا بیٹا ہوتا تو آپ کو بالکل کام نہ کرنے دیتا۔" تابندہ کی حسرت میں ڈوبی آواز۔

"ڈی سینٹ، سوبر، سنجیدہ رکھ رکھاؤ والے داؤد بھائی کتنے اچھے ہیں نا۔ لگتا ہے ان کے پاس معلومات کے خزانے ہوں جیسے۔ سچ ان کی کمپنی میں وقت گزارنے پر ذرا بھی بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔" ایمن کے خیالات۔

اور ان سب سے الگ تھے امجد صاحب کے محسوسات۔ وہ ان کے ساتھ جمعہ پڑھنے جاتا۔ واک کرتا۔ ان کے مسائل ڈسکس کرتا، بزنس میں نئے رجحانات کا ذکر کر کے کاروباری پیچیدگیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتا وہ ان کی سوچ کو نئے زاویے عطا کر گیا تھا۔

"نجانے کیوں آج مجھے شدت سے یہ احساس ہو رہا ہے کہ میں نے ایمن کو منسوب کرنے میں بڑی جلد بازی سے کام لیا۔" وہ اس وقت سلطانہ کے کمرے میں ان کے بیڈ پر ان کے ساتھ بیٹھے پر سوچ انداز میں

بولنا شروع ہوئے۔ سلطانہ نے بری طرح چونک کر ان کا فکر مند اور اداس چہرہ دیکھا۔

"یہ کیا بات کی تم نے؟" انہوں نے تحیر سے پوچھا۔

"ہاں اماں اور یہ احساس مجھے داؤد کو دیکھ کر ہوا ہے۔ کیا میرا حق نہیں کہ میں اپنی اکلوتی لاڈلی بیٹی کے محفوظ مستقبل کے بارے میں سوچوں؟" وہ ان سے پوچھنے لگے تو وہ جلدی سے بولیں۔

"مگر بیٹا' وہ لاکھ گن والا سہی مگر کیا وہ ہمارے ایان کی جگہ لے سکتا ہے؟"

"بات کسی کی جگہ لینے کی نہیں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ ایان کے ساتھ میری بیٹی کے محفوظ مستقبل کی ضمانت دے سکتی ہیں؟" سلطانہ چپ رہیں تو وہ زخمی سے انداز میں مسکرا کر بولے۔

"نہیں نا؟" اور میں اب مزید اس کے سدھرنے کا انتظار نہیں کر سکتا جبکہ آپ جانتی ہیں کہ وہ سدھرنا ہی نہیں چاہتا۔ میں بہت جلد کوئی فیصلہ کر لینا چاہتا ہوں۔"

وہ اپنی بات مکمل کر کے اٹھ کھڑے ہوئے اور وہ دروازہ کھول کر باہر نکل رہے تھے کہ ان کے نکلنے سے قبل ہی دروازے سے چپک کر کن سوئیاں لیتا معصوم وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ سلطانہ پُر تفکر سی بیٹھی رہ گئیں۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" ایان حسب معمول اپنے کمرے میں بیٹھا گٹار کے ساتھ مصروف عمل تھا تب ہی معصوم نے آکر اس کے سر پر یہ دھماکہ کر دیا۔ ایان یہ سب سن کر ششدر رہ گیا۔ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ یا ہو سکتا تھا؟

"جی لیان بھائی! اب کچھ کرنے کی سوچیں "ایسا نہ ہو کہیں آپ یہ گٹار ہی بجاتے رہ جائیں اور۔" معصوم سابقہ تجربے کی بنا پر احتیاط" دو قدم پیچھے سرکا" اور وہ داؤد ابراہیم اپنی ایمن بی بی کو لے اڑیں۔ میں نے تو آپ کو پہلے ہی کہا تھا کہ ان کی یوں اچانک آمد بے سبب نہیں' یقیناً" دال میں کچھ کالا ہے۔" وہ دیدے گھما گھما کر اور ہاتھ نچا نچا کر اپنے درست تجزیے پر بے حد مسرور سا کہتا چلا گیا۔ مگر اس کی توقع کے برخلاف ایان نے کوئی خاص ردعمل ظاہر نہ کیا۔ نہ ہی کچھ بولا۔ وہ تو ابھی تک بس یہی سوچے چلا جا رہا تھا کہ۔

"کیا ایسا بھی ہو سکتا تھا؟"

☼ ☼ ☼

"میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ تم اس فرنگی سے دور رہنا۔" دو دن صدمے کے زیر اثر رہنے کے بعد وہ اپنی پرانی جون میں واپس لوٹا' کہیں جانے کے لیے تیار ہوتی ایمن کے سر پر کھڑا چلا رہا تھا۔

ایمن جو بالوں میں برش کر رہی تھی چونک کر پلٹی اور اس کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھ کر ازحد اطمینان سے بولی۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ فرنگی نہیں۔ امریکن ہے۔"

"تب تو اور بھی دور رہو۔" وہ تنتنے پھلا کر بولا۔

"دوسری بات وہ ہمارا مہمان ہے۔" ایمن نے نوٹس لیے بنا اپنا بیان جاری رکھا۔

"اور تیسری بات یہ کہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تم اپنے ہم عمر ہونے کی بنا پر اور کزن ہونے کے ناطے اسے کمپنی دیتے۔ مگر تم اسے کمپنی دینا تو درکنار' اس سے بات تک کرنا پسند نہیں کرتے۔ اب ایسے میں اگر میں بھی اس سے دور ہو جاؤں گی تو وہ کتنا محسوس کرے گا۔" بات ختم کر کے وہ مڑی' برش رکھ کر لمبے سلکی براؤن بالوں کو سفید پونی میں جکڑا۔ چمکدار گلابی لپ گلوس بھرے بھرے ہونٹوں پر پھیرا اور شیشے میں دکھائی دیتے اپنے عکس کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھ کر واپس مڑی ہی تھی کہ زری نے آکر مطلع کیا۔

"وہ بی بی جی۔ داؤد صاحب باہر لان میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"تم جاؤ' میں آتی ہوں۔" ایمن نے اپنا سفید اور ہلکا نیلا ہینڈ بیگ اٹھاتے ہوئے کہا تو زری سر ہلا کر پلٹ گئی۔ ایمن مسلسل غصے میں کھڑے ایان کو نظر انداز کر رہی تھی مگر وہ ہر گز بھی نظر انداز ہونے کے موڈ میں

نہیں تھا۔

"تم کہاں جارہی ہو؟" اس نے درشتی سے پوچھا۔

"داؤد کو شاپنگ کروانے۔" وہ اسے چڑانے کو "بھائی" کالاحقہ ہٹا کر بولی۔

"کیوں وہ کوئی بچہ ہے؟"

"بچہ تو نہیں ہے مگر ظاہر ہے یہاں کے راستے اور شاپنگ مالز وغیرہ اس کے لیے قطعی نئے ہیں۔ پھر وہ ہمارے لیے اتنے تحائف لے کر آیا ہے تو ہمارا بھی فرض بنتا ہے ناکہ جواباً" اسے تحفہ دیں تو بس وہی دلانے جارہی ہوں۔" وہ اب سفید سینڈلز پہن کر پوری طرح تیار تھی 'سو اسے اطمینان سے جواب دے کر اس کی بات سنے بغیر کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ ایان اس کے اجنبی انداز پر ہکابکا رہ گیا۔

"یعنی کہ۔ یعنی کہ حد ہوگئی۔ ایمن نے داؤد کی خاطر میری بات ماننے سے نہ صرف انکار کردیا بلکہ میری ناراضی کی پروا کیے بغیر اس کے ساتھ بھی چلی گئی۔ یعنی کہ بس اب حد ہوگئی۔ ایان میاں اس سے زیادہ توہین تمہاری ہو نہیں سکتی۔ جلد ہی کچھ کر کے اس داؤد نامی جادو کا توڑ کرلو نہیں تو واقعی معصوم کے بقول۔ نہیں 'نہیں۔" وہ ہڑبڑا کر ہوش میں آیا۔ پھر دیوانوں کی طرح معصوم کی تلاش میں لپکا۔

☆ ☆ ☆

"میں نے محسوس کیا ہے کہ ایان مجھے کچھ خاص پسند نہیں کرتا۔"

ایمن نے داؤد کے لیے سب کی طرف سے مگر داؤد کی پسند سے مختلف تحائف کی خریداری کی تھی۔ خود اس نے اپنی طرف اور اپنی ہی پسند سے ایک برانڈڈ اسٹور سے روایتی کرتا شلوار اسے خرید کر دیا تھا۔ وہ گہرا نیلا کرتا جس پر اسکن کلر کے دھاگے سے نازک سی کڑھائی کی گئی تھی 'داؤد کو ازحد پسند آیا تھا۔ بعد میں ایمن ہی نے اصرار کر کے اسے لائٹ براؤن پشاوری چپل بھی گفٹ کی اور اب داؤد اسے آئس کریم کھلانے کے لیے پارلر میں لیے بیٹھا تھا۔ اور وہ اپنی پسندیدہ چاکلیٹ فج سے لطف اندوز ہورہی تھی تب ہی اچانک داؤد نے یہ بات کہی۔

"ارے 'نہیں نہیں۔" اس نے جلدی سے آئس کریم نگل کر نفی میں سر ہلایا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل وہ ہے ہی لیے دیے رہنے والی عادت کا انسان۔ آپ نے دیکھا ہوگا وہ ہمارے درمیان بھی زیادہ نہیں بیٹھتا۔" اس نے مدافعانہ انداز اختیار کیا۔

"ہو سکتا ہے۔" اس نے خالص امریکن انداز میں کندھے اچکا کر کہا۔ "مگر مجھے ایسا لگا تھا۔ ریزرو ہونا الگ بات ہے 'کسی کو ناپسند کرنا دوسری۔ پر اس نے میرا لایا ہوا تحفہ بھی نہیں لیا۔"

"نہیں داؤد بھائی۔ وہ اتنی پیاری نیچر کا ہے کہ کسی کو ناپسند کر ہی نہیں سکتا۔" وہ بناوٹی لہجے میں بولی جبکہ دل ہی دل میں داؤد کے اندازے کی درستی کی داد دے رہی تھی۔

"خیر۔ خیر ہو سکتا ہے تم درست کہتی ہو۔"

"آپ یہ سب چھوڑیں نا 'یہ بتائیں کہ پاکستان آکر کیا محسوس ہو رہا ہے۔ کچھ الگ سا 'یا بس ایویں؟" وہ شوخ سے انداز میں بات بدل کر بولی۔ تو وہ کچھ چونک کر اس کی جانب متوجہ ہوا تھا جیسے کہیں کھویا ہوا ہو۔

"آں۔ ہاں ایمن 'بہت۔ بہت اچھا محسوس ہو رہا ہے۔ وہاں سب کچھ ہے۔ مگر پھر بھی تو وہ روایتی ماحول اور رویوں کی گرم جوشی ہے 'جو ہم دیار غیر میں بسنے والے بہت زیادہ محسوس کرتے ہیں حالانکہ میں یہاں کے ماحول سے ناواقف تھا مگر مام 'ڈیڈ ہر عید 'رمضان 'بقر عید وغیرہ پر یہاں کی اتنی چیزیں مس کرتے ہیں کہ میں بتا نہیں سکتا اور ان ہی کی زبانی تو مجھے یہاں کے تہواروں کے بارے میں سن سن کر یہاں آکر وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا شوق ہوا تھا۔" اس نے تفصیلاً" بتایا۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں۔ بس چاند نظر آنے کی دیر ہے پھر دیکھیے گا آپ۔ چاروں طرف اتنی گہما گہمی ہو جائے گی کہ شاید آپ اپنے ملک کی عید کو مجبوراً" مس کرنے لگیں۔" ایمن ہنس کر بولی۔

وہ بھی ہنس دیا مگر ایسے جیسی پھر کہیں سوچ کا طائر اڑان بھر چکا ہوا اور وہ ایمن کو دیکھ رہا تھا۔۔۔ گہری جانچتی۔۔۔ تولتی نظروں سے۔

"کیا میں اس سے وہ سب کہہ دوں۔۔۔ کیا یہ مناسب ہوگا؟" وہ سوچتا رہا یہاں تک کہ ایمن کی آئس کریم ختم ہوگئی اور وہ لوگ شاپر تھامے اٹھ کھڑے ہوئے۔

☼ ☼ ☼

اپنے حریف کا مقابلہ انسان دو طرح سے کرتا ہے۔
ایک تو خود کو مقابل سے ہر لحاظ سے بہتر ثابت کر کے۔
دوم اسے سب کی نظروں سے گرا کر۔۔۔

چونکہ موخر الذکر حربہ عموماً" آسان اور کارگر ثابت ہوا کرتا ہے اس لیے اکثر "سہل پسند" اسی کو اختیار کرنے کو ترجیح دیا کرتے ہیں۔ لہٰذا ایان علی صورت حال کے ہر "پہلو" پر جناب معصوم کے ساتھ مل کر اچھی طرح غور و خوض کرنے کے بعد اسی نتیجے پر پہنچ سکے تھے کہ سب سے مناسب یہ ہے کہ داؤد کی اصلیت (جو ان کے نزدیک داؤد نے اپنی نیک چلنی کے بارے میں چھپا رکھی تھی) سب کے سامنے ظاہر کردی جائے۔

"مگر آخر پتا تو چلے کہ ہم یہاں ڈھونڈ کیا رہے ہیں؟" معصوم پچھلے آدھے گھنٹے سے ایان کے ساتھ مل کر رازداری سے داؤد کے کمرے میں گھسا کوئی نامعلوم چیز ڈھونڈتے ڈھونڈتے اکتا کر بولا۔

"کوئی ایسی چیز۔۔۔ جو اس کے خلاف پکا ثبوت مہیا کرسکے۔" ایان نے سرگوشی میں کہا۔

"مثلاً" کیا؟" مارے جوش کے معصوم کی آنکھیں پھٹ گئیں اور ان میں بے زاری کی جگہ اشتیاق نے لے لی۔

"مثلاً" ہوسکتا ہے وہ ڈرگز لیتا ہو' ہوسکتا ہے شراب نوشی کرتا ہو یا پھر غیر اخلاقی لٹریچر۔۔۔" وہ ابھی یہیں تک کہہ پایا تھا کہ کمرے کی ناب گھمانے کی آواز پر ان دونوں ہی کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔

"تم لوگ! یہاں اس وقت۔۔۔" تھکے تھکے سے داؤد نے اندر داخل ہو کر نہایت ہی تعجب سے اندر موجود نفوس اور صورت حال کا جائزہ لیا۔

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔" چہرے پر اڑتی ہوائیاں اور زبان کی لڑکھڑاہٹ پر بدقت تمام قابو پاتے ہوئے بمشکل ایان نے تیزی سے کچھ سوچتے ہوئے کہنا چاہا۔

"وہ۔۔۔ ہاں چوہا۔۔۔ ایک موٹے سے کالے چوہے کو تلاش کر رہے تھے ہم۔"

"میرے کمرے میں؟" داؤد نے مشکوک انداز سے دونوں کو باری باری گھورا۔

"ہاں' وہ کچن سے نکل کر اسی طرف آیا تھا۔۔۔ لگتا ہے یہاں سے بھی بھاگ گیا۔ آؤ معصوم چلیں۔۔۔ داؤد کو آرام کرنا ہوگا۔" ایان نے جلدی سے کہا اور کمرے سے باہر۔۔۔ معصوم تو اس کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی شاندار پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا کمرہ عبور کر گیا تھا۔

"چوہا۔۔۔؟ اور میرے کمرے میں۔" بات داؤد کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی مگر اسے بری ضرور لگی تھی۔

"وہ تو شکر ہے خدا کا کہ بروقت آپ کے دماغ نے کام کیا ورنہ تو ہم دونوں ان کے ہاتھوں شہادت پاچکے ہوتے۔" معصوم کا حال بے یقین تھا۔

"اور تم۔۔۔؟" ایان نے اسے غضب ناک نگاہوں سے گھورا۔ "تم نے تو کہا تھا کہ وہ باہر گیا ہوا ہے۔"

"ہاں تو گئے ہوئے تھے امجد صاحب کے ساتھ' مجھے کیا معلوم تھا کہ فوراً" ہی لوٹ آئیں گے۔ روز تو دیر سے لوٹتے ہیں۔" اس نے صفائی دی۔

"خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب اگلے قدم کے متعلق سوچو۔" ایان نے کہا تھا وہ دونوں پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

☼ ☼ ☼

سلطانہ بانو کی زبانی امجد کے خیالات جان کر تابندہ چپ کی چپ رہ گئیں۔

"اب تم خود کہو۔۔۔ باپ ہوتے کے ناطے اس کے

خدشات درست ہی ہیں۔ جو لڑکا خود اپنے ساتھ ہی سنجیدہ نہ ہو وہ کسی لڑکی کو کیا محفوظ مستقبل دے سکتا ہے۔" وہ سنجیدگی سے گویا تھیں۔ تابندہ ان کے مقابل سر جھکائے متفکر سی بیٹھی تھیں۔

"بات آپ کی بھی ٹھیک ہے مگر میں کیا کروں۔۔۔ میں تو خود اس کی روش سے تنگ آچکی ہوں ہر طرح سے سمجھا بجھا کر دیکھ چکی ہوں مگر وہ سنتا ہی نہیں۔" انہوں نے بہت دھیمی اور دل گیر سی آواز میں کہا۔

"نہیں تابندہ۔۔۔ ایسے نہیں چلے گا۔۔۔ کیا تم جانتی ہو پروین (داؤد کی والدہ) کا فون آیا تھا میرے پاس۔۔۔ لڑکے نے ڈھیر ساری تعریفیں کی ہیں اپنی ماں سے ایمن کی۔۔۔ معاملہ سمجھ رہی ہو نا؟" وہ خود پریشان سی تھیں۔

"اچھا؟" تابندہ نے سر اٹھا کر تحیر سے انہیں دیکھا "تو یہ بات ہے۔"

"ہاں یہی بات ہے۔" سلطانہ بے لچک انداز میں مگر اداسی سے بولیں۔

"امجد لاکھ ایان پر جان چھڑکتا ہے، مگر یہ مت بھولو ایمن بہرحال اس کی اولاد ہے اور کسی شخص کو بھی اپنی اولاد سے بڑھ کر کچھ پیارا نہیں ہوتا۔" جو وہ سمجھانا چاہ رہی تھیں، تابندہ اچھی طرح سمجھتی تھیں مگر ان کے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے؟

☆ ☆ ☆

"ایمن۔۔۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" شام کا وقت تھا۔ ایمن داؤد کی پسندیدہ کشمیری چائے اور چنے کا حلوہ لے کر لان ہی میں چلی آئی تھی۔ تابندہ اور امجد آفس سے نہیں لوٹے تھے۔ سلطانہ اپنے شام کے ذکر واذکار میں مصروف تھیں اور ایان اور معصوم کہاں تھے اللہ جانے۔۔۔

"جی داؤد بھائی۔۔۔ کہیے ایسی بھی کیا بات ہے؟" ویسے وہ بڑا بے تکلف سا بندہ تھا اسی لیے ایمن کو اس کا جھجکتا انداز دیکھ کر حیرت ہوئی۔

"امید ہے تم میری بات کو سنجیدگی سے لوگی اور میرا ساتھ دوگی؟" اس نے کسی قدر پرامید نگاہوں سے اس کے صبیح چہرے کی جانب دیکھا جو اس کی تمہید پر حیران دکھائی دیتا تھا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔ آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں۔" وہ اس کے انداز پر الجھتی ہوئی بولی۔

"وہ۔۔۔ دراصل بات یہ ہے کہ میں۔۔۔" اس نے اٹکتے۔۔۔ سنبھلتے کہنا شروع کیا۔ جوں جوں اس کے لبوں سے الفاظ نکلتے گئے، ایمن کی آنکھیں پہلے حیرت پھر اشتیاق اور آخر میں تبسم ظاہر کرنے لگیں۔ گویا اس نے اقرار کر لیا تھا۔ اور داؤد کو یک دم ہی جیسے کسی نے ہفت اقلیم کی دولت تھما دی تھی۔

اور پھر ایان نے دیکھا کہ ایمن آئے دن داؤد کے ساتھ کہیں نہ کہیں جانے لگی۔ گھر میں بھی دونوں کا اکثر وقت اکٹھا گزرنے لگا اور معصوم نے تو خود اپنی "گناہ گار" آنکھوں سے ایمن کو داؤد سے سرخ گلاب وصول کرتے دیکھا تھا۔ ان کی آپس میں ہوتی کھسر پھسر پر حسب عادت اپنے "گناہ گار" کان لگا کر ٹوہ لینے کی بھی کوشش کی تھی مگر کچھ پلے نہ پڑا سوائے اس کے کہ دونوں یقیناً "کوئی محبت بھری بات ہی کر رہے تھے (اور یہ انہوں نے از خود اپنے پلے پڑوا لیا تھا) اور ایان تک پہنچا کر دم لیا تھا۔ معاملہ سنگین ہوتا چلا جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"یہ پھول اور کارڈ بھیجے ہیں کسی لڑکی نے داؤد بھائی کے لیے۔" چھٹی والے دن تمام افراد خانہ دوپہر کے کھانے کے بعد لاؤنج میں بیٹھے بات چیت میں مشغول تھے تب ہی معصوم سرخ گلابوں کا بکے اور کارڈ اٹھائے چلا آیا سب ہی نے چونک کر دیکھا۔

"میرے لیے بکے اور کارڈ۔۔۔ مگر کس نے بھیجے؟" داؤد متحیر تھا۔

"کہہ تو رہا ہے کسی لڑکی نے بھجوائے ہیں۔" ایان جو خلاف معمول آج ان کے درمیان موجود تھا لہک کر بولا۔

"مگر یہاں تو مجھے کوئی نہیں جانتا۔۔۔" اس نے کندھے اچکا کر تعجب سے کہا۔

"جان پہچان ہوتے کون سی دیر لگتی ہے۔ میرا خیال ہے یہ وہی لڑکی ہوگی۔" ایان نے سوچتے ہوئے ڈرامائی لہجہ اپنایا۔
"کون سی لڑکی؟" ایمن نے پوچھا۔
"پرسوں دوپہر میں کسی لڑکی کی کال آئی تھی داؤد کے لیے کہہ رہی تھی کہ تم نے اس سے ملنے کا وعدہ کر رکھا تھا' مگر تم نہیں آئے۔" اس نے اپنا لہجہ مقدور بھر ہموار رکھنے کی کوشش کی۔
"بڑی حیرانی کی بات ہے... کون تھی وہ لڑکی۔" امجد کچھ ناپسندیدگی سے داؤد کی طرف دیکھ کر بولے۔
"آئی سوئیر... میں نہیں جانتا۔" اس نے لاعلمی ظاہر کی۔
"مگر یہ پھول اور کارڈ... پھر ایان جھوٹ تو نہیں بولے گا نا۔" یہ تابندہ تھیں۔
"چھوڑو میری ماں..." ایان کا دل اپنی چلی گئی چال کی کامیابی پر بلیوں اچھلنے لگا۔
"نہیں آنٹی... میں ایان کو جھوٹا تو نہیں کہہ رہا... میں تو صرف حیران ہو رہا ہوں کہ یہاں مجھے پھول اور کارڈ بھیجنے والا کون پیدا ہو گیا؟" اس نے مسکرا کر کہا۔
"والا نہیں والی..." معصوم نے تصحیح ضروری سمجھی۔
"چلو رکھ دو اسے یہیں اور جا کر سب کے لیے اچھی سی چائے لے کر آؤ۔" سلطانہ نے معصوم کو گھر کا...
"میرا خیال ہے کہ کل چاند نظر آجائے گا۔ کیا خیال ہے میاں... میرے ساتھ منڈی کی رونق دیکھنے چلو گے؟" امجد نے داؤد کو مخاطب کیا۔
"وائے ناٹ... میں ضرور چلوں گا... یہ یقیناً میرے لیے بڑا انوکھا تجربہ ہوگا۔" داؤد پرجوش سا ہو کر بولا۔
تو سب ہی بقر عید کے حوالے سے تیاریوں کے ذکر میں مشغول ہو گئے۔
ایان کچھ بے مزہ تو ہوا مگر اس کی محنت رائیگاں نہیں گئی تھی۔ سو وہ کسی قدر اطمینان سے اٹھ کر منظر سے غائب ہو گیا' مگر لاعلم تھا کہ ایمن نے بغور اس کے تاثرات ملاحظہ کیے تھے۔

☼ ☼ ☼

"یہ سب تمہاری حرکت تھی نا؟" آج بہت دن بعد ایمن' ایان کے کمرے میں آئی تھی ایان اس وقت اپنے بیڈ پر نیم دراز گٹار کو سینے سے لگائے اس کے تاروں سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔
"کون سی حرکت؟" ایان نے بنا انداز نشست تبدیل کیے بے حد متحیر ہو کر پوچھا۔
"یہی داؤد بھائی کو پھول اور کارڈ کسی لڑکی کی طرف سے بھیجنے والی؟" وہ کمر پر دونوں ہاتھ ٹکائے کڑے تیوروں سے اسے گھورتے ہوئے بولی۔
"مجھے کیا ضرورت پڑی ہے؟" اس نے صاف انداز اختیار کیا۔
"تب ہی تو میں حیران ہو رہی ہوں کہ آخر تمہیں کیا ضرورت پڑی ہے انہیں یوں سب کی نظروں سے گرانے کی؟" اس نے تاسف سے پوچھا۔
"تم واقعی اتنی لاعلم ہو یا ظاہر کر رہی ہو؟" اب کی بار وہ براہ راست طنز پر اتر آیا۔
"کیا مطلب؟" وہ خاک نہ سمجھی۔
"مطلب یہ ڈیئر کزن کہ تمہارے والد محترم اس کی آمد کے چند ہی روز بعد اسے مجھ پر ترجیح دیتے ہوئے' ہمارے درمیان موجود رشتے پر نظرثانی کرتے ہوئے' اسے ختم کرنا چاہ رہے ہیں اور ان سب کی وجہ ہے وہ... وہ داؤد ابراہیم..." وہ بھڑک ہی تو گیا۔
"اوہ... آئی سی اب میں سمجھی۔" ایمن یہ بات سن کر پہلے تو اچنبھے میں پڑ گئی پھر خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ "تو تم نے سوچا کہ بجائے میرے ڈیڈ کی شکایات دور کرنے کے انہیں سب کی نظروں سے گرا دو اور یونہی مزے کرتے رہو۔" اس نے چبا چبا کر کہا۔
"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔" وہ مکر گیا۔
"جانتے ہو کسی پر تہمت لگانا کتنا بڑا گناہ ہے؟" وہ بے حد تاسف سے بولی۔
"تم اس کی اتنی طرف داری کیوں کر رہی ہو...

کہیں تم بھی اپنے ڈیڈ کی طرح راستہ بدلنے کے چکروں میں تو نہیں۔" وہ چبھتے انداز میں کہتا ہوا ایمن کو ازحد چوٹ پہنچا گیا۔

"تم..... تم ایان۔" غصے سے کانپتے ہوئے اس سے کوئی بات نہ کی جا رہی تھی پھر وہ جیسے سنبھلی دو منٹ توقف کیا اور فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

"ہاں ایان..... تم نے ٹھیک سمجھا..... میں نے ڈیڈ کی بات مان لینے کا فیصلہ کر لیا ہے' میں اب مزید تم جیسے فضول اور نکمے انسان کے ساتھ اپنا وقت برباد نہیں کرنا چاہتی۔ تم اسٹار اگر بن بھی گئے' تب بھی ناکام انسان رہو گے۔ کیوں کہ تم نے رشتوں کو اپنانا اور ان کی قدر کرنا سیکھا ہی نہیں۔" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ کہہ کر رکی نہیں کمرہ عبور کر گئی۔ کیا کہہ گئی تھی وہ..... ایان دم بخود بیٹھا تھا۔

☼ ☼ ☼
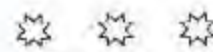
چاند نظر آگیا تھا۔ امجد ہمیشہ ہی چاند رات کو جا کر جانور خریدتے تھے کبھی اکیلے یا معصوم کے ساتھ مگر اس بار داؤد ان کے ساتھ تھا۔ ہر سال وہ ایان سے منڈی چلنے کے لیے اصرار کرتے مگر وہ نہ جاتا۔ اس بار اصرار تو در کنار انہوں نے اس سے پوچھنا تک ضروری نہ سمجھا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھا کلستا رہا۔

باہر جانوروں کے استقبال کی گہما گہمی تھی' جس میں خوشی خوشی معصوم بھی شریک تھا اور گنگناتے ہوئے بڑی دل جمعی سے گھر کا عقبی صحن صاف کر رہا تھا جہاں جانور باندھے جانے تھے۔

سلطانہ اور تابندہ مل کر عیدالاضحیٰ کے حوالے سے خریدی جانے والی اشیائے خورد و نوش کی لسٹ بنا رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ دیگر امور بھی ڈسکس کیے جا رہے تھے۔ ایمن' زری کے ساتھ مل کر کچن کی ضروری صفائی کروا رہی تھی پھر بعد میں تو وقت ہی نہ ملتا کہ اسے خود اپنی تیاری بھی کرنی تھی۔ روزمرہ کے معمولات بھی ساتھ ساتھ چلنے تھے اوپر سے وہ جانوروں کی ناز برداری بھی بڑی شوق اور لگن سے کیا کرتی تھی۔ غرض ہر کوئی مصروف تھا خوش تھا' سوائے ایان کے.....

"کیسا رہا یہاں منڈی جانے کا تجربہ۔" رات گئے تھکے ہارے بے حال سے وہ لوگ ایک خوب صورت بھوری گائے اور دو سفید بکروں سمیت واپس لوٹے تھے۔ داؤد کی حالت اتنی دگرگوں تھی کہ ایمن اسے دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھی۔

"بڑا ہی انوکھا اور منفرد۔" وہ اس کی شرارت سمجھ کر مسکرایا۔

"قیمتیں آسمان پر جا پہنچی ہیں اور دھوکہ دہی الگ....." امجد صاحب وہی روایتی باتیں دہرا رہے تھے۔

"بس اللہ ہی ہے جو ہدایت دے..... ویسے جانور ماشاء اللہ صحت مند اور خوب صورت لائے ہو تم لوگ۔" سلطانہ بھی شوق سے جانوروں کو دیکھ رہی تھیں کہ جن کو بڑے پیار سے معصوم' چارہ کھلا رہا تھا۔ سب مگن تھے۔ کسی کو بھی اس کی کمی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ایان نے چپکے سے یہ منظر دیکھا اور خاموشی سے پلٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آج کل یہ خوب صورت آنکھیں اداس کیوں رہتی ہیں؟" وہ کافی دیر سے لان میں بیٹھی بظاہر داؤد سے باتیں کر رہی تھی مگر اس کے لہجے کا پھیکا پن اور آنکھوں سے جھلکتی اداسی داؤد سے مخفی نہ رہ سکی۔

"ارے نہیں۔" وہ جلدی سے سنبھلی۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"خیر..... بات تو ایسی ہی ہے تم بتانا نہ چاہو تو اور بات ہے..... یہ میں ہی اسٹوپڈ ہوں جو تم سے سب کچھ شیئر کر بیٹھا اور تم نے اچھے ساتھیوں کی طرح میرا ساتھ بھی دیا' مگر شاید تم مجھے اس قابل نہیں سمجھتیں۔"

"ایسی بات نہیں ہے داؤد..... بس میں آج کل کچھ پریشان ہوں۔"

"اور اس پریشانی کی وجہ کا نام ایان ہے؟" وہ مسکرایا۔ اس بار وہ چپ رہ گئی۔

"تمہیں یاد ہے کچھ دن پہلے میں نے تم سے کہا تھا کہ میرے خیال سے ایان مجھے پسند نہیں کرتا مگر تم نے میری بات سے انکار کیا تھا' مگر میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتا اور کیا اب یہ بھی بتاؤں کہ وہ مجھے ناپسند کیوں کرتا ہے؟ اور کیوں مجھے سب کی نگاہوں سے گرانے کی کوشش کر رہا ہے؟" وہ آخر میں کچھ سنجیدہ سا ہو گیا۔

"اوہ تو آپ یہ بھی جانتے ہیں۔" وہ بے ساختہ کہہ گئی۔ داؤد مسکرا دیا پھر پوچھنے لگا۔

"کیا اب بھی کھل کر کچھ نہیں بتاؤ گی ایمن..... ہو سکتا ہے میں تمہارے کسی کام آسکوں۔" اور ایمن نے چند ثانیے غور کرنے کے بعد جیسے اسے سب کچھ بتا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں تو کہتی ہوں بقر عید کے بعد والا پہلا جمعہ رکھ لو..... " سلطانہ خوشی سے چہکتی آواز میں بولیں۔

"مگر اتنے کم وقت میں تیاری کیسے ہوگی۔ آخر کو میری اکلوتی بیٹی ہے۔" امجد متفکر ہو کر بولے۔

"فی الحال تو صرف نکاح ہی کر رہے ہیں نا تو نکاح کی تیاری کرنا نسبتاً آسان ہے۔" تابندہ کی بجھی بجھی سی آواز..... سلطانہ کے بند کمرے میں خفیہ میٹنگ جاری تھی (جو بوجہ معصوم کی ٹوہ لینے کے خفیہ نہ رہی تھی۔) اس میٹنگ میں یقیناً" داؤد اور ایمن کے مستقبل کا فیصلہ کیا جا رہا تھا۔

معصوم از حد رنجیدگی سے یہ اندوہناک خبر اپنے پیرو مرشد کو سنانے چل پڑا۔

"نہیں ..... یہ نہیں ہو سکتا۔" اور اس دردناک اطلاع کو پا کر ایان نے معصوم کا گریبان یوں جھنجھوڑا جیسے کسی انڈین فلم میں کوئی جوان لڑکی اپنی بیوگی کی خبر سنانے والے کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑتی ہے۔

"میں نے اپنے "گناہ گار" کانوں سے خود سنا ہے۔" معصوم روہانسے لہجے میں بولا۔ ایان کے ہاتھ اس کے گریبان کو چھوڑ کر نیچے لٹک گئے۔ شکل پہ بارہ بجتے دکھائی دیے اور وہ دھپ سے اپنے بیڈ پر یوں بیٹھا گویا کوئی شہتیر کٹ کے گرا ہو۔

"میں تو کہتا ہوں ابھی بھی وقت ہے..... کچھ سوچیے..... کچھ کیجیے ایان بھائی ورنہ آپ ہمیشہ کے لیے ایمن باجی کو کھو دیں گے۔" معصوم کتنا ہی "کمینہ" سہی مگر ایان اور دیگر گھر والوں کے لیے اس کے خلوص میں شک کی گنجائش نہ تھی۔ اور ایان اسے یوں خالی خالی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اس نے زندگی میں ہمیشہ صرف پانے کا ذائقہ چکھا تھا اور اب زندگی اس کو پہلی بار آزمانے چلی تھی۔ وہ اس کا پہلا خواب' دل کی اولین خواہش اور محبت..... ہاں محبت چھننے جا رہی تھی اور چھن جانے کا احساس کتنا جاں گسل اور تڑپا دینے والا ہوتا ہے اس سے وہ پہلی بار روشناس ہوا تھا۔ دل پر ایسی چوٹ لگی تھی کہ نجانے کہاں سے اس کے من کے اندر اتنی اداسی اور سنجیدگی در آئی تھی۔ پوری رات اس کا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا رہا اور صبح صادق' وہ ایک نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

"مام..... آپ تایا جان سے ایک بار بات تو کر کے دیکھیں۔ وہ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟" سب سے پہلے اس نے ماں کے سامنے جا کر فریاد کی۔

"کیوں نہیں کر سکتے ایان..... وہ ایمن کے باپ ہیں' اس کی بہتری سوچنے کا پورا حق رکھتے ہیں۔" وہ اس کے بجھتے چہرے سے نظر ہٹا کر خوامخواہ ترتیب سے رکھی فائلوں کو دوبارہ ترتیب دینے لگیں۔

"مگر وہ اور میں بچپن سے منسوب ہیں..... میں جانتا ہوں اسے' وہ داؤد کے ساتھ خوش نہیں رہے گی۔" وہ اپنی بات پر زور دے کر بولا۔

"اور تمہارے ساتھ؟" وہ مڑ کر چبھتے انداز میں بولیں۔ "تمہارے جیسے غیر ذمے دار اور لاابالی انسان

کے ساتھ جیسے وہ بہت آرام دہ زندگی گزارے گی نا۔۔۔ کتنا سمجھایا تھا تمہیں کہ سدھر جاؤ بے کار وقت ضائع مت کرو۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرو مگر تم نے میری کسی بات پر بھی دھیان نہ دیا اب بھگتو۔" انہوں نے ایک چیئر پر بیٹھ کر کوئی فائل کھول لی۔

"تو آپ کچھ نہیں کر سکتیں؟" اس نے موہوم سی امید کے تحت پوچھا۔

"نہیں۔۔۔!" حتمی انداز۔۔۔ چشمہ آنکھوں پر فٹ کر کے فائل کا مطالعہ شروع۔

"ٹھیک ہے میں تایا جان سے خود بات کرتا ہوں۔" وہ بے باک لہجے میں کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

"تمہاری مرضی۔" انہوں نے عقب سے ہانک لگائی مگر ان کے لبوں کے گوشوں میں مسکان دبی تھی۔

"وہ۔۔۔ وہ تایا جان مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" بہادر بن کر وہ ان کے کمرے تک آیا تو ضرور مگر انہیں بیڈ پر نیم دراز کسی کتاب کا مکمل سنجیدگی سے مطالعہ کرتے دیکھ کر اس کے حوصلے پست ہو گئے۔ وہ اس کے لاڈ ضرور اٹھاتے رہے تھے مگر وہ ہرگز بھی ان سے بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔

"کہو میں متوجہ ہوں۔" کتاب سے نظریں ہٹائے بنا جواب آیا۔

"میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں گانا بجانا چھوڑ کر۔۔۔ کل ہی سے آفس جوائن کر لوں گا۔ میرا حلیہ آپ کو ناگوار گزرتا ہے تو وہ بھی بالکل Change کر لوں گا' میں نے پہلے ہی کافی وقت ضائع کر دیا ہے۔" اس نے جلدی سے یوں کہا گویا کوئی سبق سنا رہا ہو۔

"برخوردار!" انہوں نے اس کی جانب دیکھ کر روکھے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"بات کہنے اور عمل کرنے میں بڑا واضح فرق ہوتا ہے اور یاد رکھنا وقت کی انسانی زندگی میں بڑی اہمیت ہے۔۔۔ وقت گزرنے کے بعد کیا جانے والا کام 'بولا جانے والا سچ' دی گئی گواہی غرض کسی چیز کا بھی کوئی خاص فائدہ نہیں۔۔۔ جو کہہ رہے ہو اس پر عمل کر کے دکھانا۔۔۔ اب جاؤ۔۔۔ کل ناشتے کی میز پر ملاقات ہو گی۔" وہ دوبارہ کتاب کی جانب متوجہ ہو گئے۔

"ٹھیک ہے تایا جان۔۔۔ اب صبح ملاقات ہو گی۔" وہ پرعزم لہجے میں بولا اور کمرہ عبور کر گیا۔ کتاب پر جمی امجد کی نظروں میں اطمینان تھا۔

اور پھر ہوا کچھ یوں کہ اگلے دن وہ صبح بیدار ہو ہی نہ سکا کہ رات گئے تک صبح جانے کی تیاری میں مصروف رہا۔ بال تو کاٹ نہیں سکتا تھا۔ بس اچھی طرح انہیں شیمپو کر کے سیٹ کر لیا۔ صبح جانے کے لیے معصوم سے آفس ڈریس استری کروایا مگر سالہا سال سے بگڑی عادتیں بھلا ایک دن میں کیسے سدھر سکتی ہیں صبح جب جاگا تو گھڑی ساڑھے بارہ بجا رہی تھی۔۔۔ خود کو لعنت ملامت کرتا وہ باہر آیا۔ تابندہ اور امجد آفس جا چکے تھے باقی سب پتا نہیں کہاں تھے مگر ایمن کچن میں مصروف عمل تھی۔

"مجھے ناشتا چاہیے۔" وہ کچن میں آ کر بولا۔

"یہ لنچ کا وقت ہے۔" اس نے مڑے بنا جتایا۔

"تم لنچ ہی دے دو۔۔۔ میں ناشتا سمجھ کر کر لوں گا۔"

"تم کبھی نہیں سدھر سکتے ایان۔" یک دم وہ مڑ کر ازحد تاسف و رنجیدگی سے بولی۔

"ڈیڈ صبح ٹھیک ہی کہہ رہے تھے کہ تمہاری بات بھروسے کے قابل ہی نہیں ہے۔" وہ کہہ کر رکی نہیں مگر وہ جو پہلے دن ہی اپنے پیمان پر قائم نہ رہ پانے پر ازحد شرمندہ سا تھا ایمن کے اجنبی و اکھڑے انداز پر دیر تک وہیں رکا رہا۔

"دادی۔۔۔!" اور اب جبکہ کوئی بھی اس پر اعتبار کرنے پر تیار نہ تھا تو وہ دادی کی آغوش میں آ کر گرلانے لگا۔ بس آنسو بہانے کی کسر رہ گئی۔

"میں کیا کروں' کوئی میری بات کیوں نہیں سن رہا۔" بے بس لہجہ۔

"صبر کرو میرے بچے۔۔۔ سارے معاملات طے پا گئے ہیں اب کچھ نہیں ہو سکتا' داؤد کے ماں باپ عید کے تیسرے روز پہنچیں گے۔" وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر پچکارنے لگیں۔

"دادی کیا میرا قصور اتنا بڑا ہے کہ مجھے زندگی کی سب سے بڑی خوشی سے محروم کردیا جائے۔" وہ گلوگیر آواز میں بولا۔

"مگر میرے بچے... تُو نے زندگی کی سب سے بڑی خوشی کو پانے کی کوئی کوشش بھی تو نہیں کی اور بنا کوشش کیے بھی کبھی کوئی بات بنی ہے۔"

"دادی... آپ سمجھائیں نا سب کو... آپ بڑی ہیں وہ آپ کی بات ضرور مان لیں گے۔" اس نے لاچاری سے کہا۔

"نہ بچے... اب کچھ نہیں کر سکتی میں۔" انہوں نے بھی صفاچٹ انکار کردیا۔

"کیا کروں میرے اللہ۔" بالآخر اس نے مدد کے لیے اب اسے پکارا' جسے سب سے پہلے پکار لینا چاہیے تھا۔

☆ ☆ ☆

"چلیے بھائی صاحب..." تابندہ باوجود حرارت کے آفس کے لیے نکلنے لگیں تو امجد نے ٹوک دیا۔

"آپ گھر پر رہیے بھابھی' آپ کی طبیعت ویسے ہی ٹھیک نہیں۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تایا جان۔" کیمل کلر کے پینٹ کوٹ اور بلیو شرٹ میں ملبوس ہاتھ میں بریف کیس تھامے سیڑھیوں سے اترتا ایان سب ہی کو عجب طرح کی حیرانی سے دوچار کرگیا۔

"آج سے آپ نہیں... میں آفس جایا کروں گا' آپ نے بہت کام کرلیا' اب ذرا مجھے بھی خدمت کا موقع دیں۔" وہ سب کے درمیان آتے ہوئے بولا۔

"جیتا رہ میرے بچے..." سلطانہ تو اس کے انداز پر نہال ہی ہوگئیں۔ امجد اور تابندہ نے بھی ازحد خوشی کا اظہار کیا۔ ایمن بھی مسکرائی۔ داؤد نے اثبات میں سر ہلا کر حوصلہ افزائی کی تو معصوم نے تو اسے ایسے گلے سے لگایا تھا گویا وہ کشمیر فتح کرنے جارہا ہو... اور سب کا ردعمل دیکھ کر ایان سوچ رہا تھا کہ واقعی لگتا ہے اس بار اس کے قدم صحیح راہ پر بڑھ گئے ہیں۔

بزنس میں اس نے ڈگری لے ہی رکھی تھی۔ ذہین تھا اور قابل بھی' سو وہ تیزی سے کام سیکھنے لگا۔ امجد کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ وہ محنت سے کام کررہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ اب شاید سب کچھ ٹھیک ہونے والا ہے مگر زندگی میں ایسا بھلا کب ہوتا ہے۔

وہ چائے کا کپ لیے اپنے گھر کے ٹیرس پہ کھڑا تھا۔ تب ہی اس کی نظر بکرے کی رسی تھامے گھر کے اندر داخل ہوتے داؤد اور ایمن پر پڑی۔ داؤد جھک کر اس سے کچھ کہہ رہا تھا جبکہ ایمن کے لبوں پر شرمیلی مسکان سجی تھی۔ اشتعال کی ایک تیز لہر ایان کے بدن میں دوڑ گئی۔

"آخر داؤد ایسا کیا کہہ رہا ہے' جو وہ یوں شرما رہی ہے... میرے سامنے تو کبھی ایسے نہیں شرمائی۔" اس کے اندر کا رقیب جاگ گیا اور دھیرے دھیرے موجودہ ایان پر حاوی ہوتا چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

اور پھر عید آگئی...

سب کچھ ہمیشہ کی طرح تھا۔ سوائے نماز کے لیے ازخود جاگ جانے والے ایان اور داؤد کی موجودگی کے... ایان قربانی کے وقت بھی موجود رہا۔ ایمن یوں تو قربانی کے جانوروں کی بڑی خدمت کیا کرتی تھی مگر انہیں قربان ہوتے دیکھنے کا اس میں حوصلہ نہ تھا سو وہ اندر کچن میں انگوری اور گلابی پرنٹڈ سادہ سے کاٹن کے سوٹ میں ملبوس روزمرہ کے کام نمٹاتی رہی۔ اسی مصروفیت میں سب کا دن گزر گیا۔ گوشت کی اچھی خاصی تعداد امجد کسی مدرسے یا فلاحی ادارے میں بھجوا دیا کرتے تھے۔ رشتے داروں کا حصہ نکال کر اپنے گھر کے لیے بس اتنا ہی گوشت رکھتے تھے کہ بمشکل ایک ہفتے چل پاتا۔

ایمن عید کی پہلی رات کو مہندی لگواتی تھی کیوں کہ پہلے دن تو ظاہر ہے پانی کا اتنا کام ہوتا کہ مہندی کا رنگ فوراً پھیکا پڑجاتا۔ دوسرے دن سب ہی کو قدرے فراغت تھی سو رات میں باربی کیو کا پروگرام

رکھا گیا۔ ایمن بڑے اہتمام سے تیار ہو کر کمرے سے نکل ہی رہی تھی کہ دستک دیتا ایان اندر داخل ہوا۔ لائٹ اورنج اور پنک ڈریس میں روایتی انداز سے بجی سنوری ایمن اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ وہ مبہوت رہ گیا۔

"ہاں کیا ہوا ایان؟ سب لان میں ہیں' میں وہیں جا رہی تھی۔" وہ اس کی نظروں سے گڑبڑا کر بولی تو وہ سنبھل کر ہوش میں آیا۔

"تم مجھے اس بار عید مبارک کہنا بھول گئیں ایمن!" وہ شاکی لہجے میں بولا۔

"نہیں تو... تم جانتے تو ہو میں اچھی طرح تیار ہونے کے بعد سب کو عید مبارک کہتی ہوں اہتمام سے۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔

"پرسوں تمہارے سسرال والے آرہے ہیں' کیا تم جانتی ہو؟" دراصل وہ یہ ہی بات کرنے آیا تھا۔

"میرے سسرال والے؟" اس نے تحیر سے پوچھا۔

"اوہ اچھا۔" پھر جیسے سمجھ کر سر ہلایا۔

"تم داؤد بھائی... آئی مین داؤد کے مام ڈیڈ کی بات کر رہے ہو' ہاں آتو رہے ہیں پھر؟" اس نے ایان کو دیکھا اس کے انداز پر ایان چڑ ہی تو گیا۔

"پھر یہ کہ تم ان کے سامنے ایسی اداکاری کرنا جیسے تم پر جن آگیا ہو اگر وہ تب بھی باز نہ آئے تب ہم اگلے ہی دن جا کر کورٹ میرج کرلیں گے کیوں کیسا آئیڈیا ہے؟"

"وہاٹ ربش ایان! تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو' میں ایسا کچھ نہیں کروں گی۔" ایمن بوکھلا گئی۔

"ایمن... ایمن یار کہاں ہو۔" بڑے ہی غلط وقت پر داؤد نے انٹری ماری تھی۔ ایان نے خونخوار نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اس کا سدھرنا دھرنا اپنی جگہ مگر داؤد کے لیے اس کی پرخاش ختم نہ ہوئی تھی۔

"اوہ... تو تم بھی یہاں ہو۔ آؤ' ایان یار تم بھی آجاؤ... تمہاری سنگنگ کی میں نے بڑی تعریف سنی ہے لاؤ' تا اپنا گٹار' جب تک ہم لوگ باربی کیو کر رہے ہیں' تم دو تین گانے ہی سنا دو۔" وہ کچھ ایسی بے تکلفی سے بولا گویا ان کے درمیان برسوں کا یارانہ ہو۔

"ہاں ٹھیک ہے' سناتا ہوں... اب تو میں سب کو گانا ہی سناؤں گا۔"

"ملنے ہے مجھ سے آئی...
جانے پھر کیوں تنہائی...
کس موڑ پہ ہے لائی عاشقی..."

سب لان میں موجود تھے۔ ایان ایک کے بعد ایک اپنے دل کی ترجمانی کرتا گانے سنا رہا تھا۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ وہ نہ صرف کافی سُر میں تھا بلکہ اس کی آواز سماعتوں کو بھلی بھی لگ رہی تھی۔ شاید یہ دل پہ لگی چوٹ کا اثر تھا۔ سب دبے دبے انداز میں مسکرا رہے تھے۔ سوائے معصوم کے جو اپنے مربی کے غم میں برابر کا شریک تھا۔

☼ ☼ ☼

"اب جبکہ میں سدھر چکا ہوں' تب پھر کیا مسئلہ ہے؟" کل پروین اور ان کے شوہر الیاس صاحب کی آمد متوقع تھی۔ وقت بے حد کم تھا۔ ایان کے ہاتھ پیر پھولے جاتے تھے وہ ہر طرح سے کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح یہ رشتہ ٹالا جاسکے۔

"میں تمہیں بتا چکی ہوں ایان اب ایسا نہیں ہوسکتا۔" تابندہ زچ ہوگئیں۔

"ٹھیک ہے پھر میری جو سمجھ میں آئے گا بس کروں گا۔ پھر آپ لوگ مجھ سے شکایت مت کیجیے گا۔" آخر میں وہ دھمکیوں پر اتر آیا۔

"جاؤ جو جی میں آئے کرو' مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں۔ ہاں بھئی فریدہ' میں نے تم سے فلاور ارینج منٹ کا کہا تھا وہ..." تابندہ اسے مکمل نظرانداز کرکے فون پر مصروف ہوگئیں۔ وہ احتجاجاً پیر پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

اور پھر سو برسی پروین اور ان کے گریس فل سے میاں صاحب کی آمد بھی ہوگئی۔ تمام افراد خانہ جس وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھے بات چیت میں مشغول تھے' ایان زری کے سر پر پہنچ کر بولا۔

"دھیان سے میری بات سنو۔"

"جی ایان صاحب بولیں۔" وہ مصروف انداز میں چائے کے کپ ٹرے میں سیٹ کرتی رہی۔

"مگر یاد رہے یہ بات بہت راز کی ہے اور تمہیں اس راز کی مرتے دم تک حفاظت کرنی ہے۔" اس کا انداز پُراسرار تھا۔ زری چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"ایسی بھی کیا بات ہے ایان صاحب۔"

"یہ بے ہوشی کی دوا ہے۔ اس نے ایک شیشی آگے بڑھائی، یہ تمہیں چائے میں ملا کر مہمانوں کو دینی ہے۔"

"خدا کا خوف کریں ایان صاحب۔" زری بدک کر بولی۔

"زیادہ نیک پروین نہ بنو، جو کہہ رہا ہوں خاموشی سے کرو۔"

"بہت خوب ایان۔ یہ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو تم۔" عقب سے آتی تابندہ کی کھڑکتی آواز پر وہ اچھل پڑا۔ پھر زبردستی مسکرا کر بولا۔

"مام آپ! وہ تو میں زری کو چیک کر رہا تھا کہ یہ کتنی ایماندار ہے۔" اس نے آئیں بائیں شائیں والے لہجے میں کہا۔

"بہتر ہے کہ تم اپنی بونگیاں چھوڑ کر سیدھی طرح سے آکر ہمارے درمیان بیٹھو اور زری۔ تم فٹافٹ چائے سرو کرو۔" پکڑا گیا تو کیا ہوا۔ مگر اس نے پھر بھی ہار نہ مانی اور ایک عزم سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا جہاں محفل جمی ہوئی تھی۔

"اتنی سی تھی جب دیکھا تھا، ماشاء اللہ اب تو ایمن بیٹی بہت خوب صورت ہو گئی ہے۔" پروین پیار سے اس کی ٹھوڑی چھو کر بولیں۔

"خوب صورتی تو اللہ کی دین ہے۔ اصل خوبی تو اخلاق کی ہوتی ہے۔ صورت پریوں جیسی، اخلاق چڑیلوں والا ہو تو کیا فائدہ ایسی خوب صورتی کا۔" جلے بھنے ایان نے لقمہ دیا۔

"ارے، پروین بے ساختہ ہنس دیں۔ کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔"

اس کی بات پر ایمن نے پہلو بدلا تھا۔ امجد بھی سنجیدہ سے ہو گئے۔

"اور ینگ مین۔ تم کیا کرتے ہو۔" الیاس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"پہلے اسٹرگلنگ سنگر تھے۔ اب اپنے ڈیڈ کا کاروبار سنبھال رہے ہیں۔" داؤد نے متانت سے بتایا۔

"آپ لوگ یہ سموسے تو لیں نا۔ ایمن نے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہیں۔" تابندہ نے ایان کا بنتا بگڑتا منہ دیکھ کر سب کی توجہ اس پر سے ہٹانے کی خاطر کہا۔ مگر یہ ایان۔

"واہ بھئی ایمن، بڑی پھرتیلی ہو۔ ویسے تو ایک نمبر کی کام چور ہو مگر مہمانوں کے لیے اتنی محنت کرلی۔ آئم امپریسڈ۔" اس نے آنکھیں معصومیت سے پٹپٹاتے ہوئے کہا۔

"سو سویٹ بیٹا۔ ہمارے لیے اتنا تردد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" پروین مزید اس پر نثار ہو چلیں۔ ایان منہ ہی منہ کچھ بڑبڑانے لگا۔ ایمن خون آشام نگاہوں سے ایان کو گھور رہی تھی جبکہ داؤد ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں بے حال دکھائی دیتا تھا۔

☼ ☼ ☼

اور پھر اس نے ہر حربہ آزما کر دیکھ لیا۔ ہر طرح سے کوشش کر کے دیکھ لی۔ مگر کسی نے اس کی بات نہ سنی تو مانتے کیسے۔

"میں ہار گیا، میرے یار میں ہار گیا۔" کل ایمن کا نکاح تھا۔ اور رات اس نے معصوم کے سامنے یہ اعتراف کیا۔ وہ سر نیہوڑائے ٹیرس کی ٹھنڈی زمین پر بیٹھا آنسو بہانے کی تیاری کر رہا تھا اور معصوم کا دل اس کی بکھری حالت دیکھ کر کٹا جاتا تھا۔

"صبر کریں ایان بھائی۔ صبر کا اللہ نے بہت اجر رکھا ہے۔" وہ اس کے قریب بیٹھا دلاسے دے رہا تھا۔

"قربانی اللہ کے محبوب بندے ہی دیا کرتے ہیں۔ حوصلہ رکھیں اور اپنی محبت کو خوش دلی سے کسی اور

کے حوالے کر کے تاریخ رقم کردیں۔ پھر یہ بھی تو دیکھیں ایمن باجی کتنی خوش ہیں۔" وہ اپنے طور پر تو اسے تسلیاں ہی دے رہا تھا۔

"تم اپنی بکواس بند نہیں کر سکتے۔" ایان دہاڑا تو وہ روہانسا ہو کر بولا۔

"مجھے کیوں ڈانٹ رہے ہیں میں تو صرف یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ داؤد بھائی نے خود انہیں ساتھ لے جا کر شاپنگ......"

"تیری تو۔" ایان نے رونا دھونا بھول کر بے ساختہ ہی اس کی گردن دبوچی تھی۔

☼ ☼ ☼

نکاح کی تقریب کا انتظام لان میں کیا گیا تھا۔ سرخ اور سفید تازہ گلابوں سے مزین لان کی سجاوٹ قابل دید تھی۔ فینسی لائٹس نے ماحول کو جگمگا رکھا تھا۔ سلطانہ بانو بادامی نفیس سی کڑھائی والے جوڑے میں بڑی سرشار لاؤنج کے صوفے پر بیٹھی بڑی دلچسپی اور شوق سے گھر میں ہوتی گہما گہمی کو دیکھتی تھیں اور بار بار اپنی ضعیف آنکھوں میں در آتے خوشی کے آنسوؤں کو پونچھتی تھیں۔

گہرے سبز اسٹائلش سے ٹراؤزر شرٹ میں تابندہ بھی بڑی مصروف سی دکھائی دیتی تھیں۔ پنک اور لائٹ پرپل جوڑے میں ملبوس پروین بھی ان کا ساتھ دے رہی تھیں۔

اندر کمرے میں موجود ایمن کو بیوٹیشن تیار کر کے جا چکی تھی۔ فان اور گولڈن نفیس کام سے مزین ٹخنوں کو چھوتے فراک پاجامے میں اس کے سراپے کی چھب ہی نرالی تھی۔ ڈیپ ریڈ گولڈن پٹی لگا دوپٹا سر پر ٹکا تھا۔ چھوٹا سا گولڈن یاقوت جڑا ٹیکا۔ اور گولڈن ہی بڑے بڑے بالے نما جھمکے۔ وہ بڑی سرشاری سے آئینے میں خود کو دیکھ رہی تھی۔

"حد کرتے ہو تم ایان۔ ابھی تک تیار نہیں ہوئے مہمان بس آنے ہی والے ہیں۔ شاباش میرا بیٹا ہمت سے کام لو اور جلدی سے تیار ہو کر باہر آؤ۔ حالات کو فیس کرتے ہیں میری جان یوں منہ چھپا کر نہیں بیٹھتے ہیرو لوگ۔" تابندہ کوئی پانچویں بار اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ وہ جو بیڈ پر اوندھا پڑا تھا اٹھ کر شاکی نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگا۔

"معصوم کچھ تم ہی سمجھاؤ اسے ایسے تو اس کی حالت کا تماشا بن جائے گا۔" وہ اس کی نگاہوں سے نگاہیں چرا کر کونے میں کھڑے سفید کرتے شلوار میں ملبوس معصوم کی جانب متوجہ ہو کر بولیں اور "مجھے کام ہے تم لوگ باہر آؤ" کہہ کر چل دیں۔

"بالکل دلہوں والی شیروانی پسند کی ہے بی بی نے آپ کے لیے۔ قسم سے پہن لیں۔ سب ہی سمجھیں گے کہ آپ ہی دولہا ہیں۔" معصوم نے اسے پچکارا۔

"اللہ کرے داؤد اغوا ہو جائے۔ یا پھر اچانک اس کی کوئی بیوی یہاں آ کر سیاپا ڈال دے یا پھر اس کی یادداشت کھو جائے اور وہ مخبوط الحواس ہو جائے یا۔" ایان نے دونوں ہاتھ اٹھا کر بددعائیں دینا شروع کر دیں۔

"بس بھی کریں ایان بھائی ابھی تو آپ خود سودائی لگ رہے ہیں۔ اب سمجھائیں اپنے دل کو اگر آپ پہلے ہی اپنے اس شوق کی قربانی دے دیتے تو آج یوں ایمن باجی کو قربان ہوتا نہ دیکھ رہے ہوتے۔"

"ہاں تم ٹھیک ہی کہتے ہو شاید۔" وہ یک دم خاموش ہوا اور شیروانی اٹھا کر تھکے تھکے سے انداز میں کپڑے بدلنے چل دیا۔

☼ ☼ ☼

"کالی شیروانی جس کے فقط کالر پر نفیس سی گولڈن کڑھائی کی گئی تھی۔ میچنگ کھسہ۔ خوب صورت ہیئر کٹ۔ ہلکی ہلکی شیو۔ سنجیدہ تاثرات اور بجھی ہوئی آنکھیں۔

سیڑھیوں سے مرے مرے قدموں کے ساتھ لاؤنج میں اترتا ایان حلیے سے ضرور دلہا دکھائی دے رہا تھا مگر تاثرات سے نہیں۔ اس نے اترتے سمے ایک طائرانہ نگاہ لاؤنج پہ ڈالی جہاں سب ہی افراد خانہ

موجود تھے۔ اور تو اور چمکتی، لشکتی دلہن بیگم بھی بڑے طمطراق سے وہیں براجمان تھیں۔

دل میں اک ٹیس سی اٹھی، بڑھتے قدم ٹھہر گئے۔ عقب سے معصوم نے کندھا تھپک کر گویا حوصلہ رکھنے کی تلقین کی مگر یک دم ہی کہیں سے بلیو کرتے شلوار میں خوش باش سے داؤد نے سامنے سے آکر ایان کو یوں گلے لگایا جیسے کب کا بچھڑا ملا ہو۔

"اب تو ناراضی ختم کردو دوست۔ آج تو بے حد خوشی کا موقع ہے۔" ایان اس کے والہانہ انداز پر دم بخود تھا۔ (اس کی یہ "ہمت")

"ہاں برخوردار شکل پر بارہ کیوں بجا رکھے ہیں۔ بھئی ہنسو، مسکراؤ۔" ڈارک گرے نفیس سے کرتے شلوار میں امجد بھی آگے بڑھے۔ (آہ۔ ظالم سماج)

"ہم۔ میں ٹھیک ہوں۔" اس نے ناچار مسکرا کر کہا۔ جبکہ دل رونے کو چاہ رہا تھا۔

"ارے آپ لوگ جلدی کیجیے۔ مولوی صاحب آتے ہوں گے نکاح کا وقت نکلا جا رہا ہے۔" تابندہ نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ ان کے نرغے میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا لاؤنج کے صوفوں تک چلا آیا۔ ان سب کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ سجی تھی۔ وہ الجھ گیا۔

"آپ سب مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟" کنفیوژن سے سوال کیا۔

"لے لو۔" سلطانہ قربان جانے والے لہجے میں مسکرا کر بولیں۔ "ہائے میرا معصوم بچہ۔ نہیں سمجھا۔" ان کی بات پر دلہن بیگم کے گلگلوں لبوں پر بھی مسکراہٹ چمکی۔

"میں کیا نہیں سمجھا۔ کیا ہو رہا ہے یہ سب" وہ ایک دم سے ہونق بن گیا۔

"ایک منٹ میں سب سمجھاتا ہوں۔ مگر پہلے اس سے تو ملو۔" داؤد اپنے عقب میں چھپی گلابی لباس میں ملبوس خوب صورت اور طرح دار حسینہ کو آگے لاتے ہوئے بولا۔

"کون ہے یہ لڑکی۔" صدمے سے بھرپور آواز (ایان کی)

"کہیں آپ لوگ میرا نکاح زبردستی اس لڑکی کے ساتھ تو نہیں کروا رہے۔" وہ ہوش میں آگیا تھا جیسے۔

"اوہ تو ایان، داؤد مسکرا دیا۔ یہ اریبہ ہے میری ہونے والی بیوی۔ مائے فرسٹ لو۔" داؤد نے جذبے لٹاتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"مگر تم تو ایمن سے۔ میرا مطلب ہے کہ آج تو تمہارا نکاح۔" مارے حیرانی کے اس کے منہ سے بے ربط سے جملے نکلے۔

"نہیں ایان۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں شروع سے بتاتا ہوں۔ ہاں معصوم کی یہ بات سچ ہے کہ میری پاکستان آمد کا مقصد صرف عید کرنا ہی نہیں تھا۔ میں یہاں اریبہ کے لیے آیا تھا۔ اس کی اور میری دوستی فیس بک پر ہوئی اور بعد میں یہ دوستی دل کے رشتے میں بدل گئی۔ مگر یہاں وہی روایتی صورت حال ہو گئی کہ "آوارہ فارنر" لڑکے سے اسے بچانے کے لیے اس کے گھر والوں نے اس کی شادی طے کر دی۔ میں بہت فکر مند ہو کر پاکستان آیا مگر بات بنتی دکھائی نہ دی۔ کچھ سوچ کر میں نے ایمن سے سب ڈسکس کیا اور اس پیاری لڑکی نے میرا مکمل ساتھ دیا، نہ صرف اریبہ کے گھر والوں کو میرے حق میں ہموار کیا بلکہ ہمیں منسوب کروا کر شادی کی تاریخ تک طے کروا دی۔ اب اتنی پیاری لڑکی کی مدد کرنا میرا اخلاقی فرض بنتا تھا نا، بس اسی لیے اس کی بلکہ سارے گھر والوں کی مشترکہ پریشانی یعنی تمہاری غیر سنجیدگی کو سنجیدگی میں بدلنے کے لیے بس چھوٹا سا اسکرپٹ اسٹیج کرنا پڑا اور دیکھ لو ہماری مشترکہ کوششیں آخر کار رنگ لے ہی آئیں۔" وہ بڑے مزے سے کہتا چلا گیا۔ ایان بے یقینی سے آنکھیں پھاڑے اسے یک ٹک دیکھ رہا تھا۔

"مگر میں نے تو خود اپنے گنہگار کانوں سے۔" معصوم نے کہنا چاہا۔

"وہی سنا جو ہم نے سنوایا میاں! ہم تمہاری کن سوئیاں لینے والی عادت سے خوب واقف ہیں۔" امجد نے مسکرا کر کہا تو معصوم کھسیا گیا۔

"تم۔ تم داؤد" یک لخت ہی پتھر بنے ایان میں جان پڑی۔ اور اس نے لپک کر داؤد کو گلے سے لگالیا۔

"مجھے معاف کردو میرے بھائی میں نے تمہیں کتنا غلط سمجھا تھا۔" شدتِ جذبات سے اس کی آواز کانپ کانپ گئی۔

"ارے اب ختم کرو۔ باہر مہمان آچکے ہیں۔ قاضی صاحب کا تو پتا کرو اور کتنی دیر کرنی ہے۔" سلطانہ نے اچانک کہا۔ سب الرٹ ہو گئے۔ اور ہنستے مسکراتے باہر نکلنے لگے۔ تب ہی جان بوجھ کر سب سے پیچھے رہ جانے والے دولہا نے اریبہ کے ساتھ باہر نکلتی اپنی دلہن کا ہاتھ پکڑ کر روکا۔

"نیور مائنڈ۔ مگر صرف دو منٹ۔" کندھے اچکا کر مسکراتی ہوئی اریبہ باہر نکل گئی۔

"اونہوں۔ کیا مسئلہ ہے ہاتھ چھوڑو میرا۔" گالوں پر شفق پھوٹنے لگی تھی۔ ایمن نے شرم کو جھلاہٹ کے پردے میں چھپایا۔

"اتنی آسانی سے نہیں چھوڑوں گا جانم۔ آخر کو اپنا دیرینہ خواب "قربان" کر کے تمہیں پایا ہے۔" وہ بڑی میٹھی نگاہوں سے اسے تک رہا تھا۔

"رہنے دو۔" وہ نروٹھے پن سے بولی۔ تب ہی اتنے بارے ہوئے انداز میں میرے اور داؤد بھائی کے نکاح میں شریک ہونے کے لیے تشریف لا رہے تھے۔"

"تو کیا کرتا اور۔ تم سب نے مل کر مجھے بے وقوف ہی اس طرح بنایا تھا۔ اور پھر کچھ معصوم کے اقوالِ زریں کا اثر۔ وہ مجھے مسلسل ایثار و قربانی کے فضائل پر اتنے لیکچر پلا رہا تھا کہ مجھے لگا اگر تمہاری بہتری داؤد کے ساتھ ہے تو مجھے رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔" وہ اتنے بے ساختہ و بے ریا لہجے میں بولا کہ ایمن کو اس پر بے ساختہ فخر محسوس ہوا۔

"تم بہت اچھے ہو ایان" اس نے شرمگیں مسکراہٹ سے کہا، "تمہیں خوامخواہ تمہارے اس شوق نے اسپائل کر رکھا تھا مگر شکر ہے اب سب ٹھیک ہو گیا۔"

"ہاں تم بھی مل گئیں اور میں جانتا ہوں تمہیں میری سنگنگ پر کوئی اعتراض بھی نہ ہو گا۔" اس نے بڑے اٹھلاتے ہوئے کہا۔

"ایان۔" ایمن نے بوکھلا کر کہا۔

"ابھی بھی وقت ہے میرے پاس، اگر تم نے دوبارہ یہ بات کی تو میں تم سے نکاح کرنے سے صاف انکار کردوں گی۔" وہ دھمکانے لگی۔

"ارے۔ ارے" اس نے ایمن کے کڑے تاثرات دیکھ کر جلدی سے کہا۔ "میں تو مذاق کر رہا تھا ڈیئر بھلا، قربان کر دینے والی چیز کو بھی کبھی کوئی واپس لیا کرتا ہے۔" اس نے کہا۔ تو ایمن بے ساختہ ہنس پڑی۔ اسے مسکراتے دیکھ کر ایان نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا تھا۔

اندھیرا چھٹ چکا تھا۔ ستاروں سے سجی کہکشاں ان کی منتظر تھی۔

فرح طاہر

گڈی کا اضطراب دیدنی تھا۔ وہ بے چینی سے صحن میں چکرائی پھر رہی تھی حالانکہ اچھی طرح جانتی تھی کہ فائق دو گھنٹے سے پہلے آنے والا نہیں مگر پھر بھی....

آج وہ آفس سے جلدی گھر آگئی تھی۔ عموماً" اس وقت میرا کمرہ ٹیوشن کے بچوں سے بھرا ہوتا تھا.... مگر آج زیادہ تر بچے جا چکے تھے.... دو چار ہی رہ گئے تھے اور ان کا دھیان بھی پڑھائی کے بجائے گڈی کی طرح اس قربانی کے جانور میں اٹکا تھا جسے فائق خریدنے گیا ہوا تھا۔

"باجی! آپ کے گھر بکرا آئے گا؟"

"آں...." میں خیالات سے چونکی.... پانچ سالہ جواد مجھ سے بڑی معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں.... بکرا بھی آئے گا اور گائے بھی۔"

"گائے بھی!" جواد کے ساتھ ساتھ علینہ کی بھی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھیلیں۔

"ہم بھی اگلی دفعہ قربانی کریں گے.... میری اماں نے بتایا ہے۔" وہ شرماتے ہوئے بولا تو میں نے اس کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھا۔

میرے پاس جتنے بھی بچے پڑھنے آتے تھے وہ سب غریب گھروں سے تعلق رکھتے تھے۔ سرکاری اسکولوں میں پڑھتے تھے اور ان کے ماں باپ کی اتنی حیثیت نہ تھی کہ وہ ان کے ٹیوشن کی فیس ادا کرتے.... ہم الحمدللہ خوش حال تھے۔ فائق اچھے عہدے پر تھا۔ گڈی کی تنخواہ بھی پانچ ہندسوں پر مشتمل تھی.... میں ان سب بچوں کو اسکول سے آنے کے بعد فری ٹیوشن دیتی تھی۔ میں ایک اچھے پرائیویٹ اسکول میں پرنسپل تھی۔

"پھر میں سب کے گھر گوشت دینے جاؤں گا۔"

جواد نے بات مکمل کی۔ اس تصور سے ہی اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اور میں جانتی تھی کہ یہ اگلا سال کم از کم اگلے پندرہ سالوں تک آنے والا نہیں۔

"ہاں تو ہماری گائے کا گوشت بھی تو تم ہی لوگ بانٹو گے.... میں سب کے گھر تم ہی سے بھجواؤں گی۔"

"ہیں باجی! سچ میں۔" جواد جوش سے بولا تو علینہ کی آنکھیں بھی جگمگا اٹھیں۔

"میں بھی دینے جاؤں گی...."

"ہاں تم بھی جانا۔" میں نے مسکرا کر اس کا گال تھپتھپایا۔

"باجی! تم سب سے پہلے کسے گوشت دو گی۔" مدقوق سی صالحہ نے پوچھا تو جواد نے اسے فوراً" گھر کا۔

"سب سے پہلے فریج میں گوشت رکھتے ہیں.... ہیں نا باجی.... آپ بھی فریج میں رکھو گی نا...."

"نہیں۔" میں نے قطعیت سے کہا۔ "سب سے پہلے میں تم سب بچوں کے گھر گوشت بھیجوں گی بلکہ خود دینے آؤں گی.... اس کے بعد سارا گوشت تم لوگ سب کے گھروں میں دے کر آؤ گے۔" یہ سن کر جواد مسکرانے لگا.... دوسرے بچے زور و شور سے منصوبہ بنانے لگے کہ کون کس کے گھر گوشت دینے جائے گا۔

ان سب آوازوں میں سب سے بلند آواز گڈی کی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ساتھ والوں نے اس بار قربانی کے لیے بڑی سی گائے لی ہے.... دیکھنا اس بار وہ ہمیں بھی گوشت کا

حصہ دیں گے۔۔۔ پھر ہم اس کے شامی کباب بنائیں گے۔" گڈی خوش ہو کر بولی۔

"اونہہ تم اور تمہارے شامی کباب۔۔۔ یہ ساتھ والے اتنے کنجوس ہیں کہ اپنی گائے کی ایک بوٹی بھی ہمیں نہیں دینے والے۔۔۔ پھر بھی اگر یہ کنجوس دے دیں تو بنوا لینا تم اپنے شامی کباب۔۔۔" اس کا دل توڑنے کے بعد وہ جھوٹی تسلی کا کونا اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے جوش سے بولا۔

"ناصر انکل نے کہا ہے پہلے روزان کے گھر آجاؤں پھر وہ مجھے بکرے کے سری پائے دیں گے کتنے مزے دار ہوتے ہیں نا سری پائے۔" بیو نے مزہ لے کر کہا۔

اور میں۔۔۔ اچھی طرح جانتی تھی کہ ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔ اور یوں بھی غریبوں کو کون پوچھتا ہے۔ خوش گمانیوں کی انتہا ہونے لگتی۔ ایسے میں ہماری اماں ہمیشہ کی طرح خاموشی سے اٹھ جاتیں۔

آج بھی وہ اٹھ کر مٹی سے لیے ہوئے باورچی خانے میں چلی گئیں۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چلی مگر باورچی خانے میں داخل ہوتے ہوتے رک گئی۔ اماں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ سے کچھ مانگا تھا پھر منہ پر ہاتھ پھیر کر توری کا شاپر سامنے رکھے اب اس میں سے پکانے کے لیے توری نکالنے لگی تھیں جو ابا شام کو لے کر آئے تھے کیونکہ شام کو سبزیاں سستی ملتی ہیں اماں نے شاپر اٹھایا اور بڑے سے تھال میں شاپر کو الٹ دیا۔

آدھی کٹی ہوئی اور چھوٹی چھوٹی توریاں تھال میں یہاں وہاں لڑھک گئیں توریوں کی چھانٹی کرتی اماں کی آنکھ سے یکایک ایک آنسو نکلا اور رخسار سے بہتا ہوا نجانے کون سی توری میں جذب ہو گیا۔۔۔ ہمیشہ مطمئن نظر آتی اماں کی آنکھ سے نکلے آنسو نے میرے دل میں الجھن پیدا کر دی۔۔۔ میں پلٹ تو آئی۔۔۔ مگر۔ بہت دیر تک الجھتی رہی کہ جب اماں پیاز کاٹ ہی نہیں رہی تھیں تو ان کی آنکھ سے آنسو نکلا کیوں۔۔۔؟

مگر جب رات کو کھانے میں ابا نے کہا کہ توری میں نمک زیادہ کیسے ہو گیا تو میں چونک اٹھی۔

"اماں کے آنسوؤں نے سالن کو نمکین کر دیا۔"

سالن میں نمک زیادہ ہو جانے کی بدولت سب نے بھوک کے باوجود کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔۔۔ اماں نے چپ چاپ اس وقت تو سارے برتن سمیٹ لیے مگر صبح سویرے اٹھ کر اپنے جادوئی ٹوٹکوں میں سے ایک ٹوٹکا استعمال کرتے ہوئے انہوں نے آٹے کا چھوٹا سا پیڑا گرم سالن میں ڈال کر کچھ اس طرح چمچ ہلایا کہ سالن کا سارا فالتو نمک اس پیڑے کے ساتھ لپٹتا چلا گیا۔۔۔ جس کی وجہ سے ناشتے میں سب نے شوربے والی توری کے اس سالن کو اس لیے بھی پیٹ بھر کر کھا لیا۔۔۔ کیونکہ انہیں پتا تھا کہ اب اگلے کھانے میں انہیں توری کے چھلکوں سے بنے ہی سہی مگر کھانے میں شامی کباب ملنے والے تھے۔

توری کے چھلکوں کے شامی کباب۔۔۔

جنہیں اماں توری کے چھلکوں سے بالکل اس طرح

بناتیں جس طرح قیمے سے بنائے جاتے ہیں... بس وہ یہ کرتیں کہ قیمے کی جگہ توری کے اترے چھلکوں کو دھو کران میں چنے کی دال ڈال کران میں ذرا سا پانی ڈال کر ابالتیں۔ جب وہ ابل جاتی تو ان کو پیس کر بڑی لگن سے انہیں کباب کی شکل دیتیں پھر انہیں فرائی کر کے ہمیں خوش کرنے کو شامی کباب کا نام دے کر چٹنی کے ساتھ کھانے کے لیے پیش کر دیتیں۔

ہماری اماں ایسی ہی تھیں۔ انوکھی اور نرالی... وہ ہماری چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے ہمیشہ باخبر رہتیں۔

اس لیے جب بھی رات کے کھانے کے بعد روٹی بچ جاتی تو وہ اگلے دن بڑی فرصت سے بیٹھ کر اس باسی روٹی کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں توڑ کر چھابڑی میں پھیلا کر دھوپ میں سوکھنے کے لیے رکھ دیتیں اور پھر آہستہ آہستہ جب دھوپ میں سینکے روٹی کے ان ٹکڑوں کی تعداد بڑھ جاتی تو اماں پہلے تو انہیں کوٹتیں... پھر ان کی چھان پھٹک کرنے کے بعد وہ انہیں بڑی سی پتیلی میں ڈال کر آگ میں ذرا دیر کو بھونتیں۔ اس کے بعد انہیں ذرا دیر کے لیے پانی میں بھگو دیتیں۔ جب وہ اچھی طرح پانی میں پھول جاتے تو کئی دن کے بچے کھچے سارے سالن ایک جگہ مکس کرنے کے بعد مسالا بنا کر ان ٹکڑوں کو پانی سے نکال کر مسالے میں ڈال کر دیگچی کا ڈھکن بند کر دیتیں... ڈھکن بند کرنے سے پہلے وہ ان میں زیرہ ڈالنا ہرگز نہیں بھولتی تھیں۔ اور پھر تھوڑے سے انتظار کے بعد جب پانی خشک ہو جاتا تو وہ حلیم کی صورت اختیار کیے ہوئے ان ٹکڑوں کو پلیٹوں میں نکال کر ان پر کتری ہوئی ہری مرچ اور گرم مسالا چھڑک کر ہمیں کھانے کو دیتیں تو گویا ہماری عید ہو جاتی۔

اور پھر جب عید آنے لگتی تو اماں کترنوں کا وہ تھیلا الٹ کر بیٹھ جاتیں جسے پورے سال میں ابا نے اپنے درزی دوست سے چھوٹی بڑی رنگ برنگی کترنیں لا لا کر بھر دیا تھا... اماں ساری کترنوں سے ڈیزائننگ کر کے ہمارے عید کے جوڑے تیار کر دیتیں... جبکہ سفید کترنوں سے اماں فائق کے لیے کلی والا کرتا سینے بیٹھتیں تو نئے جوڑے کے چاؤ میں باؤلا ہوتا فائق (پپو) اس وقت تک اماں کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھا رہتا جب تک کہ کرتا سل نہ جاتا... اور جب کرتا سل جاتا تو وہ کرتے کو اپنے ساتھ لگا کر ہمیں لہک لہک کر دکھاتا...

اور پھر جب ہمیں نئے جوڑوں کے ساتھ نئی جوتیوں کا خیال ستانے لگتا تو ہم عمرو عیار کی زنبیل سے ہماری ساری مشکلوں کا حل نکالنے والی اماں کے سر ہو جاتے... تب چاند رات سے دو' تین دن قبل اماں واقعی اپنی زنبیل سے وہ گلک برآمد کرتیں جس میں انہوں نے سال بھر چپکے چپکے پیسے جمع کیے ہوتے تھے۔ تب ہم سب اشتیاق کے عالم میں ان کے گرد جمع ہو جاتے تو وہ بڑی پیاری سی مسکراہٹ لبوں پہ سجا کر بڑی احتیاط سے چھری کی مدد سے پلاسٹک کے گلک کا منہ کھولتیں اور سارے پیسے باہر نکال کر پہلے انہیں گنتیں... پھر ان میں سے کچھ پیسے اماں' ابا کو ہماری اور خود ابا کی جوتی لانے کو دے دیتیں... تب ہم رگڑ رگڑ کر پاؤں دھونے کے بعد بہت جوش سے ابا کے ہمراہ جوتی لینے نکل پڑتے... جوتی لینے کے بعد گویا ہماری عید کی تیاری مکمل ہو جاتی۔

مگر ابا کے جوتے کی نئی نویلی جوڑی دیکھ کر ہمیں ایک دم ابا کے نئے جوڑے کا خیال آنے لگتا... مگر اس سے پہلے کہ ہم اماں سے اس متعلق کوئی سوال کرتے... اماں' ابا کا وہ جوڑا جسے ہم نے انہیں پچھلے دو' تین سالوں میں بس خاص خاص موقعوں پر پہنتے دیکھا تھا نکال کر پہلے اسے بلیچ میں کچھ دیر بھگوتیں پھر اسے بلیچ سے نکال کر خوشبو والے سرف سے دھو کر دھوپ میں خشک ہونے کو ڈال دیتیں... اور جب وہ خشک ہو جاتا تو اماں اس جوڑے میں خوب سارا کلف لگا کر اس پر جما جما کر استری کرنے کے بعد ابا کے پہننے کے لیے بھی بالکل نئے جیسا جوڑا تیار کر دیتیں۔ اپنی ساری تیاریاں مکمل کرنے کے بعد ہم بڑی بے چینی سے عید کا انتظار شروع کر دیتے...

اور پھر عید آ جاتی... تو ہم صبح سویرے نہا دھو کر استری کیے نئے جوڑے اور جوتیاں پہننے کے بعد پہلے تو

ابا کے ساتھ گلی کی مسجد میں عید کی نماز ادا کرتے.... اس کے بعد عیدی کے طور پر ابا سے پچاس کا کرارا نوٹ وصول کرتے.... پھر بہت قیمتی خزانے کی مانند پچاس کے نوٹ کو مٹھی میں دبا کر خوشی کے عالم میں قلانچیں بھرتے ہوئے شمسو چاچا کی دکان پر جا پہنچتے۔ پہلے تو سمجھ میں ہی نہ آتا کہ آخر پچاس کے اتنے بڑے نوٹ کو خرچ کریں تو کریں کہاں ؟؟؟

مگر پھر دوسرے بچوں کو مختلف چیزوں میں پیسے اڑاتا دیکھ کر پہلے تو ہم دس روپے کی کالی پلاسٹک کے شیشوں والی عینک خرید کر ناک پر چڑھا کر خود کو سلطان راہی سمجھتے ہوئے' دس روپے کی پلاسٹک کے چھروں والی پستول بھی خرید کر بڑے اسٹائل سے ہاتھ میں پکڑ لیتے .... پھر پانچ روپے کا میٹھا پان خرید کر منہ میں دباتے.... پھر بڑی شان سے پان چباتے ہوئے محلے کے بچوں کے ہمراہ قریبی پارک میں پہنچ جاتے۔

ناک پہ عینک' ہاتھ میں پستول.... منہ میں دبا پان.... اور چلیں .... کچھ دیر تو ہم بڑے اترائے اترائے سے پارک میں یہاں وہاں گھومتے پھر پارک میں لگی ریڑھی سے دس روپے کی چٹ پٹے دھی بھلوں کی پلیٹ پیٹ میں اتارنے کے بعد پانچ روپے کی کون والی آئس کریم اس طرح چاٹ چاٹ کر مزے لے کر کھاتے کہ جیسے اس سے بڑھ کر ہمارے نزدیک کوئی چیز مزے کی ہو ہی نہیں سکتی.... پھر دل جھولے لینے کے لیے مچل جاتا اور پھر ہم اس وقت تک جھولے لیتے رہتے جب تک ہماری دس روپے ختم نہ ہو جاتے اور پھر جب دس روپے ختم ہو جاتے۔ تب ہم منہ لٹکائے گھر لوٹ آتے....

اور پھر ہماری عید ختم ہو جاتی۔

رات کو پھر وہی روز کے کپڑے پہن لیے اور اماں ہمارے وہ نئے جوڑے اور جوتے لے کر بڑی عید پر پہننے کی خاطر سنبھال کر رکھ دیتیں.... عید کے بعد بڑی عید.... ہم پھر سے عید کا سن کر ایک بار پھر انتظار شروع کر دیتے.... پھر جوں جوں دن قریب آنے لگتے ہمارا جوش نئے جوڑے اور جوتے سے ہٹ کر آس پڑوس کے گھروں میں بندھے قربانی کے جانوروں کو دیکھ کر آسمان کو چھونے لگتا.... تب ہم شوق سے گلی سے گزرتے ہر جانور کے پیچھے اس وقت تک بھاگتے دوڑتے جب تک ہمارے پاؤں دکھ نہ جاتے....

تب ایک دن گڈی نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں دائیں بائیں پھیلاتے ہوئے اماں ابا سے سوال کیا تھا۔

"سب کے گھر بکرے آگئے ہیں۔ ہمارے گھر کب آئے گا؟"

اس کے لبوں سے نکلے سوال پر میری اور پپو دونوں کی ہی سوالیہ نظریں اماں کے چہرے پر جم گئی تھیں۔ جبکہ ابا اس طرح سر جھکائے کھانے میں رغبت ظاہر کرتے نوالہ توڑ کر شوربے میں ڈبو ڈبو کر کھانے میں مگن نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"تم لوگ دعا کرو پھر ہمارے گھر بھی بکرا آئے گا۔"

اماں دعا کی شرط لگا دیتیں۔ گڈی اسی وقت اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو دعا کے لیے اٹھا دیتی.... اور ہم سب اس کے لبوں کی خاموش دعا پر چپکے سے دل میں آمین کہتے وہاں سے اٹھ جاتے۔

اور پھر عید کے روز اپنے گھر قربانی نہ ہونے کی بنا پر قربانی کے جانور کے ذبح کا منظر دیکھنے کے شوق میں ہم پڑوس کے گھروں میں اس وقت تک کھڑے رہتے جب تک وہ سارا گوشت سمیٹ کر اندر نہ چلے جاتے .... جیسے ہی وہ اندر کی طرف بڑھتے.... ہم گھر آجاتے اور دیر تک ہمسایوں کے گھر سے گوشت آنے کی امید میں دروازے پر منتظر' نظر جمائے بیٹھے رہتے مگر ہمارا یہ انتظار' انتظار ہی رہتا۔ دوپہر ہونے لگتی تو اماں بنا کچھ ظاہر کیے' ابا کی لائی مسور کی دال کا شاپر اٹھا کر باورچی خانے کی طرف بڑھتیں۔

"عید کے روز دال...!" گڈی اور پپو دونوں کے منہ لٹک جاتے اور میں اس ساری صورت حال پر افسوس کرتی' خود کو مایوسی کے گہرے کنویں میں گرتا محسوس کرنے لگتی تو گھبرا کر اپنی اکلوتی سہیلی شبو کے گھر پہنچ جاتی....

"شبو تمہارے گھر گوشت آیا ہے کیا....؟" بظاہر

سرسری لہجے میں جو جاننے کی تمنا تھی شبو اس سے بخوبی واقف تھی۔ اس لیے وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے ہمراہ اپنے گھر کے چھوٹے سے باورچی خانے میں لے آئی...

"یہ دیکھ ہمارے گھر کتنا سارا گوشت جمع ہو گیا ہے" آگے بڑھ کر اس نے بڑی چھوٹی کئی تھالیوں سے کپڑا ہٹا کر گوشت کے چھوٹے چھوٹے پہاڑ دکھائے تو میری آنکھیں واقعی حیرت سے پھٹ سی گئیں۔

"مگر میرے گھر تو گوشت کی ایک چھوٹی سی بوٹی تک نہیں آئی..." افسوس سے زیادہ میرے انداز میں حیرت نمایاں تھی۔

"کیونکہ تم غریب ہو... اور غریبوں کے گھر کوئی گوشت نہیں دیتا۔" میری حیرت سے مزہ لیتے ہوئے اس نے کہا تو مجھے اس کا انداز حد درجے برا لگا۔

"اگر ہم غریب تھے تو وہ کہاں کی امیر تھی... ہماری ہی طرح کا دو کمروں کا گھر تھا اس کا اور اس کے ابا بھی تو وہیں مزدوری کرتے تھے جہاں میرے ابا مزدوری کرتے تھے...

"پھر وہ ہم سے الگ اور انوکھی کہاں سے ہو گئی..."

اس نے شاید میرے تاثرات سے میرے اندر ابھرتے سوالوں کو پڑھ لیا تھا۔ اس لیے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس نے کہا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے یہ سارا گوشت محلے داروں نے ہمارا دروازہ بجا بجا کر ہمیں دیا ہے...؟" بڑا طنزیہ سا انداز تھا اس کا... میں کچھ بھی نہ بول سکی۔

"میں نے کہا ہے نا 'غریب کے گھر کوئی گوشت نہیں دیتا...'" اس نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا پھر بولی۔

"غلط نہیں کہہ رہی ہوں میں... میری اماں کہتی ہے 'یہ سارے امیر' جتنے بڑے بڑے گھروں میں رہتے ہیں۔ اتنا ہی چھوٹا دل ہوتا ہے ان کا... یہ دیتے بھی اپنے ہی جیسے ان لوگوں کو ہیں۔ جن سے واپسی میں کچھ بڑھ کر ملنے کی امید ہوتی ہے۔ اب تم خود بتاؤ۔ ایسے میں ہم جیسے غریب لوگوں کو دے کر ان کو واپسی میں کیا مل جانا ہے؟ چہرے پر سجی تشکر آمیز مسکراہٹ... اور دل سے نکلی دعا۔ جس کی یہاں کسی کو ضرورت نہیں ہے۔" تفصیل سے بولتی شبو کے تاثرات آخر میں بڑے عجیب سے محسوس ہوئے تھے۔

"پھر یہ گوشت کا ڈھیر۔" میں نا سمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔ "گوشت کا یہ ڈھیر ابا نے خود لوگوں سے مانگ کر جمع کیا ہے... خود ان کے پاس جا کر ان سے شاپر لے کر آئے ہیں ابا... تب کہیں جا کر یہ اتنا گوشت جمع ہوا ہے ورنہ آس پڑوس کے سارے گھروں میں قربانی ہونے کے باوجود ہم گوشت کے انتظار میں دن ڈھلے تک بھوکے بیٹھے تھے۔" وہ ہنس ہنس کر مزہ لیتی ہوئی اپنے ابا کے کارنامے کا ذکر کر رہی تھی۔

مجھے ایک دم... اس سے اس کی باتوں سے وحشت محسوس ہونے لگی۔ اس لیے اپنا ہاتھ چھڑا کر میں بھاگتے قدموں سے اس کے گھر سے نکلی تھی۔

"تمہارے ابا خود دار ہیں..." میرے کانوں میں شبو کی آواز گونجی تو بھاگتے قدموں کی رفتار میں ذرا سی کمی ہونے لگی۔

"تمہارے ابا بھوکے مر جائیں گے مگر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلا کر سوال نہیں کریں گے..." شبو کی اگلی بات نے میری سماعت پر اس زور سے دستک دی کہ میرا سر فخر سے اٹھ گیا۔

"ہم فقیر نہیں ہیں... ہم دال کھالیں گے مگر کسی سے کچھ نہیں مانگیں گے..." غریب کے پاس ایک اکلوتی خودداری ہی تو ہوتی ہے... اگر غریب اپنی اس خودداری کو بھی کھو دے... تو پھر کیا فرق رہ جائے گا غریب اور فقیر میں؟

"گائے آ گئی۔" میرے خیالات کے تسلسل کو جواد کی جوش بھری آواز نے توڑ دیا۔

سارے بچے ہڑبونگ مچاتے ہوئے صحن کی طرف بھاگے جہاں فائق گائے کو لے کر داخل ہوا تھا...

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابا کی دوا کا ٹائم ہو گیا تھا۔ میں کمرے سے نکلی تو صحن میں رونق لگی ہوئی تھی۔ بچے تمتماتے چہروں کے ساتھ گائے پر ہاتھ پھیر رہے تھے... گڈی صحن میں بچھی چارپائی کے پایوں کے ساتھ دونوں بکروں کو باندھ رہی تھی... اماں اور فائق کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس رہے تھے...

میں بھی مسکراتی ہوئی ابا کے کمرے میں داخل ہو گئی۔

☆

ہاجرہ ریحان

"کیا مطلب کہ اسے تیار کر دوں؟"
میں نے غصے سے تقریباً" بل کھاتے ہوئے علی سے سوال کیا۔۔۔ علی نے اب کی بار گلا کھنکھار کر دھیمے لہجے میں کہا۔

"آپا! ہمیں اس کی ضرورت ہے۔۔۔ بس آج اگر آج یہ اپنے گھر پر نہ ہوئی تو ہمارے پورے سال بھر کی محنت ضائع ہو جائے گی۔۔۔ پلیز آپ اس کو تیار کر دیں کہ وہ واپس جا سکے۔۔۔ پلیز آپا سمجھنے کی کوشش کریں۔"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے۔۔۔ اس جہنم میں دوبارہ جانے دوں۔۔۔ بتایا بھی ہے کہ وہ اب اس قابل ہی نہیں۔۔۔ تمہیں اس کی تکلیف کا احساس نہیں ہے۔۔۔ ہنسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔۔۔ ایسے میں اس کو لیٹنے بیٹھنے تک میں تکلیف ہے اور تم چاہتے ہو' وہیں بھیج دوں جہاں اس قدر وحشیانہ ظلم ہو تا رہا ہے اس پر۔۔۔؟"

میں ابھی اور بھی کچھ کہتی کہ علی کا فون بجنے لگا۔۔۔ علی اس وقت ایسی عجلت میں تھا کہ آدھی بات میں کسی نہ کسی سے فون پر رابطہ کر لیتا۔۔۔ یا کسی کا فون آجاتا۔۔۔ میں بھی اپنی جگہ جمی کھڑی تھی۔۔۔ جو علی چاہتا تھا میرے نزدیک ناممکن تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کچھ بھی ہو' میں علی کی کوئی بھی بات نہیں مانوں گی۔

یہی سب سوچ رہی تھی کہ کسی نے دھیرے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔۔۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو سحرش کسی نہ کسی طرح خود ہی آچکی تھی۔۔۔ مگر اس کے بال ابھی تک اجڑے بکھرے ہوئے سے تھے۔۔۔ مجھے اس کا چند لمحوں پہلے بستر پر تکلیف سے سر پٹخنا یاد آگیا۔۔۔ جس کے نتیجے میں سلیقے سے جوڑے میں بندھے اس کے لمبے بال کھل کر بکھر گئے تھے۔۔۔

"پلیز آپا۔۔۔ علی ٹھیک کہہ رہا ہے۔۔۔ میں اس جہنم سے نجات کے لیے ہی علی کا ساتھ دے رہی ہوں۔۔۔ میرے بال بنا دیں۔۔۔ اور اجازت دیں۔"

سحرش نے سنجیدگی سے کہا میں ایک لمحے کو حیران رہ گئی۔۔۔ کیا یہ وہی سحرش ہے جو اپنی شوخی اور شرارتی ہنسی کی وجہ سے پوری یونیورسٹی میں مشہور تھی۔۔۔ میں نے تھک ہار کر اسے ایک کرسی پر بٹھا دیا اور بہت احتیاط سے اس کے بال بنانے لگی۔۔۔ ہلکے سے جھٹکے پر بھی وہ تکلیف سے آنکھیں بند کر لیتی۔۔۔ ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے میں اس کی ہر آہ۔۔۔ کراہ کو نظر انداز کر کے بے ڈھنگے پن سے اس کے کندھے پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔۔۔ وہ تکلیف سے آہ بھرتی تو میں سمجھتی کہ وہ مکاری کر رہی ہے۔۔۔ مگر جب میرا ہاتھ اس کی بائیں ہنسلی کی ہڈی یعنی کالر بون پر پڑا تو وہ چیخ اٹھی۔۔۔ اس کی ہنسلی کی ہڈی ٹوٹ کر بیچ میں خلا پیدا کر گئی تھی۔۔۔ میرا ہاتھ بھی کانپ گیا۔۔۔ یہ نہایت تکلیف دہ اور مشکل حالت تھی۔۔۔ ہنسلی کی ہڈی کے ٹوٹنے پر پلاسٹر نہیں چڑھایا جا سکتا۔۔۔ دیکھنے والا کچھ سمجھ بھی نہیں پاتا جبکہ مریض کی تکلیف سے جان بھی نکل سکتی ہے۔

جب علی اسے میرے پاس معائنہ کے لیے لایا تھا تو وہ بڑی تکلیف سے چلتی معائنہ کے بستر پر جا بیٹھی تھی۔ میں اس وقت کسی اور مریض کو دیکھنے میں مصروف تھی مگر میں نے کن اکھیوں سے سب دیکھا کہ کس طرح علی اس کو ہر ایک قدم پر سہارا دے رہا تھا۔۔۔ اور بس وہیں میرے اندر غصے کی لہر دوڑ گئی تھی۔۔۔ اس لڑکی

نے علی کو تباہ کر دیا... مکمل طور پر ناکارہ کر دیا... مگر ابھی تک علی کا پیچھا نہیں چھوڑا... میرا بھائی اس لڑکی کے چکر میں کیا سے کیا ہو گیا... اور یہ ابھی تک تماشے بازی سے باز نہیں آئی۔

مریض کو فارغ کر دینے کے بعد میں سحرش کی طرف متوجہ ہوئی اور علی کو اشارے سے کمرے سے باہر بھیج دیا... سحرش اس وقت خلاف عادت سنجیدہ تھی... اس نے صرف اتنا ہی بتایا کہ وہ سیڑھیوں سے پھسلی اور اس کے بعد سے اپنا بایاں ہاتھ ہلانے جلانے سے قاصر ہے... میں نے چند لمحے اس کی شرٹ کو اوپر نیچے کیا تاکہ معائنہ کر سکوں۔ ہر بار جب بھی میں اس کی شرٹ کو گلے سے پکڑ کر اوپر نیچے کرتی اس کے ہاتھ اور ہنسلی کی ہڈی پر زور پڑتا اور وہ تکلیف... بلبلا جاتی۔

آخر کار میں نے اسے ڈانٹ دیا... "کیا بچوں کی طرح چیخے چلی جا رہی ہو... چپ رہو... اداکاری کی بھی حد ہوتی ہے... ایک آواز نہیں نکلے اب... سمجھیں؟"

اس نے تڑپ کر جواب دیا... "کیسی باتیں کر رہی ہیں آپا؟ میں واقعی بہت تکلیف میں ہوں..."

میں نے بھی غصے سے اسے بستر پر پیٹ کے بل لٹا کر اس کے منہ کے نیچے تکیہ رکھ دیا کہ چیخنا ہے تو تکیے میں چیخے یوں آواز باہر تو نہیں جائے گی... باہر کافی سارے مریض موجود تھے اور کیونکہ ابھی تک میں نے سحرش کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا تو اس کی ہر حرکت پر شرمندگی محسوس کر رہی تھی... مگر پھر اس کے کندھے اور گردن کے درمیان سفر کرتے میرے ہاتھ نے کالر بون میں جو خلا پایا تو میں کانپ کر رہ گئی۔

مجھے سحرش پر ایک دم بہت رحم آنے لگا... میں نے اسے چند ایک ہدایات دیں... جو ہڈی جوڑ والے ڈاکٹر مریضوں کی ہڈی بٹھاتے ہوئے بتاتے ہیں...

وہ تکلیف سے ادھ موئی سی ہو گئی تھی... میرے نزدیک وہ اٹھنے تک کے قابل نہیں تھی اور یہی بتانے میں علی کو باہر آئی تھی اور تب میں نے دیکھا کہ علی نے کلینک میں موجود باقی مریضوں کو چلتا کر دیا تھا۔

"یہ تمہیں کہاں سے... کس طرح؟"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ علی سے کیا پوچھوں کہ میرے حساب سے تو علی اور سحرش کی دوستی کو کوئی پانچ سال ہوئے یونیورسٹی کے آخری سال کے ختم ہونے سے پہلے ہی ٹوٹ چکی تھی... مگر آج جس طرح علی اسے سہارا دے کر میرے پاس لایا تھا اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ علی اور سحرش ایک دوسرے سے کافی بے تکلفی سے ملتے رہے ہیں۔

سحرش کا جادو تو پوری یونیورسٹی کے لڑکوں پر سر چڑھ کر بولتا تھا... بھلا علی کی کیا مجال کہ بچ نکلتا... علی مجھ

سے عمر میں چھ سال چھوٹا تھا... ہمارے درمیان میں دو بھائی بہن اور تھے مگر گھر میں میری اور علی کی دوستی خوب جمی ہوئی تھی... علی جب تک یونیورسٹی میں پہنچا۔ میں میڈیکل کی تعلیم سے فارغ ہو کر ہاؤس جاب کرنے لگی تھی۔ یونیورسٹی میں دو ایک لیکچرر میرے دوست تھے جن سے ملنے اکثر علی کے ساتھ یونیورسٹی چلی جاتی تھی... وہیں مجھے سحرش نامی لڑکی کا پتا چلا کہ کس طرح اپنی لچھے دار باتوں اور شعلہ بیانی سے اس نے سب کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے... سحرش ایک معمولی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ خوب صورت تو تھی ہی، رہتی بھی ہمیشہ ٹِپ ٹاپ سے تھی۔ کچھ اس طرح برانڈڈ کپڑے جوتے پہنتی کہ اپنی حیثیت کو صاف چھپا جاتی علی نے جب باقاعدہ یونیورسٹی کی کینٹین میں سحرش کو مجھ سے ملوایا تو مجھے اس میں بہت بناوٹ محسوس ہوئی... مگر علی کی اس قدر تعریف کے آگے میں خاموش ہو گئی اور سوچا کہ ابھی علی جوش میں ہے اس کو کچھ بھی کہنا سمجھانا فضول ہے جوانی کا جوش اور پہلی محبت کا نشہ اکثر اندھا کر دیتا ہے۔

علی کو میں روز بروز سحرش کے لیے دیوانہ ہوتے دیکھ رہی تھی... سحرش نے نہ صرف علی کو قابو کیا تھا بلکہ وہ باقاعدہ ہمارے گھر بھی آنے لگی تھی... اور اپنی ہنس مکھ طبیعت اور شرارت سے گھر والوں کے درمیان رونق محفل بنی رہتی تھی... اور کوئی دو ڈھائی سال میں جو اپنی ہاؤس جاب میں حد سے زیادہ مصروف ہوئی تو میری نظریں یہ دیکھنے سے قاصر رہیں کہ کب علی اور سحرش میں ناچاقی ہوئی اور پھر سحرش نے ہمارے گھر آنا بھی بند کر دیا۔

اتنا یاد ہے کہ تعلق ختم ہونے سے چند مہینوں پہلے سے سحرش جب بھی گھر آتی، علی کہیں باہر چلا جاتا... سحرش بھی جیسے کسی سوچ میں گم رہتی اور گھر والے اسے یاد دلاتے رہتے کہ وہ قہقہہ لگانا... ہنسنا تقریباً بھول ہی چکی ہے۔

ہاں ایک بات اور بھی ہے جو مجھے اچھی طرح یاد ہے... پتا نہیں وہ کون سا دن تھا... اس دن سحرش آئی تو سیدھی میرے کمرے میں چلی آئی... مجھ سے وہ کم ہی بے تکلف ہوتی تھی۔ کچھ میں بھی اس کو حد میں رکھتی تھی مگر اس دن جیسے وہ تمام حدود توڑنے آئی تھی۔

"کبھی کبھی ہم اپنے ہی اندر ایک خالی مکان بن جاتے ہیں... ایسا مکان جس کو صدیوں سے کسی نے رہنے کے قابل نہ سمجھا ہو... دن بھر خاموشی... مایوسی... تنہائی سی چھائی رہے اور رات میں کچھ یوں بھوت پریت جنات کا ریلا امڈے کہ میلے کا سماں بندھ جائے... ابھی کوئی رو رہا ہے... اب کوئی قہقہے لگا رہا ہے... کہیں سے کسی کے گنگنانے کی آواز آ رہی ہے تو کبھی کوئی چھم چھم گھنگھرو باندھے ناچ رہا ہے... ایسے میں کوئی انجان راہ گیر سامنے سے گزرتے کان دھرے تو اس پر پتھر برسائے جاتے ہیں اور کسی پر پھول..."

اس نے بڑے نپے تلے انداز میں کہا تو میں چڑ گئی۔

"اور علی...؟ علی کو کون سا راہ گیر سمجھوں... جس پر پتھر برسائے گئے ہیں... کیوں؟"

سحرش نے شرمندگی سے سر جھکا لیا... اور تھکے سے انداز میں بولی۔

"علی راہ گیر نہیں آپا... وہ تو اس خالی مکان کا گمشدہ مکین ہے۔"

اور پھر وہ چلی گئی... علی کی مایوسی اور دکھ کا ہم سب کو اندازہ ہو رہا تھا۔ ایک دن امی کے کہنے پر میں نے علی کو کریدا۔ جس پر مجھے اس قدر ہی معلومات مل سکیں کہ سحرش نے کسی بہت ہی امیر بزنس مین سے منگنی کر لی ہے اور اب وہ یونیورسٹی میں بس اپنا آخری سال مکمل کرنے کے انتظار میں ہے... جبکہ علی بھی اس کے لیے کافی سنجیدہ تھا... دونوں میں کافی بحث ہوئی... مگر سحرش کے مطابق اس کے والد بضد ہیں کہ سحرش بزنس مین سے ہی شادی کرے کیونکہ شادی میں سحرش کو اس کے والدین کے لیے مکان کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ مل رہا تھا۔

علی خاموشی سے پیچھے ہٹ گیا۔ سحرش کی شادی

تعلیمی سال ختم ہوتے ہی ہو گئی جبکہ علی کئی مہینوں تک بے کار پھرتا رہا۔ ہم سب کو دکھ تھا سب ہی جانتے تھے کے علی کا دکھ بہت زیادہ ہے اور کسی میں ہمت نہیں تھی کہ اسے دلاسے کے لیے کچھ کہتا۔

صدمہ جیسا بھی ہو.... اگر سانس باقی ہے تو زندگی رواں دواں رہتی ہے۔یوں علی نے دو ڈھائی سال میں ہی اپنے لیے ہاؤسنگ منسٹری میں جگہ بنالی.... اور ایک ڈیڑھ سال میں ہی ترقی کر کے اچھے عہدے پر آگیا.... آئے دن ہم اخباروں میں پڑھتے اور میڈیا چینل میں علی کے ڈپارٹمنٹ کی جعلی الاٹ شدہ پلاٹوں پر چھاپے اور حکومتی چارہ جوئی کی خبریں سنتے رہتے۔

علی نے چند ہی دنوں میں لینڈ مافیا پر کچھ یوں ہاتھ ڈالا کہ اکثر ہمارے گھر میں قسم قسم کے لوگوں کا آنا جانا ہونے لگا.... کچھ اس میں علی کے ہی مخبر تھے اور کچھ اس کے حریفوں کے چیلے.... علی نے یہ سب دیکھ کر اپنا الگ فلیٹ لے لیا تھا اور یوں ہمارے ساتھ صرف چھٹی کا روز گزار تا باقی دنوں میں مصروف رہتا۔

میں سمجھتی تھی کہ علی سحرش کو یکسر بھول چکا ہے.... اور اپنے کام میں کچھ اس قدر منہمک ہے کہ اسے ماضی کا وہ تکلیف دہ دور یاد نہیں رہا ہے.... مگر شادی کی بات پر وہ تلخی سے ہنس دیتا اور اس کی ہنسی ہی ہم سب کو مایوس کر دیتی.... خاص طور سے مجھے علی کا کبھی کبھی کھانا کھاتے سوچ میں گم ہو جانا.... یا کسی ہنسی مذاق کے دوران اچانک خاموش ہو جانا بہت کھلتا تھا.... مگر ہم سب مجبور تھے.... محبت آپ پر اپنے ہی انداز میں اثر انداز ہوتی ہے.... سب کے لیے الگ واردات کے ساتھ ظہور میں آتی ہے.... اور ہم سب اپنی اپنی جگہ کٹھ پتلی بنے اس کے بچھائے گئے جال میں جکڑے جاتے ہیں اور تکلیف کے اظہار سے بھی ڈرتے ہیں۔

چلو یوں بھی سب ٹھیک ہی تھا.... ہم سب اپنے اپنے زخم دل میں چھپائے ہنستے مسکراتے ہیں.... زندگی گزار لیتے ہیں اور مجھے علی جیسے مضبوط ارادوں والے لڑکے سے بھی یہی امید تھی.... مگر آج سحرش کو اس کے ساتھ دیکھ کر مجھے کافی مایوسی ہو رہی تھی.... علی کو ماضی میں گھسیٹنے میں کس کا ہاتھ ہے.... سحرش یا علی خود ہی اپنا دشمن بن بیٹھا ہے....؟ میں ایسے ہی خیالات میں ڈولی سحرش کے بال بنا رہی تھی.... اس کے ہاتھ کے گرد پٹی باندھ کر گلے سے لٹکا دیا تھا.... جبکہ علی قریب ہی رکھے اسٹول کو گھسیٹ کر بیٹھ گیا تھا.... بہت گھمبیر لہجے میں اس نے سحرش کو ہدایت دینی شروع کی....

"دیکھو سحرش.... اس فائل تک تم ہی پہنچ سکتی ہو.... جس سیف کا تم نے بتایا ہے میں پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں جس فائل کی مجھے ضرورت ہے۔وہ اسی سیف میں ہے.... میں نے تم کو ویڈیو دکھائی تھی نا جس میں ہمارا بندہ تمہارے شوہر سے بات کر رہا ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی بس وہی یاد رکھو.... وہ فائل بہت اہم ہے.... اسی میں سارے نام ہیں مگر تم احتیاط کے طور پر باقی جو بھی کاغذات یا فائلز نظر آئیں اٹھا لینا.... اور پھر بس جو موبائل فون دیا ہے اس پر ایک مس بیل.... میں اپنی ٹیم کے ساتھ وہیں.... تمہارے گھر کے قریب ہی ہوں گا.... سمجھ گئی ہو.... پلیز کوئی کوتاہی نہیں.... بہت ہوشیاری اور سمجھ داری سے چلنا...."

"میں سحرش کو ہرگز نہیں جانے دوں گی.... مجھے اچھی طرح پتا ہے.... یہ چوٹ گرنے سے نہیں آئی ہے.... اس کو باقاعدہ زدوکوب کیا گیا ہے.... میں نے اس کی پیٹھ پر دوسرے نشانات بھی دیکھے ہیں.... بس اب یہ کہیں نہیں جائے گی....''میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

یہ سن کر علی کا چہرہ تاریک ہو گیا.... اس نے سحرش کی طرف دیکھ کر سختی سے پوچھا۔''کیا یہ سچ ہے؟ تم نے تو کہا تھا کہ اس نے آج تک تمہیں ہاتھ نہیں لگایا.... بولو؟''

سحرش زیر لب مسکرانے لگی اور آہستگی سے کھڑی ہو گئی.... غیر ارادی طور پر علی اور میں نے اسے سہارا دے دیا.... سحرش کو اس کی گاڑی میں سوار کرانے کے بعد علی واپس آگیا.... میں اب تک پریشان سوگوار سی

کھڑی تھی.... علی مجھ سے نظریں چرا رہا تھا اور میں منتظر تھی کہ اب مجھے اصل صورت حال سے آگاہ کیا جائے.... وہ ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگا۔
"صدیق اینڈ کو.... ایک مشہور کنسٹرکشن کمپنی ہے.... اس پر ہمارے ڈپارٹمنٹ نے ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ اس کے مالک سیٹھ توصیف نے شہر کے کئی پارک اور کھیل کے میدان یہاں تک کے قبرستان کے لیے مختص پلاٹ ہاؤسنگ ڈپارٹمنٹ کے کئی افسروں کو رشوت دے کر باقاعدہ اپنے نام کرلیے ہیں.... اور اب کئی پلاٹوں پر بڑی بڑی بلڈنگز کھڑی کردی گئی ہیں۔ ہمیں نہ صرف سیٹھ توصیف کو پکڑنا تھا بلکہ اس کے ساتھ ملے ہوئے حکومتی افسروں کو بھی.... مجھے بھی ان لوگوں نے بکاؤ سمجھ کر اپنی کمپنی کی طرف سے دی گئی بہت بڑی پارٹی میں مدعو کیا تھا.... جہاں میں سیٹھ توصیف کی بیوی سحرش سے ملا.... میں تو اپنی ہی دھن میں کمپنی اور مالک کی ٹوہ لینے گیا تھا مگر چند ایک دن میں سحرش مجھ سے ملنے آگئی.... اس نے بتایا کہ اس کا شوہر ایک نہایت سفاک انسان ہے اور وہ میری ہر ممکن مدد کرنا چاہتی ہے.... اسی طرح شاید وہ اپنے شوہر سے چھٹکارا حاصل کرسکتی ہے۔"
"اور تم نے فوراً اس کی بات مان لی....؟ یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر تمہارے ڈپارٹمنٹ سے ہی بات نکل گئی اور اس کے شوہر تک پہنچ گئی تو وہ سفاک انسان سحرش کا کیا حشر کرے گا....؟" میں نے پہلی بار گرج کر پوچھا۔
علی سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ "خدا کی قسم آپا! سحرش نے یہی بتایا تھا کہ اس کا شوہر نفسیاتی طور پر اس پر بے انتہا قسم کی سختی کرتا ہے.... اس نے جسمانی تشدد کے بارے میں مجھے کبھی نہیں بتایا۔"
میں نے نخوت سے سرہلانا شروع کردیا.... علی بے چینی سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے جیسے خود سے گویا ہوا....
"بس آج رات بھر کی بات ہے.... سحرش نے کل ہی سیف کا کوڈ.... حاصل کرلیا تھا.... میں تو یہی سمجھا تھا کہ وہ مجھے یہ خبر دینے گھر سے نکلی ہے.... ہم لوگ آفس کے بجائے ہمیشہ کسی پارک یا گمنام جگہ پر ہی ملتے ہیں.... آج اس نے کہا کہ واپسی پر اسے ایک ڈاکٹر کو دکھانا ہے تو میں اسے آپ کے پاس لے آیا.... مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ اس پر کیا بیتی ہے.... خیر آج ہی سب ٹھیک ہو جائے گا.... بس آپ فکر نہ کریں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔"
کہنے کو تو علی مجھے مطمئن کر رہا تھا مگر میرا دل بے چین ہوچکا تھا.... سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح اس خطرناک کھیل سے سحرش اور علی کو بچاؤں۔ میں یہ بھی سمجھ رہی تھی کہ اگر ان سب میں سحرش کو کچھ ہو گیا تو علی ساری عمر کے لیے گم ہوجائے گا.... مگر پتا نہیں کس مجبوری میں علی نے اس کام کے لیے سحرش کو استعمال کرنا منظور کرلیا تھا.... بہرحال میں نے بڑی مشکل سے کلینک کا وقت پورا کیا اور پھر جب میں کلینک سے نکلنے ہی والی تھی تو کلینک میں کام کرنے والی ملازمہ نے مجھے ایک موبائل لاکر دیا.... جو کہ معائنہ کے بستر کے نیچے پڑا تھا.... یقیناً "سحرش" علی کا دیا گیا موبائل یہیں بھول گئی تھی؟ میری برداشت کی حد ہوگئی تھی۔ میں کلینک سے سیدھی سحرش کے بنگلے کی طرف نکل کھڑی ہوئی۔ کچھ دور گاڑی پارک کرکے میں ابھی بنگلے تک پہنچنے ہی والی تھی کہ علی کہیں سے نمودار ہوگیا۔
"آپا! آپ یہاں کیا کررہی ہیں؟ آپ کیا سوچ کر یہاں آگئی ہیں۔" وہ **گھگھیا** کر میرا راستہ روکتے ہوئے بولا۔
"میرے سامنے سے ہٹ جاؤ علی.... میں سحرش کو لینے جارہی ہوں...." میں نے سختی سے کہا۔
"اوہو.... سمجھیں پلیز.... یہاں میری پوری ٹیم صبح سے کھڑی ہے.... میرا پلان...." علی ابھی کچھ اور کہتا لیکن میں نے اس کی بات کاٹ دی....
"بھاڑ میں جائے تمہارا پلان.... سمجھے تم...."
یہ ہی سب باتیں کرتے کرتے ہم بنگلے کے دروازے تک پہنچ چکے تھے.... میں نے علی کی التجاؤں کو نظرانداز کرتے ہوئے کال بیل بجادی.... تھوڑی ہی دیر میں

ملازم نے آکر ہم سے نام اور آنے کی وجہ پوچھی۔۔۔

"اپنے مالک کو جاکر بتاؤ کہ علی شمیم کی بہن ملنے آئی ہیں۔"

میں نے بڑے دھڑلے سے ملازم سے علی کی بہن کہہ کر تعارف اندر بھیجا۔۔۔ میں جانتی تھی یہ نام سن کر مجھے فوراً" ہی اندر بلالیا جائے گا۔۔۔ اور ایسا ہی ہوا۔۔۔ علی بے بسی سے مجھے دیکھ رہا تھا' پھر میرے ساتھ ساتھ ہی وہ بھی اندر داخل ہوگیا۔۔۔ ہمیں بڑے سے ڈرائنگ روم میں بٹھادیا گیا اور تھوڑی ہی دیر میں ایک ادھیڑ عمر کا اسمارٹ سا آدمی آگیا۔۔۔ وہ علی کو دیکھ کر چونک گیا۔

"ارے علی صاحب۔۔۔ آپ۔۔۔ ارے سرکار! آپ پہلے بتاتے تو میں آپ کو دروازے پر لینے آتا۔۔۔ یہ کیا کیا آپ نے جناب۔۔۔؟" وہ بڑے تپاک سے علی سے لپٹ گیا۔

رسمی باتوں کے بعد چائے پانی کا آرڈر دے کر سیٹھ توصیف بڑے انہماک سے ہمیں دیکھنے لگا جیسے ہمارے ہی حکم کا منتظر ہو۔۔۔ میں نے گلا کھنکھار کر کہا۔

"آپ تو ایک کنسٹرکشن کمپنی کے مالک ہیں۔۔۔ آپ کا کام ہی پرانے۔۔۔ خالی مکان خریدنا۔۔۔ انہیں نئے سرے سے بناکر بیچ دینا ہے۔۔۔ ہمارا بھی ایک معصوم سا خالی مکان تھا جو آپ نے۔۔۔"

میں اب کچھ گھبراگئی تھی۔۔۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بھلا میں کس طرح اس سے کہوں کہ اپنی بیوی کو میرے حوالے کردے۔

اس نے مسکراتے ہوئے سرہلا دیا۔۔۔ اتنے میں دیکھا کہ سحرش تھکی تھکی سی کمرے میں داخل ہوئی۔۔۔ اس کے ہاتھ میں چند فائلیں تھیں۔۔۔ وہ راستے میں ہی ٹھٹک کر رک گئی۔ اسے شاید ہمارے یا کسی کے بھی ڈرائنگ روم میں ہونے کا پتا نہیں تھا۔۔۔ اس سے پہلے کے ہم کچھ کہتے سیٹھ توصیف ایک دم کھڑا ہوگیا تھا۔۔۔ اس کی نظریں سحرش کے ہاتھ میں موجود فائلوں پر ہی ٹکی ہوئی تھیں۔

"ڈارلنگ یہ ہاتھ پٹی سے کیوں لٹکا رکھا ہے۔۔۔ کیا ہوا؟ تم ٹھیک تو ہو۔۔۔"

سیٹھ توصیف پھنکارتا ہوا سحرش کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ادھر سے علی آگے بڑھ کر اس کے راستے میں آگیا تھا۔۔۔ میں نے بھی پھرتی سے سحرش سے فائلیں لے کر اسے اپنے پیچھے کرلیا تھا۔۔۔ اس سے پہلے کہ سیٹھ توصیف کوئی سوال کرتا علی نے تحکمانہ انداز میں اسے چپ کرادیا۔

"کچھ بھی کہنے سے پہلے بہتر ہے آپ اپنے وکیل سے مشورہ کرلیں۔۔۔"

سیٹھ توصیف سمجھ چکا تھا' مگر بے بس تھا' جبکہ ہم سحرش کو لیے بھاگم بھاگ بنگلے سے باہر نکل آئے۔۔۔

ویسے بھی سیٹھ توصیف سحرش کے ہاتھ میں فائلیں دیکھ چکا تھا اور اب سحرش کو وہاں چھوڑنا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ باہر آکر دیکھا کہ ہمارے لیے ایک لمبی کالی گاڑی کھڑی ہے۔۔۔ ہم تینوں اس میں سوار ہوگئے۔۔۔ جبکہ میری گاڑی علی کی ٹیم کا کوئی بندہ پہلے ہی لے جاچکا تھا۔

سحرش تکلیف کے باوجود بہت جوش میں تھی۔۔۔ علی نے جلدی سے فائلوں کو چیک کرکے خوش خبری سنا دی تھی۔ اس کے مطلب کی فائلیں مل گئی ہیں۔ سحرش نے اطمینان سے سر سیٹ پہ ٹکا دیا' پھر چونک کر علی سے پوچھنے لگی۔

"حیرت ہے۔۔۔ میں تو تمہارا دیا ہوا موبائل آپا کے کلینک میں ہی بھول آئی تھی اور نہ ہی کسی اور موبائل سے میں نے مس کال دی تھی' پھر تم اس طرح عین وقت پر کیسے فائلیں لینے پہنچ گئے؟"

علی میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ پھر بڑے طنزیہ انداز میں بولا۔

"آپا ہی بتائیں گی کہ یہ کمانڈو بن کر وہاں کیا لینے پہنچی تھیں؟"

میں بھی اپنی اس بے وقوفانہ بہادری پر مسکرانے لگی۔۔۔ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"بھئی مجھے ان فائلوں کا کیا پتا۔۔۔ میں تو بس اپنے غریب مسکین چھوٹے بھائی کا غیر قانونی طور پر قبضہ کیا گیا خالی مکان لینے گئی تھی۔"

ام طیفور

ہُوک

ایک گمبھیر سی خاموشی نے پورے ماحول کا احاطہ کر رکھا تھا۔ جن باتوں کی بازگشت میں کئی دن سے حویلی کے باہر سن رہا تھا' آج اپنی حویلی کی بیٹھک میں اس بازگشت کے موجب کو مجسم دیکھ رہا تھا۔ مجھے شدید حیرت تھی کہ آفاق میرے سامنے بیٹھا ...... مریم کا رشتہ طلب کر رہا تھا۔ اس نے موجو میراثی کا بھی لحاظ نہ کیا جو اس کے آنے سے پہلے ہی میری بیٹھک میں موجود تھا۔

آفاق کا مدعا سننے کے بعد میں نے موجو کو اور اس نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا تھا۔

تب ہی میں نے آفاق سے پوچھا۔

"پتر! تیرے ابے کو پتا ہے کہ تو میرے پاس کس مقصد کے لیے آیا ہے...؟"

"اونہہ...!" آفاق نے سر کو استہزائیہ انداز میں جھٹکا دیا اور بولا۔ "چاچا جی! عجیب بات کرتے ہیں آپ بھی... اگر انہیں پتا ہوتا کہ میں آپ کے پاس کس مقصد کے لیے آیا ہوں تو میری ٹانگیں توڑ کر حویلی کے پچھواڑے نہ ڈلوا دیتے۔"

بات معقول تھی... مجھے اپنا سوال ہی بڑا بے تکا لگا۔

مکمل ناول

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

"تو تیرے ابے کو اعتراض کیا ہے آخر؟"

"حسب نسب پہ...!" آفاق نے جواب دیا۔ "وہ کہتے ہیں کہ مریم کے حسب نسب کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا... بے شک وہ تیرے چاچے کے گھر میں رہ رہی ہے اور تیرا چاچا اسے اپنا رشتہ دار بھی بتلاتا ہے پر انہیں پھر بھی یقین نہیں کہ وہ درحقیقت کس خاندان سے ہے۔"

"ہوں...!" میں نے ہنکارا بھرا۔ "تو میرا پتر! تو مریم کا خیال دل سے نکال دے اور جہاں تیرا پیو کہتا ہے وہاں کر لے... آخر کو تو اکو اک پتر ہے اس کا..."

"نہیں ہوں میں پتر ان کا..." آفاق یک دم میری بات کاٹ کر تلخ لہجے میں بولا۔ "بچپن سے لے کر جوانی تک میں نے ان کے اس احسان کا خراج چکایا ہے جو انہوں نے مجھ لاوارث کو وارث بنا کر مجھ پر کیا ہے...

جو کہتے رہے میں نے وہی کیا... جو پڑھانا چاہا میں نے وہ ہی پڑھا اور پھر پڑھا لکھا کر واپس گاؤں بلوایا تو بھی میں نے اف نہیں کی... مگر اب یہ میری باقی تمام زندگی کا معاملہ ہے چاچا جی! آدھی میری زندگی ابا جی نے گزار دی، آدھی میں خود گزاروں گا... بس!" آفاق نے دو ٹوک انداز میں بات ختم کی۔

مجھے دھیمے لہجے میں بات کرنے والے آفاق پر آج بڑی حیرت تھی... اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ آفاق بہت تابع دار اور رکھ رکھاؤ والا بچہ تھا۔ باپ کی آنکھ کا ایک اشارہ اس کا ارادہ بدل دیتا تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ لعل دین اس کا حقیقی باپ نہیں۔ وہ پانچ سال کا تھا جب لعل دین اور اس کی بیوی نے اسے گود لیا تھا اور پھر سب نے دیکھا کہ دنیا کی کون سی ایسی نعمت تھی جو آفاق کے قدموں میں لا کر رکھی نہ گئی ہو، مگر آفاق کی زندگی کا ہر فیصلہ لعل دین کی مرضی کا محتاج تھا۔ اس نے آفاق کو انجینئرنگ کی تعلیم دلوائی تھی، مگر اسے زمینوں، جاگیروں کے معاملات سنبھالنے پر مجبور بھی کیا تھا۔

میں جانتا تھا کہ آفاق کتنا عرصہ بجھا بجھا سا پھرا تھا، مگر پھر آہستہ آہستہ حسب معمول اس نے خود کو لعل دین کی مرضی کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ غرض ایسے چھوٹے بڑے کتنے ہی واقعات میرے ذہن میں گردش کرتے تھے۔ جب آفاق نے لعل دین کی خاطر دل مارا تھا۔ بس...! محبت مارنے میں ناکام رہا تھا۔ ہاں...! میں جانتا تھا کہ آفاق مریم سے محبت کرتا ہے اور یہ جذبہ اول روز سے میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ مریم کا میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا، مگر آفاق کا جب بھی مریم سے "اتفاقاً" سامنا ہوا، میں نے اس کی آنکھوں کو پہلے سے کہیں زیادہ روشن پایا، مگر میں اسے بڑھاوا کیسے دیتا...

لعل دین کی سرشت سے میں واقف تھا۔ وہ ذات پات اور اونچ نیچ کا قائل تھا اور کافی حد تک متعصب بھی اور میں جانتا تھا کہ مریم کو بہو کے طور پر اپنانے میں وہ کبھی رضامند نہیں ہوگا۔ اسی لیے بہتر تھا کہ میں بھی آفاق کی حوصلہ شکنی کروں۔

"پتر! بہتر ہے کہ تو بھی اس خیال کو دل سے نکال دے... کیوں باپ سے آڈھ (مقابلہ) لگاتا ہے۔ اس کے بغیر تیری حیثیت صفر ہے بیٹا... اس لیے جیسا وہ کہتا ہے تو ویسا کر۔" میں نے آفاق کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں چاچا جی... بالکل نہیں! نہ میری حیثیت صفر ہے اور نہ میرا ارادہ کمزور، میں انفرادی طور پر بھی اپنی حیثیت منوا سکتا ہوں، مگر اس دفعہ میں ان کی بات نہیں مانوں گا۔ آپ بس مجھے یہ بتائیں کیا آپ کو اس رشتے پر کوئی اعتراض ہے...؟" اپنی بات کہہ کر آفاق نے پرامید نظروں سے میری طرف دیکھا تھا۔

"ہاں...!" میں نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

"کیوں چاچا جی...؟" آفاق کو شاید مجھ سے اس جواب کی توقع نہیں تھی اسی لیے اسے دھچکا لگا تھا۔

"دیکھ پتر... تیرا باپ صرف ضدی اور کھڑوس ہی نہیں، میرا یار بھی ہے اور میں اسے جانتا ہوں کہ وہ میری یاری چھوڑ دے گا پر اپنی ضد نہیں۔"

"میں انہیں چھوڑ دوں گا..." آفاق کا انداز دو ٹوک

اور لہجہ گستاخ تھا۔ میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔
"اس نے تجھے پالا ہے... تیری کسی خواہش سے منہ نہیں موڑا اور تو اسے چھوڑ دے گا تو وہ تو شاید سہار جائے پر تیری ماں تو مرجائے گی نا...!"
آفاق نے بے چینی سے پہلو بدلا۔
"اور رہ گئی اس رشتے کی بات تو مریم کا رشتہ میں ان حالات میں تمہیں کبھی نہیں دے سکتا... ہاں اگر لعل دین راضی ہو جائے اور خود مجھ سے بات کرے تو سو بسم اللہ!"
میں نے بات ختم کردی تھی' اب مزید میں اس بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔ تب ہی موجو میراثی کی طرف متوجہ ہوا' جو اس تمام عرصے میں سرنیہوڑائے میری ٹانگیں دباتا رہا تھا۔ اس نے ایک دفعہ بھی سر اٹھا کر دخل انداز ہونے کی کوشش نہیں کی تھی' حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ حرف بہ حرف اس صورت حال کو ذہن نشین کررہا ہے اور آفاق کے جانے کے بعد مجھے اس کے مشورے کی ضرورت بھی تھی۔
"ٹھیک ہے چاچا جی! میں پھر چلتا ہوں... پر آپ یہ بات سن لیں اور اپنے یار کو بھی بتا دینا کہ نہ میں انہیں چھوڑ کر جاؤں گا اور نہ ان سے کوئی تقاضا کروں گا' مگر تمام عمر شادی نہیں کروں گا اور یہ بات میں قسم کھا کر کہتا ہوں... چلتا ہوں۔ اللہ حافظ!"
آفاق اپنی بات مکمل کرکے تیزی سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا میری بیٹھک سے نکل گیا تھا۔ پیچھے صرف میں اور موجو رہ گئے تھے اور ہماری سوچیں۔ موجو نے یوں میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھنا شروع کیا کہ میں اکتا گیا اور پوچھا۔
"موجو! تو نے چندیل بھی مزید میری طرف اس طرح دیکھا تو تیری آنکھوں کی جگہ بٹنے فٹ کرا دوں گا... سمجھا؟" میں نے گھورتے ہوئے موجو کو تنبیہہ کی۔
"سرکار...!" موجو نے کھگھیاتے ہوئے کہا۔
"سرکار... میں کیا بات کرت ہوں' چھوٹا منہ اور بڑی بات' پر جے تساں اجاجت دیو تو ایک مشورہ دیوت ہوں۔ عمل کرت نہ کرت یہ آپ کی مرضی ہووت ہے۔"
موجو سے اکثر میں کسی نہ کسی معاملے میں رائے لے لیا کرتا تھا۔ اس کی وجہ تھی کہ ایک تو وہ میرا اور لعل دین کا ہم عمر تھا اور بلا مبالغہ بڑی کھری اور پر خلوص رائے دیتا تھا اور دوسرے کبھی بھی آپے سے باہر نہیں ہوتا تھا۔
"بول موجو... بول' حالانکہ میں جانتا ہوں کہ تو کیا کہے گا..."
"تو سرکار... اس ماں برائی کیا ہووت ہے...؟ مریم بیٹا کو شاندار گھرانہ مل جاوت ہی' ہے تو آپ ہی کی جات کی' اور آفاق باؤ بھی باپ کے منہ کو نہ آوت ہے۔"
"پر موجو! میں کیسے اس کے باپ کو راضی کروں... تو لعل دین کو جانتا نہیں کیا؟" میں چڑ کر بولا تھا۔
"تو اس کا علاج ماں بتاوت ہوں نا سرکار! ملک جی کو تساں بتا دیو کہ تساں آفاق باؤ کی حقیقت جانت ہو..." موجو دبے دبے لہجے میں بولا تو میرا دماغ یک دم گھوم گیا۔
"تیری مت ماری گئی ہے کیا...؟ یا بھنگ چاڑھ (چڑھا) کر آیا ہے؟ تجھے پتا نہیں کہ لالی اور میں اک دوجے کے لیے کیا ہیں...؟ میں اس سے ایسی بات کر سکتا ہوں بھلا!" میرا تنفس تیز ہو گیا تھا۔ موجو نے بات ہی ایسی کی تھی۔
"سرکار...! منے مافی دیو سرکار...! منے پہلے ہی کہا تھا' چھوٹا منہ اور بڑی بات' مگر سرکار... جرا غور کریو تو اے رستہ تھاری بٹیا کے لیے نعمت ہووے ہے۔ ملکانی بن کے راج کرت اور تساں بھی جمے داری سے فارگ ہووت' تساں آج ہی بڑے ملک جی سے بات کرلیو' اناں کی مجبوری اناں کے ہاتھ پکڑا دیو پھر دیکھیو کہ کیسے دوڑتاں ماں مریم بیٹا کا ڈولا اٹھوت ہے۔"

موجو بات ختم کر کے دوبارہ سے میری ٹانگیں دبانے لگا تھا' مگر مجھے اس کے انداز میں پُراسراریت سی محسوس ہوئی تھی۔ اس کا پُرتفکر چہرہ مجھے فکر میں مبتلا کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"موجو...! تو مجھے اصل بات بتا۔ تو اتنا زور کیوں دے رہا ہے اس رشتے پر اور کچھ کچھ پریشان بھی دکھتا ہے۔ بتا مجھے جلدی سے...."

موجو کچھ دیر خاموش رہا جیسے لفظوں کو تول رہا ہو۔ یہ اس کی عادت تھی۔ پھر بولا۔

"سرکار! گاؤں والے بڑی باتاں بناوت ہیں' بدنامی ہووت ہے بڑی۔ آفاق باؤ۔ مریم بیٹا کو ایک آدھ واری رستے میں بھی روکت ہیں جب مریم بیٹا ملانی جی کے گھر جاوت ہیں۔ منے اوٹ ماں ہو کر سنا تھا' آفاق باؤ اک واری مریم بیٹا کو دھمکاوت تھے کہ اگر انوں کا ویاہ مریم بیٹا کے ساتھ ناں ہووت تو وہ کھود کسی کر لوت ہیں اور ساتھ ماں اک پرچا لکھ دیوت ہیں کہ تماری وجہ سے ماں یہ قدم اٹھاوت ہوں۔ سرکار...! اگر ایسا کچھ ہووت ہے ناں بڑی بدنامی ہووے گی۔ اسی لئے بہتر ہووت کہ تھاں بڑے ملک جی کو راضی کرت' اناں کو بتا دیوت کہ تھاں آفاق باؤ کی اصلیت جانت ہو...."

موجو نے مجھے بھی ہراساں کر دیا تھا اگر آفاق ایسا کوئی قدم اٹھاتا تو مریم کے مستقبل پر اس کا کیا اثر پڑتا... میں یہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا کیوں کہ اس کی ذمہ داری سے میں جلد از جلد فارغ ہونا چاہتا تھا اور مریم کے ساتھ اگر کوئی بدنامی لگ جاتی تو...! نہیں... نہیں! مجھے آفاق کو ایسی کسی بھی حماقت کو سرزد کرنے سے روکنا ہوگا۔ اور... اور کیا حرج تھا اگر مریم کو آفاق سے بیاہ دیا جائے تو...! اس کا مستقبل محفوظ ہو جاتا اور میں سبکدوش ہو جاتا۔

پر اصل مسئلہ لعل دین کو منانے کا تھا تو کیا موجو کے مشورے پر عمل کرلوں...؟ کیا برائی تھی بھلا؟ میرا جگری یار تھا' تھوڑا بہت بک بک' جھک جھک کرے گا پھر مان جائے گا۔ آفاق اور مریم کو ایک کرنے کے لیے یہ سودا مہنگا نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

کوئی بن گیا رونق پکھیاں دی
کوئی چھوڑ کے شیش محل چلیا

کوئی پلیا ناز تے نخریاں وچ
کوئی ریت گرم تے تھل چلیا

کوئی بھل گیا مقصد آون دا
کوئی کر کے مقصد حل چلیا

اتھے ہر کوئی "فرید" مسافر اے
کوئی اج چلیا کوئی کل چلیا

میں کھیتوں میں بنی پگڈنڈی سے گزرتا' خیالوں میں مگن... لعل دین سے بات کرنے کے لیے لفظ لفظ پروتا چلا جا رہا تھا۔ جب لعل دین کی حویلی کے پچھواڑے بنے باڑے کے قریب پہنچتے ہی موجو کی آواز میرے کانوں میں پڑی اور میں جھوم جھوم گیا۔

کبھی "ہیر" وارث شاہ' کبھی بابا فرید تو کبھی بلھے شاہ کا کلام...! موجو ہر لفظ میں خون جگر سینچ لاتا تھا۔

ارادہ تو میرا لعل دین کی حویلی کی بیٹھک میں جانے کا تھا' مگر میں وہیں باڑے کی اور چل دیا۔ مجھے دیکھتے ہی موجو نے جھٹ کچے میں چارپائی ڈالی اور مسکراتی نظروں سے تکتا قریب چلا آیا۔

"لے بھئی موجو! آ تو گیا ہوں' پر رب سوہنا جانتا ہے کہ کتنا اوکھا لگ رہا ہے مجھے لالی سے ایسی بات کرنا۔"

میں نے موجو سے کہا اور چارپائی پہ ٹک گیا۔ اسی دوران موجو نے میرے مقابل ایک اور چارپائی بچھائی' پھر بولا۔

"فکر ناں کرت سرکار! رب بھلی کرت۔ تمہاری نیت صاف ہووت ہے فیر کاہے ڈرت ہے۔"

"اچھا... اچھا! جا جلدی سے بلا لا اپنے ملک جی کو اور ہم دونوں کے قریب بھی نہ پھٹکیو' جب تک میں نہ کہوں... سمجھا؟"

"سرکار! موجو تمہاری آنکھ کا اشارہ سمجھت اے!" یہ کہہ کر وہ تیزی سے مڑا اور لعل دین کو بلانے چلا گیا۔ جب کہ میں ایک دفعہ پھر سوچوں میں ڈوب گیا۔

☼ ☼ ☼

"ہاں تو بھئی لعل دین جی...! کچھ منہ سے بھی پھوٹ لو کہ تمہیں سپ (سانپ) ڈنگ گیا ہے...؟" میں جو بڑی دیر سے لعل دین کے چوکھٹے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا' آخر اکتا گیا اور اسے خیالات کے تانے بانے سے نکالنے کی کوشش کی۔

"کیا بولوں...؟" لعل دین کی مری مری سی آواز نکلی۔

"ارے... بولنا کیا ہے لالے...؟ کچھ بھی بول' بس ذرا سوچ کر اور تول کر بولنا۔ کیوں کہ میں نے بھی پوری داستان بڑی ناپ تول کر تجھے بیان کر دی ہے... اب بس مجھے تیرا جواب ہاں میں چاہیے۔" میں نے مسلسل اسے گھورتے ہوئے کہا جواب پہلو پہ پہلو بدلے جا رہا تھا۔ میں نے پھر پوچھا۔

"چل پھر بتا اب... کیا کرنا ہے تو نے؟"

"کل جواب دوں گا۔" لعل دین کے چہرے کا رنگ بدلا تھا تب ہی میں نے پھر چوٹ کی۔

"نام تو تیرا لعل دین ہے پر اس وقت تو تو "موجو میراثی" کا ہم شکل دکھ رہا ہے۔ ویسا ہی کالا اور پیلا... ہاہاہا..."

میں نے اپنی بات پر خود ہی زوردار قہقہہ لگایا تھا اور چند گز کے فاصلے پہ بھینسوں کا چارہ کاٹتا موجو اپنا نام سن کر الرٹ ہو گیا۔

"حاضر سرکار۔" وہ ہاتھ کھڑے کر کے بولا۔

"او ٹھہر جا ابھی تو... کام ختم کر' پھر بلاتے ہیں تجھے۔" میں نے موجو کو وہیں کھڑا رہنے کا کہا کہ ابھی مجھے لعل دین سے چند باتیں مزید کرنی تھیں۔

"دیکھ لعل دین... آفاق ابھی جوان بھی ہے اور اتھرا بھی اور اتھری جوانی' اڑیل کھوتے کی طرح ہوتی ہے' جتنا مرضی زور لگا لو' کرتی وہی ہے' جو من میں ٹھان لے اور پھر آفاق تو فطرتاً" بالکل تیرے پر پڑا ہے... اڑیل ٹٹونہ ہو تو! دنیا والوں کو یہی پتا ہے کہ آفاق تیرا خون نہیں اور یہ بات وہ خود بھی جانتا ہے... اب اگر تو اس کی بات نہیں مانے گا تو وہ کہیں بھی منہ کر لے گا۔ تیرے ہاتھ نہیں آنے والا! اور جائیداد تو ساری اس کے نام لگا بیٹھا ہے۔"

لعل دین نے پھر پہلو بدلا تھا اور بے چارہ کب سے یہی کیے جا رہا تھا۔

"مان لے میری بات۔ بچوں کے آگے ہار ماننی پڑتی ہے اور سچی بات ہے لالے...! مجھے تیرا راز تیرے آگے اگلنا پڑا ہے... مجبوری تھی۔ اک طرف تیرا آفاق ہے اور دوسری طرف مریم ہے' جسے میں نے پوری ذمہ داری سے اپنے گھر رکھا ہے۔ اس کے شادی بیاہ سے لے کر دیگر تمام چھوٹی بڑی ذمہ داریوں کو میں نے قبولا ہے۔ آخر مرنے کے بعد اس کے مرے ماں پیو کو میں نے اپنا نیکیوں کے نور سے چمکتا چہرہ دکھانا ہے... ہاہاہا..."

میں اپنی بات کے اختتام پر خود ہی ہنس دیا جب کہ

لعل دین نے بے اختیاری مسکراہٹ کو دبایا تھا اور میں یہی چاہتا تھا کہ پچھلے گھنٹے سے جو تناؤ میرے اور اس کے بیچ تن کر کھڑا تھا اسے زمین بوس کیا جائے کہ آخر کو لعل دین میرا لنگوٹیا تھا۔ ہم دونوں کی ایک دوسرے سے جذباتی اور قلبی وابستگی سے سارا گاؤں واقف تھا۔ بس لعل دین میں تیس (اکڑ) بڑی تھی' جب بھی اڑ گیا تو سمجھو بیڑہ غرق... اور اس کی اس ٹیس کو واحد میں ہی دبا سکتا تھا۔

مجھے افسوس تھا کہ مجھے آج لعل دین کا جذباتی استحصال کرنا پڑا تھا۔ اسے اس کی کمزوری کہہ لیں یا راز... جو بھی تھا' بہرحال میں سالوں پہلے اس "خفیہ کھاتے" سے واقف تھا' مگر آج تک میں نے اس کو اپنے سینے میں یوں ہی دبائے رکھا جیسے کہ وہ میرا اپنا راز ہو کہ آج سے پہلے مجھے کبھی سوچ بھی نہ آئی تھی کہ اس بات کو زندگی میں کبھی نہ کبھی مجھے لعل دین کے سامنے دہرانا پڑے گا گو کہ یہ کمزوری اس کی کمزوری تھی میری نہیں۔

پر میں نے کہا نا... کہ لعل دین اور میں یک جان دو قالب ہیں' ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے بہت سے نجی اور خفیہ پہلوؤں سے واقف ہیں اور کئی "امانتوں" کے امین بھی...!

"او یارا...! اتنا پریشان کیوں ہوتا ہے۔ دل بڑا کر کے سوچ... وڈی پگ پہ بنتا ہے تو ظرف بھی وڈا کر۔ وگرنہ رشتے تیرے آفاق کو بھی بڑے اور میری مریم کو بھی یہ اور بات کہ تیرا آفاق قسم کھائے بیٹھا ہے کہ کنوارہ مرجائے گا پر ویاہ نہیں کرے گا۔ اب تو ظلم نہ کما... اس کا جنازہ جائز کرا... ہاہا...."

میرے ہنسنے پہ اس نے مجھے زخمی نظروں سے گھورا تو میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"لا لے...! تجھے میرا منہ بھی نہیں مارتا' یارا' میری بیٹی جیسی ہے مریم۔ میرے ہی رشتے داروں کی اولاد ہے۔"

"مجھے یقین نہیں... تو جھوٹ کہتا ہے۔!" لعل دین میری بات کاٹ کر بولا۔

"شرم کر لالے... آج تک تجھ سے کچھ چھپایا ہے جو اب چھپاؤں گا۔ مجھے زیادہ تاؤ نہ دلا' ورنہ تیرے دماغ کا سارا سودا ناک کے رستے باہر نکال دوں گا... اب جواب دے دیجیو مجھے دو دن تک... پھر بعد کے معاملات طے کرلیں گے۔" بات کے اختتام پر میں نے اپنے لہجے کو دانستہ نرم کیا اور موجو میراثی کو آواز لگائی۔

"او موجو...!"

"آیا سرکار...!" موجو ہاتھ کندھے پہ دھرے پرنے سے صاف کرتا' لپک کر نزدیک آیا اور میرے قریب ہی فرش پر پھیل کر بیٹھ گیا۔

"چل کا کا...! ذرا ہو جائے حضرت پیر وارث شاہ کا کلام... اور ذرا سر پکے رکھیو' نہیں تو دوں گا گدی پر ایک..."

میں نے کن اکھیوں سے لعل دین کے سنجیدہ اور پرسوچ چہرے کو تکا اور چارپائی پر آرام دہ حالت میں بیٹھ گیا۔ میں حضرت پیر وارث شاہ کا معتقد ہوں اور ان کے کلام سے مجھے اور لعل دین کو بے پناہ رغبت ہے۔ فرصت میں ہم دونوں موجو میراثی سے "ہیر" سنا کرتے تھے اور سچی بات تھی' موجو سماں باندھ دیتا تھا۔ اس کی گونج دار آواز دل پہ ضربیں لگاتی تھی۔ اس وقت چارونا چار لعل دین بھی سر دھننے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"اول حمد خدا دا ورد کیجے۔
عشق کیتا سو جگ دا مول میاں
پہلاں آپ ہی رب نے عشق کیتا
معشوق ہے نبی رسول میاں
عشق پیر فقیر دا مرتبہ اے
مرد عشق دا بھلا رنجول میاں
کھلے تنہا دے باغ قلوب اندر
جناں کیتا اے عشق قبول میاں
دوئی نعت رسول مقبول والی
جہندے حق نزول لولاک کیتا
خاکی آکھ کے مرتبہ وڈا دتا
سب خلق دے عیب تھیں پاک کیتا
سرور ہوئی کہ اولیاء انبیاء دا

اگے حق دے آپ نوں خاک کیتا"

"واہ... واللہ! قربان جاؤں میں لکھنے والے پر۔"

میں نے نثار ہوتے ہوئے، جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکالا اور موجو کو تھما دیا۔ پھر اپنی آنکھیں پونچھ لیں جو کہ ہر بار اس کلام کو سن کر بھر آتی تھیں۔ نامعلوم کیسی تڑپ تھی جو دل میں جاگ اٹھتی تھی کہ جی کرتا، کپڑے پھاڑ کر جنگلوں میں نکل جاؤں اور کبھی ادھر کا رخ نہ کروں... پر ہائے ری دنیا... !تو نہ اپنا رکھتی ہے نہ کسی کا ہونے دیتی ہے اور ہم جیسے دنیا داروں کے تو کیا کہنے... !موجو اٹھ کر جا چکا تھا۔ سب ہی آہستہ آہستہ اپنے ٹھکانوں پر لوٹ رہے تھے۔ سورج غروب ہو چکا تھا، پرندے دن بھر کی اڑان بھگتا کر اپنے پر سمیٹتے ہوئے اپنے گھونسلوں کو لوٹ رہے تھے۔

مجھے بھی اب گھر جانا تھا۔ جانا تو لعل دین کو بھی تھا۔ پر وہ اڑیل اپنی مرضی کا مالک، جب دل چاہتا تب ہی اٹھتا...

میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور قدم بڑھانے سے پہلے لعل دین کے کاندھے پر ہاتھ دھرا اور بولا۔

"لالے... !انا بڑی بری چیز ہے۔ ایک "میں" بندے کی نسلیں اجاڑ دیتی ہے۔ جس وارث پر بندہ اکڑتا پھرتا ہے نا۔ اس کی انا اسی وارث کو مٹی میں مٹی کر دیتی ہے۔ پھر بھلے وہ یہ سوچتا رہے کہ... لو جی! میں نے اپنی نسل مکادی پر انا کو جھکنے نہیں دیا۔ اپنا وقار سلامت رکھا، پر ہوتا یہ ہے کہ رب مت پٹھی (الٹی) کر دیتا ہے؟ اس کے خود کے ہاتھوں اس کی تباہی لکھ دی جاتی ہے... اپنی جھوٹی خودداری اور انا کے جھنڈے کو وہ اپنے وارثوں کے سینے میں گھونپ دیتا ہے اور یا تو انہیں مار دیتا ہے یا تباہ کر دیتا ہے... آخر میں اس کے پاس اس کی انا اور "وراثت" تو رہ جاتی ہے... پر "وارث" نہیں رہتا۔ تجھے حضرت پیر وارث شاہ کا ایک شعر سناتا ہوں... اس پر غور ضرور کریں... !

"وارث! مان نہ کریں کدی وارثاں دا

رب بے وارث کر مار دائی... !"

(وارث! مان نہ کرنا کبھی وارثوں کا

رب بے وارث کر کے مارتا ہے)

میں نے لعل دین کے دھواں دھواں سے چہرے کو ڈھلتی شام کے سپرد کیا اور گھر کی راہ لی۔

☼ ☼ ☼

جاتی سردیوں کی خنک شام تھی۔ تھکے ہارے مزدور، کسان گھروں کو لوٹ رہے تھے اور کچھ نے یقیناً" ڈیرے پر اکٹھے ہونا تھا، جہاں محفل رات گئے تک جمتی تھی۔ حقے گڑگڑائے جاتے، ماضی کے قصوں کی پٹاری کھل جاتی... اس دوران جانے والے گھروں کو چل دیتے اور کچھ کھانے اور نماز سے فراغت کے بعد واپس آبیٹھتے اور پھر رات گئے تک باتوں کا سلسلہ چلتا، جس کا اختتام موجو میراثی کے سنائے گئے کسی لوک گیت یا صوفیانہ کلام پر ہوتا اور گاؤں میں رات گئے سے مراد نو، دس بجے تک کا وقت ہوتا ہے۔ اکثر میں بھی ڈیرے پر جا بیٹھتا تھا، مگر یہ تب تک تھا جب تک مریم میرے گھر نہیں آئی تھی۔ وہ میری ذمہ داری اور فکر کی وجہ تھی ورنہ ذکیہ (بیوی) کے اکلاپے کی پروا میں نے کبھی نہیں کی تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ خدانخواستہ میں بے اولاد ہوں... ماشاء اللہ چار بچے ہیں میرے۔ دو لڑکیاں اور دو لڑکے۔ بیٹیاں شادی شدہ اور خوش باش اپنے اپنے گھروں میں آباد تھیں... اتفاق کی بات تھی کہ میری دونوں بچیاں سمندر پار جا بسی تھیں... کافی وقت بیت جاتا تھا ان سے ملے ہوئے...

باقی رہ گئے لڑکے... تو دونوں پڑھ لکھ کر نوکریوں سے لگ چکے تھے۔ شہر میں ہی ہوتے تھے... ہم نے بھی اعتراض نہ کیا کہ آخر اتنا پڑھ لکھ کر افسر بنے تھے تو زمینیں سنبھالنے سے انکاری ہو گئے۔

میں نے بھی کھلے دل سے انہیں شہر میں بسنے کی اجازت دے دی۔ ذکیہ نے بہتیرا رولا ڈالا تھا، پر میں نے بتایا نا کہ میں اس کے شور شرابے کی پروا ذرا کم ہی کیا کرتا ہوں۔

ویسے میرے بیٹے بے حد تابع دار اور فرماں بردار

تھے۔۔۔ ہمارا بے حد خیال رکھتے تھے۔۔۔ بلاناغہ فون پہ حال احوال پوچھنا ان کی ڈیوٹی تھی۔ میں تو ایک آدھ ضروری اور چیدہ چیدہ باتوں کے بعد نکل لیتا تھا مگر ذکیہ کو تو فون کے ریسیور سے عشق تھا۔ ایسی چمٹتی تھی کہ تب تک نہ چھوڑتی جب تک میں ہی چپکے سے پیچھے سے تار نہ نکال دیتا۔۔۔ وہ نمانی "ایلو ایلو" کیے جاتی اور میں کچھ دیر میں واپس تار لگا کر اسے چڑاتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولتا۔۔۔ "اے لو!"

وہ مجھے ایسی نظروں سے گھورتی جیسے میں نے اس کا اس کے بھیکے جانا بند کیا ہو۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ ہا۔

ان ہی دنوں اچانک مجھے شہر جا کر مریم کو اپنے ساتھ پنڈ لانا پڑا۔۔۔ ہمیشہ کے لیے۔ کسی خاص وجہ کے باعث میں ہمیشہ سے مریم سے رابطے میں تھا اور پھر جیسے ہی مجھے اس کے تنہا رہ جانے کا علم ہوا' میں اسے اپنے ساتھ شہر سے گاؤں لے آیا۔

ذکیہ نے کافی اعتراض کیا تھا پر میں نے جھاڑ۔۔۔ کر چپ کرا دیا اور سختی سے مریم کا خیال رکھنے کی ہدایت بھی کر دی۔ بس پھر چند دن ہی لگے تھے مریم کو ساری حویلی کا انتظام سنبھالنے میں۔۔۔ ذکیہ کو بھی چند ہی دن لگے' ویلے بیٹھنے کی لت لگنے میں۔۔۔ سب کچھ مریم کے حوالے کر کے پلنگ توڑتی تھی یا فون کر کے بیٹیوں کے کان کھاتی تھی۔

مریم کا بھی اب کافی حد تک دل لگ گیا تھا۔ پانچ ماہ ہونے کو آئے تھے اسے میرے گھر میں رہتے ہوئے۔ ہم سب ایک دوسرے سے بے حد مانوس ہو چکے تھے۔ بیٹیوں سے بڑھ کر مریم ہمیں عزیز ہو چلی تھی۔۔۔ اتنی خدمت کرتی تھی وہ بچی ہماری۔۔۔

میرے قدموں میں تیزی آ گئی تھی۔ راستے میں' میں نے جیدے حلوائی سے گرما گرم جلیبیاں لی تھیں۔

ان ہی ـــــــ سوچوں میں گم میں نے

دروازے پہ دستک دی تھی۔ حویلی کا بھاری بھرکم پھاٹک نما دروازہ ماسی رسولاں نے کھولا تھا۔ ماسی

رسولاں میری بے جی کے وقت سے ہماری حویلی میں قیام پذیر تھی۔ میں بھی اسی کے ہاتھوں پروان چڑھا تھا۔ اب تو بڈھی ۔۔۔ ہو چکی تھی کہ سر بالوں سے خالی اور منہ دانتوں سے فارغ تھا' مگر ابھی بھی چستی اور پھرتی لاجواب اور بصارت و سماعت بے مثال تھی۔

میں نے اندر قدم بڑھائے تو جھٹ سے کسی کونے سے مریم میرے سامنے آ کھڑی ہوئی اور میرا دل شاد کر گئی۔ کالے اور سبز امتزاج کے سادہ سے شلوار قمیص میں ملبوس' خوب صورت اور جاذب نظر نقوش والے سادہ سے چہرے کے گرد بڑی سی گرم شال لپیٹے وہ حسب معمول مجھ سے پیار لینے کے بعد' میرے ہاتھ سے جلیبیوں والا لفافہ تھام کر واپس مڑنے لگی تو میں نے پکار لیا۔۔۔

"او۔۔۔ مریم پتر! دو گھڑی کبھی بیٹھ بھی جایا کر۔ رات سونے تک ایک پیر پر کھڑی رہتی ہے۔۔۔ مائی کدھر ہے؟" کہنے کے ساتھ ہی میں نے اپنی بیوی ذکیہ کے بارے میں پوچھا۔

"چاچا جی۔۔۔! وہ تو مغرب پڑھ کر ہی کوٹھڑی میں چلی گئی تھیں۔۔۔ تسبیح لے کر اور کہہ گئی تھیں کہ عشا سے پہلے کوئی انہیں آواز نہ دے۔۔۔ وہ خود ہی باہر آ جائیں گی اور پھر مجھ سے بھی کہا کہ اپنے چاچے کو کھانا کھلا کر گرم گرم دودھ جلیبی دینا۔۔۔ بغیر کھانے کے نہیں اور۔۔۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ تمہارے چاچے کو شام ہوتے ہی سردی زیادہ لگنے لگ جاتی ہے اس لیے پہلے سے ہی انگیٹھی سلگا کر پاس رکھ دینا۔"

آخری جملہ مریم نے قدرے شریر ۔۔۔ انداز میں کہا تھا۔ میں بھی مسکرا دیا اور اس سے پوچھا۔

"اپنی چاچی کی کوٹھڑی میں بھی انگیٹھی رکھ دی ہے کہ نہیں۔۔۔؟ یہ نہ ہو کہ وظیفے پورے کرتے کرتے ہی ٹھٹھر جائے۔"

اگر ذکیہ کو میری پروا تھی تو ظاہر ہے مجھے بھی اس کی فکر تو رہتی تھی نا۔ یہ اور بات کہ میں اظہار کے معاملے میں قدرے کنجوس ہوں۔

"جی چاچاجی! بالکل رکھ دی ہے اور اب آپ بھی نماز پڑھ کر اندر اپنے کمرے میں چلیے... وہاں میں نے کچھ ہی دیر پہلے انگیٹھی رکھی تھی... اب تک تو کافی گرم ہو چکا ہو گا۔ ویسے بھی مغرب کا وقت گزر رہا ہے۔"

مریم کہہ کر جلدی سے باورچی خانے کی جانب چلی گئی جہاں سے تازہ کڑھے ہوئے دودھ کی مہک ہمک ہمک کر میرے نتھنوں میں پہنچ رہی تھی۔

میں نے تیزی سے کھرے کا رخ کیا اور نلکا گیزر کرتا زہ پانی سے وضو کرنے کے بعد وہیں برآمدے میں نماز مغرب ادا کرنے کے بعد اندر کمرے میں چلا آیا۔ کمرے میں واقعی سکون اور حدت موجود تھی جس نے میرے ٹھٹھرے ہوئے اعصاب پہ یک دم اچھا اثر ڈالا۔

رات کے کھانے میں ابھی کچھ وقت تھا تب ہی میں جوتا اتار کر پلنگ پر لحاف میں گھس گیا۔ دل نجانے کیوں بڑا بوجھل تھا۔ لعل دین کے منہ سے انکار سن کر میرا دل بے طرح اداس تھا۔ اب یہ اداسی انکار کی تھی یا اس کے سامنے اس راز کے آشکار ہونے کی جو آج تک میرے سینے میں بند تھا۔ جو بھی تھا... رہ رہ کر میری نگاہوں میں لعل دین کا پژمردہ چہرہ گھوم رہا تھا اور پھر میں لیٹے لیٹے کب لعل دین کے ساتھ بتایا ہوا پچھلا وقت دہرانے لگا مجھے اندازہ ہی نہ ہو سکا۔

☼ ☼ ☼

"اک دونی... دونی
دو دونی... چار
تین دونی... چھ..."

پیپل کے گھنیرے درخت کے نیچے بیٹھی سولہ بچوں کی جماعت ہل ہل کر زور و شور سے پہاڑہ دہراتی... سوئی پہ تنگی محسوس ہوتی تھی۔ ہلتے سروں والے بچوں کے اونچے سر کان پھاڑے دیتے تھے۔ ان ہی بچوں میں آخری سے پہلی رو میں بیٹھے میں اور لعل دین جمائیاں روکنے کی ناکام کوشش کیا کرتے جب کہ نظریں مسلسل ماسٹر غنی کی کرسی کی بانہہ سے ٹکے موٹے تازے مولا بخش کا طواف کیا کرتیں اور پھر نظریں، نظروں سے ملا کرتیں۔ جیسے ہی ماسٹر غنی بچوں کو دو کے پہاڑے کے پہاڑ تلے دبا کر خود میٹھی نیند کے جھونکوں میں جھولنے لگتے، میں اور لعل دین (جو اپنے بچپن میں لالی کے نام سے معروف تھا) ہولے ہولے کھسکتے ہوئے پہلے جماعت کی سب سے آخری رو میں کھسکتے اور پھر موقع دیکھتے ہی بڑی مہارت سے کھسک لیتے۔ ماسٹر محمد غنی جھولتے رہ جاتے اور باقی بچے دیکھتے رہ جاتے۔

کسی بچے کی جرات نہیں تھی کہ وہ ہم دونوں کے فرار کے بارے میں منہ سے کچھ پھوٹے کیوں کہ لعل دین خاصا ہتھ چھٹ اور کپتا (لڑاکا) واقع ہوا تھا۔ مرنے مارنے میں شروع سے ہی خاصا ہوشیار تھا اور پھر سب سے بڑی بات ملک نواز علی کا اکلوتا پتر... اپنے دادا دادی، ماں باپ سب کا چہیتا۔

میں یعنی محمد صادق صدیقی بھی ملکوں کی اولاد ہوں، مگر لعل دین کے ابا جی کے پاس میرے ابا جی سے چار مربعے زیادہ تھے۔ اس لیے وہ بڑے ملک جی کہلاتے تھے۔ یہی خناس لعل دین کے دماغ میں جا سمایا تھا اور اسے محسوس ہوا کہ وہ بڑی توپ چیز ہے۔

مجھ سے اس کی بڑی یاری تھی اور ہم دونوں کے گھرانوں کی دور کی رشتے داری تھی۔ آپس کے مراسم نے ہمیں اور ہماری دوستی کو آغاز سے ہی پنپنے کا موقع دیا تھا۔ اتفاق کی بات تھی کہ میں اور لعل دین ایک ہی دن کی پیدائش تھے۔ میں فجر کی اذانوں کے آس پاس اس دنیا میں وارد ہوا تھا جب کہ لعل دین عرف لالی اسی روز عصر سے کچھ پہلے اس دنیا میں کپت (لڑائی) ڈالنے آگیا تھا۔

ہماری ماؤں کا بھی آپس میں بڑا بہناپا تھا اور باپ بھی کسی چھوٹی بڑی چپقلش کے بغیر اپنا اپنا منصب سنبھالے بیٹھے تھے۔ میں پڑھائی میں لالی کی نسبت بہت بہتر تھا۔ وہ اسکول جاتا تھا تو صرف میری وجہ سے۔

اور میں اسکول آتا تھا تو صرف ماسٹر محمد غنی کی وجہ سے۔ جنہیں میرے ابا جی نے مجھ پر مولا بخش آزمانے کی کھلی چھوٹ دے رکھی تھی۔ اس کے باوجود لالی مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ "تخریبی کارروائیوں" میں ملوث کر لیتا تھا۔ اور بچپن میں بچے دنیاداری کے اور کسی رشتے کو نہیں نبھاتے ماسوائے دوستی کے....! یہ میرا اپنا ذاتی خیال ہے۔

سو میرا اور لالی کا بچپن ان ہی مستیوں میں گزرا تھا۔ فصلوں میں دوڑتے بھاگتے' دیسی کھیل کھیلتے' ماسٹر محمد غنی کا مولا بخش سہتے' بھانت بھانت کی شرارتیں کرتے' آخر کار میں نے "ہنستے ہوئے" اور لالی نے قدرے "روتے ہوئے" میٹرک کر ہی لیا۔

یہاں ان ہی دنوں کا ذکر ہے جب میٹرک کا رزلٹ نکلنے کے بعد میرا ایک دم شہر جا کر کالج میں داخلہ لینے کا جی کیا... حالانکہ پہلے میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ لالی کا نہیں تھا اور ہم دونوں کے ارادے شروع سے ایک سے ہی ثابت ہوئے تھے۔ یہ اور بات کہ ارادے پایہ تکمیل تک لالی کے ہی ہمیشہ پہنچتے تھے جب کہ میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہ جاتا تھا۔ اب یہ شہر جا کر پڑھنے کا ارادہ واحد ایسا تھا جو لالی کا نہیں تھا' میرا تھا۔ لالی تو بادشاہ آدمی تھا' میٹرک کی سند ہاتھ میں آتے ہی لہرا کر ہوا کے سپرد کی تھی اور اکڑتے ہوئے بولا تھا۔

"لو جی! اے وی سیاپا مکا' ہن مربعے سانبھاں گے تے مربے کھاواں گے۔"

(لو جی! یہ بھی سیاپا ختم... اب مربعے سنبھالیں گے اور مربے کھائیں گے)

ساتھ ہی قہقہہ مارتے ہوئے زوردار دھپ میری ران پر دے ماری تھی... اور میں جو بڑا مگن سا ہاتھ میں مکئی کی روٹی تھامے' ران پہ دھری ساگ اور مکھن کے گول گول سفید سفید پیڑے سے سجی کٹوری رکھے لالی کی لن ترانیاں سن رہا تھا... اگلے ہی پل زوردار اور کان پھاڑ قہقہہ مارنے پر مجبور ہو گیا۔ لالی رزلٹ والے دن کے لیے خاص الخاص نئی نکور لشکارے مارتی کھیڑی پہن کر آیا تھا اور اسکول سے واپسی پر بھی بڑا بچ بچا کر پیر جماتا میرے ابا جی کے کھیتوں کے مرکز میں بنے ٹیوب ویل تک آیا تھا۔

وہیں میں نے چھوٹے یوسف کو گھر بھگایا تھا کہ جو بھی پکا ہے' ادھر ہی لیتا آئے اور وہ بے جی سے پوٹلی میں ساگ اور مکئی کی روٹی بندھوا لایا تھا۔ لالی نے چند نوالے لینے کے بعد ہاتھ کھینچ لیا اور ہاتھ لہرا لہرا کر بڑھکیں مار رہا تھا جب کہ میں ابھی سیر نہیں ہوا تھا۔

اسی شوخی میں لالی نے بغیر دیکھے میری ران پہ دھپ دے ماری تھی اور مکھنو مکھنی ہوا ساگ الٹ کر لالی کے کھیڑی سے سجے پیر پہ جا سجا اور اسی چیز نے میری ہنسی چھڑا دی۔ جب کہ لالی کی حالت ایسی تھی کہ جیسے سکتے میں چلا گیا ہو۔ پاؤں کھیڑی سمیت زمین پہ جم گیا تھا۔ میں نے بمشکل اپنی ہنسی کو روکا اور لالی کی پھٹی پھٹی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرا کر اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی تو اس نے بڑے اداکارانہ انداز میں چہرے کا رخ میری جانب کیا... میں سمجھا کہ صدمے میں ہے... اگلے ہی پل عرش پھاڑ ہنسی فوارے کی مانند اس کے منہ سے پھوٹی تھی اور پھر ہم دونوں ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہوتے دہرے ہوتے چلے گئے۔

ایسے ہی خوب صورت دن تھے وہ جب مستی اور شرارت تمام جسم میں رقصاں رہتی تھی اور یوں ہی دن پہ دن بیتتے چلے جاتے تھے۔

☆ ☆ ☆

میرے شہر جانے میں تقریباً" ایک ہفتہ ابھی باقی تھا جب لالی کی حویلی میں اس کی پھپھی کی بچوں سمیت آمد ہوئی۔ لالی کی پھوپھی دوسرے گاؤں کی رہنے والی تھی' پر اب مجھے بے جی کی زبانی پتا چلا تھا کہ پھوپھی کے شوہر اپنی تمام اراضی فروخت کر کے شہر میں کسی کاروبار میں سرمایہ لگا رہے تھے جس کے لیے انہیں شہر میں کچھ عرصہ اکیلے رہائش اختیار کرنی تھی' چونکہ پھوپھی کی سسرال میں ان کی اپنی ایک نند کے علاوہ کوئی نہیں تھا اور وہ بھی شہر میں بستی تھی۔ لہٰذا ان کے خاوند کو اپنے بال بچوں کی فکر لاحق تھی کہ انہیں گاؤں میں غیر معینہ

مدت کے لیے کس کے آسرے پر چھوڑا جائے تو لالی کے ابا جی نے جھٹ بہنوئی کو تسلی کا پیغام بھجوایا اور بہن اور ان کے بچوں کو حویلی بھیجنے کو کہا، مگر لالی کے پھپھا جی متردد تھے کیوں کہ ان کی سب سے بڑی بیٹی لالی کی منکوحہ تھی۔ بچپن میں ان کا نکاح کردیا گیا تھا۔ اس نازک رشتہ کی وجہ سے وہ اپنی بیٹی کو یہاں نہیں بھیجنا چاہتے تھے۔ وہ زیبو کے اٹھارہ سال سے پہلے رخصتی کے حق میں نہیں تھے۔

یہ مسئلہ بھی بہت سے تسلی دلاسوں کے ساتھ نبٹ گیا تھا۔ یوں لالی کی پھوپھی بمع اہل و عیال جس میں سرفہرست اس کی منکوحہ زیب النساء عرف زیبو تھی، اپنے بھائی کے گھر آموجود ہوئیں اور لالی کی موجیں لگ گئیں۔ وہ لالی جو ٹیوب ویل کی ٹھڑی پہ بیٹھ کر سارا دن گرمیوں میں تربوز اور آم کھاتا تھا اور سردیوں میں گاجریں، مولیاں اور شلجم ڈکارتا رہتا تھا اور وہیں بیٹھے بیٹھے سورج غروب کردیا کرتا تھا۔ مجھے بھی دوپہر کے بعد کا اکثر حصہ وہیں بتانا پڑتا تھا۔ اب وہی لالی تھا جو حویلی سے باہر جھانک کر نہیں دیکھ رہا تھا۔ سارا سارا دن پھپھو کے گوڈے سے لگ کر بیٹھتا تھا اور بعدازاں اپنی بے بے سے اس جرم کی پاداش میں گٹوں پر سوٹے کھاتا تھا، مگر پھر بھی ہمت نہیں ہاری اور پھوپھی کے ذریعے درحقیقت زیبو کو متاثر کرنا معمول بن گیا۔

میں شہر جانے کی تیاریوں میں لگا رہا اور لالی یہاں چن چڑھانے کی تیاری میں لگا تھا۔ مجھے کانوں کان خبر نہ ہوسکی کہ لالی نے کب اور کیسے زیبو کو اپنے "عشق" کی سرمے دانی سے "اعتبار" کی سلائیاں نکال نکال کر آنکھوں میں پھیریں کہ وہ احمق نہ صرف اندھی ہوئی بلکہ شرم و حیا کے پردے بھی چاک کر بیٹھی۔ حویلی کی بیٹھک میں یا کبھی کسی نادیدہ کونے کوٹھڑی میں ہونے والی ملاقاتیں کب کماد کے کھیتوں اور بھینسوں کے باڑے کے پچھواڑے بنے توڑی بھوسے والے کمرے میں منتقل ہوئیں۔

میں آج بھی سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ میں جو لالی کے دن رات کو اس سے زیادہ جانتا تھا، کیسے اس کی بیشتر اوقات میں ہونے والی حرکات سے بے خبر رہ گیا۔ دال میں کچھ کالا ہے، یہ تو مجھے کئی دنوں سے ہی شک تھا، مگر اس کالک کے نتیجے سے لالی بے پروا ہوگا، میں اسے کم از کم اتنا لاپروا نہیں جانتا تھا۔

جس صبح میں نے لاری چڑھنا تھا، اس سے ایک شام پہلے میری لالی سے ملاقات ہوئی تھی اور مجھے وہ کافی چپ چپ اور بوکھلایا سا محسوس ہوا، مگر میں نے کرید نہیں کی تھی۔ اس کام کے لیے میں موجو کو چھوڑے جارہا تھا۔

موجو میرا اور لالی کا ہم عمر تھا، مگر کامے (ملازم) کا پتر تھا۔ ملتان کے انتہائی پسماندہ قصبے سے تعلق رکھنے والا۔ اس کا خاندان بہت عرصہ ہوا ہجرت کرکے اندرون پنجاب آبسا تھا۔ یہ لوگ میراثی بھی نہیں تھے، مگر موجو کا باپ بیٹھے بٹھائے ایسے ۔۔۔ چھکے چھوڑتا تھا کہ دنوں میں "بخشو میراثی" کے نام سے جانا جانے لگا۔ قدرت نے گلے میں سُر دیا تھا۔ کافیاں اور لوک گیت بڑے سُر میں گاتا تھا۔ غریب تھا اور شریف بھی۔۔۔ فاقہ کشی نے عزت نفس کا چولا اتار پھینکنے پر مجبور کردیا تھا، جب ہی لوگوں نے میراثی کہا تو وہ میراثی بن گیا۔ گندم، چاول کے لیے ملکوں کو خوش کیے رکھتا تھا۔ یہی صفات آگے سے موجو میں بھی تھیں۔ موجو ہو بہو اپنے باپ کی کاربن کاپی تھا۔ بول چال، عادات و فطرت اور گلے کا سُر سب ہی کچھ اس نے بخشو میراثی سے لیا تھا۔

میرے اور لالی کے علاوہ گاؤں کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ ہی کھیل کر جوان ہوا تھا پر کبھی اپنی حیثیت نہیں بھولا اور اب وہی موجو "موجو میراثی" کے نام سے جانا جاتا تھا۔ باپ مر گیا تھا اور اس کا منصب موجو نے سنبھال لیا تھا۔۔۔

خیر۔۔۔! بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ موجو میری بہت عزت کرتا تھا، اسی لیے لالی کی نسبت وہ مجھ سے کچھ حد تک بے تکلف تھا، لیکن وہ کبھی بھی میرے اور اپنے مرتبے کو نہیں بھولتا تھا۔ جب کہ لالی اس پر اپنے ملک ہونے کا خوب رعب جھاڑتا تھا اور اب اسی موجو کو میں یہ ڈیوٹی سونپ آیا تھا کہ لالی پر خوب نظر

رکھے۔ اس کی حویلی کے اندر اور باہر ہونے والی مختلف کارروائیوں پر ممکنہ حد تک نظر رکھے اور مجھے میری چھٹیوں کے دوران واپسی پر مفصل رپورٹ دے کیوں کہ میری چھٹی حس کسی بڑی گڑبڑ کی طرف اشارہ کر رہی تھی اور پھر موجو نے اس فرض کو خوب نبھایا' میرے نزدیک وہ ایسا ہی قابل اعتماد تھا۔

تقریباً" ڈھائی ماہ تک میری گاؤں واپسی ممکن نہیں ہو سکی تھی کیوں کہ ایک تو کالج میں نیا نیا ایڈمیشن اور پھر چھوٹے موٹے دیگر ضروری امور سے فراغت پانے میں مجھے کچھ وقت لگ گیا تھا۔

شہر میں میری رہائش اباجی کے چاچے کی بیٹی کے گھر تھی۔ اباجی سے عمر میں کافی چھوٹی تھیں اور وہ اور ان کے شوہر ہماری بڑی قدر کرتے تھے کیوں کہ شہر میں سکونت اختیار کرنے اور چھوٹا موٹا کاروبار سیٹ کرنے کے لیے میرے اباجی نے ہی اپنی چچیری بہن کو قرض فراہم کیا تھا۔

ان دونوں میاں بیوی کی ایک ہی بیٹی تھی جو اس وقت پانچ سال کی تھی بہت خوب صورت تھی اور میں اس کے بڑے لاڈ اٹھاتا تھا۔ اباجی کی کزن کو میں پھوپھی ثریا ہی کہتا تھا' دونوں میاں بیوی نے میرا خوب خیال رکھا تھا۔ کالج کی پڑھائی شروع ہو چکی تھی اور میری رہائش کا مسئلہ بھی حل ہو گیا تو میں نے گاؤں کا چکر لگایا تھا۔

موجو انکشافات کی پٹاری لیے میرا منتظر تھا۔ میں جمعرات کی شام کو حویلی پہنچا تھا اور اگلے دن شام کو میری واپسی تھی لہٰذا پہلی شام تو ملنے ملانے میں اور بے جی سے لاڈ اٹھوانے میں صرف ہوئی۔ اگلے دن تڑکے ہی موجو مجھے لیے کھیتوں کی طرف چل دیا۔ میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا جس میں سرفہرست لالی کی گمشدگی تھی۔ بے جی سے معلوم ہوا تھا کہ لالی تقریباً" دو ہفتے سے اپنی اماں اور پھوپھی کے علاوہ زیبو کو لے کر کسی دوسرے پنڈ گیا ہے۔ جس پنڈ کا اماں نے نام لیا تھا وہ ہمارے گاؤں سے بہت دور تھا اور کافی پسماندہ بھی۔ میں نے وہ پوچھی تھی' بے جی نے لاعلمی ظاہر کی اور ساتھ میں حیرت بھی کہ لالی کی ماں انہیں بتائے بغیر کیسے روانہ ہو گئی۔ آخر ایسی کیا مجبوری آن پڑی تھی.....!

اور پھر موجو نے مجھے بتایا کہ بڑے ملک جی کی حویلی میں کوئی بڑی ہی کھچڑی پک رہی ہے۔ دو ہفتے پہلے چھوٹے ملک جی (لالی) اپنی پھوپھی اور ملکانی جی کے ساتھ منہ اندھیرے ادھر سے روانہ ہوئے تھے۔ ساتھ میں ایک لڑکی بھی تھی جس نے برقعہ اوڑھ رکھا تھا۔ کسی کو کچھ پتا نہیں کہ وہ سب اتنی اچانک ادھر سے کیوں گئے تھے.....؟ پیچھے حویلی میں صرف بڑے ملک جی اور ان کی بہن کے دوسرے بال بچے موجود ہیں۔

موجو کی دی ہوئی تفصیل میں کسی انہونی کے بہت سے مبہم اشارے تھے۔ وہ کاما تھا منہ نہیں کھول سکتا تھا اور میں لالی کا یار تھا اس لیے خاموش تھا' پر ہم دونوں ایک ہی بات سوچ رہے تھے اور وہ یقیناً" سچ تھی۔ لالی نے دال کالی کر دی تھی.....

مگر مجھے حیرت تھی کہ اس سنگین صورت حال میں لالی اور زیبو کی رخصتی کیوں نہیں کی گئی.....؟ میں لالی سے ملنا چاہتا تھا مگر اس کی واپسی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سوچ چاپ' موجو کو ہوشیار رہنے کی تلقین کرتا واپس ہو لیا۔

مجھے شہر آئے ابھی چند دن ہی ہوئے ہوں گے جب ایک دن کالج سے واپسی پر ثریا پھوپھی کے گھر کے باہر میں نے لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ ناگہانی کے احساس نے میرے حواس منجمد کر دیے۔ مجھے پہلا خیال چور ڈاکوؤں کا آیا تھا..... نامعلوم بدبخت کیا کیا کچھ لوٹ کر چلتے بنے.....؟

میں حوصلہ جوڑتا' لوگوں کے درمیان سے گزرتا صحن تک آیا تو سامنے کے منظر نے مجھے اتنا ششدر کیا کہ میں کھڑے قد سے ایک جھٹکے کے ساتھ فرش پر گھٹنوں کے بل گرا۔ سامنے چارپائی پر پھوپھی ثریا کے شوہر کی لاش ادھڑی پڑی تھی۔ اعضاء کٹ پھٹ چکے تھے' صرف چہرہ سلامت تھا۔ بے تحاشا خون دیکھ کر میرا جی متلایا تھا' مگر میں نے خود پر قابو پایا اور پچھاڑیں

کھاتی پھوپھی کو جاکر سہارا دیا۔ ان کے بین کان پھاڑے دے رہے تھے' ان کی ننھی سی پانچ سالہ بیٹی فوزیہ' کسی ہمسائی ۔۔۔ کی بغل میں گھسی سسکیاں بھر رہی تھی۔

گھنٹے بھر میں گاؤں سے ابا جی اور بے جی بھی پہنچ گئے۔ اس کے بعد میت کو جیسے تیسے غسل دیا گیا تھا۔۔۔۔! جو لوگ لاش لے کر گھر آئے تھے' ان ہی سے معلوم ہوا کہ پھوپھی کے شوہر اپنی ہی فیکٹری میں رکھی آرے والی مشین میں حادثاتی طور پر آکر کٹ مرے۔ سانحہ بہت بڑا تھا۔۔۔۔ ابا جی اور بے جی چند دن بعد واپس ہولیے تو مجھے سختی سے کہہ گئے کہ پھوپھی کی عدت مکمل ہونے سے پہلے گاؤں کا رخ نہ کروں' مبادا باہر کے کسی کام کے لیے ضرورت پڑے اور گھر میں کوئی مرد موجود نہ ہو۔ لہٰذا اگلے چار ماہ تک میں کلی طور پر گاؤں سے کٹ گیا۔ خدا خدا کر کے ادھر پھوپھی کی عدت ختم ہوئی اور مجھے کالج سے چھٹیاں ہوئیں تو میں گاؤں بھاگا۔

پھوپھی کے پاس ہر وقت ہمسائیوں کا تانا بندھا رہتا تھا اور ایک بڑھیا سی عورت پھوپھی نے مستقل رکھ لی تھی' سو میں کچھ دن کے لیے بے فکری سے گاؤں جاسکتا تھا۔

گاؤں میں داخل ہوتے ہی مجھے موجو نظر آگیا تو میں نے اسے آواز دے کر متوجہ کیا۔ وہ دوڑتا ہوا آیا اور میرے ساتھ چلتا اسی راہ ہولیا جو میری حویلی کی سمت جاتی تھی۔ ادھر ادھر کی ہانک کر اس نے مجھے بتایا تھا کہ لالی اور اس کی ماں واپس حویلی آچکے تھے مگر لالی کی پھوپھی اور زیبو ہنوز حویلی میں موجود نہیں تھیں۔

میں حیران ہونے کے ساتھ ساتھ متجسس بھی تھا۔ یہ سارا چکر میری سمجھ سے باہر تھا۔

میں گھر پہنچا سب سے ملنے ملانے کے بعد ابھی نہانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ چھوٹے یوسف نے مجھے لالی کے آنے کی اطلاع دی۔ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ' بیٹھک کی طرف بھاگا اور پھر ہم دونوں بڑے پرجوش انداز میں ایک دوسرے سے گلے ملے تھے کہ کم و بیش سات ماہ تو ہو چکے تھے ایک دوسرے سے دور ہوئے۔۔۔۔!

ڈھیروں باتیں ہوئیں۔۔۔ شہر کی' گاؤں کی۔۔۔ ادھر ادھر کی۔۔۔۔! یہاں تک کہ لالی نے بتایا کہ اس سال فصل کی کٹائی کے بعد اس کے ابا زیبو کو باقاعدہ بیاہ کر گھر لارہے ہیں مگر میں پوچھ نہ سکا کہ پچھلے اتنے مہینوں سے وہ کیا کرتا پھر رہا ہے اور نہ ہی اس نے خود سے کوئی ذکر کیا۔ مجھے دکھ بھی بہت ہوا مگر خاموش رہا کہ ہو سکتا ہے لالی شرمندہ ہو اور یہی شرمندگی اسے کچھ بھی کہنے سے باز رکھے ہوئے ہو۔ اور مجھے لالی کی عزت نفس بہت عزیز تھی۔

زیبو اور لالی کی شادی کی خوشی اپنی جگہ۔۔۔۔! مگر اندر والا رولا پتا کیے بغیر چین مجھے بھی نہیں تھا۔ شہر واپسی پر ایک دفعہ پھر موجو الرٹ تھا۔ اب کی بار میں نے اسے حتمی اور کھری معلومات حاصل کرنے کو کہہ دیا تھا چاہے اس کام کے لیے اسے اس پنڈ جانا پڑتا جہاں زیبو اور اس کی ماں کے موجود ہونے کا امکان تھا۔ کیونکہ موجو کو یقین تھا کہ وہ دونوں اسی پنڈ میں ہیں اور اس کی وجہ وہ میری واپسی پر مع تفصیل مجھے بتانے والا تھا۔

شہر کی اپنی ہی ایک دنیا ہوتی ہے' وہاں کا اپنا ہی ایک نشہ ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ مجھے بھی شہر کی ہوا راس آگئی تھی۔ وہاں میرا خوب دل لگتا۔ شام کو کالج کے دوستوں کے ساتھ مل ملا کر "بتیاں" دیکھنے نکل پڑتا اور اکثر دیر سے واپسی ہوتی۔ اس کے علاوہ ثریا پھوپھی اور فوزیہ کی بھی ساری ذمہ داری میں نے اٹھا رکھی تھی۔ اندر باہر کے سب ہی کام میں خود ہی نبٹاتا تھا۔ اسی لیے پھوپھی کو بھی میری تفریح پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

سیکنڈ ایئر کی کلاسز شروع ہوئے ابھی چند ہفتے ہوئے تھے کہ ابا جی کا خط موصول ہوا جس میں انہوں نے لالی کی شادی کی بھی اطلاع دی تھی۔ مجھے پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ وہ تمام باتیں بھی یاد آگئیں جن کی کھوج میں' میں موجو کو لگا کر آیا تھا۔ ویسے تو گاؤں میں لڑکیاں چھوڑ' لڑکوں کی بھی جلدی

شادی ہونا کوئی ان ہونی نہیں تھی۔ لالی اور میں بھی اٹھارہ برس کے ہو چکے تھے' میں تو مزید پڑھنے شہر آگیا تھا مگر لالی کی شادی میں ایسی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

[illegible] تھی اور پھر [illegible]!

سو اس کا بیاہ کسی کے لیے باعث حیرت نہیں تھا۔ میرے اندر بس کھلبلی سی مچی تھی تو یہ جاننے کی کہ میری غیر موجودگی میں موجو کے پاس کیسی کیسی حیرت انگیز خبریں جمع ہو چکی تھیں۔

گاؤں میں شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ بڑے ملک جی کے اکلوتے پتر کی شادی تھی' جتنا بھی کرتے کم تھا۔ دو ہفتے پہلے سے ہی لنگر شروع ہو گیا تھا۔ گاؤں میں کسی کے گھر بھی چولہا گرم کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ میں نے بھی حویلی پہنچتے ہی اپنی خدمات پیش کر دی تھیں اور پھر دن رات کا فرق مٹائے شادی کے انتظامات میں جت گیا۔ موجو تو تھا ہی کاما..... میں نے اسے مسلسل اندر باہر کے کاموں میں چکراتے دیکھا حالانکہ میں جلد از جلد اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔

گو کہ لالی بے حد خوش تھا مگر کچھ تھا جو اوپرا اوپرا سا محسوس ہوتا تھا۔ وہ بات کرتے ہوئے یک دم کسی سوچ میں گم ہو جاتا تھا اور اس کی وجہ مجھے صرف موجو ہی بتا سکتا تھا۔ آج کل ابا جی کی طبیعت بھی کچھ گری گری سی رہتی تھی۔ سینے میں جکڑن سی محسوس کرتے اور جسم سن ہو جانے کی شکایت تھی۔ ابا جی اسے موسم کی تبدیلی کا اثر قرار دیتے تھے اور حکیم جی سے دوائی لے کر چپکے بیٹھ رہتے۔ شام ہوتے ہی میں بھی گھر لوٹ آتا تھا کہ ابا جی اور دیگر گھر والوں کے ساتھ وقت گزار سکوں۔

ایسے ہی ایک شام میں لالی کی حویلی سے لنگر کی تقسیم کے بعد گھر لوٹ رہا تھا کہ راستے میں ہی ایک درخت کی اوٹ سے موجو نے مجھے پکارا۔ پہلے تو میں چونکا پھر تسلی کرنے کے بعد اس کے ساتھ وہیں درخت کے موٹے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ارد گرد کی جھاڑیوں کی وجہ سے ہم اوٹ میں تھے۔ میں نے موجو کو جلدی سے چالو ہونے کا کہا کہ مجھے اذانوں سے پہلے ابا جی کے پاس پہنچنا تھا اور پھر موجو "چالو" ہو گیا! ایک ایسی حیرت انگیز داستان میری منتظر تھی جو میرے حواس شل کیے دے رہی تھی۔

موجو نے مجھے بتایا کہ میرے شہر جانے کے بعد وہ تسلی سے لالی کی سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے تھا اور پھر ایک دن موجو نے زیبو اور اس کی ماں کا بھی پتا چلا لیا' جب منہ اندھیرے اس نے لالی کو کچھ ضروری سامان کے ساتھ گاؤں سے باہر جانے والے رستے پر مڑتے دیکھا.....

موجو نے بڑی ہوشیاری سے لالی کا پیچھا کیا تھا اور پھر تھوڑی مشکل سے وہ لالی کے پیچھے اس گھر تک پہنچ گیا جہاں زیبو اور اس کی ماں موجود تھیں۔ یہ ایک نہایت خستہ حال سا دو کمروں کا کچا مکان تھا۔ جس کا مالک اس گاؤں کا واحد کمہار عبداللہ تھا اور دو سال پہلے فوت ہو گیا تھا۔ اب وہاں اس کی بیوہ اور چار بچے برے حالوں میں رہتے تھے۔

موجو ٹھکانہ دیکھ کر لوٹ آیا تھا اور پھر اگلے چند دن اس نے وہاں کے مسلسل چکر کاٹ کر یہ پتا چلا لیا تھا کہ زیبو اور اس کی ماں اسی گھر میں موجود ہیں اور وہ بھی پچھلے کئی ماہ سے۔ زیبو امید سے تھی اور کچھ ہی عرصے میں اس کے ہاں ولادت متوقع تھی اور جب تک ولادت ہو نہیں جاتی' زیبو کو وہیں رہنا تھا اپنی ماں کے ساتھ۔ اس بات کی ارد گرد کسی کو خبر نہیں تھی۔ ان دونوں سے ملنے کے لیے بھی صرف لالی ہی آتا تھا جو اپنے ساتھ پورے ٹبر کے لیے ڈھیروں سوغاتیں لے کر آتا تھا۔ اس بیوہ مائی اور اس کے بچوں کے دن پھر گئے تھے۔ ساری عمر اتنا نہیں کھایا تھا جتنا ان چند ماہ میں.....

بدلے میں زیبو کی بھرپور نگہداشت کی ذمہ داری اور بھردائی کے فرائض اسی عورت کو پورے کرنے تھے۔ موجو کا ایک یار اسی پنڈ کا رہائشی تھا..... وہ اتفاق سے اسی بیوہ عورت کی سب سے بڑی بیٹی کا منگیتر تھا۔ اسی کے ذریعے موجو نے بڑی احتیاط سے اندر کی باتیں باہر نکلوائی تھیں اور نکلنے والی تھی' موجو کے یار کی

منگیتر۔۔۔۔!

جس کو چند میٹھی باتوں اور درجن بھر رنگین چوڑیوں سے اس کے منگیتر نے رام کیا اور ساری کتھا سننے کے بعد موجو کو بتائی۔ اس دوران موجو بے صبری سے میرا انتظار کرتا رہا تھا مگر میں شہر میں مصروف تھا۔ اور اب قریباً" ڈیڑھ ماہ پہلے زیبو کے ہاں لڑکا ہوا تھا جس کی ولادت اسی گھر میں ہوئی۔

واہ۔۔۔۔! قدرت کے رنگ ہیں یہ سب ملکوں کے وارث کو لاوارثوں کی طرح اسی بیوہ عورت کے حوالے کر آئے۔

لالی اور زیبو کے اس کسب (عمل) نے بڑے ملک جی کو بے حد چراغ پا کیا۔۔۔۔ مگر پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ پانچ ماہ گزر چکے تھے۔ بہنوئی کو پھنک بھی پڑ جاتی تو بیٹی کو تو بعد قتل کرتے پہلے لالی کا گلا دبا دیتے۔ بہن کا گھر اجڑ جاتا۔ لالی ان کا اکلوتا وارث تھا۔ پھر اس اکلوتے وارث کی بھیانک غلطی کو مٹانے کی بہت کوشش کی گئی مگر دائی کے بقول وقت اوپر ہو چکا تھا۔۔۔۔ اب لڑکی مرے گی اگر کچھ ایسا کیا گیا تو!

پھوپھی کا دن رات کا رونا سب کے دل دہلائے دے رہا تھا اور خود پھوپھی کا دل دہل رہا تھا اپنے شوہر کا سوچ سوچ کر کہ اگر انہیں اس سارے سلسلے کی بھنک بھی پڑ گئی تو زیبو کا تو وہ بعد میں کچھ کریں گے، پہلے خود ان کا حشر کر دیں گے۔۔۔۔ مگر یہ خبر زیبو کے باپ سے چھپی نہیں رہ سکی اور پھر بڑی حویلی میں وہ کہرام مچا کہ رشتے ناتے ٹوٹنے کی نوبت آ گئی۔۔۔۔

زیبو کے باپ نے بیوی کو لالی کے ابا جی کے سامنے پیٹ ڈالا۔۔۔۔ معاملہ سلجھتا نہ دیکھ کر بڑے ملک جی نے پگڑی بہنوئی کے پیروں میں رکھ دی اور کہا کہ "میرے بیٹے نے غلطی ضرور کی ہے۔ گناہ نہیں کیا۔ تمہاری بیٹی آج بھی میرے گھر کی عزت ہے اور ہمیشہ رہے گی۔"

اس بات پر لالی کے پھوپھا کا دماغ تھوڑا ٹھنڈا ہوا اور پھر مل بیٹھ کر آگے کے حالات پر غور شروع ہوا۔

لالی کے پھوپھا کی ترجیح فوری رخصتی تھی جو کہ سردست ممکن ہی نہیں تھی۔۔۔ کیونکہ زیبو کے حمل کو پانچ ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا اور اگر شادی کر دی جاتی تو صرف چار ماہ بعد ولادت پورے گاؤں کو مشکوک کر دیتی۔۔۔۔!

یہ انتہائی راز کی باتیں حویلی کی بے حد پرانی نمک خوار ملازمہ ماسی برکتے نے انتہائی رازداری کی تاکید کے ساتھ موجو کی ماں کے کان میں انڈیلی تھیں۔۔۔۔! ماسی برکتے موجو کی ماں کی سگی ماسی تھی، جسے عرصہ بیت چکا تھا حویلی کا نمک کھاتے۔۔۔۔! مگر آخر عورت تھی۔۔۔۔ حویلی کا یہ انتہائی قیمتی راز موجو کی ماں کے سامنے اگل کر پیٹ ہلکا کر چلتی بنی اور موجو جو چارپائی والی کھڑکی میں گھسا مزے سے بیڑی پہ بیڑی سلگائے جا رہا تھا، سب کچھ جان گیا۔ اور ادھر ادھر خجل خوار ہونے کی نوبت ہی نہ آئی اور گھر بیٹھے ہی بڑی حویلی کے خفیہ کھاتے کھل کر سامنے آ گئے۔

ماسی برکتے نے ہی موجو کی ماں کو بتایا تھا کہ چونکہ فوری شادی نہیں ہو سکتی لہٰذا ولادت تک کا انتظار ناگزیر تھا اور یہیں آ کر لالی کا پھوپھا پھر اینٹھ گیا کہ وہ کسی بھی صورت وہ بچہ اپنے خاندان میں نہیں دیکھنا چاہتا۔۔۔۔! چاہے لالی اسے خود فنا آئے یا کسی بے اولاد کو دے دے مگر وہ اسے اپنا نواسہ یا نواسی تسلیم نہیں کریں گے۔ آخر لوگوں سے کیا کہہ کر اس بچے کو خاندان میں شامل کیا جائے گا۔۔۔۔؟ اور صرف ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے بڑے ملک جی نے بھی ان کی تائید کر دی تھی، ورنہ ان کی بہن کا گھر اجڑنے کی نوبت آ گئی تھی۔

اس کے بعد موجو کے بقول لالی کے ہاں لڑکا ہوا تھا جسے زیبو اور اس کی ماں اسی بیوہ عورت کے حوالے کر کے واپس حویلی آئی تھیں۔ زیبو کسی صورت آمادہ نہیں تھی مگر باپ کے خوف سے اسے دل پر پتھر رکھنا پڑا۔ لالی خود بہت پریشان تھا، چاہے جیسے بھی حالات میں وہ دنیا میں آیا۔۔۔۔ تھا تو دونوں کی اولاد۔

لالی نے اس بیوہ عورت کو سختی سے تاکید کی کہ بچے کی خوراک پانی کی طرف سے کسی قسم کی لاپروائی نہ

کرے... بدلے میں اسے ماہانہ رقم اور اناج ملتا رہے گا۔ اور یہ لالچ اس عورت کے لیے بہت بڑا تھا... کہ گھر کے حالات تو دو وقت کی روٹی کو بھی ترساتے تھے' کہاں ڈھیروں اناج اور نقد رقم کی صورت ڈھیروں ضرورتوں کا پورا ہونا...! ایسے میں تو وہ ایک چھوڑ دس بچے بھی پال دیتی۔

یہ ساری کتھا موجو کی زبانی سن کر میرا دل بے طرح اداس ہو گیا تھا۔ آخر اس بچے کا قصور...؟ اور پھر لالی کی پریشانی بھی جائز تھی... مگر اب وہ اپنے کیے کا خمیازہ بھگت رہا تھا۔

میں نے موجو سے پوری تسلی کی کہ اس کی ماں اور ماسی برکتے یہ باتیں کسی تیسرے کو تو نہیں بتادیں گی تو اس نے مجھ سے کہا کہ وہ دونوں کو ٹھیک ٹھاک تڑیاں (دھمکیاں) لگا کے ڈرا چکا ہے اور وہ اب بھی بھی منہ نہیں کھولیں گی۔ مجھے اس کی تڑیاں سن کر بے حد ہنسی آئی تھی۔ اور پھر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں گھر آیا تھا۔ جہاں ایک نئی پریشانی میری منتظر تھی۔ ابا جی کی طبیعت یک دم بگڑ گئی تھی۔

ابا جی پر فالج کا زبردست حملہ ہوا تھا' پھر انہیں چار و ناچار شہر لے جایا گیا اور اسپتال داخل کروا دیا گیا...

دو ہفتے ابا جی انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں رہے اور پھر ڈھیروں دواؤں اور ہدایتوں کے ساتھ ابا جی کو حویلی لایا گیا۔ ان کا جسم تقریباً "مفلوج" ہو چکا تھا۔

بے جی الگ پریشان تھیں' ان پر دہری ذمہ داری آن پڑی تھی... ابا جی کی شدید بیماری اور حویلی کا انتظام...!

گھر میں ملازموں کی کمی نہ تھی مگر بے جی کو شدت سے ایک بیٹی کی کمی محسوس ہو رہی تھی جو اگر ہوتی تو یقیناً" اس مشکل گھڑی میں بے جی کے شانہ بشانہ ہوتی۔ مجھ سے چھوٹے دو بھائی تھے' بہن کوئی نہ تھی' حالانکہ بے جی کے ہاں بیٹی ہوئی تھی پر وہ چند سانسیں لے کر پار لگ گئی تھی۔

اب ابا جی بے حد چڑچڑے سے رہتے تھے' بے جی ان کے پاس سے ذرا سا بھی ہٹتیں تو شور کرتے اور لایعنی آوازیں نکال کر غصے کا اظہار کرتے۔ ابا جی کی بیماری کی خبر سن کر ثریا پھوپھی اور فوزیہ بھی چند دن کے لیے گاؤں چلے آئے تھے' ان کے آنے سے بے جی کو بڑا آسرا ہوا تھا مگر کب تک...!

ادھر میں لالی کے ساتھ مل کر اس کے بیاہ سے پہلے اور بعد کے سلسلے نبٹانے میں لگا تھا اور ادھر پھوپھی ثریا نے اماں کو نئی راہ دکھادی۔ میری شادی کا شوشا...! میں نے سنا تو ہکا بکا منہ دیکھتا رہ گیا... ہتھے سے اکھڑا' مگر پھوپھی اور بے جی نے جذباتی ہتھکنڈے استعمال کر کے میرا زور توڑا... بقول ان کے پڑھ لکھ کر مجھے کون سا نوکری ڈھونڈنی ہے جو میری شادی میں دیر کی جائے... رب کا دیا بہت کچھ ہے! میں اگر پڑھنا چاہوں تو پڑھتا رہوں' پر کم از کم حویلی میں بے جی کے پاس تو کوئی ہو گا ناں! لالی کو پتا چلا تو وہ میرے سر ہو گیا کہ میں بھی ہر حال میں شادی کروں تاکہ دونوں یار اکٹھے ہی باپ بن جائیں اور پھر آپس میں ہی رشتے داریاں کر کے دوستی مضبوط کریں...! اس کی منطق سن کر مجھے بے تحاشا ہنسی آئی تھی کہ "سوت نہ کپاس' جولاہے سے لٹھم لٹھا" والی بات تھی...

اور آخر کار مجھے بھی نکیل ڈال ہی دی گئی' ذکیہ کی صورت! ذکیہ ہماری رشتے دار نہیں تھی' بلکہ خاندان سے باہر کی تھی۔ ہاں' ابا جی کی ذکیہ کے ابا سے خاصی دوستی تھی اور ذکیہ کا تعلق ہمارے ہی گاؤں سے تھا... اچھی سلجھی طبیعت کی تھی' گھرداری میں طاق اور صورت شکل میں بھی کم نہ تھی... بے جی نے چھری تلے دم بھی نہ لینے دیا تھا اور جھٹ نکاح پڑھوا دیا۔ سب کچھ اتنا "آناً فاناً" ہوا تھا کہ کچھ خاص تیاری بھی نہ کی جا سکی' کچھ ابا جی کی طبیعت کا اتار چڑھاؤ...!

یہاں بھی لالی اور زیبو کام آئے تھے' چھوٹے موٹے تمام انتظامات لالی نے ہی کیے تھے اور زیبو تو اپنے جہیز اور بری کے کتنے ہی سلے اور ان سلے جوڑے لیے چلی آئی کہ جو جو بھی پسند ہو وہ ہم ذکیہ کے لیے رکھ لیں...

بے جی تو نہال ہی ہو گئیں۔ غرض تو بھولانے سے تھی، سو وہ سوکھے داموں چلی آئی۔ یوں میری اور لالی کی گھریلو زندگی کا آغاز بھی تقریباً" ساتھ ساتھ ہی ہوا۔
اس تمام عرصے میں لالی کا بچہ میرے دماغ سے یکسر نکل گیا تھا۔ کچھ دن گاؤں میں ذکیہ کی ناز برداریاں کرنے کے بعد میں پھوپھی ثریا اور فوزیہ کو لیے شہر واپس آگیا۔ کیونکہ مجھے تعلیم ادھوری نہیں چھوڑنی تھی۔ یہ اور بات کہ میں جان چکا تھا کہ انٹر ہی کرلیا تو بڑا معرکہ ہوگا۔۔۔۔ کجا کہ بی اے!

انٹر پاس کرنے کے بعد ابھی میں نے تھرڈ ائیر کے لیے مضامین منتخب کیے ہی تھے کہ گاؤں سے میرے بیٹے کی پیدائش کی خبر آگئی، بات ایسی تھی کہ فطری طور پر میں بے تحاشا خوش تھا۔۔۔ ادھر لالی کے ہاں بھی لڑکی ہوئی تھی۔

میں بھاگم بھاگ گاؤں پہنچا تو ہم دونوں کی حویلی میں بھرپور خوشیاں منائی جارہی تھیں۔ میری تو واقعتاً" اور لالی کی ظاہراً "پہلی اولاد تھی"۔۔۔۔ سو جتنی خوشیاں منائی جاتیں اتنی کم تھیں۔۔۔۔! بس۔۔۔! پھر میں واپس شہر نہیں پلٹ سکا۔۔۔ کیونکہ اتنی کشش مجھے کبھی ذکیہ کے وجود میں محسوس نہیں ہوئی تھی جتنی عبداللہ میں۔۔۔۔ اپنے خون کی مہک میرے حواسوں پر ایسی سوار ہوئی کہ شہری رنگینیاں یکسر بھلا بیٹھا۔ پھوپھی ثریا اور فوزیہ کی فکر اتنی زیادہ نہیں تھی کہ ایک تو ان کے محلے دار بہت ہی اچھے تھے پھر پھوپھی ثریا کے پاس کل وقتی ملازمہ بھی موجود تھی۔۔۔ جو کہ خاصی مردمار قسم کی عورت تھی۔

پھر وقت کو تو گویا پر لگ گئے، اور جاتے جاتے جہاں ڈھیروں سکھ جھولی میں ڈال گیا وہیں پر کچھ دائمی دکھ دے گیا۔۔۔۔! میرے اور لالی کے آنگن میں تین تین بچے کھیلنے لگے۔ عبداللہ کے بعد میرے ہاں ایک بیٹی اور پھر ایک بیٹا ہو چکا تھا جبکہ لالی تین لڑکیوں کا باپ بن گیا اور قدرے چڑچڑا بھی ہو چکا تھا۔ بڑے ملک جی اور میرے ابا جی دونوں چند ماہ کے فرق سے گزر گئے۔
پھر ایک روز عجیب ہی بات ہوئی۔ امیں فجر پڑھ کر کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ یہ میرا روز کا معمول تھا اس طرح میری چہل قدمی بھی ہو جاتی تھی اور راہ چلتے بہت سوں کے حالات کی بھی خبر ہو جاتی تھی۔

میں اپنے ہی دھیان میں مگن صبح کی پرکیف فضا میں ادھر ادھر نظر دوڑاتا چلا جارہا تھا، جب لالی کی حویلی سے نکلتے موجو سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ وہ بے حد جلدی میں تھا۔ اسے لالی نے کسی ضروری کام سے شہر بھیجا تھا مگر وہ جاتے جاتے بھی مجھے ایک اہم خبر دے گیا۔۔۔۔!

لالی اس بچے کو حویلی میں لے آیا تھا، بڑی خاموشی سے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی مگر موجو تو موجود تھا۔۔۔ اسے نا صرف یہ خبر تھی بلکہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ایسا انتہائی قدم کیونکر اٹھایا گیا۔۔۔۔؟

لالی کے یہاں یکے بعد دیگرے تین بیٹیوں کی پیدائش نے اسے بے حد فکر مند اور چڑچڑا کر دیا تھا۔ اتنی جاگیر، جائیداد اور وارث کے نام پر تین بیٹیاں اور وہ بھی پرایا دھن۔۔۔ اور سب سے افسوس ناک بات یہ تھی کہ لالی کی بیوی کو یہ مژدہ سنایا گیا کہ آخری بیٹی کی دفعہ چند اندرونی پیچیدگیوں کے باعث وہ مزید بچوں کی ماں نہیں بن سکتی۔

قدرت کی نہ جانے کیا مصلحت تھی۔ مگر لالی کو وارث کی فکر کھائے جارہی تھی اور تب ہی لالی کی بے جی کو جو ابھی حیات تھیں اپنے اس پوتے کی یاد ستائی جسے اس پورے گھرانے نے کب سے "مصلحتاً" بھلا رکھا تھا۔ بے جی کو ہڑک اٹھی تو ماں تو ماں تھی۔۔۔۔ لالی کی بیوی نے بھی دن رات بچے کو واپس لانے کا راگ الاپنا شروع کر دیا۔۔۔ اور خود لالی بھی ہی ایسا چاہتا تھا جب ہی چند دن میں وہ بچہ حویلی میں موجود تھا۔ اور جس کی خبر ابھی ابھی مجھے موجو سے ملی تھی۔۔۔۔ میں وہیں سے واپس ہولیا اور گھر آکر لالی کی حویلی کی طرف ذکیہ اور بے جی کو روانہ کیا اور ساری بات معلوم کرنے کو کہا۔

واپسی پہ جو کہانی انہوں نے مجھے سنائی وہ یہ تھی کہ لالی اور اس کی بیوی نے دور پرے کے کسی رشتے دار کا بچہ گود لے لیا ہے۔۔۔ تمام تر قانونی کارروائی کے بعد!

اب وہ لالی کے گھر اس کے بیٹے کی حیثیت سے ہی پلے گا اور وہی لالی کا "وارث" ہوگا۔ وہ رشتے دار کون تھا.... جن کا یہ بچہ تھا' کسی کو نہیں بتایا گیا۔

بس لالی چند ہی دن تک اپنی معقول جائیداد اس بچے کے نام لگانے والا تھا۔ میں جانتا تھا کہ شام کو لالی سے جب میری ملاقات ہوگی تو وہ بے دھڑک مجھے بھی یہی کہانی سنائے گا اور میں بھی یقینی کیفیت میں سنتے ہوئے سر دھنوں گا۔ کیونکہ مجھے ہر حال میں لالی کے راز کو راز ہی رکھنا تھا.... گاؤں والوں کو "ملک جی" کی اس کہانی میں کھوٹ نہیں دکھ سکتا تھا.... اور اگر میں لالی کے کردار کے اس کھوٹ کو جانتا تھا۔ تو یہ دوستی کا فرض تھا کہ اس عیب پر پردہ پڑا رہے۔ موجو کی تو بات ہی کیا تھی؟ منہ میں ساری عمر پتھر ڈالے رکھے گا.... میں جانتا تھا!

اور یوں یہ حقیقت ہمارے سینوں میں دفن ہوگئی۔

میں آفاق سے ملا.... سہما ہوا قدرے اجڈ سا بچہ تھا مگر ہو بہو لالی کی کاپی۔ جس ماحول میں وہ پلا بڑھا تھا' یہ بھی غنیمت تھا کہ اسکول جاتا تھا۔ لالی نے دو مہینے حویلی میں رکھ کر اسے خود سے اور گھر والوں سے خوب مانوس کیا.... لاڈ' نخرے اٹھائے.... جان شان بنائی اور پھر تیسرے مہینے وہ آفاق کو شہر کے بہترین اسکول کے ہاسٹل میں داخل کرا آیا۔ لالی کی بے جی اور زیبو نے خوب شور ڈالا مگر لالی ہر صورت کچھ عرصے کے لیے آفاق کو سب کی نظروں سے دور کرنا چاہتا تھا.... میں لالی کی کیفیت سمجھتا تھا مگر اسے سمجھا نہیں سکتا تھا.... وہ باپ تھا اور اپنی اولاد کی بہتری اس سے زیادہ کوئی نہیں چاہ سکتا تھا اور پھر وقت نے ثابت کیا کہ یہ فیصلہ آفاق کے حق میں بہترین رہا.... کچھ ہی عرصے میں اس کی بول چال اور رنگ ڈھنگ یکسر تبدیل ہوگئے.... موجو اکثر گاؤں سے سوغاتیں لے کر شہر اس کے پاس جاتا رہتا تھا اور واپسی پر مجھے بھی اس کی روداد سناتا تھا۔

سمے کا گھوڑا سموں سے ڈھیروں خاک اڑاتا.... ہمارے سروں میں دھول جھونک گیا.... منظر صاف ہوا تو میں اور لالی عمر کی کئی منزلیں طے کر چکے تھے.... بچے کنارے لگ گئے تھے.... لالی نے لڑکیاں بیاہ دی تھیں اور میری دونوں بیٹیاں بھی بیاہ کر پردیس جا بسیں.... میرے دونوں لڑکے شہر میں ہی اچھی نوکریوں سے لگ گئے.... آتے جاتے رہتے تھے اور ہم میاں بیوی سے شہر چلنے کی ضد بھی کرتے تھے.... ذکیہ تو خیر اتاؤلی ہوئی پھرتی تھی مگر میں اسے نکیل ڈالے رکھتا تھا.... کیونکہ میں ہرگز بھی گاؤں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا.... ایک وقت تھا کہ شہر سے پرتنے (لوٹنے) کو جی نہیں کرتا تھا۔

وہاں کی فضا میں ایک الگ ہی مستی سی چھائی محسوس ہوتی تھی مگر جب گاؤں آکر بال بچے کے جھنجھٹ میں پڑا تو شہر کا شوق ختم ہو کر رہ گیا.... اب کبھی لڑکوں سے ملنے ملانے یا ان کی ماں کے ہاتھ کی بنی سوغاتیں دینے چلا جاتا تھا....

میرے بیٹوں نے شہر میں رہ کر ہی پڑھا تھا.... آفاق کی طرح جب پڑھ لکھ کر فارغ ہوئے تو وہیں نوکری کرنے کی اجازت مانگی.... میں نے بغیر حیل و حجت کے اجازت دے دی مگر ذکیہ نے بہتیرا رولا ڈالا.... اور پھر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا تھا.... بیوی کو ورکا لیا میں نے.... ایسا کرنے میں بھی بڑا سواد آتا تھا مجھے.... مگر لالی کے پتر آفاق کا معاملہ الٹ نکلا.... بڑا لائق فائق منڈا تھا.... انجینئرنگ کی شاندار ڈگری تھی اس کے پاس.... اور قدرتی بات تھی کہ وہ بھی شہر ہی میں نوکری کرنے کو ترجیح دیتا' جبکہ اگلے ہاتھوں ہاتھ اسے لینے پر تیار تھے' مگر حسب فطرت لالی اڑ گیا.... اور ایسا اڑا کہ کسی کے سمجھانے پر بھی نہ ٹلا۔ ایک ہی ضد باندھ لی کہ آفاق زمینیں سنبھالے گا اور.... بس!

اس بچے پہ شاباشی جس نے دکھے دل سے باپ کا مان رکھ لیا اور رہ گیا پنڈ میں ہی.... کبھی میرے دونوں لڑکے چھٹی والے دن حویلی آتے اور آفاق ان سے ملنے آتا تو اس کی آنکھوں میں حسرت تیرتی دکھائی دیتی.... پھر رفتہ رفتہ اسے بھی قرار آہی گیا.... آج کل لالی اور اس کے گھر والے آفاق کا گھر بسانے کے چکر میں تھے.... ان کی دیکھا دیکھی مائی کو بھی شوق ہوا لڑکے

بیاہنے کا۔۔۔ روز یوں لڑکیاں دیکھنے نکلتیں جیسے وڈی عید کے دنوں میں مرد لوگ جانور دیکھنے نکلتے ہیں۔۔۔ اور انہی دنوں مجھے ایک فون موصول ہوا۔۔۔ میں فوری طور پر شہر روانہ ہوا تھا۔۔۔ وہاں مجھے کئی دن لگ گئے تھے۔۔۔ اور جب اٹھارہ دن بعد میری واپسی ہوئی تھی تو ایک خبر گاؤں میں میری منتظر تھی اور ایک خبر مسلم میرے ساتھ گاؤں پہنچی تھی۔۔۔!

میری بیوی ذکیہ نے عبداللہ کے لیے لڑکی ڈھونڈلی تھی۔۔۔ دو گاؤں چھوڑ کر ذکیہ کے رشتے دار رہتے تھے۔۔۔ ان ہی میں سے کسی کی بچی تھی۔۔۔ سنا تھا شہر میں ہاسٹل میں رہ کر پڑھائی کی تھی۔۔۔ سلیقے طریقے والی بچی تھی۔۔۔ عبداللہ سے بھی بات کرلی تھی اور وہ بھی راضی تھا۔۔۔ اب بس میرا ہی انتظار تھا کہ میں آؤں تو بچی کی تلی (ہتھیلی) پر کچھ رکھ آئیں۔۔۔ یوں بات پکی ہو جائے۔

ہاں۔۔۔ آفاق کا رشتہ ابھی تک کہیں طے نہیں ہوا تھا۔۔۔ بقول ذکیہ کے کہ اس کی ماں بہنوں کے نخرے ہی بہتیرے ہیں۔۔۔ (ان زنانیوں کے سیاپے ہی وکھرے ہیں)

اور میرے پاس جو خبر تھی وہ مریم تھی جو میرے ہمراہ حویلی پہنچی تھی۔۔۔! وہ میرے ساتھ ہمیشہ کے لیے آئی تھی یہیں رہنے کے لیے۔۔۔!

مریم پھوپھی ثریا کی دوہتری (نواسی) تھی۔۔۔ فوزیہ کی بیٹی! وہی فوزیہ جو اپنے باپ کی موت کے وقت محض پانچ چھ سال کی تھی اور اب تو اسے مرے سالوں بیت چکے تھے۔۔۔ مریم کو پھوپھی ثریا نے ہی پالا تھا۔۔۔ کچھ دن پہلے مجھے فون پر اچانک پھوپھی ثریا کے ہی انتقال کی خبر ملی تھی جو ان کی بے حد پرانی ملازمہ نے کیا تھا۔۔۔ وہ عورت پھوپھی کے پاس ان کے خاوند کے مرنے کے بعد سے آج تک تھی۔ مریم، فوزیہ کی اکلوتی اولاد تھی اور پھوپھی ثریا کے مرنے کے بعد ظاہر ہے اس کا والی وارث کوئی نہیں بچا تھا سوائے میرے۔۔۔ اس لیے مجھے ہر حال میں اسے ساتھ لانا پڑا تھا۔۔۔ مریم بے حد سلجھی ہوئی اور خاموش طبع بچی تھی۔۔۔ عمر اٹھارہ، انیس کے لگ بھگ تھی۔ ویسے تو مجھے یقین تھا کہ ذکیہ کو اعتراض ہرگز نہیں ہوگا مگر وہ کیا ہے ناں۔۔۔ عورت کو نکتہ چینی کی کوئی وجہ نہ ملے تو یہ ہی وجہ بن جاتی ہے!

اس لیے جس وقت میں نے مریم کو اس کے آگے کیا۔۔۔ اس سے اظہار ہمدردی کرنے کے بعد اس کا منہ ماتھا چوما اور اس سے نظر بچا کر میرے کان میں بدبدانا نہیں بھولی تھی۔۔۔

"سارے سیاپے آپ نے ہی گلے ڈالنے ہوتے ہیں۔۔۔ اپنے نبڑتے نہیں۔۔۔ دوجے تیجے گھر میں جمع کر چھوڑو۔۔۔ بس!"

اس وقت تو میں نے اسے گھورنے پر اکتفا کیا تھا۔۔۔ بعد میں کافی کس بل نکالے تھے۔۔۔

تب سے اب تک مریم حویلی میں ہی تھی اور بے حد خوش بھی تھی۔۔۔! ذکیہ کا بھی دل لگ گیا تھا اس کے ساتھ۔۔۔ اپنی بیٹیاں تو کب کی پرائے گھر کی ہو چکی تھیں۔ اس لیے بھی مریم کی جگہ بننے میں وقت نہیں لگا۔۔۔ اور اب اسے تین ماہ سے اوپر کا عرصہ ہو رہا تھا ہمارے بیچ رہتے۔۔۔ اس دوران میرے دونوں بیٹے کئی بار گاؤں آئے عبداللہ اور اسفند دونوں کو ہی مریم کی موجودگی پر ہرگز کوئی اعتراض نہیں ہوا بلکہ وہ دونوں اس بات پر خوش تھے کہ مریم ہم دونوں کا جس جانفشانی سے خیال رکھتی ہے وہ کوئی سگی بیٹی ہی رکھ سکتی ہے۔

عبداللہ اور اسفند دونوں نے ہی مریم کو بالکل چھوٹی بہنوں کی طرح جانا تھا اور اسی بات کو دیکھتے ہوئے میرے دل میں اطمینان بھر گیا تھا۔۔۔ مریم نے ایف اے کر رکھا تھا اور اب پرائیویٹ بی۔ اے کی تیاری کر رہی تھی۔۔۔ مگر میرا ارادہ تھا کہ اس دوران اگر کوئی اچھا کھاتا پیتا رشتہ آیا تو میں اسے رخصت کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔۔۔ کچھ بھی تھا آج کل ہم دونوں میاں بیوی کے مزے تھے' وہ بچی اتنا سکھ دیتی تھی کہ گھر میں رہنے کو دل کرتا تھا' سب کچھ جیسے سیٹ سا ہو گیا تھا اور معمولات میں۔۔۔ بے فکری سی بے فکری تھی اور پھر

فکر کا پہلا کنکر آفاق نے پھینک مارا تھا۔۔۔ گم صم تو وہ مجھے بھی محسوس ہوتا تھا اور میری حویلی کے چکر بھی بڑھ گئے تھے مگر میں نے اس بات کو ہرگز بھی مریم سے نہیں جوڑا تھا۔۔۔ مجھے تو ابھی تک یہ ہی محسوس ہوتا تھا کہ نوکری کی اجازت نہ ملنے کی وجہ سے اداس رہتا ہے اور عبداللہ' اسفند کی خیر خبر کے لیے آئے دن مجھ سے ملنے چلا آتا ہے۔۔۔ حالانکہ موبائل سب ہی کے پاس تھا۔

خیر میں نے کسی دوسری تیسری وجہ پر دھیان نہیں دیا تھا۔۔۔ اور میں اسی وہم میں رہتا جو ایک دن اچانک آفاق میری بیٹھک میں بیٹھ کر مجھ سے اپنی خواہش کا اظہار نہ کر دیتا۔۔۔! بھوسے میں چنگاری نہیں لگی تھی بلکہ آگ دہک اٹھی تھی۔

☆ ☆ ☆

لوئے لوئے بھرلے کڑیئے' جے توں بھانڈا بھرنا
شام پئی بن شام محمد' اتے گھر جاندی نے ڈرنا
مگر شکاری کرے تیاری' اتے پار چرے پنہا ہرناں
جو چڑھیا اس ڈھینا اڑک' اتے جو جمیاں اس مرنا

"او موجو۔۔۔! اب بس کر یار۔۔۔ جا ذرا حقہ سلگا کر لے آ اور پھر دو مٹھیاں بھر دے۔۔۔ آج سارا پنڈا تھکا تھکا سا ہے۔۔۔"

لالی سے بات کیے ہفتہ بیت گیا تھا مگر ابھی تک جواب نہیں آیا تھا۔ حالانکہ میری ایک دو دفعہ ملاقات ہو چکی تھی مگر وہ سرسری نوعیت کی تھی' اس میں ایسی کوئی بات پوچھنی' کرنی مجھے بھی مناسب نہیں لگی تھی' لیکن پتا نہیں دل کیوں بوجھل سا تھا۔۔۔ ایک عجیب سا شرمندگی کا احساس تھا جو حواسوں پر چھایا تھا۔

مجھے اپنے مقام سے نیچے آ کر لالی کو اس کے ماضی کے سیاہ باب کے ورق الٹ کر دکھانے پڑے تھے مگر یہ میری انتہائی مجبوری تھی۔۔۔ میں ساری عمر منہ میں پتھر ڈالے رہتا جو بات میری عزت پر نہ آ جاتی۔۔۔ دوستی سے پیاری مجھے اپنی عزت تھی اور مریم بھی میری ہی پگ کا ایک ول (بل) تھی اور موجو نے مجھے جو آفاق کی حرکتیں جتائی تھیں اس کی وجہ سے یہ قدم ناگزیر تھا۔

میں ان ہی سوچوں میں گم تھا جب اپنے کندھوں پر مجھے موجو کے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا۔۔۔ اس نے نرم ہاتھوں سے مجھے دبانا شروع کیا۔۔۔ میرے پورے جسم میں سکون کی لہر دوڑ گئی۔

"کیا سوچت ہیں سرکار۔۔۔! اپنے ذہن ماں الٹے پلٹے کھیالات کاہے کو لاوت ہیں۔۔۔ دیکھنا کچھ ہی دن ماں وڈے ملک جی کا جواب ملت ہے اور وہ بھی ہاں ماں۔"

ہمیشہ کی طرح موجو میرے اندر تک اتر کر میری فکر اور پریشانی جان کر مجھے تسلی دے رہا تھا۔

"ہم م م۔۔۔!" میں نے ہنکارا بھرا۔۔۔ اور حقے کا ایک گہرا کش لیا۔ "ہے تو بڑا پکا ڈھیٹ لالی۔۔۔ مگر میں نے ایسا کلپچہ (شکنجہ) ڈالا ہے کہ پھر پھڑا بھی نہیں سکے گا۔۔۔ مریم کو آفاق کے لیے اسے بیاہنا ہی پڑے گا۔ بس یار! یہ جو دل پہ بوجھ سا ہے ناں۔۔۔ اسی نے تھکن سی کر رکھی ہے پورے پنڈے میں۔۔۔"

"تو سرکار کاہے کو بوجھ ڈھوونت ہیں۔۔۔ کون سا گناہ کرت ہو۔۔۔ بلکہ چھوٹا منہ اور بڑی بات۔۔۔ آج تک تساں نے گناہ پر پردہ رکھت' پورے پنڈ ماں کوئی بھی اس بات سے واقف نہ ہووت۔۔۔ آج بھی یہ راز' راز ہی رہت۔ جو وڈے ملک جی آسانی سے رشتہ کرن واسطے راضی ہووت۔۔۔"

موجو نے اب میری پنڈلیاں دبانی شروع کی تھیں۔ میں نے غور سے اس کے چہرے کو تکا اور بھاری آواز میں گویا ہوا۔۔۔

"دیکھ موجو۔۔۔! یہ راز آئندہ بھی راز ہی رہے۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ تیرے من میں یہ بات سما جائے کہ لالی کے آگے بات کھل گئی ہے تو سارے میں کھول دوں۔۔۔ یار ہے وہ میرا۔۔۔ جگری یار!"

میرے لہجے میں جو تنبیہہ تھی اسے فوراً سے پیشتر موجو نے بھانپ لیا تھا۔ اس کا چہرہ یکدم لال ہوا اور سینہ پھول گیا۔

"موجو جندہ گوراں اتر جاوت ہے سرکار۔۔۔ جے کر تساں کو بے اعتباری ہووت۔۔۔ موجو آج بھی وہی

موجو ہے سرکار.... گردن تو کٹا دیوت پھر وفاداری کا مول نہ ڈالت....."

موجو آبدیدہ ہو گیا تو میں نے پیار سے اس کا کندھا تھپکا.... اس کی وفاداری پر مجھے کبھی بھی شک نہیں رہا تھا.... مگر تنبیہہ ضروری تھی کیونکہ لالی کا یہ راز زبان زد عام ہو جاتا تو اس کی ساری عمر کی کمائی عزت چلی جاتی اور ایسا میں کبھی نہیں ہونے دے سکتا تھا....

☆ ☆ ☆
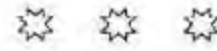
میں حویلی کے بڑے سے صحن میں چارپائی بچھائے دھوپ سینک رہا تھا۔ جاتی سردیاں تھیں' پھر بھی دھوپ بدن کو مزہ دیتی تھی.... مریم میرے پاس تپائی پر کینو چھیل کر.... ان کی پھانک پھانک علیحدہ کر کے.... کالا نمک چھڑک کر رکھ گئی تھی.... کیونکہ جانتی تھی کہ میں چھیلنے کا چور ہوں.... اس لیے ہمیشہ میرے لیے وہ ایسا ہی اہتمام کرتی تھی....

میں پھانک پھانک منہ میں دھرتا لالی اور آفاق کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا.... اگر لالی' آفاق کا رشتہ لے کر نہیں آتا تو میرا اگلا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟ مریم مجھے بے حد عزیز تھی اور گری پڑی ہرگز نہیں تھی کہ بار بار منہ سے کہہ کر میں اس کی قدر گھٹاتا.... لالی کا دماغ "کھوتا" تھا.... ایک دفعہ اڑ جاتا تو اڑ جاتا تھا' وہ پھوپھی ثریا سے خوب اچھی طرح واقف تھا.... میرے بتانے کے باوجود کہ مریم ان کی نواسی ہے.... اس کے بھیجے سے یہ حسب نسب کا کیڑا نہیں نکلا تھا.... اب یہ اتفاق ہی تھا کہ اباجی اور بے بے کے گزر جانے کے بعد پھوپھی ثریا کبھی پنڈ نہیں آئی تھی.... اس لیے لالی' مریم کے وجود سے یکسر بے خبر تھا.... وہ تو مجھ سے فوزیہ کے نکاح کی بھی تفصیل پوچھتا رہتا تھا.... اب وہ میں نمانا بھلا کدھر سے فراہم کرتا....! میں ان ہی سوچوں میں غرق تھا اور کینوؤں کی ساری پھانکیں میرے حلق میں غرق ہو چکی تھیں جب ذکیہ کی چیخیں مارتی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تھی....

"حد ہو گئی کڑیے....!" وہ مریم سے مخاطب تھی۔

"سارا دودھ ابال دتا.... سویرے سویرے بے برکتی پا دتی.... شالا تیرا دھیان کس مکان میں جاوڑتا ہے.... اج شامی تیرے دونوں بھرا پڑنے (پہنچنے) والے ہیں.... ان کے لیے فرنی چڑھانی تھی.... اب دودھ کون دے گا.... تیرا چاچا....؟"

"استغفراللہ....!" میں نے سٹپٹا کے باورچی خانے کی سمت گھورا اور گلا کھنکار کر للکار لگائی۔

"او مائی....! کج ہوش سمجھ سے بولا کر.... بند عقل کی شوہدی عورت نہ ہووے تے.... لا دیتا ہوں تجھے میں منیرے کی ہٹی سے تازہ دودھ.... خبردار جو میری دھی کو کج بولا تو.... تیرے پیو کے گھر سے نئیں آتا راشن پانی.... جو اتنا سینہ پیٹ رہی ہے.... وڈی آئی لامے (طعنے) دینے والی....!"

میں نے جھینپ مٹانے کے لیے ذکیہ کی تگڑی خبر لے چھوڑی تھی.... لے سو! جب کرے گی پاغلوں والی ہی بات کرے گی.... ویسے بھی مریم پتر کو کوئی کچھ کہے مجھے ہرگز اچھا نہیں لگتا تھا۔

ذکیہ آستینیں چڑھاتی باورچی خانے کا جالی والا دروازہ کھولتی باہر صحن میں نکل آئی.... میں ابھی "یا اللہ خیر!" کہہ کر سیدھا ہو کر بیٹھا ہی تھا جب حویلی کے بڑے سے دروازے سے لالی اور زیبو اندر داخل ہوئے۔ پیچھے ٹوکرے اٹھائے نوکروں کی فوج بھی تھی....

"لے بھئی.... بن گیا بندے کا پتر....!" میں نے جی ہی جی میں لالی کے لیے یہ جملہ بولا تھا اور بظاہر حیران ہوتا چارپائی سے نیچے اتر آیا.... اور جوش سے قریب جا کر جپھی شپھی ڈالی۔ زیبو کے سلام کا جواب دیا جو ہر دوسرے دن کی ملاقاتی' میری بیوی سے ایسے گلے مل رہی تھی جیسے یہ تب ملتی ہیں جب ان کے پیکوں (میکوں) میں کوئی مرگ ہو جاتی ہے....

"خیر ہے لالے....! اج دن دیہاڑے ای چن چڑھ آیا ہے.... اور ساتھ میں یہ اتنے ڈھیر سارے تارے کس کھاتے میں اٹھا لایا ہے....." میرا اشارہ مٹھائی کے ٹوکروں کی طرف تھا جنہیں ملازموں نے برآمدے میں ڈھیر کیا تھا۔

"چل چل... زیادہ ٹیں ٹیں نہ کر... بیٹھک میں چل... میں مخول کرنے نہیں آیا..." لالی چڑ کر بولا تھا۔ یعنی جلی رسی کے بل تھے یہ... میں نے بھی جھٹ تیوریاں چڑھائیں اور بھاری آواز میں مخاطب ہوا۔

"او... اولالے...! سیاپے کا آیا ہے تو ادھر سے ہی واپس مڑ جا... اور اپنے یہ تارے بھی اٹھا کر لے جا... پھر جو چن میں چڑھاؤں گا ناں... تو اس کی روشنائی میں تیری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی... سمجھا... وڈا آیا مجھے اکڑ دکھانے والا... اونہہ!"

میں طیش میں منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا تھا... لالی کو مجھ سے اس رویے کی توقع نہیں تھی... اس لیے زیبو کے ٹھوکا دینے پر جھٹ سے میرا رخ اپنی طرف کیا اور میرے گلے لگ گیا۔

"تو میرے ساتھ جتنا مرضی مخول کر لے... میں نے کیا نئیں اور تیرا ابو تھا جی کے کیا بنائیں... ماڑا موٹا مذاق بھی سمجھ جایا کر کبھی..." لالی میرے تیور دیکھ کر یقیناً "بوکھلایا تھا... زیبو نے بھی اسے گھوری ڈالی تھی... میں نے بات کو طول دینا مناسب نہیں جانا... لالی کے طبق روشن کرنے کے لیے میرے اتنے ہی "ٹشن" بہت تھے...

کچھ ہی دیر میں ہم سب بیٹھک میں بیٹھے تھے... ذکیہ بھی دونوں میاں بیوی کے آنے کی وجہ بھانپ گئی تھی۔ اسی لیے رسوئی میں ملازماؤں کی دوڑ لگوا دی تھی۔ مریم کو بھی ذرا منہ چھپا کر تیار ہو کر بیٹھے رہنے کو کہہ آئی... اس کے بعد چائے پانی آنے تک لالی اور زیبو آفاق کے لیے مریم کا رشتہ ڈال چکے تھے... زیبو تو بے حد خوش لگ رہی تھی... بظاہر لالی بھی خوشگوار موڈ میں تھا مگر میں اس کا یار تھا... بچپن کا بیلی! مجھے اس سے زیادہ علم تھا کہ اس کی کون سی رگ کب اور کس بات پر پھڑکتی ہے... وہ اندر سے بجھا ہوا تھا... مگر مجھے پرواہ نہیں تھی... مریم بیاہ کر چلی جاتی تو اس بچی میں اتنی صلاحیتیں تھیں کہ اپنی خدمت اور اطاعت گزاری سے وہ سب کے دلوں میں گھر کر سکتی تھی... لالی کو بدلا نہیں جا سکتا تھا کیونکہ حسب نسب کا کیڑا اس کی فطرت میں کلبلاتا تھا... اور فطرت کے ساتھ سمجھوتا کیا جاتا ہے... ڈھالا نہیں جاتا...!

میں نے دو دن رسماً "سوچنے کے لیے تھے... جس پر لالی نے طنزیہ مجھے گھورا تھا اور میں جواباً" اس کی ران پر ہاتھ مار کر بولا تھا...

"اویار لالے...! میرے دونوں پتر شام تک شہر سے پہنچ جائیں گے۔ مریم کو اپنی بہن مانتے ہیں... ان سے بھی رسمی مشورہ تو کرنا بنتا ہے ناں... ویسے فکر نہ کر، مریم تیری ہی نوں ہے... میں بھلا تجھے نا کر سکتا ہوں... میں نے کھوپڑی کھلوانی ہے اپنی کیا...؟"

میں زوردار قہقہہ مارتا... بوندی کے لڈو سے اس کا منہ میٹھا کروانے لگا اور وہ بس بے بسی سے مجھے دیکھ کر رہ گیا کہ آخر یہ سب کروانے والا بھی میں ہی تھا وہ بھی سنگی ناؤں دے کر... (گلے پر ناخن دھر کر...)!

☆ ☆ ☆

آفاق اور مریم کی بات کیا پکی ہوئی... پورا گاؤں ہی مبارک باد دینے اٹد آیا تھا... سارا دن میرا بیٹھک میں اور ذکیہ کا صحن میں عورتوں کے درمیان گزر جاتا تھا... لالی نے لنگر لگوا دیا تھا... حالانکہ شادی کی جو تاریخ طے ہوئی تھی۔ اس حساب سے ابھی ڈیڑھ ماہ پڑا تھا مگر وہ لالی تھا اور لالی پیدائشی شوخا تھا! آفاق کی خوشی اس کے چہرے سے پھوٹی پڑتی تھی... میرے پاس اکیلے میں معافی مانگنے بھی آیا تھا... میں محض کندھا تھپک کر رہ گیا تھا... اب اسے کیا بتاتا کہ اس سارے کے پیچھے اصل قصہ کیا ہے...؟

عبداللہ اور اسفند بھی بے حد مطمئن تھے... آفاق سے دوستی کی بنا پر وہ اسے لازمی ترجیح دیتے مگر مریم کو بھی وہ چھوٹی بہن مانتے تھے... اس لیے وہ ہر طرح سے تسلی میں تھے... آج کل دھڑا دھڑ مریم کے لیے شاپنگ کر کر کے سامان شہر سے بھجوا رہے تھے جس میں زیادہ تر کراکری اور الیکٹرانکس کا سامان تھا کیونکہ "دیچتو بٹے" والی ذکیہ کو بلینڈر گرائنڈر کا کچھ نہیں پتا تھا۔

باقی کپڑے لتے کے لیے میری دونوں بیٹیاں عنقریب پہنچنے والی تھیں۔۔۔ اس کے بعد کپڑے زیور کی بھی فکر ختم ہو جاتی۔۔۔ دونوں مریم کے وجود سے باخبر تھیں اور کسی طرح کا کوئی اعتراض مجھے ان کی طرف سے بھی سننے کو نہیں ملا تھا۔ بلکہ اب تو موبائل پر مریم کے ساتھ اچھی گپ شپ تھی ان کی۔

جو بیڑہ میں نے اپنے کاندھوں پر اٹھایا تھا۔۔۔ وہ کنارے لگنے والا تھا۔۔۔ یہ کوئی تین مہینے کی بات تھوڑی تھی۔۔۔ مریم صرف تین مہینے پہلے ہی تو میری زندگی میں نہیں آئی تھی۔۔۔ مریم تو اپنی پیدائش سے پہلے سے میرے ساتھ تھی۔۔۔ کب کیسے؟ بتاؤں کیا؟

"اے جی ملک صاحب۔۔۔! ذرا باہر آؤ جی۔۔۔ نال والے چودھری صاحب کی گڈی آئی ہے۔۔۔ پھاٹک پر کھڑے ہیں۔۔۔ آپ جا کے دیکھو ذرا۔۔۔"

ذکیہ کی آواز نے سارا طلسم توڑ دیا تھا۔ یہ ذکیہ بھی ناں۔۔۔ جوں جوں بڈھی ہوتی جا رہی ہے، جان زیادہ کھانے لگی ہے۔۔۔ ہے ویسے سادی۔۔۔ کتنا بڑا ہاتھ کیا ہے اس کے ساتھ۔۔۔ کبھی عقل کا گھوڑا دوڑا کر میری گردبانے کی کوشش نہیں کی اس نے۔۔۔! چنگی رہتی ہیں ایسی بیویاں۔۔۔!

پھر ملتا ہوں آپ سے ذرا۔۔۔ چودھری صاحب کو بھگتا لوں۔ ذرا میرا قصہ طویل ہے۔۔۔ فرصت سے سناتا ہوں۔

☼ ☼ ☼

جس دن سے بات پکی ہوئی تھی۔۔۔ آفاق آنے بہانے۔۔۔ حویلی کے گرد منڈلاتا رہتا تھا۔۔۔ ویسے تو مریم پردے میں جا بیٹھی تھی مگر ایک آدھ دن چھوڑ کر وہ آپا جی کے گھر جاتی تھی۔۔۔ آپا جی امام مسجد کی بیگم تھیں اور پھوپھی ثریا کی ممیری بہن بھی تھیں۔۔۔ رشتے داری کا علم ہونے پر فطری طور پر مریم کے دل میں ان کے لیے انسیت اور لچک پیدا ہونا کوئی ایسی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔۔۔ اس لیے ان سے گاہے بگاہے ملتی تھی۔

آفاق ایسے ہی موقعے کی تلاش میں تھا۔۔۔ اس دن سہ پہر کے بعد مریم بڑی سی چادر۔۔۔ اوڑھے حویلی کے پیچھے پھاٹک سے نکلی تھی۔۔۔ اس جانب سے آپا جی کا گھر بالکل ناک کی سیدھ میں تھا۔۔۔ راستے میں ٹیوب ویل کے قریب سے گزرتے ہوئے یکدم کسی نے برگد کے پرانے درخت کے پیچھے سے نکل کر اس کی کلائی تھامی تھی۔۔۔ مریم کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ بائیں ہاتھ میں تھاما اچار کا ڈول کھینچ مارتی۔۔۔ آفاق کے چہرے پر نظر پڑتے ہی تھم گئی۔۔۔

"کیسی ہو۔۔۔!" نرم لہجے میں پوچھا۔

"اچھی ہوں۔۔۔!" ادھر بھی لہجہ ملائی تھا۔

"جانتا ہوں۔۔۔ تبھی تو اتنا کشٹ کیا ہے۔۔۔"

"کس نے کہا تھا اتنے کشٹ اٹھانے کو۔۔۔"

"دل آوارہ ہو گیا تھا بس۔۔۔"

"دل تو آوارہ ہی ہوتا ہے۔۔۔ نکیل ڈالنی پڑتی ہے۔"

"اب تم ڈال دیتا ناں۔۔۔"

"مجھے اور کوئی کام نہیں بھلا۔۔۔ آفاق بھائی!" جملے کے آخر میں شرارت ہی شرارت تھی۔۔۔ آفاق کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں۔

"اب مجھے بھائی کس خوشی میں کہتی ہو۔۔۔ گھر میں دو ملے پلائے بھائی مل گئے ہیں۔۔۔ کافی نہیں ہیں کیا؟"

"بس جی کرتا ہے کہ میرے ڈھیر سارے بھائی ہوں۔" نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر شریر لہجے میں کہا۔

"مگر میرا جی ہرگز نہیں کرتا کہ میری ڈھیر ساری بہنیں ہوں کیونکہ مجھے پہلے ہی کمی نہیں ہے۔۔۔!"

"چلیں۔۔۔ چلیں سامنے سے ہٹیں اب۔۔۔ مجھے واپس حویلی جلدی آنا ہے، شام کو آپ کی والدہ تشریف لا رہی ہیں۔۔۔"

"میری والدہ تمہاری کیا لگیں۔۔۔؟"

"وہی جو میری والدہ آپ کی لگیں۔۔۔!"

"اور وہ بھلا میری کیا لگیں۔۔۔؟"

"وہی جو آپ کی والدہ میری لگتی ہیں۔۔۔"

"تم تو خاصی چالاک ہو۔۔۔ میں مفت میں بھولی بھالی سمجھتا تھا۔۔۔!"

"مفت کا جسے بھی جانیں گے وہ توقع کے برعکس ہی نکلے گا۔۔۔ اب ذرا پیچھے نظر کیجیے۔۔۔ آپ کے والد گرامی تشریف لا رہے ہیں۔۔۔" آفاق ایک جھٹکے سے پلٹا تھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ واپس مریم کی طرف چہرہ کیا تو وہ آپا جی کے گھر کی طرف چل دی تھی۔۔۔ اس کی نقرئی ہنسی کی آواز آفاق کو اندر باہر سے شاد کر گئی۔۔۔ چند قدم مزید چل کر وہ ایک لمحے کو رکی۔۔۔ پلٹی۔۔۔ اور بولی۔

"میری راہ دیکھنے کے بجائے فی الحال گھر کی راہ لیجیے، میری راہ میں پلکیں بچھانے کے لیے تو ساری عمر پڑی ہے۔۔۔ کیا سمجھے؟ آفاق بھائی۔۔۔!"

وہ ایک دفعہ پھر شرارت سے آفاق کی دکھتی رگ دباتی پلٹ گئی تھی۔۔۔ اور آفاق حیرت سے دیکھتا اور سوچتا رہ گیا تھا۔۔۔ اس نے کبھی بھی مریم کو اتنا بولتے ہوئے نہیں سنا تھا۔۔۔ کجا کہ شرارت کرتے۔۔۔! ایسے جاتے جاتے بھی اسے چھیڑ گئی تھی۔

"بالکل اپنے سر پر پڑی ہے۔۔۔!" وہ پتھر کو ٹھوکر مارتا، بائیں ہاتھ سے خوب صورت گھنی مونچھ کو بل دیتا مسکراتی نظروں سے اسے تب تک دیکھتا رہا تھا جب تک وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔

☼ ☼ ☼
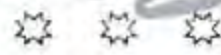
وقت بڑے بڑے رنگ دکھاتا ہے۔۔۔ چت کو پٹ اور پٹ کو چت ہوتے دیر نہیں لگتی۔۔۔ انہونی کو ہونی کرنے میں وقت کو کمال مہارت حاصل ہے۔ کبھی کبھی زندگی ہمیں ایسے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے جہاں آگے کھائی ہوتی ہے اور اس سے چند قدم مزید آگے کنواں۔۔۔! پیچھے کچھ بھی نہیں! پھر بھی ہم پیچھے جانے کے بجائے کھائی میں کود پڑتے ہیں۔۔۔ اس سے نکل آئیں تو کنوئیں میں جا پڑتے ہیں اور ساری عمر اس میں سے باہر آنے کی تگ و دو میں گزار دیتے ہیں اور پھر تھک ہار کر اسی میں پڑے رہتے ہیں۔۔۔!

ہمیں اس آفت سے انسیت ہو جاتی ہے۔۔۔ مشکل من کو راحت دیتی ہے۔۔۔ تو تن آسان ہو جاتا ہے۔۔۔!

آج سے اٹھارہ سال پہلے مجھے بھی زندگی نے ایسے ہی مقام پر لا کھڑا کیا تھا۔ جب جانتے بوجھتے میں نے بھی بھڑکتے الاؤ میں چھلانگ لگائی تھی، یہ دل چیز ہی بڑی خبیث ہے۔۔۔!

ان دنوں سردیاں عروج پر تھیں۔۔۔ سارا سارا دن زمینوں پر گزر جاتا تھا۔۔۔ ایک پرسکون اور خوشحال زندگی تھی جو سبک خرامی سے پل پل بیتے جا رہی تھی۔ اوپر سے بھرپور جوانی کے دن۔۔۔! اٹھارہ سال کی عمر میں بیاہ کرنے کا نتیجہ تھا کہ محض اٹھائیس سال کی عمر میں میں نو سال کے بیٹے کا باپ تھا اور سب سے چھوٹا بھی چار سال کا تھا۔۔۔ یہی حال لالی کا بھی تھا۔۔۔ ہم دونوں کی رگوں میں ابھی جوانی کی خماری خون بن کر دوڑتی تھی۔

خیر تو میں بتا رہا تھا کہ انہی مہکتے دنوں کا رنگین قصہ ہے۔ میں زمینوں سے ابھی ابھی ڈیرے پر پہنچا تھا جب موجو نے مجھے پھوپھی ثریا کے فون کا بتایا۔

پھوپھی ثریا کا فون اور وہ بھی ڈیرے کے نمبر پر۔۔۔؟ مجھے اچنبھا ہوا کیونکہ ایسا نہیں تھا کہ وہ فون نہیں کرتی تھیں مگر ہمیشہ حویلی کے نمبر پر ہی کیا۔۔۔ اکثر ذکیہ اور بے بے سے بات ہو جاتی تھی ان کی۔۔۔ آج اگر ڈیرے پر فون کیا تھا تو یقیناً" مجھ ہی سے خاص کام ہو گا۔

یہ سوچ کر میں نے سکون سے پہلے کھانا کھایا جو دوپہر کو میں اکثر ڈیرے پر ہی کھا لیتا تھا۔۔۔ اس کے بعد میں نے پھوپھی کو کال ملائی۔۔۔ وہ تو جیسے انتظار میں بیٹھی تھیں۔۔۔ میری سلام دعا بھی نہ سنی اور جو قصہ مجھے سنایا اس نے مجھے بھی بے حد پریشان کر دیا۔۔۔ ساری بات سن کر میں نے دو بول تسلی کے بولے اور جلد از جلد پہنچنے کا کہا۔ فون رکھ کر میں نے موجو کو کچھ بھی بتائے بغیر بس گھر اطلاع دینے کو کہا کہ میں کچھ دن کے لیے شہر جا رہا ہوں ضروری کام ہے۔۔۔ آتے ہوئے موجو کو دو جوڑے بھی لانے کو کہا۔ وہ پرسوچ نظروں سے مجھے

دیکھتا سرپلاتا ہوا چلا گیا تھا۔۔۔ شام ہونے سے پہلے میں شہر پھوپھی ثریا کے پاس تھا اور یہ پہلا موقع تھا کہ میں بالکل اکیلا تھا۔۔۔ موجو میرے ساتھ نہیں تھا۔

جس وقت میں پھوپھی کے گھر پہنچا۔۔۔ وہ مجھ سے لپٹ کر دھواں دھار روئی تھی۔۔۔ میں اسے تسلی دلاسے دیتا رہا۔۔۔ پھوپھی نے ابھی مجھے بیٹھنے بھی نہ دیا اور فوری طور پر فوزیہ سے نکاح کرنے کی درخواست کی۔۔۔ میں نے تسلی سے اسے پہلے بٹھایا۔۔۔ اور سمجھایا کہ جذباتی فیصلہ مت کرے پہلے مجھے پوری بات بتائے کہ آخر اس ہڑبونگ کا مقصد کیا ہے۔۔۔؟

"دیکھ صدیق بیٹا۔۔۔! تیرا باپ مجھے سگی بہنوں کی طرح چاہتا تھا۔۔۔ آج جس مشکل میں 'میں آن پڑی ہوں اگر وہ زندہ ہوتا تو مجھ سے ایک بھی سوال نہ کرتا بلکہ تجھے کان سے پکڑ کر میرے آگے لا کھڑا کرتا۔۔۔ مگر میں تیرے آگے پیٹ ننگا کرنے پر مجبور ہوں۔

میرے دیور کے بیٹے نے فوزیہ کا دماغ خراب کر دیا ہے۔۔۔ ساری عمر بھائی کی بیوہ اور بھتیجی کی خبر نہیں لی مگر اب جب سے پتا چلا ہے کہ فوزیہ کے نام اس مکان کے علاوہ چار موقعے کی دکانیں بھی ہیں تب سے میرے گھر کے پھیرے ہی ختم نہیں ہوتے۔۔۔ یہ بھی میری ہی مت ماری گئی جو میرے منہ سے دیورانی کے سامنے یہ بات نکل گئی۔۔۔ پتا نہیں اس نے شوہر اور بیٹے کو کیا پٹی پڑھائی کہ صبح شام آنے بہانے ادھر ٹپکے رہتے۔۔۔ شروع شروع میں تو فوزیہ نے اتنا دھیان نہیں دیا معیز پر۔۔۔ مگر کب تک۔۔۔! نادانی کی عمر ہے' باتوں میں آہی گئی۔۔۔! اوپر سے چاچا چاچی واری صدقے جانے لگے تو الٹا مجھ سے ناراض رہنے لگی کہ ماں نے ہی کبھی مجھے میرے ددھیال سے ملنے نہیں دیا۔۔۔ اور اب یہ عالم ہے کہ میرے آگے کھڑی ہو گئی ہے کہ شادی کروں گی تو معیز سے اور بس۔۔۔! میں جانتی ہوں کہ اسے معیز سے زیادہ چاچا چاچی کی بناوٹی محبت بھاتی ہے۔۔۔ اس کا ان دونوں کے آگے سر نہیں اٹھتا۔۔۔ میرا ساری عمر کا پیار اور ممتا ان دونوں کے دو دن کے دکھاوے کے سامنے دب گیا ہے۔

میں جی کڑا کر کے بیاہ بھی دوں فوزیہ کو معیز سے۔۔۔ مگر لڑکے کا چلن بھی تو اچھا ہو۔۔۔ مہینے کے چار چکر تو وہ اس بازار کے لگا آتا ہے جدھر کا نام لیتے ہوئے میری زبان پھر جاتی ہے۔۔۔ ایک دفعہ۔۔۔ محلے کی ہی کوئی لڑکی بھی اٹھوا چکا ہے۔۔۔ کام کاج کچھ نہیں کرتا تبھی فوزیہ کے روپ میں سونے کے انڈے دینے والی مرغی ہتھیانا چاہتا ہے۔۔۔ اور میری فوزیہ خوشی سے اس کھائی میں چھلانگ مارنے کو تیار ہے۔۔۔ مگر میں کیسے اسے ایسا کرنے دوں۔۔۔ ایک ہی میری بچی ہے۔۔۔ اپنے ہاتھوں سے اسے برباد کر دوں۔۔۔ اس پریشانی میں مجھے تیرے علاوہ اور کوئی بھی نہیں دکھا جس پر میں بھروسا کر سکوں۔۔۔ فوزیہ جذباتی ہے۔۔۔ میں جانتی ہوں کہ تیری محبت اور ساتھ اس میں ٹھہراؤ لے آئے گا۔۔۔ اور وہ اس کمینے کو بھول جائے گی۔۔۔! میری عزت تیرے ہاتھ میں ہے صدیق بیٹا۔۔۔! تجھے اپنے باپ اور میرے مرے بھائی کا واسطہ۔۔۔ فوزیہ کو اپنا لے۔۔۔ ورنہ میں اسے زہر تو دے دوں گی مگر ان بدنیتوں کے حوالے ہرگز نہیں کروں گی۔۔۔!"

اس ساری جذباتی تقریر کے اختتام تک میری آنکھیں پھٹنے کے قریب تھیں اور دم نکلنے کے۔۔۔! اس سارے مسئلے کا جو حل پھوپھی بتا رہی تھی اس نے میرے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔۔۔ دوسری شادی اور وہ بھی فوزیہ سے۔۔۔ جسے میں نے اس کے بچپن کے علاوہ دوبارہ کبھی نہیں دیکھا تھا اور پھر ذکیہ کو خبر ہو گئی تو، میرے بچے۔۔۔؟ یہ تمام ممکنہ درپیش خطرات چند لمحوں میں میرے دماغ میں قلابازیاں کھا کر ایک دم چوکس ہو گئے تھے۔۔۔!

بھلا ایسا کیسے ہو سکتا تھا گو کہ میں مالی اعتبار سے ایک چھوڑ چار بھی رکھ سکتا تھا اور ذکیہ کو تو اکثر چھیڑ چھیڑ کر ستاتا بھی تھا مگر درحقیقت یہ کوئی چھوٹی بات نہیں تھی۔

میں نے پھوپھی ثریا کو تسلی دی اور فوزیہ سے ملوانے کا کہا۔۔۔ میرا ارادہ تھا کہ میں اس نادان کو سمجھاؤں گا تو شاید عقل آجائے مگر اس کے کمرے میں آنے کے بعد اس نادان کی نادانی کے باوجود میری عقل

سلب ہو گئی۔ فوزیہ کو دیکھ کر میں چاروں شانے چت ہوا تھا۔۔۔

ذکیہ اماں ابا کی پسند تھی۔۔۔ خوب صورت تھی۔۔۔ وفاشعار تھی' میرے بچوں کی ماں تھی۔۔۔ !مگر فوزیہ کو دیکھ کر جیسے چند پل کو میرے حواس چھن سے گئے۔۔۔ وہ کل کی بچی ایک مکمل اور خوب صورت دوشیزہ کے روپ میں میرے سامنے تھی جس کا حسن ملال کا رنگ لیے مزید تابناک دکھائی دے رہا تھا۔۔۔ میرے گمان نے بھی فوزیہ کے ایسے رنگ و روپ کا گمان نہیں کیا تھا۔۔۔ اس کے حسن میں بانکپن تھا۔۔۔ اک ادا تھی اور میرا دل گھائل تھا۔۔۔ صرف ایک صدا تھی کہ اس چہرے پر زندگی فدا تھی۔۔۔!

کہاں کا سمجھانا۔۔۔ کیا سمجھانا۔۔۔ میری اپنی سمجھ بوجھ فوزیہ کے قدموں میں لوٹنیاں لگا رہی تھی اور پھر دل تو سب ہی کا "تھوڑا بوہتا" کمینہ ضرور ہوتا ہے۔۔۔ میرا بھی تھا سو میرے دل نے کمینہ پن دکھاتے ہوئے پھوپھی ثریا کو ادکے کا سگنل دے دیا اور شام کو مغرب کی اذان کے بعد فوزیہ کا نکاح میرے ساتھ پڑھوا دیا گیا۔

نکاح سے پہلے کافی دیر فوزیہ کے کمرے سے پھوپھی ثریا اور فوزیہ کے بولنے کی آوازیں آتی رہیں جن میں پھوپھی کی آواز حاوی تھی۔۔۔ ایک آدھ کراری سی "چپیڑیں" بھی سنائی دیں جو بلاشبہ پھوپھی نے فوزیہ کو دھری تھیں' میرے دل کو کچھ ہوا مگر پھر دل کی خاطر ہی دل کو ڈپٹ لیا۔۔۔

یوں اس شام میری زندگی میں بہت بڑی تبدیلی آئی تھی جس کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی اور میں پورے دو ہفتے پھوپھی ثریا کے گھر گزار کے واپس گاؤں چلا آیا۔۔۔ واپسی پر میرے انگ انگ میں سرشاری اور مستی ہلکورے لیتی تھی۔۔۔ لب بات بے بات مسکراتے تھے۔۔۔ اسی شوخی میں ذکیہ کو بھی دو چٹکیاں بازو پر بھر دیں تو وہ دیدے پھاڑ کر "توبہ استغفار" کرتی سامنے سے ہٹ گئی۔

یہ سب اس محبت کا اعجاز تھا جو مجھے یک دم اور انتہائی شدت کے ساتھ فوزیہ سے ہوئی تھی۔۔۔ گو کہ اس کا رویہ ہرگز بھی حوصلہ بخش نہیں تھا مگر مجھے پروا نہیں تھی۔۔۔ ان دو ہفتوں میں اس نے میری کسی بھی بات کا ہاں یا نا سے زیادہ جواب نہیں دیا تھا مگر مجھے پروا نہیں تھی۔۔۔! میرے لیے یہ ہی بہت تھا کہ جس عورت کو دیکھ کر مجھے پہلی نگاہ میں محبت ہوئی۔۔۔ قدرت نے اسے میری بیوی بنا دیا تھا۔۔۔

میں حویلی لوٹ تو آیا تھا مگر میرا دھیان مستقل فوزیہ میں اٹکا تھا۔ موجو نے بھی میری بدلتی حالت کو محسوس ضرور کیا مگر ایک بار کے بعد پھر دوبارہ نہیں پوچھا۔۔۔ مزاج تھا کہ خوش ہوا جاتا تھا۔۔۔! چند دن بعد ہی میں نے دوبارہ شہر کا رخ کیا۔۔۔ گو کہ پھوپھی ثریا سے ٹیلی فون کے ذریعے مسلسل رابطہ تھا مگر دل تھا کہ ٹھہرتا ہی نہیں تھا۔۔۔ فوزیہ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے دل ہمکتا تھا سو میں کچھ دن بعد ہی در یار پر پڑا تھا۔

فوزیہ ہنوز ویسی ہی سپاٹ سی تھی۔۔۔ میرے لائے ہوئے بے حد قیمتی تحفوں کو جو میں بے حد محبت سے لایا تھا۔۔۔ ان پر ایک سے دوسری نگاہ ڈالنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔۔۔ مگر میں پھر بھی خوش تھا کیوں کہ وہ میرے سامنے تھی۔۔۔ دیدار یار سے بڑی لذت نہ کوئی دیکھی نہ چکھی۔۔۔!

میں ایک ہفتہ گزار کر واپس روانہ ہوا تھا اور یہ ایک ہفتہ بے حد مصروف گزرا۔۔۔ فوزیہ کے چاچے اور چاچے کے پتر سے بھی نبٹ لیا۔۔۔ شہر کے ایک دو واقف کاروں سے کہہ کر "تڑیاں" لگوائیں اور دو چار ہاتھ لگوائے تو سکون سے بیٹھ گئے۔۔۔ اس کے علاوہ فوزیہ کو بھی کئی جگہوں پر لے کر گھوما۔۔۔

اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔۔۔ ہر دوسرے ہفتے میری گاڑی شہر کا رخ کرتی تھی۔۔۔ موجو ٹھٹک گیا کیوں کہ وہ موجو تھا مگر میں نے اس دفعہ اس کے ہاتھ گرد کا ذرہ بھی نہ آنے دیا۔۔۔!

اور پھر جس دن مجھے پھوپھی ثریا نے فون کر کے بتایا کہ فوزیہ کی طبیعت خراب ہے۔۔۔ ڈاکٹر آئی تھی اور خوش خبری سنا گئی ہے۔۔۔ میری حالت ایسی تھی جیسے

میں پہلی دفعہ باپ بننے جا رہا ہوں۔۔۔ خوشی چھپائے نہ چھپتی تھی اور اگلی شام میں دنیا جہان کی نعمتیں لے کر فوزیہ کے پاس تھا۔

اس کے ناز نخرے اٹھا اٹھا کر میرا جی ہی نہیں بھرتا تھا۔۔۔ وہ جتنا اینٹھتی تھی میرا دل اتنا ہی اس کی طرف ہمکتا تھا۔۔۔ اب اس حالت میں تو وہ مزید نازک مزاج ہو گئی تھی۔۔۔ پہلے جو ہوں' ہاں میں جواب آتا تھا اب وہ بھی ندارد۔۔۔ اور پہلی دفعہ مجھے تشویش نے گھیرا تھا۔۔۔ ڈاکٹر کہتی تھی مریضہ بہت کمزور ہے' خون کی کمی ہے۔۔۔ بلڈ پریشر بھی نارمل نہیں۔۔۔ خوش رکھیں!

اور میں ہزار جتن کر کے بھی فوزیہ کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں لا پا رہا تھا۔۔۔ اس طرح میرے بچے کو بھی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ نہ کچھ کھانا نہ کچھ پینا۔۔۔ بس بے زار سی پڑی رہتی تھی۔۔۔ پھوپھی ثریا اسے میرے سامنے ہی خوب لتاڑتی تھی مگر وہ یونہی ٹس سے مس نہ رہتی

کم سنی میں ہوئی شادی نے کہیں دیکھنے کی فرصت ہی نہیں دی تھی اور اس سے پہلے دو سال جو میرے شہر میں پڑھائی کی غرض سے گزرے' ان دو سالوں میں ابھی اتنی تعقل ہی نہیں تھی کہ ادھر ادھر تاک جھانک کی جاتی تو دل اب توجہ کا طلب گار تھا مگر فوزیہ بے جان چینی کی مورت سے بڑھ کر کچھ نہیں تھی۔۔۔ اسی لیے اس دفعہ واپسی پر میں تہیہ کر کے آیا تھا کہ اب مجھے فوزیہ سے طلب گار شتہ نہیں رکھنا۔۔۔ میرے پاس اس کے لیے دل میں پیار کا دیا بہتا تھا' سو کیا تھا جو اسے سیراب کیے جاتا۔۔۔!

☆ ☆ ☆

ایسا کرنے کے باوجود بھی مجھے فائدہ نہیں ہوا تھا اور میری ڈھیروں محبت کے باوجود فوزیہ دیمک لگی لکڑی کی طرح کھوکھلی ہوتی چلی گئی۔ میری مجبوری یہ تھی کہ اس کٹھن مرحلے پر میں ہر وقت فوزیہ کے پاس نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے واپس گاؤں جانا ہی پڑتا تھا کیونکہ میری ذراسی کوتاہی سب کو چوکنا کر سکتی تھی اور میں فی الوقت ایسا کوئی مسئلہ کھڑا کرنا نہیں چاہتا تھا۔۔۔ میرا ارادہ تھا کہ بچے کی پیدائش کے بعد سب سے پہلے بے بے کو بتاؤں گا اور پھر ان ہی کو ذکیہ کو بتانے کے لیے کہوں گا۔۔۔ مگر اس کی نوبت ہی نہ آسکی۔۔۔!

فوزیہ کا وقت قریب تھا اور میں ابھی چند دن پہلے ہی اس سے مل کر آیا تھا۔۔۔ تب سے لے کر اب تک اس کا چہرہ میری نگاہوں سے ہٹتا نہیں تھا۔۔۔ بے حد لاغر اور بیمار وجود۔۔۔ مدقوق چہرہ!

پھوپھی ثریا بے بس بیٹھی تھی اور میں شاید اس سے بھی زیادہ بے بس تھا۔۔۔! ڈاکٹر کے بقول ماں کی حالت ہرگز تسلی بخش نہیں تھی۔۔۔ بچہ بھی بے حد کمزور تھا مگر میں کیا کر سکتا تھا۔۔۔ میرے اختیار میں ہوتا تو اپنے جسم کی تمام تر توانائی فوزیہ کو دان کر دیتا مگر وہ واقعی میں برف کا مجسمہ تھی جسے ہرگز ہرگز بھی کوئی فرق سرے سے پڑتا ہی نہیں تھا۔ بھلے سے میں اپنی کھال کی جوتیاں بنوا کر اس کے قدموں تلے رکھ دیتا۔۔۔

میں بے حد دل گرفتہ سا واپس آیا تھا۔۔۔ ایک دفعہ پھر اس سے منت کی تھی کہ اپنا خیال رکھے' اس مرحلے سے بخیریت نکل آئے تو میں اس کے مستقبل کا فیصلہ اس کی مرضی کے مطابق کروں گا۔۔۔!

تب سے اب تک میری طبیعت بوجھل اور مزاج میں تناؤ تھا۔۔۔ نشانہ موجو تھا اور موجو تھا کہ میرے آگے پیچھے لوٹنیاں لگا رہا تھا۔ جو بن پڑتا' مجھے خوش کرنے کے لیے کرتا۔۔۔ کافیاں سنائے چلا جاتا' کلام گائے چلا جاتا مگر میرے بے چین دل کو قرار نہ آیا۔۔۔!

اور پھر ایک رات بڑی شدید بارش تھی۔۔۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی دل میں طرح طرح کے وسوسے جڑ پکڑ کر بیٹھے تھے۔۔۔ اس رات میں ڈیرے پر ہی ٹھہر گیا تھا۔

آدھی رات کے بعد پھوپھی ثریا کا فون آیا تو میرے دل کو سنکھے لگ گئے۔۔۔ میں سمجھ گیا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔۔۔ پھوپھی مجھے فوراً "شہر پہنچنے کو کہہ رہی تھی۔۔۔ فوزیہ کی حالت خراب تھی اور بارش کا وہاں بھی بے حد زور تھا۔۔۔ میں نے پھوپھی کو کسی بھی طرح فوزیہ کو

لے کر ہسپتال پہنچنے کا کہا مگر وہ خود خاصی ہراساں تھیں
ایک تو اس وقت پاس کوئی مرد نہیں تھا اور دوسرے سواری کے لیے بھی محلے والوں میں سے کسی کو کہنا پڑنا تھا...!

میں جیسے تیسے گاڑی لے کر نکل کھڑا ہوا... موجو کو اٹھانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ اس وقت میں جس قدر حواس باختہ تھا... کچھ بعید نہ تھا کہ اس کے آگے اپنا ہی راز اگل دیتا...!

شدید بارش کی وجہ سے جو سفر میرا ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوتا تھا وہ ساڑھے تین گھنٹے میں ہوا... برستی بارش میں میں سب سے پہلے پھوپھی ثریا ہی کے گھر پہنچا تھا جہاں ثروت نامی عورت جو پھوپھی ثریا کے ہاں اس کی بیوگی کے وقت سے مستقل ساتھ تھی... وہ میرے لیے ہی گھر پر ٹھہری ہوئی تھی اس نے مجھے ہسپتال کا پتا دیا اور خود بھی تالا ڈال کر میرے ساتھ ہولی... مجھے کچھ خبر نہیں کہ میں کس طرح سے ہسپتال پہنچ پایا تھا۔

زندگی میں پہلی دفعہ میں نے خود کو کسی رعشہ زدہ مریض کی طرح کانپتے محسوس کیا... مجھے یقین ہو گیا جیسے اس مرض کا میں مستقل مریض ہو جاؤں گا۔

زچہ بچہ کے کوریڈور میں پھوپھی ثریا آنسو بہاتی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی... میں بھاری قدموں سے اس تک پہنچا تھا... وہ مجھے دیکھ کر پھپک پھپک کر رو دی... میرا دل سکڑ کر پھیلا تھا... اس قدر رونا کسی انہونی کا پتا دیتا تھا... میرے کچھ بھی پوچھنے سے پہلے ایک نرس تیز قدموں سے چلتی آئی اور ننھی سی گلابی رنگ کی پوٹلی پھوپھی کے ہاتھ میں تھما کر مزید عجلت دکھاتی اندر گم ہو گئی... یعنی کہ میری اور فوزیہ کی اولاد دنیا میں آچکی تھی... یقیناً پھوپھی ثریا کو خبر ہو گی اور اب نرس بچے کو صاف ستھرا کر کے ہمیں تھما گئی تھی... میں نے اسے دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی کیونکہ اس وقت مجھے فوزیہ کی فکر تھی... صرف اس کی لگن تھی۔

اس سے پہلے کہ میں ایک بار پھر پھوپھی ثریا سے کچھ پوچھتا... لیبر روم کا دروازہ کھلا اور ایک درمیانی عمر کی عورت پژمردہ سی باہر آئی... اس کے ہمارے قریب آکر رکنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ڈاکٹر ہے... اس کے چہرے کے تاثرات ہرگز حوصلہ افزا نہیں تھے۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا... میں نے آنکھیں میچ کر بے ساختہ فوزیہ کی سلامتی کی دعا کی تھی... مگر!

''مریضہ کی حالت بہت خراب تھی... میں نے آپ سے کہا تھا کہ اس میں خون کی پہلے ہی بے حد کمی ہے... عین وقت پر حالت بگڑ سکتی ہے' وہی ہوا... ہم بڑی مشکل سے بچے کو بچا پائے ہیں۔ آخری سانسیں ہیں... آپ چاہیں تو ایک نظر دیکھ لیں...''

کوئی قیامت سی تھی جو اس ڈاکٹر نے ہم پہ ڈھائی... پھوپھی ثریا کے حلق سے زوردار چیخ نکلی... ثروت نے لپک کر وہ پوٹلی تھامی جو مستقل کسمسائے جا رہی تھی اور میرا مفلوج ذہن ابھی تک اس حقیقت کو قبول کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو وہ ڈاکٹر اگل کر چلی گئی تھی۔ اپنے بے جان قدموں سے میں نے لیبر روم کا رخ کیا جہاں فوزیہ سرد سفید بستر پر نیم وا آنکھوں سے اکھڑے اکھڑے سانس لے رہی تھی... اسے آکسیجن ماسک لگا دیا گیا تھا۔

برف کا مجسمہ قطرہ قطرہ پگھل کر ساکن ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی ساری رعنائی جیسے بھاپ کی صورت تحلیل ہو چکی تھی اور چند پل جاتے تھے کہ اس کا وجود بھی اسی دھوئیں کا حصہ بن جاتا۔

میں نے دکھ کی انتہا پر پہنچتے ہوئے اس کا ٹھنڈا اور نیم مردہ ہاتھ تھاما تو چند ثانیے بعد آنسوؤں کی ایک لمبی اور باریک سی لکیر اس کی بائیں آنکھ سے نکل کر کنپٹی سے ہوتی اس کے سنہرے بالوں میں جذب ہو گئی...

اس نے مجھے محسوس کیا تھا... وہ میرا لمس پہچان گئی تھی... اس سوچ نے میری آنکھوں کے بھرے پیمانے چھلکا دیے اور میں گھٹ گھٹ کر رو دیا... میرے گرم آنسو اس کے یخ ہاتھ پر گرے تو ایک ذرا سی حرکت سے اس کی نازک کملائی انگلیوں نے میرے مضبوط ہاتھ کو دبایا تھا...

میں نے بے بسی سے بے ساختہ دیوانہ وار اس کے

ہاتھ کو بوسہ دیا اور اپنی گیلی آنکھوں سے لگالیا۔۔۔ صرف چند پل اور پھر اس کے ہاتھ کی رہی سہی حرارت بھی میری انگلیوں کی پوروں میں جذب ہو گئی۔۔۔ ایک نحیف سی ہچکی میری سماعت میں اتری اور مجھے لگا کہ میری روح ہمیشہ کے لیے بہری ہو گئی۔۔۔!

☆ ☆ ☆
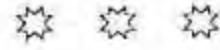
ڈھولکی کی زوردار تھاپ پر میرے خیالوں کا سلسلہ منتشر ہوا تھا۔۔۔ یاد ماضی بھی اون سے بنے سویٹر کی طرح ہے۔۔۔ بس ایک سرا ہاتھ میں لو اور ادھیڑتے چلے جاؤ۔۔۔ ہاتھ رکتا نہیں!

آج مریم کی مایوں ہے۔۔۔ مریم میری اور فوزیہ کی بیٹی۔۔۔! میری اولین محبت کی نشانی۔۔۔! وہی محبت جو آج بھی میرے دل میں ویسے ہی ڈیرہ جمائے ہوئے تھی جیسی اول روز۔۔۔!

اس رات فوزیہ بیٹی کو جنم دے کر ہمیشہ کی نیند سو گئی۔ مگر آج بھی میری انگلیوں کی پوروں پر اس کے ہاتھ کی ٹھنڈک ٹھہری ہوئی ہے آج بھی اس کی بجھتی نگاہوں کے دیے کی آخری ٹمٹماہٹ میرے تصور میں تازہ ہے۔

اور مریم میری وہ بدنصیب بیٹی جسے میں آج تک اپنا نہیں سکا۔۔۔ حالانکہ وہ میری رازداں ہے۔۔۔ وہ جانتی ہے کہ میں اس کا باپ ہوں مگر اس کا ظرف اتنا بڑا ہے کہ اس عمر میں مجھے کسی قسم کی خواری سے بچانے کے لیے اس نے مجھ سے اپنے رشتے کی اصل چھپالی تھی۔

میرے ساتھ ہمیشہ کے لیے حویلی آنے سے پہلے اس نے بڑے رسان سے مجھے ایک بات کہی تھی۔

"ابو۔۔۔! میں نے چھوٹی سی عمر سے زندگی کو الگ ڈھب میں برتا ہے۔۔۔ وقت نے مجھے رشتوں کی نزاکتوں کا شعور بہت چھوٹی عمر سے دلا دیا۔۔۔ اسی لیے کہ نانی نے میری تربیت ہی ایسے ڈھنگ سے کی۔۔۔ ہر چند کہ میرے پاس باپ جیسی نعمت ہے مگر ماں کے نہ ہونے نے مجھے بھی بہت عرصہ قلق میں مبتلا رکھا۔۔۔ آپ کی محبت میں کمی ہرگز نہیں مگر آپ کی کمی میں نے

بہت سے موقعوں پر بہت زیادہ محسوس کی۔۔۔ لیکن نانی نے مجھے ہمیشہ سنبھالا دیا اور آپ کی مجبوریوں کو دل کی خلش بنانے کے بجائے۔۔۔ حقیقت پسندی سے قبول کرنے کا حوصلہ پیدا کیا مجھ میں۔۔۔ اس لیے آج جب ہم باپ بیٹی ہمیشہ کے لیے قریب ہونے لگے ہیں تو میں سمجھتی ہوں قدرت ایک بار پھر میرے ظرف کا امتحان چاہتی ہے۔۔۔ آپ کی پریشانی مجھ سے اوجھل نہیں مگر آپ کے پاس مجھے حویلی لے جانے کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں۔۔۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم اپنے رشتے کی حقیقت کسی کو نہیں بتائیں گے۔۔۔ میں آپ کو چاچا جی کہہ کر بلاؤں گی۔۔۔ اس سے میرا اور آپ کا رشتہ بدل تو نہیں جائے گا نا۔۔۔ مگر باقی رشتوں میں دراڑ آنے سے بچ جائے گی۔۔۔ ویسے بھی مجھے اس دنیا میں لانے والی ہستی میرا منہ دیکھے بغیر مر گئی۔۔۔ نانی اب گزر گئیں۔۔۔ تو جب آپ کے اس راز کی امین وہ ہستیاں پردہ پوش ہو گئیں تو پھر میں اور آپ بھی اس قصے کو پردے میں ہی رہنے دیں۔۔۔ فی الحال اسی میں بہتری ہے۔۔۔!"

اور میں اپنی اس کم عمر بیٹی کا منہ دیکھتا رہ گیا جس کا ظرف حقیقت میں بہت بڑا تھا۔۔۔ وہ اپنی ماں کی طرح ہرگز نہیں تھی۔۔۔ بلکہ وہ شاید مجھ پر بھی نہیں پڑی تھی ۔۔۔ وہ کوئی لطیف سی روح محسوس ہوتی تھی۔۔۔!

اور یوں تب سے اب تک مریم میرے گھر میں پھوپھی ثریا کی نواسی کی حیثیت سے رہ رہی ہے۔۔۔ جس وقت وہ مجھے چاچا جی کہتی ہے ایک برچھی سی میرے دل کے آرپار ہوتی تھی مگر میں واقعی خود کو مجبور پاتا ہوں کہ میں یہ راز افشا کر دوں۔

میں ثریا پھوپھی کا مرتے دم تک احسان مند رہوں گا جس نے میری بیٹی کی اس قدر عمدہ تربیت کی اور کبھی بھی میرے اور مریم کے رشتے کو لے کر آڑے نہیں آئی اور خاموشی سے قبر میں اتر گئی۔۔۔

چاہتی تو زور دے کر مجھے مجبور کر سکتی تھی کہ میں مریم کو۔۔۔ اپنی اولاد کی حیثیت سے متعارف کرواؤں مگر میں نے مریم کی پیدائش کے ساتھ ہی جو اس بچی کو پھوپھی کے حوالے کیا۔۔۔ اس اللہ کی بندی نے پلٹ کر مجھ سے سوال تک نہ کیا۔۔۔ گو کہ میں مریم سے بے خبر کبھی نہیں رہا مگر ماہانہ خرچ بھیجنا اور مہینے دو مہینے بعد چکر لگا لینا خبر گیری بھی تو نہیں۔۔۔!

جب آفاق کا جھکاؤ مریم کی جانب ہوا تو میں نے ضرورت سے زیادہ غیرت مندی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا۔۔۔ آفاق بھی وہ بچہ تھا جس کا باپ اسے سگی اولاد ہونے کے باوجود اعلانیہ کہہ نہیں سکتا تھا اور مریم بھی وہ بچی تھی جو میری سگی بیٹی ہونے کے باوجود 'کہلوائے جانے' سے قاصر تھی۔ اس لیے میں نے ایک داؤ کھیلا۔۔۔ لالی کے ساتھ!

اور میرا داؤ چل گیا۔۔۔ لالی لپیٹے میں آ گیا۔۔۔ اس کی دکھتی رگ ساری عمر میں نے پکڑے رکھی تھی۔۔۔ اب آ کر مجھے دبانی پڑ گئی۔۔۔ کیا کرتا۔۔۔؟ مریم کے لیے آفاق بہترین رشتہ تھا۔۔۔ میری بچی میری نظروں کے سامنے رہتی اور اچھی جگہ بیاہی جاتی۔۔۔ میرے لیے یہ نعمت تھی۔۔۔ اور لالی کا کل کلاں کو دماغ نہ الٹ جائے اور میری بیٹی کو طعنے مارنے پر آ جاتا۔۔۔ اس کے سدباب کے لیے میں نے پیشگی اسے آئینہ دکھا دیا تھا۔۔۔

کیا کریں جی۔۔۔ کبھی کبھار کسی کمینے کے کمینے پن کو تھوڑی سی کمینگی دکھا کر کمین گاہ میں گھسیٹنا پڑتا ہے ۔۔۔ یہی دستور دنیا ہے۔۔۔!

اللہ کے حکم سے میری مریم کا پلڑا بھاری رہے گا۔۔۔ یہ اور بات کہ وہ بے حد صلح جو اور خدمت گزار بچی ہے۔ اس کی فطرت میں عاجزی اور انکساری ہے۔۔۔!

آج کل میرے حواسوں پر فوزیہ بڑی شدت سے سوار ہے۔۔۔ باہر ہماری بیٹی کی مایوں تھی۔۔۔ لڑکیاں بالیاں خوب شور مچائے ہوئے تھیں۔۔۔ میں باڑے کے قریب مناسب طول و عرض پر مشتمل بیٹھک میں بیٹھا تھا۔۔۔ یہاں پر عام طور پر موجو کے علاوہ کوئی نہیں آتا تھا۔

جب فوزیہ کی یاد کچھ زیادہ ہی بے کل کرتی تو میں یہاں آ بیٹھتا تھا۔۔۔ یہاں ایک چھوٹی سی دیوار گیر الماری ہے۔ جس میں فوزیہ سے منسوب چند چیزیں تھیں

نے سنبھال رکھی ہیں۔ دل بے طرح اداس ہو تو میں انہیں نکال نکال کر دیکھتا ہوں اور پھر کسی قیمتی خزانے کے طور دوبارہ تالے میں ڈال دیتا ہوں۔۔۔!

میں نے ایک نظر کھڑکی میں سے نظر آتے آخری دنوں کے زرد چاند پر ڈالی اور نواڑی پلنگ پر دھرے گاؤ تکیے کے نیچے سے سرخ جھلملاتا' تلے کے کام سے بوجھل دوپٹہ نکالا تھا۔۔۔ اس کی جھلملاہٹ یکدم میری آنکھوں میں اتر آئی تھی۔۔۔ یہ فوزیہ کا دوپٹہ تھا جو اس نے نکاح کے وقت اوڑھ رکھا تھا۔

میری نگاہوں کے آگے چھم سے وہ منظر اتر آیا تھا جس کے حصار میں' میں آج بھی پھڑپھڑاتا تھا۔۔۔ پتا نہیں کیوں مگر مجھے لگتا تھا کہ وہ جو آخری سانسوں کے درمیان فوزیہ نے اپنے نحیف ہاتھ میں جکڑا میرا ہاتھ دھیرے سے دبایا تھا۔ وہ محض دبانا نہیں تھا' وہ اظہار تھا۔۔۔ ان کہا سا۔۔۔ ان سنا سا اور ہمیشہ رہ جانے والا۔۔۔ محبت کا اظہار۔۔۔!

اور اس اظہار نے ہی تو مجھے بے مول خرید کر انمول کر دیا۔۔۔ زندگی ڈوبتی ابھرتی موجوں کا نام ہے مگر کچھ لہریں کنارے سے ٹکرا کر واپس نہیں پلٹتیں۔۔۔ وہیں پہ دم توڑ دیتی ہیں۔۔۔ فوزیہ بھی ایسا ہی ایک کنارہ تھی جس سے ٹکرا کر میں کبھی واپس نہیں پلٹ سکا۔۔۔ مدغم ہو گیا۔۔۔!

"حق ہاہ!" میں نے ایک ٹھنڈی اور بوسیدہ سی آہ بھری تھی اور وہیں گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔۔۔ دوپٹہ میرے سینے پہ اب بھی یوں دھرا تھا جیسے محبوب کا سر!

میری بیٹیوں اور پنڈ کی دیگر بچیوں کی بے سری تانیں میرے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔۔۔ میں مسکرا دیا۔۔۔ دھیان بے ساختہ موجو کی سمت گیا اور باڑے میں چارے کو پھولتا موجو ایک دفعہ پھر میرے دل کی پا گیا۔۔۔ فضا میں یکدم موجو کی تیز اور سریلی آواز ابھری اور چاند کے عشق کے وبال میں پھنسا چکور دیوانہ وار اس کی سمت پرواز کر گیا۔۔۔!

سن چرخے دی مٹھی مٹھی کوک

ماہیا مینوں یاد آوندا

میرے دل وچوں اٹھدی اے ہوک

ماہیا مینوں یاد آوندا

میری عید والا چن کدوں چڑھے گا؟

اللہ جانے ماہی کدوں ویہڑے وڑے گا۔۔۔؟

دکھ ڈاہڈے نیں تے جندڑی ملوک۔۔۔

ماہیا مینوں یاد آوندا۔۔۔

سن چرخے دی مٹھی مٹھی کوک۔۔۔

☆

کنیز نبوی

عمر ماروی

اکھر پڑھ الف جو پیا ورق سبھ وسار
اندر توں اجار ' پنا پڑھندیں کیترا

"صرف لفظ الف کا پڑھ لے باقی سارے اوراق بھول جا۔
باطن کو صاف کر لے اور کتنے فضول کاغذ پڑھے گا۔"

ماروی! "روح" دل کو یکتا کی یاد سے روشن کر لے' صرف الف سے لو لگا لے' اور سارے کورے کاغذوں کو پھاڑ دے' قلب کے کاغذ سے غیر کا نام مٹا دے۔

دل کی تختی صاف کر' الف کی تسبیح پڑھ کے' سب کچھ نفس کی نذر کر دے۔ اثبات حقیقی کے بحر میں غوطہ زن ہو کر ثبات عطائی کی سیپیاں چن لے۔
ماروی! کن کہنے والے کو راضی کر لے اور امر روح کو اس کے تابع کر لے۔

او ماروی!
او ماروی!
ذرا سن لے

ندائے ملیر

مکمل ناول

ندائے الست

الست بربکم (کون ہے تمہارا رب) جب سماعت نے یہ ندا سنی۔ تو ماروی (روح) اسی وقت قلب سے قالو بلیٰ (تو ہی ہے میرا رب) کا اقرار کر بیٹھی۔

وہ وعدہ' وہ عہد' اب اس عالم ناسوت میں وفا کرنا ہے۔ وہ وعدہ وہ عہد پورا کرنا ہے۔

اے ماروی! یہ دنیا خوب صورت و پر فریب سہی' عمر(نفس) خواہشات کا خریدار سہی۔

پھوگ (شیطان حرص و ہوس) کی ترغیب پر فریب سہی۔

مگر

ندائے 'ملیر(عالم ارواح) سے نہ مکر
قالو بلیٰ کے اقرار کو نہ بھول
وحدانیت کی وادی کو یاد کر
قلب کی گرہیں کھول دے
ظاہر و باطن' اول و آخر کے ذکر سے زبان کو تر رکھ

او عالم ناسوت میں پھنسی' پور پور جکڑی ماروی
ابھی سورج مغرب سے طلوع نہیں ہوا
ابھی توبہ کے دروازے بند نہیں ہوئے
لوٹ آ راستہ کھلا ہے
آلائشوں سے دامن جھاڑ
کورے کاغذ سارے پھاڑ
ملیر کی اور کر مہار (رخ)
نفس کو نیند سلا
نیند (عشق کا کاجل لگا)
توفیق الٰہی کے جھولے میں جھول جا
توفیق الٰہی کی دعا سے دامن آراستہ کر
لوٹ آ ماروی
اپنی اصل کی اور

☆ ☆ ☆

ماروی منتوں دعاؤں سے پانے والی من چاہی مراد۔ محبت کا میلہ سجانے آ رہی ہے۔ سورج کی سفید روحانی روشنی پر چمکنے والی ریت نے۔

سورج کے گیروا لباس پہن کر' آرام کرنے پر خود بھی مٹیالا لباس زیب تن کر لیا ہے۔ پاؤں کے نیچے ہجر ایسی تپتی ریت نے وصال کی ٹھنڈک جیسا لباس پہن لیا۔

ان بھٹوں ٹیلوں کی اوٹ میں اکا دکا تھری درخت بادلوں کو سمیٹے سر نیہوڑائے کھڑے ہیں۔ بکریاں اپنے بچوں کو سونگھ رہی ہیں۔ مٹیالا گھاگھرا پہنے گاؤں کے کونے پر ایستادہ ٹیلا' جس کی تکون پر کھڑا کھیت میلوں دور اس سڑک کو گھور رہا ہے۔ جو ریت میں سانپ کی طرح رینگتی لگتی ہے۔

اس دور دراز نئی سڑک کے تین کلو میٹر پار' وہ گاؤں جہاں ماروی کی آمد متوقع ہے۔ اور جس کے انتظار میں کھڑا کھیت' استقبال کے خوش کن خیال سے خیرہ ہو رہا ہے۔

کتنا تسلی بخش تصور ہے ـــــ چاندنی رات میں محبوب کو اونٹ پر بٹھائے اونٹ کی مہار پکڑ کر محبت میں محو ہو کر منزل کی اور بڑھنا۔

اس تصور کے طیور تلوار کی طرح تیز ہیں۔ مور کے رنگوں کی طرح حسین۔ وہ اس تصور کی قوس قزح میں کھویا ہوا ہے۔ محبت کا مینہ برس رہا ہے اور وہ اس میں پور پور بھیگتا جا رہا ہے۔

دور آسمان پر چاند اس چکور ایسے کھیت کی دیوانگی پر مسکرا رہا ہے۔

کھیت سر اٹھا کر چاند کو دیکھ کر ہنس پڑتا ہے چاند تیری ذات' اپنے محبوب کی مثل برابر نہیں سمجھتا' تو تو صرف رات میں چمکتا ہے' میرا محبوب تو ہر وقت روشن رہتا ہے۔

وہ چاند کو آنکھ مار کر شرارتاً" طعنہ دیتا ہے۔ اس سے سرد سندھی کی آواز میں شیخ ایاز کا کلام اس کی سماعتوں میں زندہ ہو جاتا ہے۔

او رے چاند اور رے چاند۔
میرا محبوب تم نے تو نہیں دیکھا۔

اس کا رنگ اس کا روپ ایسا ہی ہے جیسا تو
چاندنی رات کا فسوں فضائے بسیط پر طاری ہو کر اس کے دل کو فیض یاب کر رہا ہے۔ محبت کی مدھ میں مدہوش ہو کر' اس کے دونوں بازو تلور کے پروں کی طرح پھیل جاتے ہیں۔ وہ چکور کی طرح پھرتا ہے ٹیلے کی بھیگی بھیگی ٹھنڈی ٹھار ریت اس کے پاؤں کے نیچے سے سرکتی جاتی ہے۔
اس کی نظریں چاند سے ملتی ہیں' چاند کی مسکراہٹ اسے بھلی لگتی ہے' اس کے دماغ پر اسے پیار آتا ہے۔
اور ے چاند اور ے چاند میرا محبوب تم نے تو نہیں دیکھا
اس کا رنگ اس کا روپ ایسے ہی ہے جیسے تو۔
اس کی بلند آواز فضاؤں میں پھیلے فسوں پر سوار ہو کر پورے گاؤں پر گونجتی ہے۔
ٹیلے سے لہراتی آواز پر' صحن میں سوئی بھاگی آنکھیں کھول کر کروٹ لیتی ہے۔
''پگلا صحیح تو کہتا ہے' میری ماروی بھی تو چاند ایسی ہے۔''
اور ے رات اور ے رات میرا محبوب تم نے تو

نہیں دیکھا' اس کے بال اور گھنگھریالی جکڑ' ایسی ہی ہے جیسے تو۔ ماروی کے گھنگھریالے بال' جو ساری پشت پر سایہ کیے رکھتے وہ بال زنجیر بن کر اس کے دل کی ہتھ کڑیاں بن جاتے۔ دل بے قابو ہوتا' اس کی پشت پر سانپوں کی طرح لہراتے بالوں کو چھونے کو۔ وہ اپنے ہاتھوں پر ان ریشمی بالوں کا لمس محسوس کرنا چاہتا تھا۔
مگر روایات اور بڑوں کا اعتماد' ضبط کے ان دیکھے پہاڑ کھڑے کر دیتا۔
اور میرا پھول میرا محبوب تم نے تو نہیں دیکھا' اس کا ساتھ اس کی سنگت' ایسی ہی ہے جیسا تو۔'' خوشبوئے محبت کی لطافت چاروں اور پھیلتی جا رہی ہے۔ تیزی سے نیچے کی طرف ناچتی گرتی ہے۔
اور ے سانپ اور ے سانپ میرا محبوب تم نے تو نہیں دیکھا' اس کا خوف' ڈنگ ایسا ہی ہے جیسا تو۔
کوئی سانپ اس کے پیروں تلے بد کتا ہے' پھدک کر نکلتا ہے' وہ ہنس کر اسے چھوڑ دیتا ہے۔
محبوب کے جدا ہونے کے خوف سے اسے تشبیہ دی تھی' اس کی جان بخشی لازمی تھی' یہ عشق کا معاملہ ہے کوئی مسخری نہیں۔ وہ ناچتا ہے۔ اس کے ساتھ ٹیلا ناچتا ہے' اس کے قدموں تلے جیسے سارا تھری رقصم کی مدہم تان پر تھر کتا ہو۔ وہ مدہوش ہوا جا رہا ہے۔ اس سے اب دور سے آنے والی جیپ کا انتظار ٹیلے پر نہیں ہوتا' وہ بے تابی سے ٹیلے کی نچلی سطح پر دوڑتا ہے۔
اس کا ایک پاؤں ریت میں دب جاتا ہے' وہ کھینچ کر نکالتا ہے' تو صرف پاؤں چپل سے باہر آتا ہے۔ وہ جلدی میں دوسری چپل بھی اتار دیتا ہے اور ریت اس کے پاؤں کو چومتی ہے لپٹ جاتی ہے' اسے دیکھ کر اونٹ اٹھ جاتا ہے' وہ اس کی مہار پکڑ کر روڈ پر ہوٹل کی طرف رخ کرتا ہے۔
''اس کے من میں محبت کی مدہم مدہم مہک سر دھنتی ہے اور ابراہیم منشی کی ایسی پر سوز محبوب کو پریت نگر سے کھینچنے والی آواز میں' وہ مست ہو کر گنگناتا ہے۔ بی جا رات ٹھری آہے اٹھرے میں اچن تنہنجو بھاگن ئی بھری آہے۔

وہ اپنی بھاگوں بھری گھڑی کو پانے جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ماروی نے جیپ کے شیشے سے اس پار اپنے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے چاند کو دیکھا۔ چاند جو محبوب جیسا دکھتا اور پریت کا پیغام چھوڑ دیتا۔

اور چاند ایک آنکھ سے محبت میں ناچتے کھیت کو دیکھ رہا ہے۔ دوسری آنکھ سے ماروی کو خاموشی کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ شانت سکون سے سوچ کا سورج طلوع ہوتا ہے۔ تصویر محبوب دل کے نہاں خانوں سے ابھرتی ہے کھیت اس کی دید کا مشتاق بھٹوں پر اس کی آمد کے انتظار میں مور کی طرح ناچتا رہا ہے۔

وہ ساتھ چلتے چاند کو دیکھ کر مسکراتی ہے۔ اس وقت وہ گاڑی میں سوئی شمع اور عبداللہ کے خراٹوں بھری نیند سے غافل ہو جاتی ہے۔ اس نے آہستہ سے شیشہ نیچے کیا، چھوٹی سی درز سے ہوائیں اپنے ہوش و حواس گم کر کے اس سے آلپٹیں اس نے لمبی سانس کھینچ کر محبت کی آکسیجن اپنے اندر اتاری۔

سپنے اس کی آنکھوں کی منڈیروں پر آکر چپکے چپکے مسکاتے رہے۔ اس نے تتلی کے پروں کی مانند چپکے سے اک سپنے کو چٹکی میں تھاما۔

چھوٹے ڈیم سے بننے والی واٹر کی خوب صورت قطار کھیتوں کے گرد پھیلتی جا رہی تھی۔ تھر کی ریت پر لہلہاتے کھیتوں کے ایک طرف ترتیب سے بنے ہوئے پکے مکانات، ان کے بیچ بنا شاندار اسکول اور اس میں پڑھاتا ہوا کھیت، اس نے خوشحالی کے خواب کو آہستہ سے سنبھال کر اپنی جگہ رکھا۔

اس نے آنکھ کی منڈیر سے دوسرے سپنے کا جگنو پکڑا۔

اک خوب صورت ہٹ نما چھوٹے سے خوب صورت گھر میں وہ کھیت کے ساتھ، قحط کے دنوں کی پلاننگ کر رہی ہے، کیسے تھریوں، تھر کے باسیوں کو اناج دینا اور روزگار سے لگانا ہے۔ اس کے ذہن میں کئی منصوبے آ رہے ہیں، جن کی تعبیر پانے کی جستجو اسے سندھ یونیورسٹی میں سوشیالوجی میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کرنے کو کھینچ لائی تھی اور پھر ان منصوبوں کی سطح پر، کھیت کا وجود ابھر کر نمایاں ہو جاتا ہے۔

اور کھیت جو گا رہا ہے۔ اسے میسج بھیج رہا ہے، اس کے میسجز، بے تابیوں پر، ماروی پر یہ بھید کھلتا ہے کہ کھیت کا وصال وہ میٹھا بھت (میٹھے چاول کا زردہ) ہے جو تھر باسیوں کو کئی روز کے فاقوں کے بعد میسر آ رہا ہو، اس نے پہلی بار سوچا محبوب کا ہجر بھی قحط جیسا ہی ہے وہ پلک جھپک جھپک کر آنے والے ہر خیال کو من کی اور بھیجتی ہے۔

چاند اب بھی اس کی ہم سفری پر مسکرا رہا ہے۔ اس نے بہت احتیاط سے آنکھیں میچ کر، سارے سپنے اپنے اندر سمو لیے۔ بند آنکھیں، گاڑی رکنے کے جھٹکے سے کھلیں۔ "آنا" فانا" جیپ کے دروازے کھلے، گھسیٹ کر عبداللہ اور ڈرائیور کو روڈ پر پھینکا گیا۔ اس کے ساتھ بیٹھی شمع کو دوسری طرف سے بازو سے کھینچ کر اتارا گیا۔ اسے ایک لمحے کو یہی لگا کہ یہ ڈاکو شاید گاڑی لے جانا چاہتے ہیں۔ اس نے دیکھا ڈرائیونگ سیٹ پر ایک نقاب پوش براجمان ہو چکا تھا۔

باہر اترنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا۔ دوسرے دروازے سے شمع کے پیچھے اترنے کا، اس نے مستعدی سے شمع کے پیچھے اترنے کی کوشش کی، شمع کو اتارنے والا اب گاڑی میں چڑھ آیا تھا۔ اسے دھکا دے کر اپنی سیٹ پر گرا کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ تیسرا آدمی اگلی سیٹ پر بیٹھ کر دروازہ بند کر چکا تھا۔ اس نے ایک چیخ ماری اس کے منہ سے عبداللہ کے بجائے کھیت نکلا، اگلے ہی لمحے بھیگا رومال اس کے منہ پر تھا۔ ماروی نے بمشکل سر سے کھسکنے والی چنری کو اپنے ہاتھوں میں تھاما، بے ہوش ہوتے وقت اس کے ذہن کی اسکرین پر کھیت ساکت تھا، بھٹ شاہ میں بھٹائی کی وائی کرلائی بھالوا میں ماروی کی روح بے چین ہوئی۔

تھر کی دنیا بھی عجیب تھی۔ جہاں وہ پل کر جوان ہوئی۔ وہ ماروی عمیر کی غربت کا بن باس لے کر ہاتھ میں

تختی پکڑے ببول کے درخت تلے جا بیٹھی۔ اس کا ہاتھ پکڑنے والا کھیت تھا۔ جس نے اسے اپنے قریب بٹھایا۔

"ابا! ماروی کو بھی پڑھا۔" اس نے تختی ابے کے گھٹنوں پر رکھی۔ کامبھ باندھ کر دونوں گھٹنے کھڑے کر کے ان کے گرد اجرک کمر کے پیچھے اڑس کر گھٹنوں کے گرد باندھ کر سندھی صوفیانہ طریقے پر بیٹھے ہوئے سجن سندھی نے تختی اٹھا کر ماروی کو مسکرا کر دیکھا۔

"ماروی! پڑھے گی؟"

"جی ابا! پڑھے گی؟" ماروی سے پہلے کھیت کا جواب بے تابی سے آیا۔ ماروی نے شرما کر اثبات میں سر ہلا کر کھیت کی تائید کی۔

اجرک کی گانٹھ کھولتے ہوئے سجن دو زانو ہو کر تھر کی ریت پر عاجزی سے بیٹھ گیا۔ ماروی کو گھٹنے پر بٹھا کر تختی تھمائی۔

"الف انب (آم)

ب بلا۔ بلا دیکھی ہے۔ جو ریت میں رینگتی ہے۔"

ماروی نے فوراً اس بات پر سر ہلایا۔

"کل ابا نے ماری تھی اتنی بڑی۔"

"اچھا" بھئی واہ! تمہارے ابے نے تو کمال کر دیا۔ ورنہ وہ ہمیشہ پورا گاؤں اکٹھا کر لیتا ہے۔ اگر کہیں بلا دیکھ لے تو۔" وہ جی بھر کے ہنسا۔

"ارے سجن! کیا پٹی پڑھا رہا ہے میری ماروی کو؟"

"ارے پاندھی! تو بھی پہنچ گیا۔ تیرا پندھ (راستہ) کبھی گم نہیں ہوتا۔ ہمیشہ بات پکڑنے کو عین موقع پر پہنچ جاتا ہے۔"

"تو میری غیبت کرتا ہے، مجھے پتا چل جاتا ہے۔" پاندھی نے ببول کے درخت کے نیچے رکھے مٹکے کے اوپر رکھے مٹی کے پیالے میں پانی انڈیلتے ہوئے کہا۔

"تو تھریا ہو کر ٹانگ بلاؤں سے ڈرتا ہے۔ ہنسی تو آتی ہے نا بھلا تیری اس بزدلی پر۔"

"بس بس سجن! تو تو ٹھٹول کا موقع جانے نہیں دیتا۔ سارا دن مشکوکی۔" وہ غٹاغٹ دوسرا پیالہ پانی کا پی گیا۔

"تو بھی تھر کی طرح پیاسا ہے۔"

"ارے سجن! پیاسا تو ہر کوئی ہے۔ محبت کا، مال کا۔ جو سکون دے اس خوشی کا۔"

"بھلا تھر والوں کا سکون تو صرف پانی ہے۔ ساری خوشیاں مند ملہار سے جڑی ہوئی ہیں۔"

"چنگو (اچھا) بھاؤ! اب میں چلتا ہوں۔ میری ماروی کو پڑھانا۔ پہلے لوئی لج (چادر عزت) کا سبق جو ماروی کی شان ہے۔ جس سبق سے ماروی ماروی بنتی ہے۔" پاندھی نے اجرک لپیٹ کر کندھے پر رکھی۔

"ارے فکر نہ کر پاندھی۔ یہ سبق تو تھر کی ہر بیٹی کو ازبر ہے۔ سب سے پہلا سبق جو ماں کی گود سے سن کر بڑی ہوتی ہے۔ یہی لوئی لج کا ہی تو ہے۔"

☆ ☆ ☆

وہ ماروی بھی بھلا کیا ماروی تھی۔ اک غریب تھریاسی کی بیٹی۔ جو تھر کی جنگلی جڑی بوٹیاں جمع کرتی پھرتی جو مویشی اور لوگ بھی کھاتے بکریاں چراتے چرواہے۔ وہ ایسی ہی تھر کی سفید چاندی جیسی ریت سے رزق لیتے۔ رزق کی فراوانی تھریوں کے لیے مفقود ہے۔ تھری تو اپنے رازق کا ان جنگلی پھل اور بوٹیوں پر شکر ادا کرتے کہ یہی چیزیں تھریوں کے پیٹ کا ایندھن تھیں۔ مگر جب مند ملہار آتی ابر باراں برستا پھر تو تھریوں کے وارے نیارے ہو جاتے رزق کی فراوانی ان کا قحط ختم کر دیتی۔ مال مویشی مارو سب خوش اللہ سائیں رزق کے دروازے کھول دیتا۔ اور تھر کی زمین سونا اگلتی، خربوزے، تربوز، ٹنڈے، گوار کی پھلیاں، باجرہ، چاول تھریوں کے پیٹھ سے لگے پیٹ پھولنے لگتے۔ وہ خوشی سے جھومتے گاتے، ملہار گنگناتے۔ ان کے سانولے بدن تھر تھرا اٹھتے کیوں کہ چاندی ایسی جلتی ریت سبز پوشاک پہن لیتی، اسے ساون نے سجا دیا۔ قدرت مہربان ہو گئی۔ قادر نے کرم کیا۔ کن من برستی بوندوں نے من میں ملن کے میلوں کی آس جگا جاتی۔ اب تھریاسیوں کے منٹھار لوٹ آئیں گے، ان کے دھنار (چرواہے) جو مویشیوں کے ریوڑ لے کر نہری علاقوں

کی اور ہجرت کر گئے وہ پاندھیر گے (پیدل چلنے والے) قحط کا بن باس کاٹ کر اپنی ملکاؤں کے من موہنے واپس لوٹیں گے۔ ان کے مویشی دوڑیں گے۔

من موہنی ملکائیں۔ ملن کے سندیسے پا کر خوش ہو کر سات سنگھار کے سنگھاسن پر بیٹھیں گی۔ سپنوں کی تعبیر ملنے کا وقت آیا چاہتا ہے۔ وصال کی وائیں (سندھی شاعری کی اک جنس) فضا پر فسوں طاری کر دیتی۔ اور ایسے ہی فسوں میں گھری ماروی کی ماں بھاگی اپنے پاندھی کے انتظار میں تھی جو بدین مویشیوں کا ریوڑ لے کر گیا تھا۔

ماروی روز اپنے ابے کو یاد کرتی۔ تاروں بھرے آسماں کے نیچے اپنے آنگن میں چارپائی پر لیٹ کر بازو ماں کے گلے میں ڈالتی۔

"اماں! ابا کب آئے گا"

"جب قحط ختم ہوگا۔" بھاگی کی قحط زدہ آواز ریت میں سرسراتی بلاؤں کی طرح پھول پھول کر کے پھنکارتی۔

"اور قحط کب ختم ہوگا؟" ماروی زچ ہو کر کہتی۔

"جب سکار ہوگا۔" سکار (خوش حالی) کا لفظ آہ بن کر ظاہر ہوتا۔

"اماں! آخر سکار کیوں نہیں ہوتا؟" ماروی روہانسی ہو جاتی۔

"تو دعا کر رب رحم کرے۔ والی مینہ برسائے پیاسی دھرتی سیراب ہو اور سب کے وارث واپس آئیں۔" بھاگی کی آواز بھرا گئی۔ تارے دھندلا گئے۔

"اماں! تو رو رہی ہے؟"

"نہیں دھی۔" اس نے غربت کا پیوند لگے پلو سے آنکھیں پونچھیں۔

"اللہ سائیں تھر وسے (برسے) ریگستان وسے۔" اس نے اپنے باپ کی زبانی سنی دعا فوراً "دہرائی۔

"اماں اب مینہ برسے گا نا؟ اور تو روئے گی بھی نہیں۔"

"ہاں میری بچی!" اس نے اس سے کہا۔ آنکھ سے بہے شبنم کے قطرے تکیے میں جذب ہو گئے۔ وہ بھی تو پیاسی تھی اپنے سر کے سائیں کی۔ اس کا من بھی تو ویران تھا اور گھر کے تسلے میں دو روٹی کا آٹا۔ کتنے روز سے وہ اک ہی روٹی پکا رہی تھی۔ ماروی کے سامنے رکھ کر کسی کام کے بہانے اٹھ جاتی اور سیانی ماروی آدھی روٹی کھا کر آدھا پیٹ بھر کے تختی لے کر چاچا ساجن سندھی کے ببول کے درخت کے نیچے آکر بیٹھ جاتی۔

چاچا ساجن سندھی نے دوسرے دن اسے گود میں بٹھا لیا۔ اس کی چہرے پر بھوک رقم تھی آدھا پیٹ' آدھی روٹی' آدھی بھوک اور پورا درد' جو کہ مشترکہ تھا' تھر کے باسی واقف حال تھے۔ اک دوجے کے۔

اس دن چاچا ساجن اس کو پکڑ کر اپنے گھر لے آیا۔ کھیت کے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلایا اس نے دو نوالے لینے کے بعد انکار کر دیا۔

"کیوں دھی! بانی کیوں نہیں کھا رہی؟"

"چاچا! باقی اماں کے ساتھ جا کر کھاؤں گی۔" آدھی روٹی کا درد مشترک ساجن سندھی کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

"کتنی حساس بچی ہے۔ بھوک میں بھی ماں کو نہیں بھولتی۔"

"ماروی جو ہوئی۔" چاچی کے اس جملے نے اس کا سر فخر سے بلند کر دیا۔

کھیت نے روٹی لپیٹ کر چنگیر اٹھا کر اور سالن کی پلیٹ رکھ دی۔

"چل تیرے ویڑھے میں اکٹھے کھاتے ہیں۔"

"بھاجائی' کب سے آٹا نہیں۔" اس نے تسلے کا ڈھکن اٹھا کر خالی تسلے کو دیکھ کر استفسار کیا۔

"بھاؤ بس ادا جمن آیا ہی نہیں ایک ماہ ہو گیا۔ اس کے گج تیار ہیں۔" جواباً "مختصر عذر پیش کیا۔

"بھلا ادھار کی ماں تو نہیں مری۔" ساجن کی آواز میں تاسف جھلکتا تھا۔

"پاندھی نے بھی کوئی قاصد نہیں بھیجا۔ ورنہ وہ چار پیسے بھیج دیتا ہے۔"

اب کیا بتاتی تھر باسی سارے ہی ایک جیسے تھے' دونوں وقت آدھی روٹی کھانے والے اور رہنو سیٹھ کی

اکلوتی دکان سے ادھار آٹا لینا گوارا نہیں کہ اس کی ناگوار نگاہیں غیرت پر حملہ تھیں۔

☆ ☆ ☆

اور کچھ ہی عرصے بعد وہ گج ثقافتی میلے کی زینت بن کر چکا ہوگا جو ندروشنیوں میں اپنی چھب دکھا رہا ہوگا۔ اس کے شیشوں کا عکس ان روشنیوں پر تھرکتا ہوگا اور کوئی سیاح ہزاروں میں خرید کر اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں دیوار پر سجا کر ہر آنے والے مہمان کو بتا رہا ہوگا' یہ ہاتھ کا کام ہے۔ جو صحرائے تھر کی عورتیں کرتی ہیں۔ مشینی دور کے مشینی انسان کے لیے بہت بڑی بات ہو گی۔ ہاتھ سے بنا ہوا گج۔

یا کسی امیر کبیر خاتون نے کسی ثقافتی شو میں پہننے کے لیے خرید لیا ہوگا اور اس پہننے والی خاتون کو یہ اندازہ ہی نہیں ہوگا کہ اسے کاڑھنے والی مٹیالے رنگ کی عورت نے کتنی امیدوں سے اسے کاڑھا ہوگا۔ اک اک ٹانکے میں اپنی اک اک حسرت ٹانک کر اس کے بڑے بڑے شیشوں میں اپنا عکس دیکھ کر مسکرا کر اپنے ہی ہنر کو داد دی اس کے مشقت بھرے سیاہی مائل ہاتھ کی رگیں وہ دھاگے کھینچنے پر ابھر آتیں اور وہ شیشہ اپنی جگہ پر ٹھیک لگاتے سوئی دانتوں میں دبا لیتی ہو گی۔

یہ گج دنوں اس کی توجہ اپنے جانب کھینچ کر اس کے حواس پر چھایا ہوگا' وہ ہر کام کرنے کے بعد فوراً "اسے اٹھانے کو سوچتی ہوگی۔ جب میلوں پیدل چل کر وہ کنویں سے پانی بھرنے جاتی ہوگی۔ تو دوہرے مٹکے سر پر دھر کر اک گھڑا بازو پر اٹھا کر وہ تیز تیز چلتی ہوگی۔ اسے گج کا رہا سہا کام یاد آتا ہوگا۔ جلدی جلدی لکڑیاں چنتے' روٹی پکاتے' لسی بلوتے اور اگر بکری دودھ کے لیے پالی ہوگی تو اسے چراتے یہی خیال ذہن میں آتا ہوگا کہ ابھی گج کا اتنا کام باقی ہے۔ کرلوں تو چار پیسوں کا آسرا بندھے اور ان چار پیسوں کے انتظار میں دنوں کراچی سے آنے والے دلال کا انتظار کرتی ہوگی۔

اور جب وہ دلال اس سے بھاؤ تاؤ کر کے وہ گج آٹے کے کلو کے عوض خریدتا تو اس کے ارمانوں پر اوس پڑ جاتی' پڑے کے پیوند یونہی اس کی غربت کے چولے پر لگے ہوتے' نہ نیا جوڑا ملتا' نہ نیا چوڑا' بس آدھی روٹی' آدھی بھوک پورا درد۔

ساری حسرتیں تھر کی ریت میں بچھو کی طرح چھپ جاتیں اور وہ بچھو ڈنک مارتا۔ تیرے چولے کی ادھڑی ہوئی سلائی' تیرے پڑے کے پیوند' تیری چنری کے چھید سو زہر پی جاتی مگر ماروی کے پرانے کپڑے اور آدھی روٹی۔ پوری بھوک سارا درد زہر بن کر اس کو نیلوں نیل کر دیتا۔ اور بھلا ان باتوں کا اس گج کو گھر میں سجانے والے' مرمریں جسم پر پہننے والوں کو کیا پتا کہ ان کی رقم نے دلالوں کے پیٹ بھرے اور کاڑھنے والی کی بھوک بڑھی۔

☆ ☆ ☆

اس دن وہ بھرے ہوئے پیٹ سے اسکول دوڑتی جاتی۔ بلند ٹیلے خاک اڑاتے رہتے اور ٹیلے کی آڑ میں بنے ببول اسکول کے نیچے بیٹھے آٹھ دس طالب علموں کو دیکھتے رہتے۔ ان ٹیلوں نے صدیوں پہلے اس ماروی کو بھی دیکھا تھا جسے عمر پانی پلانے کا کہہ کر کنویں سے اٹھا کرلے گیا تھا۔

اور اب اس ماروی کو بھی دیکھ رہے تھے۔ جس کے پاؤں اسی نقش قدم پر اٹھتے تھے۔ جو چاچا ساجن سندھی سے ہر روز نصابی سبق لینے کے بعد صدیوں پہلے ماروی کے قصے کی کوئی نہ کوئی بات اپنے پلو میں باندھتی تھی۔ اور اس کے قریب بیٹھا کھیت اسے محویت سے تکتا رہتا۔ چاچا ساجن اس کی نظروں کو جانچتا تولتا اور دل میں عہد کرتا ہے' ماروی میری ہی بہو بنے گی۔ اور اب کی بار سکار ہو تو میں اس کی کھیت سے پدھری (بات پکی) کردوں گا۔

اور یوں اللہ نے کرم کیا۔ اس سال مینہ ٹوٹ کے برسا' سارا تھر جل تھل ہو گیا۔ رزق کی فراوانی ہوئی اور ان ہی دنوں ساجن نے اپنے دوست پاندھی سے ماروی کا رشتہ کھیت کے لیے مانگ لیا۔

بات پکی ہو گئی اور گیارہ سالہ ماروی پندرہ سالہ کھیت سے منسوب ہو گئی' انہوں نے ننگر پار کر شہر سے لائے ہوئے زرد لڈو بانٹے اور سارے گاؤں میں دھوم مچ گئی کہ کتنی شان دار پدھری ہے کہ ساجن نے تو نان ختائیاں نہیں شہر کی بنی پکی مٹھائی بانٹی اور لوگوں کو گڑ کے بنے چاول بھی کھلائے۔

☼ ☼ ☼

ماروی کے من میں محبت کی میخ ٹھونک دی گئی۔ کھیت کی چاہت نے اس کی کامیابیوں میں اہم کردار ادا کیا۔ سندھ یونیورسٹی جاتے ہوئے' راستے میں وہ بدین اتر گیا۔

"ارے ارے کہاں جا رہا ہے کھیت۔"

"بس چاچا! ابھی آیا۔"

"دیکھ اس کے کام' بس ابھی چل پڑے گی۔"

ارے چاچا! فکر نہ کر تیرا بیٹا آجائے تو پھر چلاتے ہیں لاری کو۔ کنڈیکٹر نے اسے دلاسا دیا۔ وہ بار بار کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھتا رہا دور سے کھیت کو آتے دیکھ کر ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال کر اسے اشارے سے بلایا۔

"اور ابا! جلدی۔"

اس کی آواز سن کر اس کے قدموں میں تیزی آئی۔ وہ جب بس پر سوار ہوا تو اس کی سانس پھول رہی تھی۔ ڈرائیور نے بس اسٹارٹ کر دی۔

"ابا! تیرے بھی یہ انصاف ہیں' اتنی دیر کرا دی۔" پاندھی شکوہ کناں ہوا۔

کھیت کھسیانا ہو کر ہنس دیا۔ ماروی نے اسے دیکھ کر مسکراہٹ کا تبادلہ کیا اور سر سیٹ کی پشت سے ٹیک کر آنکھیں موند لیں۔ اس کی ذہن کی اسکرین پر آنے سے پہلے والے مناظر تیرتے رہے۔

اس کی ماں نے اس کے لیے بھوگاڑو (ڈرائی فروٹ کی مٹھائی) بنایا بسری پکائی' تل کے لڈو بنائے اور کھیت کے ہاتھوں منگوائے ہوئے سوٹ کیس میں ساری چیزیں رکھ دیں۔

"اماں! وہاں شہر ہے' ہر چیز ملتی ہے یہ زاد سفر ہم تھریوں کے لیے ہے۔ جو تھر کے بیابانوں میں رہتے ہیں۔" وہ کھلکھلائی۔

"بس دھی بس۔ وقت بے وقت بھوک لگ سکتی ہے۔ اپنے پاس چیز پڑی ہو گی تو نکال کر کھا لے گی۔ ورنہ تو باہر نکل کر لینی پڑیں گی ناں اور دماغ خشک ہو جائے پڑھائی میں تو فوراً" بھوگاڑے کی اک ٹکیہ کھا لینا اصلی گھی اور مغزیات کی طاقت ملے گی۔"

"اچھا ٹھیک ہے' جو میری ماں کا حکم۔"

"حکم ہی ماننا ہے تو دھی سب سے پہلے میرا یہ حکم پلو سے باندھ لے کہ لوئی لج کبھی بھی نہ لجانا۔"

"اماں! میں ماروی ہوں ماروی۔" اس کے پرعزم لہجے نے بھاگی کے دل سے سارے وہم دور کر دیے۔

باپ کے خراٹوں پر اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ سامنے والی سیٹ پر بیٹھے کھیت کی نگاہیں خود پر مرکوز دیکھ کر وہ دل سے مسکرائی تھی۔

ان دونوں کے بیچ دوری کی کسک کھسک آئی تھی۔ جن کے من میں محبت کی مستیاں مست مگن تھیں۔ کنڈیکٹر کے بیچ میں سے گزرنے پر وہ اک لمحے کو اک دوجے کی آنکھوں سے اوجھل ہوئے اور یہ بھی انہیں ناگوار گزرا تھا۔

"بیٹھ جا بھاؤ' کیوں بار بار آجاتا ہے' ہمارے بیچ۔"

اس کی آخری سرگوشی صرف وہ ہی سن سکی۔ اس کے ہونٹوں پر ہنسی کے پھول کھل گئے' کھیت نے اک لمحے کو آنکھیں موند کر اس منظر کو اپنی پتلیوں میں قید کیا تھا۔

انہیں بدین سے جام شورو پہنچتے تین گھنٹے لگ گئے۔

"ماروی!" ہاسٹل کے گیٹ پر پاندھی نے اس کے سر کو چومتے ہوئے کہا۔

"دھی اپنی لوئی لج (چادر' عزت) کی حفاظت کرنا۔"

"ابا! یاد نہیں میں آپ کی ماروی ہوں' لوئی لج کا سبق بچپن سے ازبر ہے۔"

"ہاں' مجھے یاد ہے میرا بچہ!" پاندھی نے اسے سینے

سے لگالیا۔

کھیت نے اس کا سوٹ کیس اس کے پاس رکھ کر بدین سے لینے والا کالا شاپر کھولا۔ اس سے رنگین چنری نکالی' کھول کر ماروی کو اوڑھائی۔ "یاد رکھنا تو میری ماروی ہے۔" اس کا لہجہ بھیگا تھا۔

اس نے چنری کے پلو مضبوطی سے تھامے۔

"یہ ماروی کی ریت نہیں کہ محبوب کو سونے کے بدلے میں دے دے۔ اسے بھول جائے۔ جھونپڑیوں کی محبت' محلوں کے برابر نہیں سمجھوں گی۔" اس کے پرعزم لہجے پر متزلزل ہوتے یقین نے پھر سے کھیت کے دل کا کونا پکڑا تھا۔ اس سے وہ دونوں دل سے مسکرائے تھے۔

"ابا اب چلیں واپس۔"

"اماں دھی رانی اللہ کے حوالے۔" پاندھی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"اللہ واھی۔" ماروی نے دونوں کو دیکھتے کہا۔

واپس پلٹتے کھیت کی آنکھوں میں جدائی نمی بن کر نمودار ہوئی۔

"بس بیلی بال (بچہ) نہ بن۔" پاندھی نے کھیت کے گلے میں بانہیں ڈال کر ہنستے کہا اور اجرک کے پلو سے چپکے سے اپنی بھی آنکھیں پونچھ لیں' چوری پکڑے جانے پر کھیت نے بھی زور سے اسے بازوؤں میں بھر کر بس میں سوار کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ چنری ماروی کی پہچان بن چکی تھی۔ وہ تھر کی ماروی کہیں بھی آتے جاتے وہی چنری چادر کے طور پر اوڑھتی۔

اس کی روم میٹ' کلاس فیلوز اس پر ہنستیں۔

"ماروی کوئی اور بھی چادر ہے کہ نہیں؟" وہ مسکرائی۔

"بھئی تم کیا جانو' جن کے تن کورے کاغذ ہوں۔ جن پر کوئی محبت کی تحریر عشق کی پکی سیاہی سے لکھی ہی نہیں گئی۔"

"اوہو ہو۔" اس کا پورا گروپ لمبی تان الاپتا' وہ کھلکھلا اٹھتی۔

"اور نہیں تو کیا۔ تم لوگوں کو کیا پتا کہ میرے من کو کیسا قرار ملتا ہے اس چنری کو اوڑھ کر۔"

"ارے لڑکیوں بالیوں! اس کی چنری کو ذرا جھاڑ کر تو دیکھو۔ کہیں کھیت تو نہیں چھپا ہوا۔ ہم بھی دیکھ لیں اس سرسبز کھیت کو۔" شمع کی جولانیاں اپنے عروج پر پہنچ جاتیں۔

"تو جلتی رہ شمع' کھیت چھپا ہوا نہیں' میرے دل کے پلو سے بندھا ہوا ہے۔" مشترکہ قہقہے پورے کمرے میں گونج اٹھتے۔

"ارے پگلیو' اس کی محبت کی میخیں میرے من میں لگی ہوئی ہیں۔ تمہیں کیا پتا' میری ہڈیاں یہاں ہیں' روح تو اس کے پاس ہے۔"

"لو جی اب نئی تکنیک آگئی' پہلے سنتے تھے کہ محبوب کے پاس دل ہوتا ہے۔ اب روح بھی رہنے لگی۔"

"پاگل' محبت روح کا ہی تو رشتہ ہے' ورنہ دل بیچارے کی کیا مجال کہ اس ٹھاٹھیں مارتے سمندر کو اپنے اندر سمو سکے' یہ روح کی طاقت' روح کی توانائی ہی ہے جو اسے یہ جذبہ پالنے کی توفیق دیتی ہے۔"

"ہم مان گئے تمہارے تجربے کو بابا! بحث نشستند۔" وہ یک زبان ہو جاتیں۔

"تم مادیت کے بیوپاری دل کا دھندا کیا جانو۔" وہ شرارتاً ہنستی۔

"اوہو' تو یہ دل کا دھندا صرف دیہاتی ہی جانتے ہیں کیا۔" شمع کی زبان تیز ہوئی۔ "بھلا کیا بیچتے ہو اس دھندے میں۔"

"اپنا وقت' جو تم لوگ کسی کو نہیں دے سکتے۔ اپنا خلوص' اپنی چاہت' محبت' پریت' پیار' خواب' درد' حسرتیں' پوری جان ہی تو رہن رکھ دیتے ہیں۔ انمول سوداگر' یادی لو سے سلگتے ہیں اے شمع فروزاں' کچھ اور پوچھنا ہے تو پوچھ لے۔" ماروی کے لہجے سے ایک شان بے نیازی امڈی پڑتی تھی۔

بات شمع کے دل کو لگی۔ وہ لوگ وقت کے گرد

بھاگتے اور وقت ان کے ہاتھ نہ آتا تھا۔ ان کو اپنے پیچھے دوڑائے رکھتا وقت، سیلاب تھا جو اپنائیت، خلوص، پیار، وضع داری، اقدار اور سب سے قیمتی متاع محبت کو بہائے لیے جاتا تھا اور دنیاسیتوں کے پاس وقت ٹھہر جاتا۔ اپنے دامن سے سارے انمول موتی، محبت، وفا، خلوص و پیار کے چن لینے کی مہلت مہیا کر دیتا، وقت سبک رو جھیل کی مانند بہتا، جہاں اپنائیت کے سارے پنچھی آکر بسیرا کرتے اور اپنے اپنے حصے کا خلوص، پریت، پیار، انسانیت، محبت کا رزق چگتے۔

مادہ پرستوں اور محبت پرستوں میں اک یہی فرق تھا۔ وہ وقت کے غلام تھے اور یہ وقت کی قید سے آزاد پھرتے تھے۔

☆ ☆ ☆

عمر سومرو نے اسے پہلی بار لائبریری سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے سر پر سلیقے سے اوڑھی ہوئی چنری نے اس کی توجہ کھینچی۔ اس کی اٹھان میں اک شان بے نیازی تھی۔ اس کی توجہ کہیں نہیں تھی۔ اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتابوں اور اٹھتے ہوئے قدموں کے سوا۔ حسن اس کی ذات سے چھلک چھلک پڑ رہا تھا۔

"کافی مغرور لگتی ہے۔" اس کی خود کلامی پر عبداللہ نے کتاب سے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر اس کی نظروں کے تعاقب میں دور ہوتی ماروی کو۔

"نہیں، خوددار اور غیرت مند۔"

"نیا مال ہے یونی میں۔" وہ اسے مسلسل دیکھتے ہوئے ہنسا۔

"یار! تمیز سے بات کر۔ ہر کسی پر جملے کستے ہوئے اتنا تو سوچ لیا کر کہ وہ بھی کسی کی بہن بیٹی ہے۔" عبداللہ کو اس کا لہجہ، انداز دیکھنا، کچھ بھی اچھا نہیں لگا۔

"بڑی حمایت کر رہا ہے۔ جان پہچان کہاں تک پہنچ گئی کہ دوست کو بھول گیا۔" عمر سومرو کو اس کی باتیں سخت بری لگیں۔

"یقین کر اس لڑکی سے میری آج تک کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔" عبداللہ زچ ہوا۔

"پھر دل میں بس گئی ہے کیا۔" عمر نے طنز کیا۔

"ہے بھی بسنے والی۔"

"نہیں، میری کوئی جذباتی وابستگی اس لڑکی کے ساتھ نہیں مگر کچھ لڑکیوں کو دیکھ کر ان کی عزت کرنے کو جی چاہتا ہے، ان کے بلند کردار کی وجہ سے۔ یہ لڑکی بھی ان میں ہی سے ہے۔" عبداللہ نے اپنا مؤقف بیان کیا۔

"ارے دیکھتے ہیں، سالی کتنی دیر تک پارسا رہتی ہے۔" عمر سومرو استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

"تم نہیں سدھرو گے۔ ہر ایک کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا اچھی بات نہیں۔ عمر سومرو! خیال سے جانا۔ شکار کرتے کرتے کبھی بندہ خود بھی شکار ہو جاتا ہے۔" عبداللہ نے تنبیہہ کی۔

"تمہارے دوستانہ مشورے کا شکریہ۔ عمر سومرو صرف شکار کرنا جانتا ہے۔ ہونا نہیں۔"

"بہت زیادہ خود اعتمادی بھی بندے کو لے ڈوبتی ہے۔"

"فکر نہ کرو عبداللہ! تمہارا یار کھلاڑی ہے، اناڑی نہیں۔"

وہ بات تو عبداللہ سے کر رہا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں اس چنری والی لڑکی کا انداز بے نیازی گردش کرتا رہا۔ وہ بالکل غائب دماغی سے بولتا جاتا تھا اور پھر اچانک ہی جی اچاٹ ہونے پر باتیں ادھوری چھوڑ کر اپنی گاڑی میں آبیٹھا۔

"پھوگ۔" اس نے اپنے کمدار کو پکارا۔

"جی سرکار۔"

ایک لڑکی آئی ہے یونیورسٹی میں، کل اس کا اتا پتا معلوم کرنے کی مہم پر نکل جانا۔"

"حاضر سرکار۔" پھوگ ہنسا۔

☆ ☆ ☆

"انسان میرا راز ہے، میں اس کا راز ہوں۔"

"میں بندہ تو معبود، تیری وحدانیت میں کوئی شک و

شبہ نہیں۔

تمہاری یاد' پیار' ذکر' اے میرے محبوب' تجھ سے محبت کرنے والوں کے لیے باعث افتخار ہے۔

تجھ کو پانے' ڈھونڈنے والی ہر دلیل بات برحق ہے' سچ ہے۔

ماروی 'الانسان سری' میں گم ہو چکی ہے' وجود کو کھونے کی جستجو میں محو "میں" کو فنا کرنے کی لگن کو معدوم نہ ہونے دیتی' وہ اس راز کو جان چکی ہے۔ عبد جب فنا ہو تو ہی بقا کو پہنچتا ہے۔

عشق کے چڑھتے سورج کے ساتھ ہی ان نینوں کو (مہرین) محبوب واحد و یکتا کو دیکھنے کی عادت ڈال ٭ گر ماروی تمہارے نین ادھر ادھر کو جھانکیں' غیر پر فدا ہوں' تو ایسے نادان نینوں کو نوالے بنا دو کوؤں کے' زاغوں کے' ماروی کو الست کی صدا یاد آتی ہے اور قالو بلیٰ۔ کا اقرار' اس عمر کوٹ و دنیا میں نہیں بھولتی۔

بس... بس ایک محبوب مائل ہو جائے۔ اس پر نظر کرم ہو جائے۔

قلب کو قرار ملے۔ احد کے اسرار میں جو محو ہو گئے۔ وہ کسی اور کی طرف نگاہ نہیں اٹھاتے ٭ اسی راز میں پوشیدہ رہتے ہیں۔

ماروی اس درجے کے لیے پریشان اس عالم ناسوت میں ماری ماری پھرتی' توفیق الٰہی پانے کے لیے کبھی بھٹائی کی روحانی رمز میں رہتی اور کبھی سچل کی سرمستی میں سما جاتی۔

ماروی! خدائے ازل و ابد تیرا راستہ آسان بنائے۔

☆ ☆ ☆

اس کے ہاتھ میں سوشیالوجی کی کتابیں تھیں۔

"تم پہلے اس ڈپارٹمنٹ میں جاؤ۔" اس نے آدھا گھنٹہ پہلے پھوگ کو کہا تھا' خود گاڑی میں بیٹھا رہا۔

بھلا عمر سومرو کی یہ شان ہے کہ کسی لڑکی کو ڈھونڈنے خود نکل کھڑا ہو؟ اس نے نخوت سے سوچا' وہ گاڑی میں بیٹھا' موسیقی سے لطف اندوز ہوتا رہا' چیونگم چباتا رہا۔ ایک گھنٹے بعد پھوگ دوڑتا آیا۔

"سرکار! وہ لڑکی تو ماروی ہے' اپنے علاقے کے پاندھی چرواہے کی بیٹی۔"

"اچھا..." وہ خوشی سے ہنس دیا۔ اپنے علاقے کے لوگوں کو تو وہ مال غنیمت سمجھتا تھا۔

"کتنا مول ہو سکتا ہے اس کا؟" اس نے پھوگ کو آنکھ مارتے ہوئے تمسخر اڑایا۔

"سرکار' بس یہی' چند ٹکے یا زیادہ سے زیادہ کچھ زمین۔" پھوگ نے قہقہہ مارا۔

عمر سومرو دل کھول کر ہنسا۔

"دیکھنے میں تو بڑی ان مول لگتی ہے۔ اب دیکھتے ہیں کتنے مول میں بکتی ہے۔ چل ذرا اس سے جان پہچان تو کرلیں۔" وہ پریڈ لے کر نکلی تھی۔

"ارے ارے ادی ماروی!" اس نے پھوگ کی آواز پر رک کر دیکھا۔

"بڑی خوشی ہوئی ہے تمہیں سندھ یونیورسٹی میں دیکھ کر۔"

"اچھا' شکریہ۔" ماروی نے رکھائی سے کہا۔

"یہ میں نہیں کہہ رہا' چھوٹے بھوتار عمر سومرو کا پیغام ہے' آخر میرے علاقے کی لڑکی یونیورسٹی لیول تک پہنچی ہے۔" ماروی کی پیشانی پر عمر سومرو کے ذکر پر شکنیں نمایاں ہو گئیں۔

"ادی ماروی' آؤ میں سائیں عمر سومرو سے تمہاری ملاقات کرا دوں۔ ہمارے علاقے کا "سردار وڈیرہ" ہے۔ سو کام پڑ سکتے ہیں۔ جان پہچان لازمی ہے۔" پھوگ نے اپنے تئیں پتا پھینکا۔

ماروی کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"بھاؤ پھوگ! میں یہاں تمہارے بھوتار سے جان پہچان کرانے نہیں آئی۔ میں ان لوگوں کو اچھی طرح پہچانتی ہوں' اگر پہچان نہیں ہے تو ان بھوتاروں کو نہیں' اپنے غریب ماروں کی' ان کے دکھوں کی۔" ماروی کا لہجہ پر تاسف ہوا۔

"آپ کے خیالات سن کر آپ سے مل کر کافی خوشی ہوئی۔" اس کے پیچھے کھڑے عمر نے بات کو سنبھالنے اور تعارف بڑھانے کو کہا۔

"آپ یقیناً" ماروی ہیں۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔"

"مگر عمر سومرو صاحب! مجھے آپ سے مل کر بالکل بھی خوشی نہیں ہوئی۔"

عمر سومرو کے ہونٹوں پر آنے والی مسکراہٹ معدوم ہوگئی۔ یہ اس کی توہین تھی، جس کا وہ کبھی بھی عادی نہیں رہا تھا۔ اک غریب چرواہے کی بیٹی کی یہ ہمت' وہ تپ گیا' چڑ گیا۔ اس کے کان غصے میں لال ہو گئے۔

ماروی رکھائی سے کہہ کر رکی نہیں تھی۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ کا مکا بنا کر دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر زور سے مارا' خالص وڈیرانہ انداز میں۔

"سائیں فکر نہ کریں' کہاں جائے گی؟ پھڑپھڑا کر آخر پھنسے گی۔" پھوگ نے دلاسا دیا۔

☼ ☼ ☼

جام شورو کی ٹھنڈی ہوائیں' دریائے سندھ کے پانی کا لمس لے کر اس کے جسم سے ٹکرا رہی ہیں' اک فرحت بخش احساس اس کے دل میں انگڑائیاں لے کر بیدار ہوا ہے۔ اس نے اپنی کتابیں سرہانے رکھ دی ہیں اور خود کھڑکی سے تاروں کی طرح شہر کی ٹمٹماتی روشنیوں کو سرسری سا دیکھ رہی ہے۔

اسے اوپر تھر کا تاروں بھرا آسمان یاد آتا ہے اور بچے ماں کی آنکھ سے بہنے والی شبنم اور پیٹھ سے لگے پیٹ کی آدھی بھوک' اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگتی ہے۔

"اللہ سائیں تھر کی پیاس مٹا دے' ماروں کی بھوک مٹا دے۔" تہہ دل سے دعا کی۔

بکریاں چراتا اس کا باپ' لکڑیاں چنتی اس کی ماں اور گاؤں کے اسکول میں اب چاچا ساجن کی جگہ پڑھاتا ہوا کھیت' سب ہی تو اس کے منتظر تھے کہ کب وہ پڑھ کر آئے اور صرف اپنے گھر کی ہی نہیں پورے گاؤں کی قسمت بدل دے۔

کھیت کے نام کا پہنا ہوا چاندی کا وہ چھلا اس کے دل میں میٹھی میٹھی محبت جگاتا ہے وہ آپوں آپ مسکرانے لگتی ہے۔ اس کے دل میں محبت کی گھٹائیں اڈنے لگتی ہیں اور کھیت کی یاد برسنے لگتی ہے۔

اس کی دوستیں اس پر ہنستی ہیں۔

"ماروی کھیت یاد آرہا ہے۔"

"وہ بھی بھلا کوئی بھولنے والا ہے' اس کی یاد موجود رہتی ہے ہر ویلے' بس کبھی کبھی دل کے کواڑ اور آنکھوں کی باڑھ پھلانگ بیٹھتی ہے' نادان جو ہوئی۔"

وہ سر کو نفی میں جنبش دے کر یاد کو سرزنش کرتی ہے۔

وہ ماروی ہے جس کے من میں اپنے ماروں (لوگوں) کی محبت مچلتی ہے۔ ان محبت کے جلووں میں کھیت کی محبت کا جلوہ سب سے نمایاں' انوکھا' اور بھاری بن کر نمودار ہوتا ہے' وہ اس جلوے میں جلتی ہے اور جلا پا جاتی ہے۔

کھیت کی یاد کی لہریں چند سو میل دور ہوا کے رستے کھیت کی روح تک پہنچ کر اسے جگاتی ہیں اور برقی آلہ گنگنا اٹھتا ہے۔

"سارا دن جلتی ہے مگر ظاہر بھاپ تک نہیں ہوتی۔" اس کی آنکھیں کھیت کے بھٹائی کے بیت کے پیغام پر بھیگتی ہیں اور انگلیاں سیل کے کی پیڈ پر تھرکتی ہیں۔

بھٹائی کی زبانی وہ بھی پیغام بھیجتی ہے۔

"نین نیند نہیں کرتے" آنکھوں کی سستی اور نیند ختم ہو چکی ہے۔

وہ گل ہو کر پھر جل اٹھتی ہیں' تمہیں یاد کرنے اے محبوب۔"

رات اپنے پلو سمیٹ رہی ہے اور محبت گزیدہ جاگتے ہیں۔ جب سارے لوگ نیند کی آغوش میں آرام کرتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

اس نے شمع سے رابطہ کیا' شمع' جس کو وہ گھاس بھی نہیں ڈالتا تھا۔

"وہ تمہاری دوست ہے۔ تم پر اعتماد کرتی ہے'

"میری سیٹنگ کرادو اس کے ساتھ۔" عمر سومرو کسی لگی لپٹی کے بغیر بولا۔
"تم اس کے ساتھ کیوں سیٹنگ کرنا چاہتے ہو۔ وہ تمہارے علاقے کی اک غریب لڑکی ہے۔" شمع کو عمر سومرو کی خواہش بڑی عجیب لگی' وہ عمر سومرو جس کے لیے کئی لڑکیاں جان دینے کو تیار بیٹھی تھیں۔
"وہ اپنی چنری سمیت مجھے اچھی لگی ہے۔" عمر سومرو نے مدعا بیان کیا۔
"کیوں؟ اس لیے کہ وہ تمہارے پیچھے دوڑنے والیوں میں سے نہیں اور یہ بات تمہاری غیرت کے لیے کسک بن کر رہ گئی ہے۔" شمع کی آنکھیں بات کی تہ تک پہنچنے پر چمک اٹھیں۔
عمر سومرو' ہکا بکا رہ گیا تھا۔ لب بھینچ کر اک ساعت کو سوچا۔
"تم کچھ بھی سمجھ لو' بس مجھے اس سے دوستی کرنی ہے۔" اس نے قطعی لہجے میں کہا۔
"معاف کیجیے گا۔ میں نے فی الحال ایسی کوئی ایجنسی نہیں کھول رکھی۔" وہ کہتے ہوئے اٹھی۔ عمر سومرو نے فوراً" اس کا ہاتھ پکڑا۔ ماروی تک پہنچنے کا ایک یہی وسیلہ تو تھا۔
"میں تمہیں فیس دینے کو تیار ہوں۔"
"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے' سومرو صاحب۔ میں ضرورت مند نہیں۔" اس نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑایا۔
"مجھے پتا ہے' تمہارے والد انٹرنیشنل این جی او میں بہت بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ تم لوگ روپوں میں نہیں ڈالروں میں کھیلتے ہو۔"
"کیا مطلب ہے آپ کا۔" شمع جز بز ہوئی۔
"ضرورت صرف پیسوں کی نہیں' انسان کی بنیادی ضرورت میں محبت کا رول بہت اہم ہے۔ آپ میرا کام کردیں' میں آپ کا کردوں گا۔" شمع خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔
"وہ آپ کی دوست ہے اور عبداللہ میرا دوست' ہم دونوں ڈیل کر لیتے ہیں۔ ایک دوسرے کی مدد کی۔" عمر سومرو نے اس کی خاموشی کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اور کامیابی سے جال پھینکا۔
شمع نے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔
"ضرور سوچنا اس بات پر۔" وہ اس کے پیچھے آیا۔
"میں منتظر رہوں گا۔" وہ گاڑی تک آیا۔
شمع نے لمبی سانس لی اور گاڑی اسٹارٹ کردی۔ وہ اسے جاتا دیکھ کر مسکرایا۔ اس کی خاموشی ہمت افزا تھی اور امید دلاتی تھی کہ وہ اس کے پھینکے گئے جال میں ضرور پھنسے گی۔ عبداللہ کتابی کیڑا تھا اور شروع دن سے شمع کی اس کی جانب دلچسپی' کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔
عبداللہ اس کا یار تھا' وہ اس سے بھی کوئی نہ کوئی ڈیل کر ہی لیتا' اس کی چار بہنیں تھیں۔ ان کی شادیاں کرا دیتا اور عبداللہ سے شمع کی شادی' اس کا پلان اس کامیاب سیاست دان کی طرح ناکام نہیں ہو سکتا تھا۔ جو سب کو ساتھ لے کر چلنے کی بات کرتا تھا۔ وہ بھی ایک کامیاب سیاست دان وڈیرے کا بیٹا ہی تو تھا۔

☼ ☼ ☼

"سلام چاچا!" کھیت جھونپڑے میں داخل ہوا۔
"بابا وعلیکم سلام۔" دیہاتی تلفظ میں پاندھی نے جواب دیا۔
"چاچا! آپ سے پوچھنے آیا ہوں۔ کوئی کام ہو' کچھ لینا ہو تو بتا دیں۔ میں ننگرپار کر شہر جارہا ہوں۔"
"اڑے بابا! سارے کام پیسوں سے ہوتے ہیں۔ ہم مسکین مارو' غریبی پر صابر' روکھی سوکھی پر گزر کرنے والے۔ ہمارا کیا کام شہر سے' اس کے سودے سے۔ بس اللہ سائیں کا شکر ہے' مالک نے ہمارا رزق اسی تھر کی ریت میں سے پیدا کیا ہے۔" پاندھی نے لمبی تمہید باندھی۔
"توں ماٹھ تہ کر' بات کرتا ہے تو چپ ہی نہیں ہوتا۔" بھاگی ہنستے ہوئے چند دھاگے ہاتھ میں پکڑ کر آئی۔
"بھلے بات کر' کس نے روکا ہے تجھے" پاندھی

خوش دلی سے ہنس دیا۔

"ابا! کھیت یہ نمونے کے دھاگے اور شیشے پکڑ! ایسے لے آ اور یہ ان کے پیسے۔" اس نے کھیت کو پکڑاتے کہا۔

"بس ابا! جب تک ماروی کی چھٹیاں ہوں تب تک کچھ گج مکمل کردوں، شہر میں جا کر بیچے گی تو اچھے پیسے ملیں گے، میری بچڑی پتا نہیں کیسے گزارا کرتی ہوگی۔ پیسے اس کے پاس ہوں گے بھی کہ نہیں۔" بھاگی کے لہجے میں تاسف در آیا۔

"ان شاء اللہ، مالک سائیں اس کے دن بدلے گا۔" پاندھی نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔

"آمین۔" ان دونوں کی زبان سے بیک وقت نکلا۔

وہ باہر نکلا صحن میں ٹہلتے ہوئے مور نے اس کو دیکھ کر آواز نکالی۔

"ماروی کی یاد لگی ہے۔" اس نے مور کو پکارا۔ مور اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ کھیت نے سیل فون نکالا۔

"ہیلو ماروی۔"

"ہاں بولو کھیت، جلدی میں ہوں، پریڈ نکل جائے گا۔" اس نے پھولی سانس سے کہا۔

"بس دو لفظ اپنے مور سے بول دو۔" کھیت نے اسپیکر کھولا۔

"اوہ میرے مور کیسے ہو تم، اداس نہیں ہونا میں جلد آؤں گی۔" مور نے اس کی آواز سن کر خوشی سے آواز نکالی۔ ماروی کی کھلکھلاتی ہنسی ابھری۔

"یہ کس مور سے بات کر رہی ہو، دو ہاتھوں والا یا دو پروں والا۔" شمع کی کھنکتی آواز اسپیکر سے ابھری۔

"چپ کر بد تمیز۔" ماروی کی بھنچی سی آواز پر کھیت دل کھول کر ہنسا تھا۔ ماروی نے کال کاٹ دی۔

"ابا! ماروی تھی؟"

"ہاں چاچی! جلدی میں تھی۔ رات کو آکر آپ سے بات کرواؤں گا۔"

اس کی سکھی سہیلیاں اب میری نسبت سے اسے چھیڑتی ہیں۔ اس احساس نے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے پھول کھلا دیے۔

☆ ☆ ☆

کھیت اسے لینے آیا تھا۔

"کھیت میں اب وہ ماروی نہیں، میرے اندر ان چھ مہینوں میں کافی خود اعتمادی اور بہادری آگئی ہے۔" وہ ہنسی۔

"مجھے پتا ہے ماروی! تو صدیوں سے بہادر ہے۔ یہ کوئی آج کی بات تھوڑی ہے۔" کھیت کا لہجہ گمبھیر ہوا۔

"پتا ہے کھیت، جب تم مجھے اس ماروی سے ملاتے ہو نا، تو مجھے ڈر لگتا ہے۔ اس ماروی کے اوپر بہت بڑا امتحان آگیا تھا۔ اللہ ہر بیٹی کو ایسی آزمائش سے محفوظ رکھے آمین۔"

"ماروی تو ماروی بنتی ہی تب ہے۔ اگر اس کی کوئی لج کا امتحان نہ لیا جاتا وہ اس آزمائش پر پوری نہ اترتی تو وہ تھر کی لاکھوں عورتوں کی طرح بے نام ہی رہتی۔ اسے نام والا بنایا ہی اس واقعے نے تھا۔" وہ ہنس دیا۔

"تم نہیں سمجھ سکتے کھیت، کسی لڑکی کے لیے اس کا اغوا ہونا موت ہے۔ چاہے وہ باعصمت واپس لوٹے مگر دنیا اسے بے عزت کر کے رکھ دیتی ہے۔ یہ آج کی حقیقت ہے۔ مگر جو تم کہہ رہے ہو، وہ بھی درست ہے مگر ماروی کا حال ماروی کو بے حال کر دیتا ہے۔ اس کا کوئی مستقبل نہیں رہتا جب تک وہ ماضی نہ بن جائے پھر اس کا قصہ داستان کو دہراتے ہیں اور خراج تحسین کے ڈونگرے برساتے ہیں۔ مگر در حقیقت ماروی اپنی زندگی میں اس ناموس، عزت و پارسائی کا کوئی فیض نہیں پاتی۔" وہ مسکرائی۔

کھیت ہنس دیا۔

"یہ بھی ہے کہ ہر ناموری کوئی نہ کوئی قربانی ضرور مانگتی ہے۔" وہ بس سے باہر خلا میں گھورتے ہوئے بولی۔

"اور ہر محبت بھی۔" اس کی آواز دھیمی ہوئی، سرگوشی نما۔

"جیسے تھریوں سے تھر کی محبت، بھوک جیسی قربانی

مانگتی ہے اور تھری وہ قربانی دیتے۔ بھوکے رہتے ہیں، مگر تھر نہیں چھوڑتے۔ تھر کی محبت، وطن کی محبت ایمان کا حصہ ہے۔ وہ اس ایمان پر ایمان رکھتے ہیں۔" اس نے بہت گہری آہ نما سانس سندھ کے نہری علاقے کی فضاؤں کے سپرد کی اور چپ ہو گئی۔

"چپ کیوں ہو گئی ہو، بولو ماروی، بولو۔ جب تم بولتی ہو، تو مجھے لگتا ہے۔ میں بھٹائی کی وائی سن رہا ہوں۔ جیسے مائی بھاگی کھڑی نیم کے نیچے گا رہی ہو، یا صادق فقیر کی آواز شیخ ایاز کے کلام سے کانوں میں رس گھول رہی ہو۔ جب تم معاشرتی علوم پر بات کرتی ہو، تو مجھے لگتا ہے میں امر جلیل کو سن رہا ہوں۔ تمہاری باتیں میرے دل پر ایسے برستی ہیں جیسے تھر کی دھرتی پر بارش کی کن من برستی بوندیں۔ میرا دل سیراب ہو جاتا ہے، تھر کی ریت کی طرح جو ریت بارش کی میٹھی بوندوں کو چوس لیتی ہے اور میں تمہارا کھیت۔ جس کا دل تمہاری ماٹھی مٹھڑی آواز سے ــــ بہار ہو جاتا ہے۔ جیسے ساون کی بارشیں ہوں۔ تمہاری باتیں.... تمہاری باتیں۔" کھیت نے آنکھیں بند کر کے اسے جواب دیا۔

یہ کھیت اس کا منگیتر، سنگی ساتھی اس سے وہ شرما گئی۔ بس کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی سندھ کی شہری علاقوں کی سبز ہریالی اپنے اختتام کو پہنچ کر تھر کی ریت میں بدل رہی تھی۔ تھر کے علاقے کا آغاز ہی دردناک ہوا تھا۔ وہاں مرے ہوئے مور اور مویشیوں کی ہڈیاں پڑی ہوئی تھیں۔

"بولو ماروی" کھیت کی آواز نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچی۔ "تمہاری چپ مجھے اچھی نہیں لگتی تم چپ کرتی ہو، تو مجھے لگتا ہے جیسے تھر پہ قحط کا سناٹا چھا گیا ہو۔"

ماروی نے اس قحط سے نظریں ہٹا کر کھیت کو دیکھا۔ جو اس کی محبت سے آباد تھا۔ ان نظروں کے ٹاکرے سے محبت کا دریا بہتا تھا کھیت کا دل چاہا وہ اس کا ہاتھ پکڑ لے اور اپنے ہونٹوں سے لگا لے۔ مگر اس کی روایات اس کی خواہش پر بند باندھ دیتی تھیں۔ وہ چاہ کر باندھی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

"تمہاری خاموشی تھر کی تپتی ریت پر کڑکتی دھوپ کی چادر بن جاتی ہے۔"

"بس کرو کھیت۔" وہ جھینپتے ہوئے بولی۔

کھیت اس کے شرمانے پر دھیمے سے ہنسا۔ "ایسا لگتا ہے، جیسے ترایاں (ٹیلوں کے نیچے بنے چھوٹے حوض) پانی سے لبالب بھر گئی ہوں۔ تمہاری آواز کی بارش سے۔" ماروی کے ہونٹوں پر مسکان ٹھہر گئی۔ بس میں اور مسافروں سے بے خبر وہ اپنی باتیں کرتے گئے بس اسٹاپ پر رک گئی تھی۔ ان کے گاؤں میں ابھی لنک روڈ کا نام و نشان نہ تھا۔ چھپر ہوٹل کے قریب وہ اونٹ باندھ آیا تھا۔ ہوٹل کا مالک اس کا دوست تھا۔ وہ دوڑ کر آیا، چائے پانی کا پوچھا وہ وہاں بیٹھ گئے۔ تھکن اتارنے اور چائے پینے لگے۔

"بھاؤ! راستے میں پریشانی تو نہیں ہوئی۔"

"نہ بھاؤ، راستہ آسانی سے کٹا، بلکہ کچھ زیادہ ہی جلدی کٹ گیا۔" کھیت کا سرگوشی نما آخری جملہ صرف ماروی ہی سن سکی اور ہونٹوں پر اڈنے والی مسکراہٹ کو بمشکل روک پائی، اس نے نظریں خلاؤں میں گاڑ دیں، جہاں ریت اڑاتے ہوئے ٹیالے رنگ کی راجدھانی تھی۔

"تھا بھاؤ، روڈ تو اچھی بن گئی ہے، بس اب تھر میں لنک روڈ بھی بن جائیں تو باقی سفر آسان بن جائے، گوٹھوں دیہاتوں تک بھی۔" ہوٹل والا سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے بولا۔

"فکر نہ کر بھاؤ، یہ اپنی ماروی گئی ہے نا۔ شہر پڑھنے، پڑھ کر آئے گی تو کسی این جی او، میں اسے اچھی سی نوکری مل جائے گی پھر دیکھنا۔ میرے گاؤں کی تو قسمت ہی بدل جائے گی۔" کھیت فخر سے بولا۔

"ہاں بھاؤ! تمہاری تو واقعی قسمت اچھی ہے، جو بھاگوں بھری ماروی ملی ہے۔" ہوٹل والے نے ہنس کر چھیڑا۔

ماروی ذرا سی جز بز ہوئی اور اس نے فوراً رخ موڑ

لیا۔

"اس میں بھلا کوئی شک ہے۔" کھیت کی آواز میں خوشی رچ بس گئی۔

"اب ہم چلتے ہیں۔ رات پڑ جائے گی۔" اس نے ماروی کا بیگ اٹھا کر اونٹ کو بٹھا کر اسے بٹھایا۔

"اللہ واھی۔"

"اللہ واھی۔" ہوٹل والا زور زور سے ہاتھ ہلا کر بولا۔ اس کے ہوٹل پر کارونجھر سے گھومنے والے سیاحوں کی اک بس آکر رکی تھی۔ وہ ان کی چائے بنانے میں لگ گیا۔

☼ ☼ ☼

محبت کی مہار پکڑنے والا کھیت اپنے شانے پر مہار رکھ کر اونٹ کو دوڑائے جا رہا ہے اور اونٹ پر بیٹھی ماروی اس کے قدموں سے اڑتی ہوئی دھول میں دھندلے مناظر دیکھ رہی ہے۔ بھٹوں (ٹیلوں) کی بندیاں اور ان کی اوٹ میں بنے ان لوگوں کے جھونپڑے اور اس کے جھونپڑے پر بیٹھا اس کا مور' صحن میں بندھی بھیڑ بکریاں اور ٹیلوں کے بیچ بنی ترائیاں۔ لبالب بھر جاتیں اور لوگ اور مویشی اس کے پانی سے سیراب ہوتے' گھری چوڑے والی' بانہوں والی عورتیں' خوش گپیاں کرتیں۔ اپنے مویشیوں کو پانی پلاتیں اور اپنے گھر کے لیے پانی بھرتیں۔ وہ جھیلیں جن میں مٹی اڑتی رہتی' وہ آباد ہو جاتیں۔

"تو میری عند ملہار ہے۔" محبت کی مہار پکڑنے والا پلٹ کر زور سے بولتا ہے۔ اس کی آواز پر ٹیلے سر اٹھا کر آتی ماروی کو دیکھتے ہیں۔ اور سورج پلٹ کر اپنی آنکھوں میں اس منظر کو قید کرتا ہے اور غروب ہونے کے لیے اپنی لال ٹمٹماتی بتی روشن کر لیتا ہے۔

"تو آئی ہے تو ایسا لگتا ہے' جیسے تھر کا قحط ختم ہو گیا ہو۔ یہ کھیت بھی تھر بن گیا تھا' تیری دید کا پیاسا۔"

وہ الٹے قدموں سے آگے بڑھتا چلتے ماروی کو اپنے بے تابی کی کتھا سنا رہا ہے۔

ماروی نے ہوا کے دامن پھیلانے پر اپنی چنری زور سے مٹھی میں پکڑی ہے۔ آنکھیں میچ کر اڑتی ریت سے خود کو بچاتی ہے۔ آنکھ کھولتی ہے تو منظر بدل جاتا ہے۔

کارونجھر سے آنے والے تلوروں کی اک قطار اور نیچے رائفل لیے عمر سومرو ان کے شکار میں منہمک۔

"رک جا کھیت۔" وہ چیخی ہے۔

کھیت کے قدم فوراً تھمتے ہیں' اس کی آواز کی بیڑیوں پر۔ وہ اونٹ کے بیٹھنے کا انتظار نہیں کرتی' چھلانگ لگا کر' ریت پر کودتی ہے۔ گرتی ہے' اٹھتی ہے اور دوڑ پڑتی ہے۔

"ارباب عمر! مت کر یہ ظلم۔" اس کی دھاڑ پر عمر سومرو کا نشانہ چوک جاتا ہے' تلوروں کی اڑان گولی کی آواز پر تیز ہو کر قطار تتر بتر ہو جاتی ہے۔

"ارباب عمر سومرو! آخر کب بنو گے اس دھرتی کے دوست' کیوں ختم کرنا چاہتے ہو تھر کا حسن' چند ٹکوں کے عوض۔ شکاری دوستوں کے ہمراہ اپنے چند لمحوں کی تسکین کی خاطر۔" ارباب عمر سومرو اسے دیکھ کر ہنسا۔

"تو وہی ماروی ہے نا جو یونی میں مجھ سے بات کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔" وہ طنزیہ انداز میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں میں وہی ماروی ہوں' جو تم جیسے وڈیروں کو منہ نہیں لگاتی کیوں کہ تم ظالم ہو' شکاری ہو' غدار وطن ہو۔" وہ غصے سے بولی۔

"اوہو اڑان تو تلور جیسی ہی تیز ہے' مگر آگے بھی ارباب عمر سومرو ہے' جس کا نشانہ کبھی بھی نہیں چوکتا' ماروی!" وہ دل کھول کر ہنسا۔

"نفرت ہے مجھے تم جیسے شکاریوں سے۔" عمر سومرو کے لیے اس کے لہجے میں حقارت تھی۔ وہ اس کے لیے ٹوہ بن گئی تھی۔

"اڑے بس کر چھوکری' اتنا آگے نہ بڑھ۔" پھوگ اپنے سردار کی مدد کو آیا۔

"تو چپ کر بکاؤ مال۔" وہ اس پر دھاڑ کر پھر عمر سومرو

کی جانب بڑھی۔

"تم میرے گاؤں میں تلور کا شکار نہیں کر سکتے۔"

"یہ میرا علاقہ ہے۔" عمر سومرو کو تاؤ آیا۔

"یہ میرا گاؤں ہے۔ یہ میری دھرتی ہے' یہ میری زمین ہے' تو جا کر اپنے علاقے میں شکار کر۔ میرے گاؤں میں نہیں' آئی بات سمجھ میں۔" وہ شعلہ بن کر اس کو جلا رہی تھی۔ اس کی توانا آواز میں طاقت تھی۔ عمر سومرو زندگی میں پہلی بار کمزور ہوا۔ اس کی سٹی گم ہو گئی تھی۔

"سائیں بھوتار' چھوری کے منہ لگنا ٹھیک نہیں۔ چلیں آپ۔" پھوگ کے بازو سے پکڑ کر جیپ میں بٹھانے پر وہ فوری بیٹھ گیا تھا۔

کھیت یہ سارا منظر حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ کتنی طاقت ور ہو گئی تھی ماروی۔ عجیب سی خوشی تھی جو سارے سراپے میں دوڑ گئی تھی۔

"ماروی۔" اس نے پکار پر کھیت کو دیکھا۔ جس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

"یہ عمر سومرو' جب ادھر ادھر سے دل بھر جاتا ہے' تبدیلی کے لیے یونیورسٹی میں دھکے کھانے آجاتا ہے' کسی نہ کسی لڑکی کے پیچھے۔ وہاں میں اس سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتی۔" اس نے کھیت کی حیرت کو کم کیا۔

"علم بہت بڑی طاقت ہے' آج یقین آگیا۔ ماروی! جن لوگوں کے آگے ہم ہاتھ جوڑتے رہے ہیں صدیوں سے' آج ان کو للکار رہے ہیں۔ یہ پہچان ہمیں تعلیم نے دی ہے۔" کھیت نے جاتی جیپ سے اڑنے والی دھول کو دیکھتے ہوئے کہا اور یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے گاؤں میں پھیل گئی۔

صدیوں سے غلام لوگ انگشت بدنداں ہو کر' انگریز کے پٹھوؤں کو وفاداری کے صلے میں ملی جاگیروں سے مرعوب غلامانہ ذہنیت رکھنے والے' خوف زدہ ہو گئے۔

"پاندھی تمہاری بیٹی نے قہر کر دیا۔ وڈیرے کے بیٹے کو للکارا ہے۔ اب دیکھنا رات تک سارا گاؤں پولیس باندھ کر لے جائے گی۔"

"کیوں؟ ہم نے کوئی وڈیرے کی بھینس چوری کی ہے' جو پولیس باندھے گی۔" کھیت غصے سے کہتا۔

پاندھی بے چارا خاموشی سے سب کی سنتا اور دل ہی دل میں دعا مانگتا رہتا کہ اس واقعے کی وجہ سے' پولیس نہ آجائے۔ ورنہ پورے گاؤں میں بھونچال آجاتا اور اسے گاؤں سے نکال دیا جاتا۔

پورا گاؤں چند دنوں تک ہراساں رہا' ماروی کے واپس شہر جانے کے بعد سب لوگوں کی جان میں جان آئی کہ اب وڈیرا کچھ نہیں کرے گا۔

☆ ☆ ☆

اس کے اندر ہی اندر ایک طوفان اٹھا تھا ایک غریب چرواہے کی بیٹی کی یہ مجال کہ اس کے علاقے میں اس کو شکار سے منع کرے۔ اسے رہ رہ کر غصہ آتا' اور پھر وہ غصہ پیار میں تبدیل ہو جاتا۔

"کم بخت ہے بھی تو خوب صورت' آنکھیں ہیں کہ جھیلیں' جس میں تیرنے کو دل بے تاب ہوا جا رہا ہے۔ ہرنی کی طرح چھال مارتی ہوئی اور شیر کی طرح دھاڑتی ہوئی۔ پھوگ اس وقت دل کر رہا تھا' ابھی اٹھا کر گاڑی میں ڈال لوں چھوری کو۔ بڑی اچھی لگتی ہے۔" اس وقت اسے اپنے ہی منہ سے چھوری کا لفظ اچھا نہیں لگا تھا۔ یہ بات اس کے اندر تبدیلی کی غماز تھی۔

"بھوتار سائیں! عام دن ہوتا تو خیر تھا۔ ابھی تو بڑے بھوتار سائیں کی الیکشن سر پر ہے۔ ایسا کرنے سے لوگ باغی ہو جاتے' ووٹ بینک پر اثر پڑتا۔"

"اسی لیے تو رک گیا' اسی لیے تو رک گیا۔" ہتھیلی پر مکا مارتے بولا۔ بے بس ہونا اس کی سرشت میں نہیں تھا۔ وہ اس مقام پر آکر کیوں بے بس ہو گیا ہے۔

"سائیں! گرم کھانے سے منہ جل جاتا ہے۔ ٹھنڈا کر کے کھائیں۔" پھوگ اس کی بے چینی بھانپ گیا۔

"صبر نہیں ہوتا۔ اب صبر نہیں ہوتا۔" وہ ٹہلنے لگا۔

"دیکھو عبداللہ آگیا؟"

پھوگ فوراً" باہر نکلا اور الٹے پیروں واپس پلٹا۔

"سائیں' عبداللہ صاحب ڈرائنگ روم میں آپ کے منتظر ہیں۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا مشروب کا گلاس وہیں رکھا اور تیزی سے ڈرائنگ روم میں آیا۔

"عبداللہ! تم میرے دوست ہو اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"وزیر کے بیٹے کو' میری مدد کی کیا ضرورت آن پڑی ہے' یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے۔" عبداللہ کی حیرت دیدنی تھی۔

"تم شمع سے شادی کرلو۔"

عبداللہ اس کی بے تکی بات پر بے ساختہ ہنسا۔ "مگر کیوں؟"

عمر سومرو نے اس کے سوال کو نظر انداز کردیا۔

"میں ادھار کا قائل نہیں' فوراً" قرض چکاتا ہوں۔ تمہیں پتا ہے' تم پڑھ کر نکلو گے' پھر بھی تمہیں نوکری نہیں ملے گی۔ میں تمہیں سترہ گریڈ کی پوسٹ دوں گا۔ تمہاری بہنوں کی شادی کے اخراجات برداشت کروں گا۔ میری ایک بات ماننے میں تمہارے ایک نہیں دس فائدے ہیں۔" وہ اپنے سارے پتے بڑی ہوشیاری سے پھینک رہا تھا۔

"میں مانتا ہوں' میں تمہارا دوست ہوں' مگر یہ اتنا کچھ تم ۔۔۔ میری دوستی میں نہیں کررہے' پھر آخر کس لیے؟" عبداللہ الجھ گیا۔ عمر سومرو یک لخطہ چپ ہوا' تھوک نگل کر کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

"تمہیں پتا تو ہے۔" وہ لڑکی۔

"ماروی!"

"ہاں' وہ میرے گلے کا کانٹا بن گئی ہے۔"

"صرف گلے کا کانٹا یا دل کا درد بھی۔" عبداللہ ہنسا۔

"پتا نہیں۔" وہ شیشے کے دروازے سے باہر دیکھ کر جھنجلا کر بولا۔

"میں نے شمع سے بات کی تھی' اس نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ شمع کی تم سے محبت ڈھکی چھپی بات نہیں۔ تم اگر اس سے شادی کی ہامی بھرلو گے تو لے میری باتوں پر یقین آجائے گا۔ وہ ماروی کی اکلوتی با اعتماد دوست ہے' ہو سکتا ہے' شمع اسے میری طرف راغب کرنے پر آمادہ ہوجائے۔" عبداللہ سوچ میں پڑ گیا۔

☆ ☆ ☆

"قید الماء"

یہ تو ماروی (روح) بھی مٹی کے پتلے میں مقید مگر اس پتلے کی تو شان ہی عجیب کہ یہ مسجود ملائک گارے جیسی کھنکھناتی مٹی سے بننے والے پتلے کے اندر خیر ہی خیر تھا۔ جب تک شیطان نے حسد سے شر پھیلایا اس کے اندر پھر دو قوتیں کام کرنے لگیں خیر و شر کی۔

اور پھر' ماروی بے چاری اور پھوگ (شیطان) کے واہمے' وسوسے' ناامیدی' اور بھٹکانے کے جتن اور ان آلائشوں کے درمیان مجبور محض ماروی بار بار خودی اور انا کو کھو دینے کی فکر میں ماری ماری پھرتی۔

وہ کب سے بے کل تھی۔

"جز" کو چھوڑ کر "کل" میں فنا ہونے کو بے تاب

مگر وہ تو چھپ گیا۔ عہد لے کر' پھر اس گندگی بھری دنیا میں بھیج کر "اب مجھے ڈھونڈ۔ ندائے ملیر" عالم ارواح" کا عہد یاد پڑتا۔

"کہاں ڈھونڈوں؟ کہاں ڈھونڈوں؟" ماروی سرگرداں' حیران و پریشان' آلائشوں کے درمیان لرزتی جاتی۔

"اپنے اندر ڈھونڈ۔" لطیف الاپتا۔

"اپنی پہچان رکھ۔ خود کو پہچان جا۔" سچل سرمست پر عشق حقیقی کی مستی چڑھتی۔

"جان لے' اپنی روحانی طاقتوں کو۔ پھر دیکھ "اس ایک" کی معرفت مل جائے گی۔"

صوفی ستار بجتا۔ عشق کا ساز بلند ہوجاتا۔ ماروی جسم کی چنری اوڑھ کر ناچتی' بیابانوں میں ریگستانوں۔ کبھی عمر (نفس) کی پرستش سے بچا کر اپنی عصمت کی لوئی کی حفاظت کرتی اور کبھی پھوگ (شیطان) کے شر سے فرار ہوتی۔

ماروی کہاں آکر پھنس گئی۔

قید الما (تقدیر دانے پانی کی قید میں) جو ہونا تھا' اس ہونی کو لکھ کر قلم سوکھ گیا۔ اور اب بیچاری ماروی اس ہونی کے ہونے کا خوف دل میں پالتی اور پھوگ اس خوف کی بیل کو پانی دیتا۔

ماروی اندھا دھند اس قلم کی سیاہی کے راستے پر بھاگتی جاتی، عمر کوٹ کی بھول بھلیوں میں اس "یکتا" کو بھول بھول جاتی جو راستہ پکڑنا تھا وہ نہ ملتا۔

راستے کا ہی تو روگ تھا سائیں' ورنہ کون نہ مرجاتا اس زندگی میں راضی بہ رضا۔

راستہ ہی تو نہ ملتا۔ راستے ہی کی تو پہچان نہیں گم کر راہ کا پتا بھلا بیٹھی ادھر ادھر گم ہوتی رہی۔ ذات کو فنا کرتی' خودی کو مارتی انا کو دفناتی رہی۔ پتا ہی نہ چلا ماروی کو۔ یہ واہمہ ہے' یقین نہ تھا۔ رستہ ہے منزل نہ تھی۔ سرائے زندگی میں کیا کیا نہ صدمات تھے۔

بس لگتا جان گئی سو گئی۔

مگر نہیں گئی' نہیں گئی۔

ماروی کے قلب میں گونج ہوئی' بس جان ہی تو جانی ہے۔ اک بار ہی تو جانی ہے تو کیوں نہ قربان کر' اس ایک اللہ' ایک اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم پر۔

راستہ تو بھی بھائی دیتا۔ اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن پکڑ کر چلنے کا' اس کو پانے کا تو بس ایک رستہ تھا' ندا آئی۔

"میں ان کی شہہ رگ سے قریب ہوں۔"

☆ ☆ ☆

شمع کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔

"ہیلو' میں عبداللہ بات کر رہا ہوں۔"

"اوہ عبداللہ تم۔" اس کے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہوئی۔

"میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

مگر ابھی تو میں کراچی ہوں۔ آپ کو پتا ہے' میرا گھر وہیں ہے۔ جیسے ہی چھٹیاں ختم ہوتی ہیں میں آتی ہوں تو مل لیتے ہیں۔"

"کراچی کی درسگاہوں کو چھوڑ کر' سندھ یونیورسٹی میں پڑھنا کیا وجہ ہے؟"

"میرا ڈومیسائل کراچی کا نہیں' اس لیے۔"

"اوہ تو یعنی آپ بھی لسانی پابندی کا شکار ہوئیں۔"

"جی" "بالکل۔"

شمع اصل میں بات یہ ہے کہ میں اپنی امی کو آپ کے گھر رشتے کے لیے بھیجنا چاہتا ہوں' آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔"

شمع کو لگا اس کا دل ابھی سینے سے باہر کود جائے گا۔ وہ اس اچانک ملنے والی خوشی سے بے حال ہوئی جاتی تھی۔

"نہ...نہ' نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔"

"اور آپ کے گھر والوں کو؟"

عبداللہ! آپ کو پتا ہے' ہم آزاد خیال لوگ ہیں۔ ہمارے والدین کو ہمارے فیصلوں پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔"

"پھر کب بھیجوں؟" وہ اس کام میں کوئی تاخیر نہیں چاہتا تھا۔

"جب آپ کی مرضی۔"

"ٹھیک ہے' میں کل ہی امی کو بھیجتا ہوں۔" اس نے کہتے ہوئے فون بند کیا اور اپائنٹمنٹ لیٹر کو نئے سرے سے پڑھنے لگا۔ عمر سومرو ہنس دیا۔

"اس سیٹ پر بٹھایا ہے تمہیں' جہاں مال ہی مال ہے۔ فنانس ڈپارٹمنٹ میں آڈٹ آفیسر۔ مال بٹورنے والوں سے اپنا حصہ لو اور پرکھوں کی غربت سے جان چھڑاؤ۔" وہ تھا مستقبل کا سیاست دان سارے سیاسی گر جانتا تھا۔

"میرا کام ضرور یاد رکھنا۔"

"میں تمہاری محبت تمہیں دلانے میں ہر ممکن کوشش کروں گا۔" عبداللہ نے اس سے ہاتھ ملا کر عہد کیا اور اس کے ڈرائنگ روم سے باہر نکل آیا۔

"ماروی! تم مجھ سے بچ نہیں سکو گی۔ تمہاری دوری میری مجبوری کبھی نہیں بن سکے گی۔ میں تمہیں ہر

قیمت پر حاصل کروں گا۔ پاندھی (چرواہے) کی بیٹی! تم کیسے بھاگ سکتی ہو مجھ سے۔ ارباب عمر سومرو کو اتنا مجبور سمجھ لیا ہے کیا۔" وہ اضطراب سے ٹہلنے لگا۔

"سائیں! وہ شیرنی آخر کو ہرنی بن کر ہمارے سائیں کے دام میں پھنسے گی۔"

پھوگ نے ہمیشہ کی طرح اس کی ہمت بندھائی۔ اس کے دل کو ڈھارس ملی۔ اس نے شمع کا نمبر ملایا۔

"جی عمر صاحب!"

"میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اب آپ اپنا وعدہ وفا کریں۔"

"میری کوشش آپ کے ساتھ اور آپ کے حق میں ہو گی' مجھے جو خوشی آپ کے توسط سے ملی ہے' میں چاہوں گی وہ آپ کو بھی ملے۔" وہ خوشی سے شاد لہجے میں بولی۔

"مجھے آپ پر یقین ہے۔"

"میں کبھی بھی آپ کو دھوکا نہیں دوں گی۔ عمر سومرو صاحب' نہ ہی آپ کے اعتماد کو ٹھیس پہنچاؤں گی۔" اس نے فون بند کر دیا۔

☆ ☆ ☆

پھوگ اس کا کمدار اس کا بانہہ بیلی' اس کا نوکر' محرم راز اور ہر جرم میں شریک ساتھی تھا۔

بچپن سے لے کر جوانی تک اس کے ساتھ رہتا آیا تھا۔ پھوگ کا باپ اس کے باپ حاکم سومرو کا کمدار تھا اور پھوگ اپنے باپ کا جانشیں' وہ دونوں اپنے باپوں کے جانشیں' اکٹھے پلے بڑھے' مالک و نوکر کے حیثیت میں۔

مگر آگے چل کر پھوگ اس کی ذات کا لازمی جز بن گیا اس پر جان نچھاور اور ہر جائز ناجائز خواہش پر سر دھڑ کی بازی لگانا' پھوگ کی زندگی کا مقصد ٹھہرا۔

پھوگ یہ کیسے قبول کرتا کہ ماروی اس کے سائیں عمر سومرو کو انکار کر دے۔ ٹھکرا دے' نظر انداز کر دے۔ سو وہ جال پر جال بننے لگا' داؤ پر داؤ کھیلنے لگا۔ ہر طرز کے جال اس نے ماروی کے گرد پھیلا دیے۔

اس دن گاؤں میں پولیس بھیجنے کا شوشہ چھوڑ کر اس نے گاؤں والوں کو ہراساں کیا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ الیکشن سر پر ہے وہ ایسا بھول کر بھی نہیں کر سکتا تھا۔

مگر وہاں اک کٹنی اس نے چھوڑ رکھی تھی۔ جو ماروی اور اس کے رشتے داروں کو پھوگ کی حکمت عملی کے تحت پریشان اور دباؤ میں لے۔ گاؤں والوں کی معرفت۔ پھوگ اس دنیا میں شیطان کا روپ تھا اور ہر طرح کے شیطانی ہتھکنڈوں اور ہتھیاروں سے لیس۔

☆ ☆ ☆

ہاسٹل کے کمرے میں آتے ہی شمع اس سے لپٹ گئی۔

"اوہو! اتنا پیار کاہے کو۔" ماروی مزاحیہ انداز میں بولی۔

"یہ دیکھو۔" شمع نے اپنی انگلی اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔

ماروی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر غور سے دیکھا۔ "کوئی خاص بات ہے اس میں؟"

شمع نے ماروی کے استفسار پر لب بھینچ کر اثبات میں سر ہلایا۔ "یہ منگنی کی انگوٹھی ہے۔"

"اچھا کس سے کب ہوئی۔"

"عبداللہ سے' دو دن پہلے۔" شمع کے چہرے پر محبت ملنے کی خوشی نمایاں تھی۔

"بدتمیز! مجھے اب بتا رہی ہو۔" ماروی بگڑی۔

"سوچا' فون پر انگیجمنٹ رنگ دکھانے سے تو رہی۔ اس لیے دکھا کر' سامنے بٹھا کر بتاؤں گی۔" شمع ہنسی۔

"اچھا مبارک ہو۔ شکر تمہیں اپنی محبت ملی' مگر کیسے فتح کیا اسے آناً" فاناً"۔" ماروی اسے گلے لگا کر بولی۔ اس کی آخری بات پر شمع نے نادانستگی سے لب کاٹا۔

"محبت میں بڑی طاقت ہے' ماروی! فتح کر کے فتح پا جاتی ہے۔" وہ ہنسی۔

"دیکھنا' ایک دن عمر سومرو کی محبت بھی تمہیں فتح کر

لے گی۔" اس نے ملے ہوئے ٹاسک کا آغاز کیا۔

"دیکھو اس بند کر۔" ماروی ناراض ہوئی۔

"یار بات کرنے میں کیا حرج ہے۔"

"مجھے مذاق میں بھی یہ بات گوارا نہیں۔" اس کی ناراضی ہنوز برقرار تھی۔

"ایک بار سوچ کر تو دیکھو۔ آخر اتنا بڑا وڈیرہ' وزیر کا بیٹا' مستقبل کا وزیر' تمہاری محبت کا اسیر ہوا ہے۔" شمع نے پریکٹس کی ہوئی ساری باتیں دہرا دیں۔

"ان وڈیروں اور وزیروں کی محبت بھی الیکشن میں ووٹر سے کیے ہوئے وعدوں کی طرح ہی ہوتی ہے' جو کامیابی کے بعد ڈسٹ بن کی نذر ہو جاتے ہیں۔ سمجھیں تم۔" ماروی کا انداز ناصحانہ تھا۔

"ماروی! ایسی بات نہیں ہے یار۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ سارے وڈیرے ایک جیسے تھوڑی ہوں گے۔"

"جس بات کا تمہیں خود یقین نہیں' اس کا یقین مجھے دلانے کی کوشش کیوں کر رہی ہو۔"

"اف توبہ' باتوں میں تم سے کوئی نہیں جیت سکتا۔" شمع ہنسی۔

"اور تمہیں شرم آنی چاہیے۔ تم میری دوست ہو' عمر سومرو کی نہیں۔ تمہیں میری محبت کا احساس ہونا چاہیے۔ عمر سومرو کی انا پرست نام نہاد' خالی خولی محبت کا نہیں۔ تم اچھی طرح جانتی ہو میں بچپن سے کھیت سے منسوب ہوں اور ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کے ان مول دھاگے سے بندھے ہوئے ہیں۔"

ماروی نے اپنی کلائی میں بندھے دھاگے کو انگلی سے کلائی کے چوگرد پھرایا۔

شمع کے بات کرنے کے سارے راستے بند ہوئے۔ اس نے باقی کوشش بعد میں کرنے کا سوچا۔

"نام نہاد انا پرست' خالی خولی محبت' واہ ماروی کیا اصطلاحات ایجاد کی ہیں یار' تمہارا ابھی جواب نہیں۔" وہ اپنی خفت مٹانے کو ہنسنے لگی۔

اس کی ہنسی کا ساتھ ماروی کی جان دار خوب صورت مسکراہٹ نے دیا۔ اس کے گال میں پڑنے والا ڈمپل' بہت خوب صورت لگتا جو کہ مسکراہٹ پر کم اور ہنسنے پر اور زیادہ نمایاں ہو جاتا تھا۔

اور عمر سومرو اس ڈمپل پہ اپنا دل ہار گیا تھا۔ اس دل ہارنے سے پہلے وہ صرف اس سے دوستی کا خواہش مند تھا۔ اور پیسوں کے عوض خریدنے کا متمنی مگر اس کی بلند کرداری نے یہ باتیں ناممکن بنا دیں۔

وہ ماروی کو رکھیل بنانے کے ارادے سے بھی باز آ گیا۔ یہ تھا تو اس کے شان کے خلاف کہ اک شاہی وڈیرا ایک چرواہے' باندھی کی بیٹی سے شادی کرلے' مگر اس نے یہ گنجائش بھی نکالی اور اسے دوسرے درجے کی بیوی بنانے کی حیثیت پر خود کو راضی کیا۔ کیوں کہ نہ تو اس کی وڈیرانہ انا کی تسکین ہو رہی تھی اور نہ ہی آتش محبت ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ وہ دو آتشہ احساس میں گھر گیا۔ پھوگ اپنے تئیں ماروی کا رشتہ لینے گیا تھا۔ نہری آباد زمین کا لالچ اور پیسے' آسائشات کی طمع سب کچھ ہی تو ٹھکرا دیا باندھی نے۔

"ابا! ہماری نیانی بچپن سے منسوب ہے۔ ہم اپنی زبان کو جھوٹا کر کے اس نسبت کو دولت پر قربان نہیں کریں گے۔ تم عمر سومرو سائیں سے معذرت کر لو اور عمر سومرو سائیں' ہمارے علاقے کا چنگا مڑس (بڑا آدمی) ہے' وہ ضرور ان روایتوں سے آگاہ ہو گا۔ برا نہیں مانے گا اور اپنے دل کو بھی سمجھائے گا۔ باندھی کے اس جواب پر پھوگ نے شکر ادا کیا کہ عمر سومرو رشتہ مانگنے خود نہیں آیا۔

"چاچا! چنگا مڑس سمجھتے تو انکار نہ کرتے۔ تمہارے گھر تو لکشمی چل کر آئی ہے' خود ہی اپنے بھاگ کو لات مار رہے ہو۔" پھوگ اپنے غصے کو دباتے بولا۔

"ابا! ہمارا کیا بھاگ' کیا بھاگ؟ ہم مسکین لوگ روز جنگلی سبزیاں' میوے چن کر لاتے ہیں اور ہانڈی چڑھاتے ہیں۔ ہم نے تو کب کی طمع کو طلاق دے دی۔ دنیا دو دم' آج ہے کل نہیں' دنیاوی دولت پر اپنا ایمان نہیں بیچیں گے۔ بابا ہمیں معافی دو' خدا کا رن باندھی نے اپنے دونوں ہاتھ پھوگ کے آگے باندھتے کہا' پھوگ جز بز ہونے لگا۔

"چاچا! اب بھی وقت گیا نہیں، تم تسلی سے پھر اس رشتے پر سوچنا۔"

"ابا، میرا جو جواب آج ہے۔ وہ ہی کل بھی ہوگا۔ ہم مسکین ماروی ہیں۔ وڈیروں کی جوتی میں پیر نہیں ڈال سکتے ہماری جان بخشی کرو کہو تو میں پٹکا پگڑی اتار کر تمہارے پیروں میں ڈالوں۔" پاندھی اس کی تکرار سے عاجز آگیا۔

"نہیں نہیں چاچا! تو بڑا ہے تیری پگڑی کی۔ عزت کرتا ہوں۔" پھوگ نے آنے والے طیش کو حکمت عملی سے روکتے کہا۔

وہ اب بھی بات بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔

"پکی بیری پہ ہر کوئی ڈھیلے مارتا ہے۔ جس گھر لڑکی ہو وہاں رشتے تو آتے رہتے ہیں۔ تمہاری اپنی چیز ہے ہاں تو ہاں، نہیں تو نہیں تمہاری اپنی مرضی ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے اس کو ٹھنڈا کرنے کی خاطر بولا۔

☆ ☆ ☆

"اس کی ہمت تو دیکھو سائیں! اس نے آپ کی رشتہ داری سے انکار کیا۔ بدبخت کہیں کا۔" پھوگ کو رہ رہ کر پاندھی پر غصہ آرہا تھا۔

"اس کی ہمت پر میں خود حیران و پریشان ہوں۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں۔" عمر سومرو الجھ گیا۔

"سائیں! اس نے آپ جیسے بادشاہ زادے پر اس ببول کے درخت کے نیچے چار بچوں کو پڑھانے والے کھیت کو ترجیح دی ہے، کہاں دو ٹکے کا کھیت کہاں آپ۔" پھوگ اپنے ازلی کام میں مشغول تھا۔

"پاندھی نے میرے لیے انکار کیا ہے، میرے لیے۔" عمر سومرو اپنے سینے انگلی مارتے بولا "ہم اسے عزت دے رہے تھے۔ اپنا رشتے دار بنانا چاہ رہے تھے، مگر اس نے گھمنڈ کیا ہے، اب اس کو یہ گھمنڈ بہت مہنگا پڑے گا۔" اس نے میز پر لات ماری۔

"ہاں سائیں بھگتے گا، وہ بھگتے گا۔" پھوگ اثبات میں سر ہلا کر بولا۔

"ارے ہم کسی کو رکھیل بنا کے رکھیں تو بھی بڑی بات ہے۔ اس کے گھر والے ہماری جوتیاں چاٹتے ہیں۔ ہم ان کا مقدر بدل دیتے ہیں۔"

"ہاں سائیں یہی بات ہے یہی حقیقت ہے۔" پھوگ کو یاد آیا اس کی پھپھی بھی حاکم سومرو کی رکھیل بن کر مر چکی ہے اور ان کے پاس یہ دولت اور یہ کم داری اس کے مرہون منت ہے۔

"سائیں شکر ہے کہ بڑے بھوتار سائیں کو خبر نہیں۔ وہ پاندھی کو تو چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دیتے مگر ہمیں بھی نہیں چھوڑتے مجھے تو الٹا لٹکا دیتے۔" پھوگ یہ سوچتے ہی کانپ اٹھا۔

"فکر نہ کر۔ بڑے سائیں کو پتا نہیں چلے گا۔" اس نے ڈھارس بندھائی۔

"میں اب دیکھتا ہوں شمع اور عبداللہ کتنا ساتھ دیتے ہیں۔" شمع کا یاد آتے ہی اس نے نمبر ملایا۔

"اور بتاؤ شمع بھابی! میرا مشن کہاں تک پہنچا۔"

"عمر بھائی! اس کاٹھ کی الو میں پتھر کا دل ہے۔ پگھلتا ہی نہیں مگر میں بھی وقتاً" فوقتاً" آپ کے ذکر سے اسے چھیڑتی رہتی ہوں کہ شاید آپ کا نام اور محبت سنتے سنتے اس کی دل میں بھی نرم گوشہ پیدا ہو جائے۔ وہ تو آپ نے سنا ہوگا کہ پتھر پر بھی اگر قطرہ ٹپکتا رہے، تو بالآخر سوراخ بن جاتا ہے۔"

"اس سوراخ بننے تک ہمارا دل ہی نہ برباد ہو جائے۔" عمر سومرو ہنستے ہوئے ہنسا۔

"اللہ نہ کرے۔ آپ کی محبت سچی ہوگی تو بالآخر جیت ہی جائے گی۔" شمع نے آسرا دیا۔ اس نے شمع سے دوسرے دن کی منصوبہ بندی پر بات کرکے فون بند کردیا۔

"اس کو اگر غرور ہے تو وہ خاک میں ملانا ہے۔ گھمنڈ توڑنا ہے۔ اسے روندنا کون سا مشکل کام تھا، مگر اس کی وڈیرانہ انا کی تسکین اس میں تھی کہ وہ خود نیچ بن کر اس کی طرف مائل ہو۔ وہ اسے محب بن کر نہیں محبوب بن کر تسخیر کرنا چاہتا تھا اور یہی اس کی بھول تھی کہ اس کے آگے بھی ماروی تھی۔ وہ ماروی جسے لوئی لج بچانا آتی

تھی جسے اگر تسخیر کر سکتی تھی تو وہ سچی محبت تھی دنیا کی لالچ اور فریب نہیں نا ہی شاہانہ ٹھاٹھ باٹ۔

☆ ☆ ☆ ☆

وہ دونوں کلاس روم سے باہر نکلیں۔

"یار! بھوک لگی ہے۔ ذرا کینٹین تک چلو میرے ساتھ۔" ماروی' شمع کی بات پر ہنسی اسے تھریوں کا کم کھانا یاد آیا۔

"تم کھاتے پیتے لوگوں کی بھوک کبھی ختم نہیں ہوتی۔ جب دیکھو تمہیں بھوک ستاتی رہتی ہے۔"

"تم تو ماروی لوہے کی بنی ہو' یا کاٹھ کی میرے خیال میں پتھر کی بنی ہوئی ہو۔ تب ہی تو سنگ دل ہو ذرا رحم نہیں آتا عمر سومرو پر۔"

"ہر بات میں عمر سومرو کی مثال لانا کہاں کی دانش مندی ہے' یہی تو خرابی ہے تم مادیت پرستوں کی ذرا عمدہ دیکھا "دولت" دیکھی وہاں پر ستش شروع۔" ماروی کے لہجے میں تاسف در آیا۔

"یار! ہم لوگ ایسے بھی گئے گزرے نہیں' ہم زندگی کی دوڑ میں کامیاب لوگ ہیں۔ محبت بھی کر ہی لیتے ہیں۔" شمع نے جان بوجھ کر عمر سومرو کے ذکر سے گریز کیا۔ تا' ماروی اس پر شک نہ کر سکے۔

ماروی اس کے انداز پر ہنس پڑی۔

"ہاں محبت بھی کر ہی لیتے ہیں۔ ذرا محبوب کی بات بری لگی گالیاں شروع' ذرا سی بے توجہی پر محبت سے دست بردار۔ در در پر دل پھینکنے والے۔" اس نے اپنی دوسری روم میٹ کی مثال دی۔

"دیکھو ماروی! ایک بات تو تمہیں ماننے پڑے گی۔" وہ کینٹین کی طرف چلتے ہوئے پھولی ہوئی سانس سے بولی۔

"ہم ہیں ترقی یافتہ لوگ' بے کار چیزوں کو پیروں کی زنجیر نہیں بناتے اور آگے بڑھتے ہوئے خلاؤں کے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں' دیہاتیوں کی طرح سست نہیں۔" شمع نے اپنی بات میں وزن پیدا کیا۔ ماروی نے ہنستے ہوئے اسے دیکھا اور اپنے مخصوص بے باک لہجے میں بولی۔

"ہاں سارے شرفا اور ان کے کل پرزے خلاؤں میں ہی رہتے ہیں۔ نہ زمین پر دیکھتے ہیں نہ ہی زمین کے مسکین ماروؤان کی نظر میں اپنے جیسے انسان ہیں۔ وہ تو کیڑے مکوڑے ہیں۔ ساری نعمتیں ساری آسائشات ان کے لیے ہیں۔ یہ گداگر شرفا جن کا کاسہ بیرون ملک امداد سے پُر ہو کر ان کے پیٹوں میں چلا جاتا ہے' پورے کا پورا ملک ہڑپ کرنے والے کیا جانیں کہ بھوک کیا ہوتی ہے' غربت و عسرت کیا ہوتی ہے۔"

"ایسی بات نہیں ماروی! ہم لوگ غریبوں کا بھی بہت خیال رکھتے ہیں' ہر ممکن مدد کرتے ہیں' بیرون ملک ایڈ کی بات شمع کے دل پہ لگی تھی۔

"بھرے پیٹ والے کیا جانیں' بھوک کاٹنے والوں کا درد۔" ماروی کی آواز کینٹین کے شور میں گم ہوئی "میڈیکل سائنس نے اتنی ترقی کرلی مگر تھر میں زچہ و بچہ کے لیے حکومت اور این جی اوز کے پاس کوئی پروگرام نہیں۔ نہ ڈراپس نہ انجکشن' نہ گولیاں نہ ہی سپلیمنٹ' جو زچہ و بچہ کی قوت مدافعت کو بڑھا سکے۔ اور شرح اموات پر قابو پایا جائے۔ مگر کیوں کریں گے وہ ایسا' ان کے ہاں تو صرف فوڈ پروگرام ہے۔ تاکہ گندم میں ریت بھر کے وہ اپنے پیٹ کے ایندھن کا انتظام کر سکیں' اربوں روپیہ فوڈ پروگرام کی نذر ہو جاتا ہے مگر تھریوں کی بھوک و غربت ویسی ہی رہتی ہے۔" شمع اس کی ہربات پر سر ہلا کر تائید کر رہی تھی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو ماروی! یہاں اگر کرپشن نہ ہو تو یقیناً" ان اربوں روپے سے بہترین فوڈ پروگرام چل سکتا ہے۔ ویسے تمہاری یہ ماں اور بچہ کے سپلیمنٹ وغیرہ والی تجویز قابل غور ہے۔ میں ضرور پاپا سے ڈسکس کروں گی۔" وہ برگر کھاتے ہوئے بولی۔

"اس لیے شمع کہ یہاں گندم اگر مل بھی جائے تو وہ پورے گھرانے کی کفالت کرتی ہے۔ ماں اور بچے کو تو مکمل خوراک چاہیے۔ ان کے لیے یہ فوڈ پروگرام بے کار اور نامکمل ہے۔ ان کے لیے الگ سے پروگرام ہو

جو صرف ماں اور بچے کے لیے ہو۔"
"السلام علیکم۔" عمر سومرو کے سلام پر ماروی کو اپنی بات ادھوری چھوڑنی پڑی۔
"وعلیکم السلام ارے عمر سومرو صاحب' آپ ٹھیک وقت پر پہنچے' اصل میں ہم آپ کے تھر کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ آپ لوگ تو بااختیار ہیں تھر میں ماں اور بچے کے لیے کوئی خاص اسپیشل فوڈ پروگرام کیوں نہیں بناتے' ماروی کے پاس اتنی بہترین تجاویز ہیں۔" شمع پرجوش ہو کر بولی۔
ماروی اس کی بات پر طنزیہ ہنسی۔
عمر سومرو اسے اس کے سلام کے جواب نہ دینے پر جزبز ہوا۔
"ضرور' ضرور اگر ماروی کے پاس اچھی تجاویز ہیں تو میں اپنے بابا سائیں کے سامنے رکھوں گا۔" عمر سومرو' ماروی کو دیکھتے ہوئے بولا۔
"شمع! تم بھی نا بھول سے میرا مانگ رہی ہو۔ جو کانٹے دیتا ہے وہ پھل نہیں دیتا۔" ماروی نے ایک لمحے کو بھی اس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔
"ماروی! بھول اگر انسانوں کو بیر نہیں دیتا تو بکریوں کو رزق ضرور دیتا ہے۔" عمر سومرو دونوں ہاتھ ٹیبل پر رکھتے جھک کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے بولا۔
ماروی کو عمر سومرو کے اس حاسیانہ انداز پر غصہ آیا۔
"آپ خواص نے عوام کو انسان سمجھا ہی کب ہے۔ بھیڑ بکریاں ہی تو سمجھا ہے۔" ماروی دوسری طرف دیکھتے بولی۔
"ہم آپ کو خواص میں جگہ دیں گے۔ خاص الخاص بنا دیں گے۔ آپ نگاہ تو ملایے۔" عمر سومرو کی سرگوشی اس کے کانوں کے قریب ابھری۔ وہ اس کے اتنے قریب منہ لایا تھا کہ اس کے منہ سے اٹھنے والی بو سے اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ ماروی کا پورا جسم جیسے جل اٹھا ہو۔
"مجھے نفرت ہے آپ جیسے لوگوں سے۔" اس کی آواز میں غصے اور نفرت کی لرزش نمایاں تھی۔

"جب رانی بنا کر رکھوں گا' دنیا کی ہر خوشی تمہارے قدموں میں ہوگی۔ تو یہ نفرت خود بخود محبت میں بدل جائے گی۔"
ماروی آپ سے تم پر آنے پر اور زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش سے۔ تپ اٹھی۔
"کتنی رانیاں ہوتی ہیں۔ تمہاری حویلیوں میں اور کتنی کنیزیں؟ میں اچھی طرح سے جانتی ہوں' یہ جھانسہ کسی اور کو دینا۔" وہ کہتے ہوئے غصے سے اٹھی' عمر سومرو نے اسے روکنے کو اس کا ہاتھ پکڑا۔
"رکو ارے رکو۔" وہ مخمور لہجے میں بولا۔
کینٹین میں سارے لڑکے لڑکیاں ان کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔
سرگوشیاں' سیٹیاں' اوہو' دبی دبی ہنسی کی مختلف آوازوں نے اسے غیرت کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا۔
"ہاتھ چھوڑو' میرا خبیث انسان۔" وہ چیخی۔
"نہیں نہیں' اتنے لوگوں کے سامنے پکڑا ہے تو چھوڑنے کے لیے تو نہیں۔" وہ اپنی وڈیرانہ ہٹ دھرمی سے بولا۔
ماروی جو دوسرے ہاتھ سے اپنی چیزیں سنبھالے ہوئی تھی' اس نے ہاتھ کو آزاد کیا اور پوری طاقت سے اس کے منہ پر جڑ دیا۔ عمر سومرو نشے میں لڑکھڑا گیا۔ ماروی کا ہاتھ خود بخود اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ماروی دونوں ہاتھوں سے اپنی چیزیں سنبھالتی ہوئی۔ تیزی سے کینٹین سے باہر نکل گئی۔
عمر سومرو جس کو توقع کے خلاف تھپڑ پڑا تھا' وہ چند لمحے تک پورے مجمع کے ساتھ سکتے میں آ گیا تھا۔ اضطراری طور پر اپنا ایک ہاتھ گال پہ رکھتے چیخا۔
"نہیں چھوڑوں گا منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔ تم نے چٹان سے سر ٹکرایا ہے۔ پاش پاش ہو جاؤ گی۔" اس دھمکی نے دروازے تک ماروی کا پیچھا کیا تھا۔
سب لوگوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ شمع اس بائری کی طرح پریشان بیٹھی تھی۔ جس کے نہ چاہتے ہوئے بھی ڈائریکٹر نے ناز بہا سین ڈرامے میں ڈال دیا

ہو۔

عمر سومرو کا غصہ انتہا پر پہنچ رہا تھا وہ پچھتا رہا تھا کہ بھوگ کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لایا' ورنہ اس کا ڈراپ سین یہیں کر دیتا۔

☼ ☼ ☼

عمر سومرو جس کی دھاک سندھ یونیورسٹی میں ہی نہیں' اس کے پڑوس میں لمز اور مہران یونیورسٹی پر بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ جو لڑکیوں کے درمیان راجہ اندر بنا رہتا اور دوستوں کو نوازنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اس کے دوستوں کا حلقہ تینوں درس گاہوں میں پھیلا ہوا تھا۔ بہت سارے لوگ اس سے اپنا کام نکلوانے اور کنٹس بٹورنے کے لیے اس سے چمٹے ہوئے تھے اور بہت سارے لوگ صرف دوسرے لوگوں پر اپنی دھاک بٹھانے کے لیے کہ عمر سومرو ان کا دوست ہے اس کے گروپ میں شامل رہتے تھے۔

شاید ہی کوئی لڑکی ہو' جس کی طرف اس نے نگاہ اٹھائی ہو اور وہ اس کے دام میں پھنسنے سے بچی ہو۔ یونیورسٹی میں اس کا آنا صرف پڑھائی یا ڈگری کے لیے نہیں تھا۔ یونیورسٹی کا چکر لگانا اس کے دل کا بہلاوا تھا۔

پہلی بار اسے کسی باکردار لڑکی سے پالا پڑا تھا اور وہ بھی غریب' ورنہ عمر سومرو غریب لڑکیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ وہ اس کے مرتبے سے میل نہیں کھاتی تھی اور علاقے کی لڑکی کوئی غریب مگر حسین ہوتی تو وہ کسی نہ کسی بہانے اس کے اوطاق میں پہنچا دی جاتی۔ اس ضدی' خود سر انا پرست' عمر سومرو کے ساتھ یہ کیسا حادثہ ہوا کہ وہ اک غریب اور اپنے ہی علاقے کی لڑکی کے سامنے اپنا آپ ہار گیا۔

وہ طوفان جو اس کے دل میں پل رہا تھا وہ آندھی بن گیا۔ وہ پورا دن کمرہ بند کر کے نشے میں بے سدھ پڑا رہا۔ رات گئے اس کا نشہ ٹوٹا اور کینٹین کا واقعہ اک بار پھر ذہن کی اسکرین پر چلنے لگا۔ اتنی ذلت' اتنی رسوائی' اتنی بے عزتی اس نے پوری زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔

طلباء کی معنی خیز مسکراہٹیں جلتی پر تیل کا کام کر رہی تھیں۔ اب کس منہ سے یونیورسٹی جاؤں گا۔

"بابا سائیں دل پر بات نہ لیں' کبھی کبھی ایسی سر پھری لڑکیاں نصیب میں لگ جاتی ہیں۔" بھوگ ڈھارس بندھاتا۔

"بھوگ۔" وہ روہانسا ہوتا۔

"حاضر سرکار۔" بھوگ مستعدی سے ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا۔

"جو خود چل کر آئے' وہ بے مول ہو جاتی ہے۔ جو بکتی نہیں اس کے مول بڑھ جاتے ہیں اور جو دونوں صورتوں میں نہ آئے وہ ان مول ہو جاتی ہے۔" وہ مسلسل پی رہا تھا۔ بھوگ نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے خالی گلاس لیا۔

"بابا سائیں' دکھ نہ کر' آپ کا دکھی ہونا ہم سے دیکھا نہیں جاتا۔"

"بھوگ پٹی نہ پڑھا' کوئی تدبیر کر اس کو چکر میں لانے کی۔" اب کی بار عمر سومرو نے سگریٹ جلالی۔ اس کے دھوئیں میں وہ خود کو چھپا لینا چاہتا تھا۔ کیوں کہ اس کا دل دھواں بن گیا تھا۔

"کوئی لڑکی ہمارے سرکار کے لیے ان مول نہیں ہو سکتی' یہ ماروی بھی بے مول ہو جائے گی۔ بس اس کے لیے مکڑی کا جالا بنانا پڑے گا اور لومڑی کی چال چلنی پڑے گی۔" بھوگ نے کہتے ہوئے اس کے پیر دبانے شروع کر دیے تھے۔

میں ماروی ہوں' مجھے اپنی عصمت بچانا آتی ہے۔ یہ دعوا اس کے گلے کی پھانس بن گیا۔ اس اکیسویں صدی میں اس نے صدیوں کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ اس کا کردار بھی کیا کردار تھا۔ جو صدیوں پہلے بنا صدیوں بعد بھٹائی نے گا کر امر کیا اور صدیوں سے گایا جا رہا ہے۔ وہی کردار نئے روپ میں موجود تھا۔ اور اس کردار کا امتحان بھی۔

ہاتھ تو کبھی اس کا کھیت نے بھی نہیں پکڑا تھا۔ منگنی کے بعد وہ حیا کے رشتے میں بندھ گئے چھونے کی اجازت نہ ان کا معاشرہ دیتا تھا نہ دین اور نا ہی حیا' حیا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

کے تقاضے نبھانا جانتے ہیں۔ وہ لوگ بے حیا نہیں تھے۔ مارو لوگ اپنی زندگی میں خوش' وہ اپنے پورے علاقے کی پہلی لڑکی تھی جو پڑھ رہی تھی اور یونیورسٹی کی سطح تک پہنچی تھی' یہ سب چاچا سائیں باندھی اور کھیت کی مرہون منت تھا۔ وہ اس کے شوق کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے ورنہ اگر کھیت سے نسبت نہ ہوتی تو کب کی اس کی شادی ہو چکی ہوتی اور وہ بھی ہزاروں عورتوں کی طرح اجڑی گود لیے رو رہی ہوتی۔

اور اس کھیت کی محبت کی راہ میں بادشاہی آرہی تھی۔ محبت ہمیشہ جیت جاتی ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کھیت کی محبت پر وہ عمر سومرو کی بادشاہی کو فوقیت دے' اس کا کھیت تو کھیت تھا۔ سینکڑوں عمر سومرو اس کے کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ کھیت کی تھی مگر اس کی نگاہ میں' عمل میں' ہمیشہ احترام جھلکتا تھا۔

یہاں آنے کے بعد یہ پہلی بار ہوا تھا کہ اس نے کھیت کی کال اٹینڈ نہ کی' میسجز کا کوئی جواب نہ دیا۔

ماروی خود کو مجرم سمجھنے لگتی' اس کا ہاتھ جلنے لگتا۔ عمر سومرو کی بے حیائی' ڈھٹائی اور ہوس بھری نگاہیں اس کی برداشت سے باہر تھیں۔ یہ تضحیک تھی۔ کیچڑ تھی اس کی ذات پر اور وہاں موجود لوگوں کی نگاہیں مسکراہٹیں جواب رہ رہ کر اسے یاد آرہی تھیں۔ وہ تماشا نہ ہوتے بھی تماشا بنادی گئی اس وقت اسے سخت طیش آرہا تھا۔ تھپڑ کیا وہ اسے قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ عمر سومرو نے اس کی عزت پر حملہ کیا تھا۔

تو ماروی تم پر بھی امتحان آہی گیا۔

اس نے چنری کے پلو سے آنسو پونچھے اور ایک ہمت سے کھڑی ہو گئی۔ ثابت قدم رہنے کے عزم کے ساتھ۔

تم کیا سمجھتے ہو عمر سومرو! میں تمہاری دولت' امارت پر فدا ہو جاؤں گی' ہرگز نہیں میری دولت میرے مارو (مسکین لوگ) ہیں میری امارت میری محبت ہے۔ میں اپنی وفا اور عزت پر کبھی بھی آنچ آنے نہیں دوں گی۔ میں ماروی ہوں' جو صدیوں سے اپنی حمیت' غیرت اور عزت کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ صدیوں کا سفر جو میں نے طے کیا ہے اور میں تھکی نہیں ہوں۔ ابھی تک باہمت ہوں۔ ہر باکردار لڑکی کے روپ میں جو اپنی عزت پر جان نثار کر دیتی ہے۔ میں وہ ماروی ہوں۔" اس کا عزم آسمان کی بلندیوں تک پہنچا۔

☆ ☆ ☆

ان دوستوں کا بلاوا آگیا عمر سومرو کے ڈرائنگ روم میں وہ نئے سرے سے پلاننگ کرنے لگے۔ عبداللہ اور شمع سر پکڑے بیٹھے تھے۔ ساری کہانی الٹ ہو گئی۔ رائٹر کے ہاتھ سے نکل گئی اور اپنا آپ بننے لگی۔

منظر نامہ بدل چکا تھا۔ ڈائریکٹر نے سین غلط ڈال دیا۔ جو کردار ماروی کی نظر میں بلند کر کے دکھانا تھا۔ وہ گرا پڑا تھا۔ لوز کریکٹر' عمر نے اپنی مرضی کا سین ڈال کر اسکرپٹ کمزور کر دیا۔ وہ ہیرو سے ولن بن گیا۔ سارا کھیل بگڑ گیا۔

عبداللہ کی ساری پلاننگ کو عمر سومرو کی ہاتھ پکڑنے کی غلطی نگل گئی۔

"اسے کہو' وہ مجھ سے معافی مانگے' ان سب کے سامنے جن کے سامنے تھپڑ مارا تھا۔ اس کے بعد خاموشی سے میرا ساتھ دے' میں اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

وہ ٹہلتے ہوئے بولا۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی بہت مضطرب ہوتا تو تیزی سے ادھر ادھر چلتا' اور غصہ بڑھنے کے ساتھ اس کے چلنے میں تیزی آجاتی۔

"اگر وہ نہ مانے تو؟" عبداللہ بولا۔

"تو بھی کیا۔" عمر سومرو استہزائیہ ہنسا۔ "میں اسے قید کرلوں گا۔ کسی چڑیا کی ہمت کہ میرے سامنے پر مارے۔" اس نے زور سے مٹھی بھینچی "عمر سومرو کوئی خواہش کرے اور وہ پوری نہ ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ میں کبھی بھی اس سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔ تم لوگ ڈیل کے تحت اسے راضی کرو۔ دوست بن کر سمجھاؤ۔ ڈراؤ' دھمکاؤ پھر بھی راضی نہیں ہوتی تو میرے پاس دوسرا آپشن موجود ہے۔"

عمر سومرو نے اک بار میز پر مکا مارا۔ اک بار لات ماری اور مٹھیاں بھینچ لیں۔ عبداللہ اور شمع کو احساس ہوا کہ انہوں نے ڈیل کر کے کس سر پھرے سے سر ٹکرایا ہے۔ جو انسان کو انسان نہیں سمجھتا' جس کے سامنے اپنی خواہش ہر طرح سے مقدم ہے۔ اور چاہے سندھ ہو بھیا سوکھے' ترسے یا برباد ہو اسے کسی بات سے سروکار نہیں۔

☆ ☆ ☆

"تم عمر سومرو سے نہیں ٹکرا سکتیں۔ نہیں لڑ سکتیں' وہ بہت طاقت ور ہے۔ ماروی! خدا کے لیے اس سے معافی مانگ لو۔ یہ دیکھو میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" شمع کتنی دیر سے اس کی منتیں کیے جارہی تھی۔

"ہرگز نہیں' کسی قیمت پر نہیں۔" وہ نفی میں سر کو جنبش دیتے بولی۔

"معافی مانگنی ہی ہے' تو عمر سومرو کو مجھ سے مانگنی پڑے گی۔ پہلے وہ مجھ سے ہاتھ پکڑنے کی معافی مانگے۔ میرا تھپڑ اس کے ہاتھ پکڑنے سے ہلکا ہے' اس کا ہاتھ پکڑنا بہت بھاری بوجھ ہے۔" ماروی کے لہجے میں نفرت نمایاں تھی۔

"ماروی! تم کیوں نہیں سمجھتیں' یہاں ہاتھ پکڑنا اک عام بات ہے۔ یار یہ اتنا بڑا ایشو نہیں۔" شمع جل جاتی۔

"تم لوگ شخصی آزادی کے اتنے قائل اور عورتوں کے حقوق کے داعی۔ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ یہ فزیکلی ہراسمنٹ اور شخصی آزادی کی کھلی خلاف ورزی ہے' کسی عورت کا ہاتھ پکڑنا اس کی مرضی اور منشا کے خلاف۔"

"تم بے وقوف ہو' کھیت تمہیں کیا دے سکتا ہے' جب کہ عمر سومرو اتنا بڑا آدمی تم سے شادی کے لیے تیار ہے۔"

"کھیت مجھے وہ دے سکتا ہے۔ جو عمر سومرو نہیں دے سکتا۔ میں اس کی ضد ہوں' محبت نہیں۔ اس لیے وہ وڈیرانہ ہٹ دھرمی سے باز نہیں آرہا۔ کھیت مجھے احترام' محبت' وفا اور سب سے بڑھ کر سکون دے سکتا ہے۔ یہ ساری باتیں عمر سومرو میں ناپید ہیں۔"

"پاگل ہو تم یار! آج کل ایسی چیزوں کو کون پوچھتا ہے۔ عقل سے پیدل ہو بالکل' وہاں آسائشات کا جہان ہے۔ خوشیاں ہی خوشیاں' جس طرف نگاہ اٹھاؤ خرید لو' رسائی ہی رسائی۔ نارسائی کبھی قریب نہیں آتی۔" شمع نے ہر ممکن اپنی بات میں وزن پیدا کیا۔

"اچھا' ایسی دولت سے وہ میرا دل تو خرید کر دکھا دے؟ شمع! خواہشات کی اندھی پٹی باندھ کر مت چلو' انسانیت کے لیے جیو' یہ سب خاک ہے' خاک میں مل جائے گا ایک دن اچانک ایک جھٹکے سے زندگی رک جائے گی اور آنکھیں بند' سب کچھ ختم۔ پھر اس کے سامنے پیشی ہوگی' جواب دہی ہوگی۔ انسان کیا جواب دے گا۔ دولت کے لیے دین بیچ دیا۔ خواہشات کے لیے ایمان بیچ دیا۔ اس کو بھلا دیا؟ دنیا کی رنگینی میں کھو کر ماروؤں (اپنے دیس کے لوگوں) کی محبت' والدین کی اطاعت سب کچھ قربان کر دیا۔" ماروی دلیل پر دلیل دے رہی تھی۔

"افوہ ماروی! تم بات کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہو۔ جیتی جاگتی ہستی کو فوراً "خاک میں ملا دیتی ہو۔" شمع نے مارنے والے انداز میں سر پر ہاتھ رکھا۔

"یہی حقیقت ہے' باقی سب فسانہ۔ انسان بے وقوف ہے جو ساری عمر اس سے بھاگتا رہتا ہے۔" ماروی نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"موت کا رقص میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ آج کل تھر کے قحط زدہ بچے نگلنا موت کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔" ماروی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "شمع تم کیا جانو! اجڑی گود' خالی جھولی کا درد' تم چاہو تو بھی محسوس نہیں کر سکتی' کے ایف سی' میکڈونلڈ' پزا ہٹ پر ہر قسم کے طعام تناول کرنے والے' تھریوں کی بھوک محسوس نہیں کر سکتے کہ وہ کیسے جنگل کے پتے کھا کر گزارہ کرتے ہیں۔ کمزور پیدا ہونے والے بچے جب بھوک سے بلکتے ہیں تو ماؤں کی چھاتیوں میں دودھ

نہیں ہوتا۔ وہ بلکتے بلکتے مرجاتے ہیں۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ شمع خاموش ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا جواب دے' کیسے دلاسا دے۔

"میں نے دیکھا ہے سکھاں کا درد' جس کا بیٹا بھوک سے بلکتے مرا' میں نے وعدہ کیا ہے اس سے کہ جب تم دوسرا بچہ پیدا کرو گی میں اس وقت تھر کے لیے اک این جی او بنا کر ماں اور بچے کی خوراک کا پروگرام شروع کر دوں گی۔ تمہیں اور تمہارے ہونے والے بچے کو خوراک اور دوائیں ملتی رہیں گی۔ یہ میرا اس سے وعدہ ہے' عہد ہے' اور تم کہتی ہو' میں سب وعدے توڑ کر' سارے عہد چھوڑ کر اس ظالم وڈیرے سے شادی کر لوں۔" ماروی کے لہجے سے نفرت کی چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔

"ماروی' وہ وڈیرہ ہے۔ وزیر کا بیٹا ہے۔ اس سے شادی کر کے تم بہتر پوزیشن میں آجاؤ گی' اپنے ماروؤں کے لیے کام کرنے کا بہترین پلیٹ فارم مہیا ہو جائے گا بہت بڑے پیمانے پر کام کر سکو گی۔" شمع بات کو گھما پھرا کر پھر اسی پوزیشن میں لے آئی۔

"ان سے بھلائی کی توقع رکھنا عبث ہے۔" ماروی اٹھ کر کھڑکی میں آگئی۔ اس ذکر سے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ ہوا کے تازہ جھونکے نے اسے آکسیجن پہنچائی۔ اس نے گہری سانس لی۔

"یہ وڈیرے' جو تھریوں کو امداد میں ملنے والی گندم بھی کھا جاتے ہیں۔ جو ہمارا خون پی کر پلے ہیں' جنہوں نے غریبوں کا ماس کھا لیا ہے۔ اس سسٹم کا ایک فرد مجھے غریبوں کے لیے کام کرنے دے گا۔ یہ بھول ہے تمہاری' وہ میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر' داشتہ بنا کر رکھے گا' تم کیا جانو؟ تمہارا کون سا پالا پڑا ہے۔ ان ظالم انسانوں سے۔ مجھے نفرت ہے ان ظالموں سے جو طاقت اور اختیار رکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں کرتے۔ صرف ووٹ مانگنے آتے ہیں۔ وہ بھی ڈرا دھمکا کر لے جاتے ہیں۔ پھر پلٹ کر ایک بار بھی نہیں پوچھتے کہ مرے یا جیے ان کی بلا سے۔" ماروی کے انگ انگ سے نفرت پھوٹ کر نکلی۔ پہلی بار شمع کو احساس ہوا کہ وہ پتھر سے سر ٹکرا رہی ہے۔ برف پگھلتی ہی نہ تھی۔ وہ سخت مایوس ہو گئی۔

"سوری یار! تم میری باتوں سے دکھی ہوئیں' میں تو تمہارا بھلا چاہتی تھی۔ تب ہی اصرار کر رہی تھی۔" شمع نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی پشت تھپکی' اپنی صفائی دینے لگی۔ مبادا وہ اس پر شک نہ کرنے لگے۔

ماروی کے دل پر اس کے خلاف شک کی چھائی گرد فوراً" صاف ہو گئی۔

وہ ایسی ہی تھی۔ صاف دل' جو جیسا نظر آتا ہے' ویسا ہی سمجھنے کی عادی' ماروی جو تھی۔

☼ ☼ ☼

ماروی کی ماں نے جب سے سنا کہ عمر سومرو نے اس کا رشتہ مانگا ہے تو خوف سانپ کی طرح کنڈلی مار کر اس کے دل میں بیٹھ گیا۔ وہ ساری ساری رات دھرتی کے داتا کو پکارتی ماروی کی حفاظت کی دعائیں مانگتی رہی' پاندھی کہتا۔

"ارے بھاگوں بھری کیوں ڈرتی ہے۔ اللہ پہ بھروسہ رکھ غریبوں کا اللہ وارث ہے۔ وہ میری دھی کو اپنی پناہ میں رکھے گا۔"

مگر وہ ماں تھی اس کا دل پتے کی طرح لرزتا رہتا۔ وہ کھیت کی منتیں کرتی۔

"ابا کھیت جا ماروی کو لے آ واپس' وہ اس کے ساتھ پڑھتا ہے۔ پتا نہیں کیا کرے گا۔"

"چاچی! خطرہ تو اسے یہاں ہے' وہاں نہیں۔ وہاں تو وہ ایک جگہ بیٹھی ہے۔ ہاسٹل کے اندر کوئی نہیں گھس سکتا۔ کوئی اس کا نام بھی نہیں لے سکتا۔ تو پریشان نہ ہو' اللہ پہ بھروسا رکھ اللہ چنگی کرے گا۔" وہ ڈھارس بندھاتا اس کے چولہے میں لکڑیاں ڈالتا جاتا۔

"ابا! میں خوف سے مر جاؤں گی۔ میرا دل سینے سے باہر نکل آتا ہے۔ جب ماروی کا سوچتی ہوں' جسم لرزنے لگتا ہے گھر کا کام نہیں ہوتا مجھ سے۔" بھاگی نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

پاندھی موڑھے پر بیٹھا 'بیٹا کھیت کا شانہ تھپکتا "ابا یہ بھلی مانس سمجھتی نہیں وہم بیٹھ گیا اس کی روح میں۔ ماروی کی کھیت سے شادی ہوگی۔ سارا دیس دیکھے گا 'میری دھی کی دھوم دھام سے شادی ہوگی کیوں فکر کرتی ہے 'انہوں نے رشتہ مانگا 'ہم نے نہیں دیا۔ بات ختم خلاص۔" وہ ہاتھ چلاتے ہوئے بولا۔

"اس کا نام ماروی رکھ کر میں نے بڑی غلطی کی اللہ سائیں۔ ماروی کی لج رکھنا۔" اس نے خود کلامی کی۔

"دیکھ اس کے کام۔" پاندھی نے اس کی طرف ہاتھ کا اشارہ کر کے کھیت کو مخاطب کیا۔ کھیت ہنس دیا۔

بھاگی نے ناراضی سے پاندھی کو دیکھا۔

"ارے ارے چاچی! روٹی جل گئی۔"

"میں کیا کروں ابا 'میرا بس نہیں چلتا۔" وہ لاچاری سے بولی۔

"ہر وقت روح ماروی میں اٹکی ہوئی ہے۔ کھانا پینا سب زہر ہو گیا کچھ اچھا نہیں لگتا 'جی کو۔" اس نے پانچوں انگلیاں ملا کر سینے پر رکھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ پھوگ تھا جس نے ماروی کی محبت اس کے دل میں جگائی تھی۔

"سائیں! وہ پاندھی کی بیٹی صرف تیرے ہی لائق ہے۔ مور کی طرح حسین 'تلوار کی طرح تیز 'مورنی کی چال 'رنگت ایسی کہ جیسے سورج کی شعاعوں پر ریت چمک اٹھے 'ہنستی ہے تو گال لال پھول بن جاتے ہیں۔

"بل کھاتے بال واسینگوں (سانپ کی اک قسم) کی طرح ڈستے ہیں بات کرتی ہے تو جیسے مائی بھاگی گنگنا رہی ہو۔ لب ایسے بھیگے رہتے ہیں 'جیسے کارونجھر سے نکلے شہد سے تر کیے ہوں۔"

"اور آنکھیں کیسی ہیں اس کی؟" عمر سومرو بے تاب ہوا۔

"سائیں! آنکھوں کی تو بات ہی نہ پوچھیں 'پہلی نظر میں ہی شکار کر لیتی ہیں 'گھائل کر دیتی ہیں۔" وہ بھی پھوگ تھا 'کوئی کسر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا 'عمر سومرو کو اشتیاق دلانے میں۔

اس کے اندر انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں ہو رہی تھی۔ ساجن کا بیٹا کھیت اس سے بازی جیت گیا تھا۔ سمن سرکار کے میلے پر اس کے بیل دوڑ میں بازی لے گئے تھے۔ ٹرافی اور انعامی رقم اس کو ملی تھی اس انعامی رقم سے اس نے ماروی کی فیس دی اور دوسرے اخراجات اٹھائے تھے یہ دوسری بازی جو اس کی برداشت سے باہر تھی۔

ایک ماروی اس کی جیت 'دوسری بیل دوڑ 'مات پر مات نے اسے بوکھلا دیا تھا۔ پاگل کر دیا۔ وہ حاسد انسان تھا۔ غرور تکبر سے بھرا ہوا ودیرے کا کمدار 'جھوٹا کھانے والا۔

ہر طرح سے عمر سومرو کو اس کا شوق دلانا چاہتا تھا۔

اور برا ہوا کہ عمر سومرو یونیورسٹی میں پہلی نظر میں گھائل ہو گیا۔ اس وقت خود کو شکاری سمجھنے والا اپنے زعم میں شکار ہو گیا۔ جیسے ہی پتا چلا 'وہ پاندھی کی بیٹی ہے 'اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ وہ اس کی دسترس سے باہر نہیں۔

اور پھوگ جو جھوٹا کھانے والا تھا۔ اس کے وارے نیارے ہونے لگے۔ وہ بھی عمر سومرو کا دل بھرنے کے بعد اس کو مل جائے گی۔ اس کی رال ٹپک پڑتی اور وہ داؤ پر داؤ کھیلنے لگا۔ چال پر چال چلنے لگا۔ جال پر جال بچھانے لگا۔

"پھوگ۔" وہ غصے سے چیختا۔

"جی سرکار۔" پھوگ مستعد ہوتا۔ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا۔

"وہ کہتی ہے 'میرا ہاتھ پکڑنا 'بہت بھاری بوجھ ہے۔" وہ طنزیہ ہنستا۔ "میں اسے بوجھ سے لاد دوں گا۔ نہ سر اٹھانے کی ہمت ہو گی 'نہ منہ دکھانے کی طاقت۔" وہ تیز تیز چلتے راستے میں پڑی ہر چیز کو ٹھوکر مارتا۔

"سائیں کامیابی اس کے نصیب میں نہیں۔ وہ رانی بنا کر رکھنے کی لائق ہی نہیں۔ اسے رکھیل بنا لیں 'سرکار۔" پھوگ اکساتا۔

"میرے سائیں بادشاہ' ویسے بھی چروا ہے کی بیٹی کیا اچھی لگے گی آپ کی حویلی میں۔"

"جس طرح اس نے مجھے ٹھکرایا ہے۔ میرا دل بھی اب یہی چاہتا ہے۔ اب موقع تلاش کر اور اسے میرے پیروں میں ڈال دے۔ بھاڑ میں جائے بابا سائیں کا الیکشن۔"

"حاضر سرکار! جو حکم۔ وہ چڑیا اپنے گھونسلے سے جیسے ہی نکلتی ہے۔ میں اسے قید کرلوں گا۔"

☼ ☼ ☼

شام نے رات کی چنری اوڑھی۔ بہار رت کی ٹھنڈی ہواؤں نے اس کے مساموں میں تازگی بھری دی تھی۔ وہ کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی' دریائے سندھ کے پار حیدر آباد شہر کی ٹمٹماتی روشنیاں آسمان پر ستاروں ایسی دکھتی تھیں۔ پت جھڑ کا موسم آیا چاہتا تھا۔ درختوں کے پتے درختوں کی شاخوں پر اوس سے غسل کر کے زرد لباس پہن رہے تھے۔

کینٹین سے آنے والا کھانا اس نے شکر کر کے کھایا' اور شمع نے بے دلی سے۔

"کیا مصیبت ہے یار' آخر تم باہر کیوں نہیں نکل رہیں۔" شمع حسب معمول جھنجلائی۔

"مجھے کھیت نے منع کر دیا ہے۔" وہ حسب توقع سکون سے بولی۔

"کھیت نے ٹیوشنز پڑھانے سے منع کر دیا' باہر نکلنے سے منع کر دیا۔ شاپنگ کرنے' آنے جانے' واک کرنے پر' پابندی لگا دی' یہ تمہارا کھیت آخر ہے کیا بلا۔" ماروی اس کے تیز تیز بولنے پر مسکراتی رہی۔

"کھیت نہ ہوا' دیوتا ہو گیا۔"

"دیوتا ہی ہے وہ۔" ماروی نے جتلایا۔

"اور تم اس کی پجارن۔" وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر لڑاکا عورتوں کی طرح کھڑی ہو گئی۔

ماروی کو بے طرح ہنسی آئی۔ "صحیح سمجھیں آپ۔" اس نے نچلا لب دانتوں تلے دبا کر سر کو اثبات میں جنبش دی اور برتن سمیٹ کر ٹرے میں رکھے۔

"اب تو قتل کرنے کو دل کرتا ہے تمہیں۔" شمع نے گھورا۔

"تمہارے قاتل کا فون آ رہا ہے۔" ماروی نے وائبریشن پر تھرکتے فون کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے پلٹ کر فون اٹھایا۔ "ہائے اللہ مجھے پتا ہی نہ چلا۔" وہ کہتے ہوئے تیزی سے کمرے سے باہر نکلی۔

ماروی ہنسی۔ "اب راز و نیاز شروع۔" شمع نے اس کے آواز کسنے پر دھیان ہی نہیں دیا۔

وہ اپنا سیل فون لے کر کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی تھی۔ کھیت کا میسج اک بار پھر پڑھا۔

"ماروی بھول کر بھی کسی بھی کام سے باہر مت نکلنا' سمسٹر ختم ہوتے ہی میں تمہیں لینے آجاؤں گا۔"

"کھیت! تم اتنے بزدل تو نہیں' پھر کیوں مجھے ڈرا رہے ہو۔" اس نے جواب لکھا' اسی وقت جواب آیا۔

"چاچی کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی' دن میں دس بار آکر مجھے تمہیں واپس لانے کو کہتی ہیں' سب سمجھا سمجھا کر تھک گئے ہیں۔"

"اور سنو! تمہارا کھیت بزدل نہیں۔" دوسرا میسج آیا۔

"مجھے پتا ہے' زیادہ اترانے کی ضرورت نہیں۔" جواب دیا۔

"تمہاری محبت کا کھیس اوڑھ رکھا ہے' اترانا تو بنتا ہے۔" جواب آیا۔

"اچھا اب زیادہ پھیلو نہیں' اللہ واہمی۔"

"تمہاری محبت سے پھل پھول رہا ہوں۔" اس نے مسکراتا کارٹون بھیجا ماروی نے سیل چارجنگ پر رکھتے ہوئے پھر سے نکالا۔ اپنی باتوں میں الجھا دیتا ہے' واپس میسج کیا' مسکراتے ہوئے۔

"اور ہاں' اماں کو بھی سمجھا دینا کہ ماروی بھی بزدل نہیں' پریشان نہ ہوا کرے' وہ بیمار ہو جائے گی۔ تو مجھ سے پڑھا نہیں جائے گا' میرا پیغام صبح ہوتے ہی پہنچا دینا۔"

"حاضر سرکار! اور کوئی حکم۔" فوراً" جواب آیا وہ دل سے ہنسی۔

"بس کافی ہے۔"

٭ ٭ ٭

"اسے باہر نکال عبداللہ۔" وہ فاسٹ فوڈ سے انصاف کرتے بولا۔ گاڑیوں کے شور میں اس کی آواز دب گئی تھی۔

"کیسے نکالوں یار۔" عبداللہ زچ ہوا۔

"کوئی تدبیر کر۔"

"ہزار بار شمع کو کہا ہے، اسے کسی بہانے اپنے ساتھ یونیورسٹی کی حدود سے نکالو، مگر وہ کہتی ہے، کھیت نے اسے منع کر دیا ہے۔ کہیں بھی آنے جانے کو تیار نہیں۔" عبداللہ نے ریشمی کباب کا ٹکڑا منہ میں ڈالا۔

"دیکھو عبداللہ صاحب! جو گرنٹی دے سکتے ہیں۔ وہ چھیننے کا بھی اختیار رکھتے ہیں۔" پھوگ کہہ کر استہزائیہ ہنسا۔

عمر سومرو نے لب بھینچ کر اپنے اردگرد نظر دوڑائی۔ گاڑیوں کا شور، شاپنگ کرنے والے لوگ، سنہ باد پر بچوں کو گھمانے والے، ہر کوئی اپنے آپ میں مگن تھا۔

"مجھے اندازہ ہے کہ ہم ڈیل کے تحت تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکے، مگر یہ مسلمہ حقیقت ہے کسی کی محبت دل میں زبردستی نہیں ڈالی جا سکتی۔ ہم نے اپنے تئیں ماروی کو مائل کرنے کی بھرپور کوشش کی۔" عبداللہ نے اپنی صفائی دی۔

"مجھے وہ ہر صورت چاہیے۔" عمر سومرو انگلی مسلسل ٹیبل پر مارتے بولا۔ "میرے احسانات کا بدلہ تمہیں چکانا پڑے گا عبداللہ۔"

وہ اب بھی اسے نہیں دیکھ رہا تھا، اس کی نظریں گھما گھمی کی طرف تھیں۔ کھانے سے اس کا جی اچاٹ ہو گیا تھا۔ پراٹھا رول، چکن تکہ، اسپائسی بوٹی، ریشمی کباب، چیز بال، گولا کباب، سب اس کے سامنے ویسے کے ویسے پڑے تھے۔

"ہم اب بھی تمہارے ساتھ ہیں اور موقع کی تاک میں ہیں، اس احتیاط کے ساتھ کہ ماروی کو ہم پر کوئی شک نہ ہو، ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ سکتا ہے۔" عبداللہ وضاحت پر وضاحت دیے جا رہا تھا۔ پھوگ کی دھمکی نے اثر دکھایا۔ وہ ڈر گیا کہ ایمان بھی بیچا مگر حاصل بھی کچھ نہیں ہوا۔

عمر سومرو اس کی وضاحتوں کو "میں نہ مانوں" کی صورت سن رہا تھا۔ عمر سومرو اس کی طرف دیکھنے کا روادار نہیں تھا اور پھوگ اسے مسلسل گھور رہا تھا، عبداللہ کو احساس ہو رہا تھا کہ وہ بہت برا پھنسا ہے۔

اس نے اپنی صفائی دینے کے لیے شمع کو فون کیا۔

"شمع! اسے کسی بھی بہانے سے باہر نکالو۔"

"عبداللہ میں نے ابھی ابھی اس سے کہا کہ چلو آج مرچی کا مزہ لیتے ہیں، اس نے انکار کر دیا۔ کل بھی کہا تھا۔ الشنظر پر مچھلی کھاتے ہیں، ٹیلر کو کپڑے دیے ہیں۔ کچھ ضروری شاپنگ کرنی ہے۔ مگر یار وہ مانتی نہیں ہر بار کہتی ہے، تم میری مجبوری جانتی ہو، پھر کیوں اصرار کرتی ہو۔ میں شرمندہ ہو جاتی ہوں۔"

کھلے ہوئے اسپیکر سے اس کی آواز بخوبی عمر سومرو تک پہنچ رہی تھی۔

"ڈرپوک چڑیا، کب تک بھاگے گی، مجھ سے ایک دن آ ہی جائے گی، میرے پنجرے میں۔" عمر سومرو ہنسا۔

"ارے عبداللہ! تم عمر کے ساتھ ہو۔" شمع عمر کی آواز پہچان کر بولی۔

"ہاں، ہم مرچی پر ہی بیٹھے ہیں تم آ جاتیں اسے لے کر تو مزہ آ جاتا۔" عبداللہ نے سیل منہ کے قریب کر کے کہا۔

"ارے یار وہ کاٹھ کی الو مانتی تب نا۔ بس کھیت کا کہا پتھر پر لکیر ہے۔ اچھا میں فون بند کرتی ہوں، شاید وہ آ رہی ہے۔"

عمر سومرو اٹھا۔ لات مارنے والے انداز میں کرسی کو ہٹایا۔ "تتلی اک دن میری مٹھی میں آ جائے گی۔" اس نے مٹھی بھینچی۔ "سارے رنگ اڑ جائیں گے۔" وہ ہنسا۔ پھوگ نے بڑھ کر پراڈو کا دروازہ اس کے لیے کھولا۔

٭ ٭ ٭

بھاگی بیمار ہو چکی تھی' اسے خوف کھا گیا تھا۔ وہم مار گیا تھا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی۔ تھکی تھکی سانس لیتی' ہر سانس سے ماروی کی سلامتی کی دعا جڑ جاتی۔ اور ماروی سے بات کرتی۔

"چاچی! اب تو صبح و شام ماروی سے بات کرتی ہے' اب تو مطمئن ہو جا۔"

"ابا! اللہ سکون دے گا۔" وہ دونوں ہاتھ اوپر کی طرف اٹھا کر کہتی۔

ماروی اسے سارے دن کا احوال سناتی کہ صرف کلاسز اٹینڈ کر کے واپس ہاسٹل آئی ہے' وہ بھی لڑکیوں کے گروپ کے ساتھ' اب۔ کینٹین جانا بھی چھوڑ دیا ہے۔ وہ سن کر کچھ دیر مطمئن ہوتی پھر اس کا اطمینان رخصت ہو جاتا پھر سے وہمی بن جاتی' وہ ذہنی مریض بن گئی تھی۔ سوتی تو ڈراؤنے خواب آتے۔ ماروی رو رہی ہے۔ اک کنواں ہے' ٹیلے ہیں اور ان کے بیچ دوڑتی ماروی ہے۔ اونٹوں کی لمبی قطار اس کے پیچھے ہے' ظلمت کا اندھیرا چہار سو چھایا ہے' ٹیلوں سے خنزیر اتر رہے ہیں۔

وہ چیخ مار کر اٹھتی۔ "میری ماروی' میری ماروی۔"

"بھاگی کی چیخ سن کر سارا گاؤں اس کے اردگرد اٹھ آیا ہے۔ کیا ہوا بھاگی کیا ہوا بھئی۔"

"میری ماروی' میری ماروی!" وہ بیچ صحن میں چارپائی پر کھڑی ہو کر یہی صدا لگا رہی تھی۔

"اڑے بابا' چری ہو گئی ہے۔" پاندھی تھر تھر کانپ رہا تھا۔ "کوئی خواب دیکھ لیا' خواب' خواب اسے آتے ہی رہتے ہیں۔" اس کا لہجہ لرز رہا تھا۔

بھاگی دونوں ہاتھ سینے پر باندھے خاموش کھڑی سب کو خالی خالی نظروں سے تکتی رہی۔

"چاچی بیٹھ جا۔" کھیت نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر چارپائی پر بٹھا لیا۔

"کیا ہوا چاچی۔" کھیت نے سر پر دوپٹہ اوڑھاتے نرمی سے بچے کی طرح پچکارا۔

"ابا! میری ماروی اکیلی رہ گئی ہے۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی۔

"ماروی اکیلی نہیں' ہم سب ہیں اس کے ساتھ۔ ہم ہیں نا۔" کھیت نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

گاؤں کے لوگ گھروں کی اور کھسکنے لگے۔

"دماغ چل گیا بے چاری کا۔"

"وہم میں کوڑیل (وہم میں جکڑی ہوئی۔)"

"ادھ چری" (آدھی پاگل)۔

کچھ دل جلی بھنبھناہٹیں ابھریں۔ مگر کھیت وہیں کا وہیں رہ گیا۔

"چاچا تو بھی بیٹھ جا۔" اس نے پاندھی کو پکڑ کر بٹھایا' موبائل جیب سے نکال کر دیکھا تو رات کے تین بج رہے تھے۔

"ماروی سو رہی ہو گی۔ صبح اس کا پیپر تھا' وہ اس کو ہر بات بتانے والا' یہ بات بتانے سے باز آیا۔ سمجھاتے سمجھاتے اسے دلاسا دیتے دیتے صبح ہو گئی۔

حسب معمول اس کا فون نہ آنے پر ماروی نے خود کال کی۔

"کیا ہوا خیریت؟ آج یاد کرنا بھول گئے۔"

"ہاں ماروی! رات چاچی کو بخار تھا' ابھی ابھی آنکھ لگی ہے۔ ورنہ بات کروا دیتا۔"

اس کے سوال کا جواب الٹا آیا' یہ کچھ گڑبڑ کی نشانی تھی۔

"اماں کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔"

"تم پریشان نہ ہو' آرام سے پیپر دو۔ میں لے کر جاتا ہوں چاچی کو پھر بات بھی کرواتا ہوں۔" اس نے دلاسا دے کر کال کاٹی۔ بھاگی بالکل گم صم تھی۔ خاموش سارا جسم بخار میں جل رہا تھا اور رہ رہ کر اسے وہ خواب یاد آ رہا تھا۔

"یا اللہ! خیر کر۔" کتنی ہی دیر یہی دعا اس کی زبان کا تالا توڑ کر ہواؤں پر تیرتی۔

اس نے اپنے باپ کے دوست چاچا یوسف سے اس کی جیپ منگوائی' اسے مٹھی سول ہسپتال لے آیا۔ بخار سے اسے غشی ہو رہی تھی' خوف کی حالت بڑی شدید تھی۔ اسی خوف کی وجہ سے بخار کی شدت میں بھی اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ پیپر کے بعد ماروی کا ہر دن

منٹ بعد فون آرہا تھا۔ اور وہ بات کرانے سے قاصر تھا۔ وہ ہوش میں ہوتی تو ماروی سے بات کرتی۔

"کھیت! مجھ سے صبر نہیں ہوتا' میں آرہی ہوں۔ کچھ نہیں ہوتا۔" ماروی کی بے چینی حد سے سوا ہوئی۔

"پاگل ہو گئی ہو' اگر چاچی ہسپتال میں نہ ہوتی تو میں تمہیں خود لینے آتا مگر اب نہیں آسکتا۔ تم ذرا سا ٹھہر جاؤ۔ اکیلی مت آنا پلیز ماروی۔" کھیت کے لہجے میں منت تھی۔

"کھیت میری ماں بیمار ہے۔ وہ مجھ سے بات نہیں کر سکتی اور تم۔" وہ رو پڑی۔

"ماروی میری بات اور مجبوری سمجھو' میں کل خود آجاؤں گا تمہیں لینے۔"

"آخر تم لوگ اتنے ڈرتے کیوں ہو۔"

"ہمیں ڈرانے میں چاچی کے ڈراؤنے خوابوں کا بھی ہاتھ ہے۔" کھیت ہنسا۔

"کھیت پرسوں میرا پھر پیپر ہے' میں آج آجاتی ہوں کل وہاں سے نکلوں گی تب ہی یہاں پہنچوں گی۔ اماں کو دیکھنا بہت ضروری ہے' میرے دل کو قرار نہیں آرہا۔" اس بار وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

ڈاکٹر کے آنے پر کھیت کو بات ختم کرنا پڑی' اسپتال میں ہنگامی صورت حال نافذ تھی' بڑھتی ہوئی شرح اموات نے میڈیا کے ذریعے تہلکہ مچا رکھا تھا۔ آئے دن کوئی نہ کوئی بڑی شخصیت آتی اور ہلچل مچ جاتی۔

"چاچی' ماروی آرہی ہے۔" یہ سرگوشی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ بھاگی کے کان کے قریب آکر کرتا۔ اس کا اثر ہوا اور بھاگی کا بخار کم ہوا۔ اس نے آنکھ کھولی۔

"ماروی۔" نحیف آواز وارڈ کے شور میں گم ہوئی۔ کھیت اس کے ہلتے لبوں سے سمجھ گیا کہ ماروی کا نام ہونٹوں پر آیا ہے۔

"آرہی ہے' آرہی ہے۔" اس نے خوشی سے اثبات میں سر ہلایا۔ بھاگی کے چہرے پر رونق مسکان بن کر چھائی۔

خوش تو وہ بھی تھا۔ ماروی کو دیکھنے ملنے کی خوشی دل کی دھڑکنوں کو تیز کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

شمع مسلسل اسے اپنی نظروں میں رکھے ہوئے تھی۔

"کیا کہہ رہا ہے اب۔"

"وہ مجھے آنے نہیں دے رہا' بار بار منع کر رہا ہے جان جاتی ہے ان وڈیروں سے ان کی۔" اسے پہلی بار کھیت پر غصہ آیا۔ "کیا کر سکتا ہے آخر عمر سومرو۔"

"زیادہ سے زیادہ تم سے شادی۔" شمع نے چھیڑا۔

"بکواس بند کرو اپنی' نہ موقع نہ محل ہر وقت ٹھٹھول۔" وہ سخت برہم ہوئی۔

"اچھا میری مدد کی کوئی ضرورت ہو تو بتاؤ۔" اسی وقت عبداللہ کی کال آئی۔ اس نے بات بیچ میں چھوڑ کر ریسیو کی۔

"ارے کیسے فون کروں تمہیں' صبح سے تو اس کی رونی شکل دیکھ رہی ہوں۔" وہ عبداللہ کو من وعن اس کی صبح سے اب تک کی کتھا سنانے لگی۔

"سنو عبداللہ کہہ رہا ہے وہ میرپور خاص جا رہا ہے اپنے دوست کی جیپ میں' کہو تو آگے مٹھی تک تمہیں چھوڑ آئیں اسپتال جانا ہے نا تمہیں۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ "عبداللہ کے ساتھ اکیلی ہم بھی چلو نا میرے ساتھ۔"

"یار! اپنا پیپر تو خراب کر رہی ہو' میرا بھی کرو گی کیا۔" وہ فون کان پر رکھتے ہوئے دونوں طرف بات کر رہی تھی۔

"عبداللہ پر اعتماد نہیں ہے کیا۔ جیسی میں ویسا عبداللہ۔ بھائی ہے تمہارا۔"

"عبداللہ نے سنی ہو گی۔ تمہاری بکواس کیا سوچے گا۔" ماروی برہم ہوئی۔ "ٹھیک ہے۔ کس وقت نکلے گا۔"

"دم بھی پندرہ منٹ میں۔"

ماروی نے گھڑی دیکھی' سہ پہر کے تین بج رہے

تھے۔ اگر وہ اس وقت نکل جاتی ہے تو سات بجے تک تو پہنچ ہی جائے گی۔ وہ شش و پنج میں تھی۔

"اچھا بابا! میں چلتی ہوں۔" تمیم اس کی پریشانی اور دو مردوں کے ساتھ اکیلا جانے کی گھبراہٹ بھانپ گئی۔

"اوہ شکر ہے" وہ کھل اٹھی۔

اس نے اپنی کتابیں، ضروری نوٹس بیگ میں رکھے چنری اوڑھ کر تیار ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"اماں کی طبیعت اب صحیح ہے۔ ہم انہیں ڈسچارج کر رہے ہیں۔" ڈاکٹر نے دوائیوں کا نسخہ لکھتے ہوئے کہا۔

"سر! اگر آپ ایک دو دن اور رکھ لیتے ہاسپٹل میں تو اماں بالکل ٹھیک ہو جاتی، تو زیادہ بہتر ہوتا۔" اس نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

"نہیں ہمیں یہ بستر خالی کرنا پڑتا ہے، زیادہ سیریس کنڈیشنز والے مریض ہماری پہلی ترجیح ہوتے ہیں اور بدقسمتی سے ہمارے یہاں وہ مریض زیادہ آ گئے ہیں' اس لیے بخار اور معمولی امراض والے سارے مریضوں کو چھٹی دے رہے ہیں۔ یہ ہماری بھی مجبوری ہے۔" ڈاکٹر نے نسخہ تھمایا۔

"ٹھیک ہے میں دوائیں لے کر آتا ہوں' پھر اماں کو لے جاتا ہوں۔"

"مگر جلدی...."

"بس سر! دس منٹ" وہ کہتے ہوئے وارڈ سے باہر نکلا' اسٹور پر رکتے ہوئے اس نے ماروی کا فون نمبر ملایا۔ اور ساری بات بتائی۔

"میں نکل چکی ہوں وہاں سے۔"

"اب تمہیں مٹھی نہیں ننگر پار کر میں آنا ہو گا' روڈ پر چھوڑ دیں' میں وہاں تک تمہیں خود لینے آؤں گا۔" اس کی آواز سے بے تابی جھلکتی تھی۔

اثبات میں جواب ملنے پر اس نے دوائیں لیں اور بھاگی کو سہارا دیتے ہوئے لا کر گاڑی میں بٹھایا۔ گاؤں پہنچے تو شام کے سائے لہرا رہے تھے' گاؤں کے سارے لوگ مزاج پرسی کو آ موجود ہوئے۔ کھیت کی ماں سب کو چائے بنا کر پلا رہی تھی۔

"ابا کھیت! ذرا بکریوں کی خبر گیری کر آ۔" پاندھی کے کہنے پر وہ جو اسپتال میں ڈاکٹر نے کیا کہا' ہر آنے والے کو پوچھنے پر بتا رہا تھا۔ ساری باتیں چھوڑ کر بھٹوں (ٹیلوں) کی طرف روانہ ہوا۔

اس کی منتوں مرادوں سے مانگی ہوئی من کی مراد ماروی آ رہی تھی۔

بھٹوں پر آ کر اس نے بکریوں کو دیکھا' اس میں پاندھی کی نشان زدہ بکریاں الگ کیں اور چھوٹے بکرے اور "چھوٹی بکریوں" کے منہ پر کپڑا باندھا' مبادا صبح تک یہ سارا دودھ نہ پی جائیں۔ اس سے پہلے اس نے انہیں خوب کھلایا پلایا۔ اب وہ بے فکر تھا' یہ بکریوں کا ریوڑ ساری رات بھٹوں پر رہتا اور صبح سویر پاندھی آ کر ان کو پہلے گھر لے آتا' منہ اندھیرے ان کا دودھ دوہتا چائے تک پی کر' پھر ان کو چرانے لے جاتا۔ اس کی تو من محرم ماروی آ رہی تھی۔ وہ اس احساس سے سرشار ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

صحرا کی چاندنی رات ... صحرا کو سحر زدہ کر دیتی ہے۔ اس کے حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ ایسے میں محبوب کی یاد پر پھیلائے من میں بسرام کرتی ہے۔ اور اگر ایسی رات میں محبوب کے ملنے کی امید بندھ جائے تو قیس مجنوں بن جاتا ہے۔

مگر اس سمے صحرائے تھر میں قیس نہیں کھیت مجنوں بنتا جا رہا تھا۔ تھر کی ریت اس کے تلوے چومتی جا رہی تھی اور اس سرشاری میں۔

اسے پتا ہی نہ چلا کہ وہ گاتے گاتے پکی روڈ پر پہنچ گیا ہے۔

"او بھاؤ! میرے یار! بھلی کرے آئیں۔" ہوٹل والے نے اس کے ہاتھ سے اونٹ کی مہار پکڑی۔ اونٹ کو چھپر ہوٹل کے لکڑی کے ستون سے

باندھا۔

"آج پریں (محبوب) کی آمد کی تیاری ہے۔ پاپیادہ چلے آئے ہو۔" اس نے کھیت کے مٹی آلود پیروں کو دیکھ کر کہا۔

کھیت ہنس دیا۔ "ہاں یار چپل' ریت نکل گئی۔"

"اور تم نے اتنا وقت بھی نہیں لیا کہ ریت کھود کے چپل نکال لو' کہیں پریں کو انتظار نہ کرنا پڑ جائے۔ محبت ایسی ہی طاقت ور ہوتی ہے' بے خود کر دینے والی۔" ہوٹل مالک نے اس کا کاندھا تھپکا۔

وہ سر جھکا کر مسکرا دیا جیسے اپنی محبت کو خراج تحسین پیش کر رہا ہو۔ اس نے سیل نکال کر ٹائم دیکھا۔ اب تک تو اسے پہنچ جانا چاہیے۔

"فون کر لے۔" ہوٹل والے نے چائے کا کپ اس کے سامنے رکھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلاتے فون نمبر ملایا اس کے سیل سے "آپ کا مطلوبہ نمبر بند ہے" کے جواب نے کھیت کو ہلا دیا اس نے یکے بعد دیگرے اس کا نمبر ملایا مگر جواب ندارد۔ اس نے شمع کا نمبر پھر عبداللہ کا نمبر ملایا مگر ان کے نمبر بھی بند جا رہے تھے۔

"جس ہونی سے وہ ڈر رہا تھا وہ ہونی ہو گئی ہے شاید۔" اس خیال نے اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی۔

وہ بغیر کسی منزل کا تعین کیے ہوئے' کوچ میں سوار ہو گیا۔

وہ غائب دماغی سے نمبر ڈائل کرتا رہا' بار بار نمبر ڈائل کرنے کی وجہ سے موبائل کی بیٹری لو ہو چکی تھی۔

اس کی سماعتوں میں سائیں سائیں کی آوازیں گونج رہی تھیں ذہن ماؤف' دماغ خالی خالی' جسم بے جان تھا لوئی لج' چادر' ہتھوڑے بن کے اس کے اوپر برستی رہی۔

کیا ہو گیا تھا یہ' وہ پھر سے امید کو پکڑ کر دماغ سے وہم دور کرتا۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہوا ہو گا ہو سکتا ہے' گاڑی خراب ہو گئی ہو' ہو سکتا ہے ان تینوں کے موبائل چھین لیے گئے ہوں۔ ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کی سینکڑوں سوچوں سے وہ دل کو بہلا رہا تھا' مگر دل میں اک شک جو جڑ پکڑ چکا تھا' وڈیروں کے اغوا کے قصے زبان زد عام تھے۔ وہ اس سے مکر نہیں سکتا تھا۔ بس صرف یہ دعا کر سکتا تھا کہ ماروی ان کے ہتھے نہ چڑھی ہو۔

وہ اپنے اردگرد سے بے خبر بے سدھ پڑا ہوا تھا' کنڈیکٹر نے آ کر ٹکٹ کے پیسے لیے۔ "حیدر آباد اترنا ہے یا آگے کراچی تک جانا ہے۔"

"حیدر آباد۔" اس کے منہ سے مری مری آواز نکلی۔

"بس تو جام شورو پل پر پہنچ چکی ہے' یہیں اتر جاؤ۔" وہ غائب دماغی سے اترنے لگا۔

"بھائی! ٹکٹ کے پیسے تو دو۔" کنڈیکٹر نے اسے شانے سے پکڑا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا جتنے پیسے تھے نکال کر کنڈیکٹر کو تھمائے' یہ بھی غنیمت تھا کہ اسپتال میں جانے کی وجہ سے اس کی جیب میں کچھ رقم باقی بچ گئی تھی۔

کنڈیکٹر نے اپنا کرایہ کاٹنے کے بعد بقیہ رقم واپس دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ مگر وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ دروازے سے باہر دیکھا تو وہ مسافر پل کے بیچ کھڑا تھا۔

"پاگل ہے یہ آدمی۔" وہ بڑبڑا کر نیچے کودا' اسے ہاتھ سے پکڑ کر فٹ پاتھ پر کھڑا کیا۔ بقیہ پیسے واپس دیے اور کوچ میں سوار ہو گیا۔ وہ غائب دماغی سے وہیں کھڑا تھا۔ یہ پل کراس کرنے کے بعد ہی سندھ یونیورسٹی آتی تھی اور وہ اپنی ماروی کو اسی سندھ یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے چھوڑنے آتا رہا تھا' اس نے نیچے دیکھا پانی کے دھبے کہیں کہیں کھڑے دکھائی دیتے تھے۔

شدت سے اس کے دل نے خواہش کی کہ اس وقت اس پل کے نیچے سیلاب ایسا پانی جوش مار رہا ہوتا اور وہ اس میں کود کر جان دے دیتا۔ اس کی حیاتی کا جوش ختم ہو جاتا۔ اس کی ٹانگوں میں اب جان نہیں رہی تھی۔ وہ کھڑے کھڑے تھک چکا تھا وہ وہیں لیٹ گیا۔ نگاہ آسمان پر ٹمٹماتے تاروں پر اٹک گئی۔ اس کی

زندگی میں رات آچکی تھی اس کی زندگی کا آسمان سیاہ تھا۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ ستارے اپنے گھروں کو واپسی کی تیاری میں تھے پریشانی، جسمانی اور اعصابی تھکاوٹ نے چند لمحوں کے وقفے وقفے سے اس پر غنودگی طاری کردی تھی۔

ریل کی چھک چھک سے اس نے پوری آنکھیں کھول دیں۔ ٹرین پوری رفتار سے پل کے اوپر بنی پٹڑی سے گزر رہی تھی پورا پل اس کی چھک چھک کی آواز میں گم ہو رہا تھا۔ اس سمے اس کا دل چاہا اس کی زندگی کا پل اسی پل میں زمین زد ہو جائے۔

ستارے اپنے گھروں کو لوٹ چکے تھے، سورج انگڑائی لے کر بیدار ہونے کو پر تول رہا تھا۔ اس کی ماروی روز صبح ا... سو رہی جاتی ہے اس خیال نے اس کے تھکے وجود... ں بجلی سی بھر دی۔ وہ پوری توانائی سے تیز تیز چلنے لگا۔ اسے ہر صورت ہاسٹل کے دروازے پر پہنچنا ہے اس کے اندر اتنی توانائی پتا نہیں کہاں سے آگئی تھی اردگرد ٹریفک سے بے خبر اس کے لیے سارا جہان بے معنی تھا، مضحکہ خیز نظریں۔ کسے ہوئے فقرے اپنے ابتر حال، ہر بات سے بے نیاز وہ دوڑنے والے انداز میں دیوانہ وار جا رہا تھا۔ ہاسٹل کے دروازے پر پہنچتے پہنچتے اس کی سانس پھول گئی تھی۔ وہ کسی دمے کے مریض کی مانند ہانپ رہا تھا۔

چوکیدار نے آنکھیں رگڑ کر اسے دیکھا۔

"کس سے ملنا ہے؟"

"ماروی۔" اس کے منہ سے اک ہی لفظ نکلا تھا۔

"اچھا اچھا۔ ابھی دروازہ کھلنے میں پندرہ منٹ ہیں۔"

وہ کسی جیلر کی طرح رعب دار آواز میں بولا۔ وہ وہیں زمین پر بیٹھ گیا اسی وقت اک ٹیکسی آکر رکی عبداللہ اور شمع اترے تھے وہ دوڑ کر ان کے پاس گیا۔

"میری ماروی؟" اس کے لہجے میں صحراؤں کے سفر کی پیاس جھلکتی تھی۔

عبداللہ اور شمع اس کو وہاں دیکھ کر حیران ہوئے تھے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر بہانہ بنانے کی کوشش کی۔

"وہ ہمارے ساتھ اپنے گاؤں جا رہی تھی، راستے میں میرپور خاص کراس کرتے ہی، اسے اغوا کر لیا گیا، ہمیں گاڑی سے باہر پھینک دیا گیا۔" وہ آگے ساری تفصیلات بتاتے جا رہے تھے، مگر اس کی سوئی لفظ اغوا پر اٹکی ہوئی تھی۔ جس شک نے اسے ادھ موا کر دیا تھا۔ اس کے یقین پر وہ ڈھے سا گیا، وہ عبداللہ کے قدموں میں گرا تھا۔

"کہہ دو کہ یہ سب جھوٹ ہے۔" وہ رو پڑا۔

"میرا فریکچو زدہ بازو دیکھو۔" اس نے بینڈیج کیا ہوا بازو آگے کیا۔ "یہ زخم دیکھو جب انہوں نے مجھے گرایا تھا گاڑی سے۔" عبداللہ نے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا۔

"میں کیسے کہوں کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ یہ حقیقت ہے۔ میں شمع کو ہاسٹل چھوڑنے آیا ہوں۔ ساری رات پریشانی میں گزری ہے۔" وہ اپنی پریشانی بیان کر رہا تھا اور شمع اس سے نظریں چرا رہی تھی۔

کھیت بے جان ہو رہا تھا۔ اس وقت اس کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ عبداللہ کا منہ توڑ دے۔ اس سے سب کچھ سچ اگلوائے۔ مگر اس کے جسم میں سکت نہ تھی۔ وہ اس مسافر کی طرح تشنہ رہ گیا۔ جو دشت میں پیاسا سراب کے پیچھے دوڑتا دھوکا کھا جاتا ہے۔ اس کے وجود سے جان نکلتی جا رہی تھی۔

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ)

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---- فرینہ اعجاز

میک اپ ---- روز بیوٹی پارلر

فوٹوگرافی ---- موسیٰ رضا

سائرہ رضا

"ٹیچر! اتنے اچھے موسم میں پڑھنے کو دل نہیں کرتا۔"

"پلیز ٹیچر...!" سب نے ایک دوسرے کو اشارے کیے تھے اور پوری کلاس یک زبان ہو گئی۔

"اچھا پڑھیں گے نہیں تو کیا کریں گے؟" اس نے دونوں ہاتھ روسٹرم پر رکھ دیے۔

"باتیں کریں گے ٹیچر...!" یہ لاڈ بھری اکساتی آواز سی آر کی تھی۔

"یس ٹیچر... پلیز ٹیچر!" سب ہی چلانے لگیں۔

"او کے او کے مگر کون سی باتیں؟" وہ جان چکی تھی کہ ان سب کو آج پڑھنا نہیں ہے۔

"بس یونہی باتیں..." سی آر نے کندھے اچکائے۔

"مگر ٹاپک تو ہونا چاہیے ناں۔" اس نے اپنے نوٹس فائل میں رکھنے شروع کر دیے۔

"عینی کی منگنی کی پکچرز دیکھتے ہیں ٹیچر...!" صدف نے کھڑے ہو کر عینی کی طرف ہاتھ اٹھایا۔ عینی تڑپ کر مڑی۔ وہ مسکرا دی۔ کالج میں البمز وغیرہ لانے کی پرمیشن نہیں تھی۔ مگر سب ہی جانتے تھے۔ یہ سرگرمیاں جاری رہا کرتی تھیں۔

"تو آپ لائی ہیں البم...؟" اس نے دوستانہ انداز اختیار کیا۔

"نو ٹیچر...!" وہ کھڑی ہو گئی چہرہ اترا ہوا تھا۔

"ٹیچر البم نہیں ہے۔ اس کے موبائل میں سب کچھ ہے۔"

"موبائل!" اس نے بھنویں سکیڑیں۔ عینی کا سر جھک گیا۔

"چلیے منگنی کی خوشی میں... آج موبائل معاف ہے۔" اسے ترس آ گیا مگر عینی کا سر ہنوز جھکا اور انداز میں غصیلا پن نمایاں تھا۔

اس نے استفہامیہ نگاہوں سے کلاس کو دیکھا۔ ساتھ ہی عینی پر نظر پڑی وہ مقدور بھر آنکھیں نکال کر دانت پیس کر اور مکے بنا بنا کر چھیڑنے والی کو گھور رہی تھی۔

"ایکچوئیلی ٹیچر... عینی اپنی منگنی سے خوش نہیں ہے۔"

عینی کے ساتھ بیٹھی اس کی پکی دوست نے ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اسے بھی غم میں شریک کرنا چاہا اور واقعی اس کے سر پر پہاڑ سا ٹوٹ پڑا نظریں عینی پر گئیں۔ جو ہارے جواری کی طرح گردن گرا کے دھپ سے ڈیسک پر بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر ایسا ملال طاری ہو گیا تھا کہ اس کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ سیکنڈ ائیر کی طالبہ... نو عمر پیاری سی عینی...

"اوہ...!" تفکر سے اس کے ہونٹ سکڑ گئے۔

"کیوں بیٹا... کیوں نہیں پسند... کیا وجہ ہے؟" وہ روسٹرم کے پاس سے ہٹ کر ڈیسک کی قطار میں آ گئی۔

"بس ٹیچر...!" عینی کی آواز بھرا گئی۔ ساتھ ہی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئی تھیں۔

"آپ کے پیرنٹس نے آپ سے پوچھا نہیں تھا بی بی۔"

"پوچھا تھا!" وہ بڑبڑائی۔ "میں نے منع کر دیا تھا۔" وہ رو ہی پڑی۔

"پھر بھی..." اس نے تشفی کے لیے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ویری سیڈ!" وہ واقعی دکھی ہو گئی۔

"یہ آج کے والدین... بلکہ کل والے بھی...

بیٹیوں کو سونے کا نوالہ کھلا دیں گے مگر اس معاملے پر آکر۔۔۔" اس کو حقیقتاً" دکھ ہوا تھا۔
اس کی نظریں عینی پر ٹک گئیں۔ گندمی بے داغ رنگت' بڑی بڑی آنکھیں' سیاہ بالوں کی موٹی اور چھوٹی چوٹی دائیں کندھے پر ڈالے وہ بہت پیاری بچی تھی۔ مگر آنکھوں کے آنسو۔۔۔ اور چہرے پر تحریر غم۔۔۔ وہ مشکل

میں پڑ گئی۔ اب کیا کہے۔

تب ہی کانوں میں ہنسی کی آواز ٹکرائی۔ ایسی ہنسی جو قابو سے باہر ہو گئی ہو۔ اس نے چونک کر سب کو دیکھا۔ عینی بھی اپنا غم بھلا کر خشمناک نگاہوں سے سب کو دیکھنے لگی تھی۔

وہ سخت سست کہنا ہی چاہتی تھی۔ مگر ہکا بکا رہ گئی۔ ہنسی کا غبارہ۔۔۔ غبارہ نہیں بم تھا جو پھٹ گیا تھا۔ لڑکیاں ایک دوسرے پر گرتی پڑتی لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں۔ انہیں ٹیچر کا خوف بھی نہ رہا۔ عینی سے بھی نہ ڈریں۔

"کیپ کوائٹ کلاس!" بالآخر اس نے دھاڑ ماری کلاس کو سانپ سونگھ گیا۔ ٹیچر کے چہرے پر شدید طیش کے تاثرات آگئے تھے۔

"یہ ہنسنے کا مقام ہے بھلا؟" اس کا لہجہ سخت شرمسار کرنے والا تھا مگر۔۔۔

"بہت افسوس ہوا آپ سب پر۔۔۔" وہ واقعی متاسف تھی۔

"مشکل مرحلہ ہوتا ہے یہ ہر لڑکی کے لیے۔۔۔ اور بیٹا عینی! آپ کو بھی ایک بات کہوں، آپ ابھی بہت کم عمر ہیں، انوسینٹ ہیں، آپ کو اپنے اچھے برے کا نہیں پتا۔ لیکن وہ جو آپ کے والدین ہیں ناں، وہ آپ کے لیے غلط فیصلہ نہیں کر سکتے۔

ایک وقت آئے گا جب آپ کو سب ٹھیک لگے گا آپ اپنے پیرنٹس پر بی لیو کریں۔"

اس کے بہت نرم اور متوازی جملوں پر عینی کا سر نفی میں ہلنے لگا۔

"اوہ بیٹا۔" اس نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ سخت دکھی ہو گئی تھی۔ سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں ایسے آنسو۔۔۔

تب ہی وہ ایک بار پھر بری طرح چونکی۔ پھنسی ہوئی ہنسی اور اگلے پل پوری کلاس چھت پھاڑ قہقہوں سے گونج اٹھی اور اس بار کسی پر بھی ٹیچر کی آگ برساتی گھوریوں کا اثر نہ تھا۔ ضبط نے اس کے چہرے کو سرخ کر دیا۔

"ٹیچر۔۔۔!" سی آر خود پر قابو پا کر کھڑی ہوئی۔ "اس سے یہ تو پوچھیے اس کو اعتراض کیا ہے منگیتر پر۔۔۔؟" اس کا سوال منطقی مگر لہجہ متبسم تھا۔

وہ بے ساختہ عینی کی سمت گھوم گئی۔

"وہ میرا آئیڈیل نہیں ہے ٹیچر۔۔۔!" ضبط کی طنابیں چھوٹ گئیں۔ وہ رو ہی پڑی۔

"اوہ۔۔۔!" ٹیچر کو نئے سرے سے دکھ ہوا۔ کلاس کی دبی دبی ہنسی وقفے وقفے سے سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔

"ٹیچر اس سے یہ بھی پوچھ لیں اس کا آئیڈیل ہے کون؟" ہنستے لہجے کی یہ آواز پچھلی کسی ڈیسک سے ابھری تھی۔ اس کی گردن بے ساختہ عینی کی سمت مڑی۔ اور عینی اس بار گھبرا گئی۔ وہ آئیں بائیں شائیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر ایک بار پھر پچھلی ڈیسک سے نعرہ بلند ہوا۔

"اسے شرم آرہی ہے روزینہ۔۔۔ تم ہی بتا دو ناں۔"

"مجھے کیوں کہتی ہو تم خود بھی بتا سکتی ہو۔"

"ہاں تو میں بتا دیتی ہوں اس میں کیا ہے۔ ٹیچر اسے رمن بھلہ پسند ہے۔ ان فیکٹ وہ اس کا آئیڈیل ہے۔"

"رمن بھلہ۔۔۔ وہ کون ہے۔"

"آپ رمن بھلہ کو نہیں جانتیں ٹیچر۔۔۔!" صدمے سے پھٹتی یہ آواز عینی کی تھی۔ "رمن بھلہ۔۔۔ نام تو سنا سنا سا لگتا ہے۔"

"جی ٹیچر۔۔۔ وہی رمن بھلہ جو "یہ ہیں محبتیں" کا ہیرو ہے۔"

"اوہ۔۔۔!" اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

"آپ نے دیکھا ہے ناں اسے ٹیچر۔۔۔؟" اس کے چہرے پہ شناسائی کی رمق دیکھ کر سب جوش سے بھر گئیں۔

"ہاں۔۔۔ نہیں، لیکن۔" وہ تو چکرا کر رہ گئی۔ اسے کبھی شوق نہیں رہا تھا ڈراموں کا۔۔۔ اور وہ بھی انڈین سوپ۔۔۔ ناممکن۔

لیکن گھر میں یہ ڈرامے چلتے ضرور تھے۔

"دیکھئے ٹیچر ہم مانتے ہیں وہ گڈ لکنگ ہے۔ اسمارٹ بہت امپریسیو ہے مگر صرف دیکھنے کی چیز ہی ہے ناں... اب وہ منگیتر تو ہو نہیں سکتا۔"

"مذہب بھی الگ ہے دونوں کا..." ایک اسکارف والی طالبہ نے خوف خدا سے لرز کر سب کو یاد کروایا۔

"اوہاں مذہب بھی!" سب سر دھننے لگیں۔

وہ ساکت کھڑی تھی۔ شوخ نوعمر آج کی لڑکیاں... بلکہ بچیاں ابھی دو سال پہلے تو اسکول میں تھیں۔

اور وہ عینی... جو ہاتھ کی پشت سے آنکھ پونچھ رہی تھیں۔

"کیا کرنا تھا آپ نے... اس بھلّہ کا؟" اس کی آواز کمزور تھی۔

"کچھ بھی نہیں ٹیچر! بس وہ اچھا لگتا ہے اس کا بولنا... دیکھنا غصہ کرنا سب... وہ ہر لک میں پیارا لگتا ہے۔" وہ بے بسی کا شکار تھی۔

"اری ہیر کی دادی... وہ آل ریڈی میرڈ ہے۔ اصلی والی شادی بھول گئی کیا؟" پہلی رو میں بیٹھی ثنا نے اپنی دادی کا انداز اپنایا۔

"تو کیا ہوا۔ اس سے اس کی پرسنالٹی کی اٹریکشن کم تو نہیں ہوتی۔ وہ ہینڈسم ہے تو ہے۔" عینی نے آنسو پونچھ کر گویا بازو چڑھالیے۔

"ایک دم بکواس... انڈسٹری میں اگر کوئی ہینڈسم ہے تو وہ صرف ورون ہے۔" دوسری لڑکی نے ہاتھ نچا کر کہا۔

"جی نہیں... ٹائیگر شیرف!" ایک پتلی آواز میں بلا کی تیزی تھی۔ سب ہنس دیں۔

"ٹائیگر شیرف... وہ شی مین! صرف دوپٹے کی کسر ہے ہی ہی ہی۔"

"بدتمیزی مت کرو۔ وہ سب سے اٹریکٹو ہے۔ اس کی آئیز اور ہائٹ۔" پتلی آواز والی نے ترنت کہا۔

"بھئی شاہ رخ خان کے آگے سب... پانی بھرتے ہیں۔"

"نام تو سنا ہوگا... ہے ناں ٹیچر...؟"

"یہ آپ کن لوگوں کے نام لے رہی ہیں؟" وہ بمشکل بول پائی تھی۔

"یہ ہیروز ہیں ٹیچر... بالی وڈ کے ہیرو... آپ شاہ رخ خان کو نہیں جانتیں؟" وہ اچنبھے سے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں جانتی تو ہوں مگر... آپ سب لوگ کیا ذکر کر رہی ہیں۔" وہ واقعی انجان تھی۔

"ہم ہیروز کی بات کر رہے ہیں ٹیچر..."

"ہیروز...؟"

مگر...

"تو آپ سب کے بھی آئیڈیلز ہوں گے پھر... عینی کی طرح۔" وہ پوچھ رہی تھی۔

"یس ٹیچر..." جواب کورس میں آیا۔

"او گاڈ..."

اسے لگا وہ کسی اور سیارے سے یہاں ابھی ابھی پہنچی ہے اور ہر شے سے نابلد ہے زبان سے طور طریقوں سے خیالات سے۔

"ویسے ٹیچر! آپ کے فیورٹ کون ہیں؟"

"میں... میرے..." وہ استعجاب ہی سے ابھر نہ پاتی تھی۔

"ٹیچر! ان سب کا جذبہ حب الوطنی فوت ہو چکا ہے۔" **سنعیہ عمیر** کھڑی ہوئی اس کا سر اٹھا ہوا تھا اس نے جملے میں بھاری بھر کم اردو استعمال کی تھی۔

"مجھے تو بس عاطف اسلم اور کیوبی پسند ہیں۔"

سب ٹیچر کو بھلائے ایک دوسرے کو پچھاڑتے میں لگ گئیں۔ اس کا ہاتھ روسٹرم پر بہت زور سے بجا۔

پلک جھپکتے ساری کلاس میں ہو کا عالم طاری ہو گیا۔ سب ہی ٹیچر کے چہرے کی خطرناک سنجیدگی سے گھبرا گئی تھیں۔ گرتے پڑتے اپنی جگہوں پر بیٹھیں۔

"یہ سب لوگ آپ کے آئیڈیل ہیں۔ ہیروز...!" اس کے لہجے سے سناٹا جھلکتا تھا۔ "یہ بھلّہ اور فواد خان

اور دوسرے۔۔۔" اسے نام بھول گئے۔

"یس ٹیچر۔۔!" کلاس اپنی بات قائم تھی۔

"آپ لوگ انہیں اپنے ہیروز کہتی ہیں۔" صدمے نے اس کے الفاظ گم کردیے تھے۔

طالبات اس بار بھی پورے وثوق اور فخر سے "یس ٹیچر" کہنے والی تھیں مگر تب ہی انہیں اس کی حالت کا احساس ہوا' وہ بے یقین تھی' حد سے زیادہ مگر ساتھ ہی لگتا تھا جیسے کسی نے اسے ادھیڑ دیا ہے۔ کتر دیا ہے' بکھیر دیا ہے۔

"تو پھر ہمیں کس کو ہیرو کہنا چاہیے ٹیچر۔۔۔؟" کوئی ایک تھی جو سوال میں چھپے سوال تک پہنچی تھی۔

"کم از کم ان سب کو تو کبھی نہیں۔۔۔" اس کا پورا وجود انکار بن کر سب کو حیران کر گیا۔

"تو پھر کون۔۔۔؟" بہت لمبے سے کیا آ آ کے بعد تین لفظی ادھورا جملہ تو تھا مگر سوال مکمل تھا۔

"آپ کرکٹرز کو ہیرو کہتی ہوں گی مس۔۔۔؟" سنیعہ عمیر کے لہجے میں اس کے لیے ترحم سا تھا۔ وہ انکار میں سر ہلاتے ہلاتے رہ گئی۔

"میں نے کب کہا کہ میرا ہیرو کرکٹر تھا۔"

وہ استاد تھی اسے اپنا لہجہ پرسکون رکھنا ہی تھا۔ ہنسی کو بریک لگا۔ سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ ٹیچر کی سنجیدگی' آنکھوں میں تیرتا حزن۔۔۔ شکستگی' مایوسی' یاد۔۔۔

"جیسی ان کی ڈریسنگ ہے۔ اسکارف' فل سلیوز' سیدھی سادی سی' دیکھ لینا یہ کسی مذہبی شخصیت کا نام لیں گی۔" یہ سرگوشی' ببل چباتی ڈیزی نے کی تھی جو شروع سے ہی کانوں میں ہینڈز فری ٹھونسے ہوئے تھی۔

"تو پھر کون تھا آپ کا ہیرو۔۔۔ آپ کا آئیڈیل؟" سب چلا اٹھیں۔

"پہلے آپ بتایئے۔۔۔ آپ لوگ آئیڈیل یا ہیرو سے کیا مراد لیتی ہیں۔ ڈیفائن کریں؟"

وہ شکستہ لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ جانتی تھی کوئی جواب نہیں دے پائے گی۔ اور یہی ہوا سب ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔۔۔ آدھے ادھورے جملے آنے لگے۔

"جو آپ کو سب سے اچھا لگے۔ جس کی طرح ہونے کا دل چاہے' جس کا ہونے کو دل چاہے ٹیچر۔۔۔ جو سب سے بہتر ہو' ون آف دی بیسٹ ہو' مکمل۔۔۔"

اس کا سر نفی میں ہلا۔

"وہ جو میرا آئیڈیل تھا میرا ہیرو۔۔۔ وہ سب سے اچھا تھا۔ اس کی طرح ہونے کی خواہش میں آج تک پوری نہیں کر سکی' وہ سب سے بہتر بھی تھا۔ ون آف دی بیسٹ۔۔۔ اور سب سے بڑی بات میں چاہ کر بھی اس کی ہو نہیں سکتی تھی' یہ ممکن ہی نہ رہا۔" ساری کلاس دم بخود رہ گئی۔ ٹیچر کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ غم و اندوہ کے بیچ سے پھوٹتی مسکراہٹ۔۔۔ اداسی عیاں تھی۔

جیسے تازہ قبر پر پڑا اکلوتا گلاب۔۔۔ خوشی و غم کا امتزاج۔۔۔ کیسا عکس تھا چہرے پر۔۔۔ یاد کی جگمگاہٹ آنکھوں کی نمی یوں جیسے پانی پر تیرتا دیا۔

"میرا ہیرو۔۔۔ ذرا لمبی کہانی ہے۔" وہ ذرا سا مسکرائی تھی۔

"پلیز ٹیچر۔۔۔" ساری کلاس نے یک زبان ہو کر اصرار کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

یہ جاتی بہار اور آتی گرمی کی کشمکش کے وہ دن تھے۔ جب آنسہ عظیم آٹھ نو برس کی کھلے بالوں والی لاپرواہ بچی تھی۔ وہ گڑیا گڈے کا بیاہ رچاتی تھی۔ ساری ساری دوپہر ہم جولیوں کے ہمراہ یا پھر اکیلی خود کلامی کرتی پہل دوج کھیلتی تھی۔ سرکس کی مشاق کرتب دکھانے والی لڑکی سی پھرتی سے دیواریں چڑھتی اور چھتیں پھلانگتیں۔

آج سوچ کو زبان دینے کے لیے آرٹیکل لکھنے میں ماہر تھی۔ تب بس پہروں سوچتی تھی۔ یونہی ادھر ادھر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

کی خواہ مخواہ کی باتیں۔ ذرا الگ تھلگ ہی رہتی غور و فکر کرتی۔

تین دن سے چڑھا بخار آج صبح کم ہوچکا تھا۔ وہ بستر سے نکل کر ناشتے کے بعد سہیلیوں کے گھروں کی طرف نکلی۔ مگر وہ سب اسکول روانہ ہوچکی تھیں۔ بخار کے باعث وہ رخصت پر تھی۔ اس نے پہل دوج کھیلنا چاہا مگر بخار کی نقاہت نے جلد ہمت توڑ دی۔ گڑیا سے بھی کھیلنے کو دل نہ کیا۔ ابو اور باقی بہن بھائی کام اور اسکول جاچکے تھے۔ امی پیچھے کا پھیلاوا سمیٹ رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے چھت پر چلی آئی۔ وسیع و عریض آسمان اسے اپنی طرف کھینچتا تھا اور وہ چاروں طرف گھوم کر آسمان کا کنارہ ڈھونڈا کرتی تھی۔ نیلا آسمان جس میں جابجا سفید دھبے تھے۔ نگاہ کی حد پر نظر آتی چیلیں جو پروں کو پھڑپھڑائے بنا ایسے اڑتی دکھائی دیتی تھیں جیسے پانی پر پھولوں کی پتیاں تیر رہی ہوں۔ خراماں خراماں' بے آواز۔

آنی چھت پر آسمان کی جانب منہ اٹھائے گول گول گھوم رہی تھی۔ وہ چیلوں کو گننا چاہتی تھی۔ دور کہیں بجتے ڈیک نے توجہ کھینچ لی۔

"ہوا ہوا اے ہوا خوشبو لٹادے

کہاں کھلی ہاں کھلی زلف بتادے

اب اس کا پتا دے۔ میں اس سے ملوں گا اک بار ملادے

ہوا ہوا۔ اے ہوا۔"

وہ گھومتے گھومتے ساکت ہوگئی۔ یہ یقیناً" دودھ والے کی دکان پر بجتا ڈیک تھا۔ گانا نیا تھا اور بہت مزے کا تھا۔ وہ آسمان کی طرف دیکھنا چھوڑ کر اب بغور سن رہی تھی۔

تب ہی سر کے اوپر سے گزرتے تربیتی جنگی جہاز کی چنگھاڑ نے اسے نہ صرف چونکایا۔ لڑکھڑایا بلکہ بدمزہ بھی کردیا تھا۔ گانا سننے میں کتنا مزہ آرہا تھا۔ اس نے فوراً" سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ مسرور بیس اس علاقے سے کچھ ہی دور تھا۔ اور جہاز یہاں سے گزرتے ہوئے نیچی پرواز کیا کرتے تھے۔ ایک کے بعد ایک گزرتے جہاز یہاں کے مکینوں کے لیے قطعاً" باعث حیرت نہ تھے۔ مگر اس جہاز کی آواز اور بے حد نچلی پرواز سے چونکتی آنی کی آنکھیں اس وقت پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب اس نے جہاز کو عین اپنے سر کے اوپر دیکھا اور یہ کیا' اس کی دم میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اڑتے جہاز کے پیچھے ایک روشنی کا لپکا تو ہمیشہ ہی نظر آتا تھا مگر یہ آگ تھی بھڑ بھڑ بھڑکتی۔ آنی بیچ کے گھر میں رہتی تھی اور اس کے عین سامنے بڑے گراؤنڈ کے بعد فلیٹ تھے۔ کیا یہ جہاز فورتھ فلور کی نیلے شیشے والی کھڑکی میں گھس جانا چاہتا ہے۔ اس نے دہل کر سوچا۔

یا آج وہ کسی فلیٹ کی چھت پر اترنا چاہتا تھا۔ اتنا آآآ نیچے۔

"امی' امی۔ امی جی۔" وہ بے حد گھبراہٹ کے عالم میں چلاتے ہوئے کنارے پر آرکی۔

"کیا ہوا آنی۔ پیچھے ہو گر جاؤ گی۔ کیوں چلا رہی ہو۔ کنارے سے دور تو ہو۔"

"امی وہ۔ وہ جہاز کو آگ لگ گئی امی۔"

"کون سے جہاز کو۔؟"

"وہ جو ابھی اوپر تھا۔" اس نے جواب دینے کے ساتھ ہی منہ اٹھایا۔ اوپر تو کچھ بھی نہ تھا۔ آسمان صاف۔ وہی بے آواز اڑتی چیلیں۔ وہی دودھ والے کا بجتا ڈیک۔

"اے جولی جولی۔ جولی کا دل تجھ پر آیا جولی۔

تیرے لیے چڑھ جاؤں سولی۔

تو ہی تو میری جان ہے' جان ہے جان ہے۔

جولی جولی۔"

"پاگل تو نہیں ہوگئی۔ بخار میں جاکر چھت پر ٹنگ گئی اور اوپر سے انوکھی باتیں فوراً" نیچے آؤ۔ آرام کرو۔ خدانخواستہ چکر کھا کر نیچے گر گئی تو۔"

"میں سچ کہتی ہوں امی۔ وہ جہاز بہت نیچے تھا اور اس کی دم کو آگ۔" اپنی صفائی دیتے دیتے اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ پیچھے سے یک دم ایک شور ابھرا تھا۔ وہ چھت پر ہی گلی کی سمت بھاگی اور نیچے جھانکا۔

بہت سے لوگ بے یقینی کے سے عالم میں ایک گروہ کی صورت میں جمع ہوتے جا رہے تھے۔ اور ایک دوسرے کو بتا رہے تھے اور تصدیق چاہ رہے تھے۔ ابھی اوپر جہاز تھا۔ اس کی دم میں آگ لگی تھی ناں۔ اور بہت نیچے تو وہ تھا ہی۔ ہاں واقعی نیچے تو وہ تھا ہی۔ تب ہی ایک دوسرا جہاز سر سے گزرا۔ وہ مناسب بلندی پر تھا اور پلک جھپکتے غائب ہو گیا زن ان ان ان۔

"میں غلط نہیں کہہ رہی تھی امی۔ دیکھیں نیچے سب لوگ بھی کہہ رہے ہیں جہاز کو آگ لگی ہوئی تھی۔"

اس نے آنگن کی جانب آکر جھاڑو پھیرتی ماں کو بتایا۔ امی نے جواباً "کچھ کہا جو سن نہ سکی۔ نیچے سے شور ابھرا تھا۔ اور اس کے سر کے اوپر وہی دم کو لگی آگ والا جہاز تھا۔ وہ پہلے مسرور بیس کی طرف جاتا دکھائی دیا تھا۔ اب کیا واپس آرہا تھا اور آگ زیادہ ہو گئی تھی اور وہ اتنا نیچے تھا کہ اس نے خوف زدگی کے عالم میں اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ دھر لیے اور اسی طرح وہ زمین پر اکڑوں بیٹھتی چلی گئی۔

جہاز زن سے سر کے اوپر سے گزر گیا۔ لیکن اب وہ غائب نہیں ہوا۔ وہ مسلسل نظر آرہا تھا۔ وہ اس آبادی کے چاروں طرف گھوم رہا تھا۔ نیچے ایک بابا کار مچی تھی۔ ہر شخص منہ اٹھائے آسمان کو کھوج رہا تھا ہر ایک گھر سے باہر تھا۔ کھلے آنگن ہی تھا اور پھر ایک ایک چھت انسانوں سے بھر گئیں۔

"ارے لاکھوں روپے خرچ کر کے جہاز لیتے ہیں اور تربیت کے نام پر ان نکموں کو پکڑا دیتے ہیں۔ سالے کو جہاز اوپر تک لے جانا نہیں آرہا۔ ایسے ہی کرتا رہا تو ہمارے سروں پر ہی گرا دے گا۔"

یہ پڑوسیوں کا نکھٹو جاجی تھا۔ جو شدید طیش کے عالم میں بزرگ انکل سے مخاطب تھا۔ (انکل کی صاحبزادیاں بھی ذرا سی اوٹ میں ہوئی آسمان کو دیکھ رہی تھیں۔

"بھئی ایسے ہی کہیں گے آسمانی عتاب۔ اب اگر جو یہ گر جائے تو نیچے کیا خاک بچے گا۔ بس ایسا ہی ہوتا ہے اللہ کا عذاب۔ کہیں طوفان، سیلاب، زلزلے آتے ہیں۔ اب مشینوں کا عذاب نازل ہوا کرے گا۔"

مولوی صاحب بھی چھت پر کھڑے تھے۔

"سالا (پائلٹ) آج کچھ نہ کچھ کرے گا۔ یہیں پر منڈلا رہا ہے جاتا کیوں نہیں۔"

سب کو تشویش تھی۔ اگر اس غیر تربیت یافتہ پائلٹ نے عقل استعمال نہ کی تو جہاز آبادی پر گرے کہ گرے۔

"جاتا کیوں نہیں۔"

"یہ پاس تو ہے بیس۔"

چنگھاڑتا، غراتا جہاز سب کی سن رہا تھا شاید۔ وہ زن سے کہیں دور نکل گیا۔ آسمان صاف اور پرسکون۔

آنسہ کی گردن درد کرنے لگی۔ کیا، کیوں، کیسے جیسے سوال سے سر بھی دکھنے لگا۔

"جہاز کو کیا ہو گیا آج۔" وہ معصومیت سے سوچتے ہوئے اس پہاڑی کو دیکھنے لگی۔ جہاں جہاز نے رخ بدلا تھا۔ داستان چھوڑ کر جہاز نجانے کہاں چلا گیا تھا۔ کیا اب دوبارہ نہ آئے گا۔ لیکن اسے تو سامنے جانا تھا وہ پیچھے کیوں گیا؟

تھوڑا سا وقت اور گزرا اب جہاز نہیں تھا اور روٹین کی پرواز کرنے والے جہاز وقفے وقفے سے گزر رہے تھے۔ پیچھے سے آتے نظر آتے اور فلیٹ سے آگے جا کر نظروں سے غائب ہو جاتے۔

سب گفتگو کرنے میں ایک دوسرے کو پیچھے چھوڑنا چاہ رہے تھے اور سب ہی دعوے دار تھے کہ جلتے جہاز کو سب سے پہلے انہوں نے دیکھا جہاز کے دوبارہ نمودار ہونے کے انتظار میں کھڑی آنی کچھ نہ بولی۔ یقیناً "جہاز کو سب سے پہلے اسی نے دیکھا تھا۔ وہ مایوس ہو کر پریشان دل کے ساتھ نیچے اترنے لگی۔ جب اس نے اپنے سامنے الٹی جانب بہت بلندی پر اسی دم سے جلتے جہاز کو ایک بار پھر دیکھ لیا۔

"ارے وہ رہا... وہ دیکھو... اتنا اوپر ہو گیا مگر اسے تو

سیدھی جانب جانا تھا نا' یہ غلط سمت کیوں گیا؟"

"ارے میں یہی تو کہہ رہا ہوں' عوام کے خون پسینہ کا پیسہ خرچ ہوتا ہے ان جہازوں کی خریداری اور مینٹی نینس پر۔۔۔ آج تو جہاز ہے ہی کسی اناڑی کے ہاتھ میں جسے یہ تک نہیں پتا کہ جانا کہاں ہے۔"

مختلف آرا۔۔۔

زہر میں بجھے جملے۔۔۔

کسی دل جلے نے کچھ گالیوں سے جملے کے سابقے لاحقے کی ترتیب کی تھی۔

جتنے منہ اتنی باتیں۔ قیافے' گمان' شکوک اور فکر کے ہمراہ شدید حیرت یہ منظر شاید تمام لوگ پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ سو جوش و جستجو بہت زیادہ تھی ایکسائٹمنٹ سی۔۔۔

تب ہی ایک عجیب سا منظر سب کو حیران کر گیا۔ جہاز کے اندر سے کوئی سیاہ سی گٹھڑی نکلی تھی' بس کوئی چیز مگر کیا؟ یہ کوئی نہ سمجھ سکا۔ وہ اتنی دور اور بلند تھی کہ اپنے وجود کی وضاحت نہیں دے سکتی تھی۔ سیاہ گٹھڑی نیچے کو گرتی ہوئی اور حیران کن بات یہ ہوئی کہ گٹھڑی کا بوجھ اتار پھینکنے کے بعد جہاز نے تیزی سے رخ بدلا۔ وہ اونچائی سے ایک دم بہت نیچے ہوا تھا اور اگلے ہی پل وہ ایک بار پھر آنی کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ اس کے گرد چکرا رہا تھا۔

وہ اتنا نیچے تھا کہ آنی کو لگا اگر اس کے ہاتھ میں ایک بڑا بانس ہو تو وہ جہاز کو شاید چھو لے۔ وہ وہاں سے چلا کیوں نہیں جاتا۔ اس نے جہاز کو بلندی پر تو دیکھ رکھا تھا۔ مگر اتنا نزدیک اف۔۔۔!!

جب جہاز گرتا ہے تو جہاں گرتا ہے تو وہ جگہ تو تباہ ہو جاتی ہے نا۔ تو کیا وہ تھوڑی دیر بعد مر جائے گی اگر جہاز اس کے سر پر گر گیا اور اگر وہ سر پر نہ بھی گرا تو اس کے گھر پر گر گیا مسجد پر۔۔۔ اور فلیٹس میں بھی تو اس کی بہت سی سہیلیاں تھیں اور گراؤنڈ میں جہاں وہ سائیکل چلانے جاتی تھی۔ اور جہاز اسی گراؤنڈ کے اوپر منڈلا رہا تھا۔ وہ وہیں تک گیا تھا گویا۔ یعنی ہر دو صورت نقصان آنی ہی کا ہوتا تھا۔

وہ کبھی دائیں طرف گردن موڑ کر گراؤنڈ پر بہت نیچی پرواز کرتے جہاز کو دیکھتی اور کبھی ہاتھ کا چھجا ماتھے پر ٹکا کر گٹھڑی کی تلاش کرتی' جو نجانے کہاں جا گری تھی۔ اور اس گٹھڑی میں کیا ہوگا۔ اس کا ننھا ذہن سوچ نہ پاتا۔ کوئی خزانہ یا راز یا بہت سارے نوٹ۔۔۔ یا۔۔۔ یا کیا؟

وہ ابھی تک چھت پر تھی' مگر اسے اندازہ تھا کہ ایک دنیا گراؤنڈ کے نزدیک ہوگی۔ دفعتاً" جہاز نے اڑان بھری' وہ دائیں جانب اڑا تھا۔ پرواز بہت نیچی تھی۔ وہ کہاں جا رہا تھا' کیا بیں؟ مگر اس سوال کے جواب سے پہلے ایک شور نے اسے متوجہ کیا۔ چھت پر کھڑے لوگ انگلی سے بائیں جانب اشارہ کر رہے تھے اس نے کھوج کی تو آسمان پر کچھ تھا۔ وہ چیل بھی نہیں تھی کوا بھی نہیں تھا وہ۔۔۔ وہ ایک۔۔۔ آنی نے پالیا۔ وہ چلائی۔

آسمان پر گڈا ہے' چھتری کے نیچے لٹکتا گڈا۔۔۔ جہاز نے گڈا گرایا تھا؟

"ارے یہ تو پائلٹ ہے، جو پیراشوٹ سے اتر رہا ہے۔"

"کیا؟" سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ پیرا شوٹ سے اترتا پائلٹ۔۔۔ (گڈا) وہ بہت اوپر اڑ رہا تھا۔

سب جہاز کو بھول کر گڈے کو دیکھنے لگے۔ وہ شور کے الامان۔۔۔ تب ہی ایک دھماکے کی آواز اور کالے دھوئیں نے سب کے منہ بند کر دیے اور گردنیں دائیں جانب موڑ دیں۔

گراؤنڈ سے بہت دور جہاں گودام اور فیکٹریز تھیں

جہاز منہ کے بل روئی کے گودام میں جا گرا تھا۔ ساتھ کوئی بیٹری فیکٹری تھی۔ روئی کے گودام سے آگ کے شعلے بھڑکنے لگے ایک ہنگامے کے سے عالم میں لوگ فیکٹری کی طرف بھاگ رہے تھے۔ آنی سرعت سے نیچے اتر آئی۔ وہ ماں کی نظر بچا کر گودام کی جانب بھاگنا چاہتی تھی' مگر تب ہی اسے لگا کہ آسمان سے اترتا

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد، صائمہ اکرام، عُشنا کوثر سردار، اشفاق احمد
نمرہ احمد، سعدیہ عابد، نبیلہ عزیز، نسیم حجازی
فرحت اشتیاق، عفت سحر طاہر، فائزہ افتخار، عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو، تنزیلہ ریاض، نبیلہ ابر راجہ، ہاشم ندیم
نگہت سیما، فائزہ افتخار، آمنہ ریاض، مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ، سباس گُل، عنیزہ سید، مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ، رُخسانہ نگار عدنان، اقراء صغیر احمد، علیمُ الحق
رفعت سراج، اُمِ مریم، نایاب جیلانی، ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

گڈا اب بہت واضح ہو گیا ہے۔ اس کے سر پر چھتری کھلی تھی اور دونوں ٹانگیں فضا میں وی کی طرح کھلی تھیں۔
آنی نے فوری فیصلہ کیا وہ گودام نہیں جائے گی' وہ گڈے کے پیچھے بھاگے گی۔ اسے یہ گڈا چاہیے ..... ہر صورت۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ وہ جلد از جلد جائے تاکہ سب سے پہلے پہنچ کر اس گڈے کو اپنے قبضے میں لے لے۔ پھر وہ سب کو بتائے گی کہ اس کا گڈا وہ ہے جو گرنے والے جہاز نے پھینکا تھا اور اب وہ اس کا ہے۔
لیکن گڈا ابھی بہت دور تھا۔
وہ اگر آبادی سے نکل کر دائیں سڑک پر جائے اور پھر اس راستے پر زمین پر بھاگتی جائے جہاں جہاں اوپر گڈا اڑ رہا ہے تو جب وہ کہیں بھی گرے گا۔ اترے گا تو وہ اسے پکڑے گی' مگر آنی کی یہ سوچ غلط ثابت ہوئی وہ اکیلی گڈے کا تعاقب کرنے والی نہیں تھی اور بھی کتنے بہت سارے لوگ اسی جانب بھاگ رہے تھے جہاں "گڈے" کے اترنے کا گمان تھا۔ روڈ کے اختتام پر الیکٹرونکس کمپنی تھی اور ساتھ ہی بوائز کالج اور بھاگتا روڈ۔ اور اسے تو آبادی کے باہر آنے والے روڈ تک پر جانے اجازت نہیں تھی' تو وہ پیچھا کرتی کہاں تک جائے گی؟ اور اگر گم ہو گئی تو ..... امی کتنا ماریں گی۔ امی نے گم ہو جانے سے سختی سے منع کر رکھا تھا۔
لیکن وہ اکیلی تو نہیں جو گڈے کا تعاقب کر رہی ہے' اسی کی گلی کے کتنے لوگ لڑکے اور انکل اور بچے بھی..... وہ ان ہی کے ساتھ واپس آجائے گی' مگر یہ گڈا گیا کہاں..... اس نے دفعتاً چونک کر دیکھا' پریشان ہونے سے پہلے وہ اسے دکھائی دے گیا۔ وہ کالج کے عین اوپر تھا اور اب واضح ہو گیا تھا۔ وہ گڈا نہیں تھا کہ جس سے کھیلا جا سکتا یا وہ اپنی گڑیا کا بیاہ رچالیتی' وہ تو بہت بڑا تھا۔ اس کے ابا کے قد کے برابر یا شاید ان سے بھی بڑا..... لیکن اب یہاں تک آکر وہ واپس کیوں جائے وہ اسے دیکھے تو ضرور..... آسمان پر دائیں جانب کالے دھوئیں کی لکیر تھی اور بائیں جانب وہ سیاہ پوش.....
ہجوم کے ساتھ دوڑتی آنی کالج کے گراؤنڈ کے اندر داخل ہو گئی۔ وہ چھوٹی تھی اور بڑوں کی ٹانگوں میں سر گھسا گھسا کر جگہ بناتی اب سب سے آگے کھڑی تھی۔
سیاہ پوش اب سروں کے عین اوپر تھا اور کسی بھی لمحے نیچے اترنے والا تھا' اسے دیکھنے کا شائق ہجوم جو مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ جب اسے دھیرے دھیرے زمین کے نزدیک ہوتا دیکھنے لگا تو کسی کے بھی حکم کے بغیر خود بخود پیچھے سرکنے لگا۔ بہت بڑا کھلا میدان اترنے میں معاون تھا' مگر ہوا کا رخ! اگر وہ کسی درخت سے جا لگتا تو' سیاہ بڑے گیٹ سے تین گاڑیاں اندر داخل ہو رہی تھیں ان میں سے نکلنے والے وردیوں میں ملبوس تھے' مگر وہ آگے نہ بڑھے۔ وہیں رک کر دیکھنے لگے۔ ان کی نظر اترنے والے پر تھی وہ اتنا نزدیک ہو گیا تھا کہ اس کے چہرے کے نقش واضح ہو رہے تھے۔ وہ نجانے کتنی دیر سے ہواؤں سے نبرد آزما تھا' کتنے گھنٹوں سے.....
ہجوم ساکت تھا۔ سراسیمہ۔ بے یقینی پھٹی آنکھوں والے لوگ۔ بوڑھے جوان' پہلی بار اس چیز کا تجربہ کر رہے تھے۔
وہ اگلے لمحوں میں زمین پر اترنے ہی والا تھا۔ اس کے قدم زمین کو چھونے والے تھے۔ سب کی سانسیں رک گئی تھیں۔ اسے کچھ ہو نہ جائے' لیکن اسے کچھ نہ ہوا' بے حد مشاقی سے بھاری بوٹ زمین سے ٹکرائے تھے۔
وہ رکتے رکتے بھی گراؤنڈ میں کتنا ہی بھاگ لیا' دھیرے دھیرے سرکتا' مدھم ہوتا بہت آرام سے گھٹنوں کے زور پر نیچے بیٹھ گیا۔ اس کا سر شاید چکرا رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے تھام لیا تھا۔ ہجوم ذرا سا آگے ہوا تھا' مگر نیچے کھڑے فوجی جوان الرٹ تھے' ان کے فقط ہاتھ کے اشارے نے سب کو اسٹاپ

کر دیا۔

ایک بوڑھی خاتون اپنے گھر سے دودھ منگوا کر اسے پلا دینا چاہتی تھیں کہ اس نے کتنی مشقت جھیلی کب سے تو اڑ رہا تھا۔

اور وہ واقعی کسی نقاہت کے زیر اثر تو تھا۔ فوجی اس کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ وہ اس کی مدد کر رہے تھے۔ پیراشوٹ کھولنے میں اور پتا نہیں کیا کیا۔۔۔ وہ سب مسلسل کچھ بول رہے تھے اسے اٹھنے پر اکسا رہے تھے پھر کسی نے شاید سہارا دینا چاہا ایک نے ہاتھ بڑھایا کہ وہ اٹھ جائے۔ ہجوم خدشات میں گھرا تھا کیا وہ کھڑا ہو سکے گا اتنی دیر تک ہوا میں رہنے کے بعد؟ دل کانپنے لگے اور آنکھ بھرنے۔۔۔ خشک حلق نے زبان کو بھی اکڑا دیا تھا۔

دونوں ہاتھوں کا دباؤ زمین پر ڈال کر اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ ہجوم میں مردوں کی تعداد زیادہ تھی اور بچے۔۔۔ بچے بس حق دق تھے۔ اور مرد۔۔۔ کون کہتا ہے مرد کو درد نہیں ہوتا اور اس کی آنکھ بہتی نہیں۔ یہاں تو ہر آنکھ اشکبار تھی اور بس چلتا تو وہ سب اسے آگے بڑھ کر کسی بھی طرح اٹھا لیتے۔ وہ نجانے کس تکلیف میں تھا، مگر یہاں کھڑے تمام لوگ اذیت سہنے کی آخری حد میں تھے۔ وہ آخر کھڑا کیوں نہیں ہو جاتا۔

اور ایسا کیا کیا جائے کہ وہ بس جلدی سے اپنے قدموں پر کھڑا ہو جائے۔ تب ہی آنی نے دیکھا اس نے ایک بار پھر زمین پر ہاتھ جمائے (اٹھنے کی کوشش) ہجوم نے دل پر ہاتھ رکھا تھا۔ اور۔۔۔ اور وہ ذرا سا لڑکھڑا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ہجوم بے قابو ہو گیا۔ ایک خود ساختہ حد بندی کا حصار توڑ کر وہ آگے بڑھے تھے اور اگلے پل "آنی کا گڈا" ہجوم کے کندھوں پر تھا۔ وہ نعرہ تکبیر بلند کر رہے تھے۔ پاکستان زندہ باد، پاک فوج زندہ باد کے

یہ جشن نجانے کب تک برپا رہتا، مگر گاڑیوں میں آئے فوجیوں نے ذرا سختی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بمشکل اسے ہجوم کے ہاتھوں سے نکال کر گاڑی تک پہنچایا، ہجوم جسے رخصت کرنے بیس تک جانا چاہتا تھا، مگر یہ سب پیدل تھے اور وہ گاڑیاں تھیں، فضا میں مسلسل نعرے بلند ہو رہے تھے۔

شدت جذبات سے لوگوں کے چہرے سرخ تھے وہ ایک دوسرے سے لپٹ کر نجانے کس شے کی مبارک باد دے رہے تھے۔ گاڑیاں چند لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہوئی تھیں۔ آنی ساکت و صامت کھڑی تھی۔

وہ تو گڈے کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے بھاگی آئی تھی۔

لوگوں کی زبانوں پر قصے ہی قصے تھے۔ زیب داستان کے لیے وہ حاشیہ آرائی کر رہے تھے کہ بس۔

دائیں جانب کالا دھواں ہنوز تھا۔

☼ ☼ ☼

"ان کے پاس پیٹرول ختم ہو گیا تھا اور فنی خرابی اس کے علاوہ۔۔۔" ابو نے رات بتایا۔

"تو دونوں کو دجاتے نا ابو۔۔۔ ایک ہی کودا؟" یہ آنی کا بھائی تھا۔

"دونوں ہی کودنا چاہتے تھے اور اس کی اجازت بھی ہوتی ہے۔ اپنی جان کی حفاظت سب سے اہم ہے۔"

"تو پھر کیوں نہ کودے۔" آنی نے عجلت سے پوچھا۔

"بیس تک جانے کے لیے اونچی پرواز کرنی پڑتی تھی، جو خرابی کے باعث ممکن نہ تھا اپنی جان بچاتے تو سب سے موزوں جگہ جہاز گرانے کے لیے یہی آبادی اور اس کے ارد گرد کا علاقہ تھا۔ چاروں اطراف بڑی بڑی فیکٹریز۔۔۔ جہاز گراتے تو آگ سے سب تہس نہس ہو جاتا۔"

نعرے لگا رہے تھے وہ اسے چھونا چاہتے تھے اور چومنا وہ گوشت پوست کا بنا، جیتا جاگتا انسان نہ ہوتا تو شاید اس کے ٹکڑے کر کے بطور تبرک آپس میں بانٹ لیتے۔

"تو ہمارے سر پر ہی کیوں چکر لگاتے رہے؟" آنی کی نگاہوں سے منظر ہٹتا ہی نہیں تھا۔

"وہ آبادی پر نہیں گرانا چاہتے تھے۔ بڑے گراؤنڈ کو بار بار جانچتے تھے۔ گراؤنڈ بیسٹ تھا مگر جہاز گرتا تو ساتھ کھڑے فلیٹ بھی شاید گر جاتے۔"

"تو ابو جب جہاز کا گرنا طے ہو چکا تھا تو دونوں پیراشوٹ سے چھلانگ لگا لیتے' ایک ہی نے کیوں لگائی؟"

"ایک نے اس لیے لگائی کہ دونوں اپنی جان بچانے کے لیے جہاز کو بے لگام چھوڑ کر کود جاتے تو جہاز ڈولتا ہوا کہیں بھی گر جاتا' فیکٹریز پر' روڈ پر یا یہاں ہمارے گھر پر۔"

"میرے اوپر ابو...." ان کے سینے پر سر رکھ کے انہماک سے سنتی آنی نے تیزی' مگر شدید بے یقینی سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بیٹے آپ پر.... کسی پر بھی...."

"کیا انہیں پتا تھا کہ نیچے آنی ہے.... یعنی میں ہوں آنسہ عظیم....؟ کیا میں انہیں نظر آ رہی تھی؟"

"بالکل نظر آ رہی تھی اور اگر نہ بھی نظر آتی تو وہ دونوں جانتے تھے نیچے' بہت سی آنیاں رہتی ہیں۔"

"آپ صحیح کہتے ہیں ابو.... انہیں پتا تھا نیچے صرف میں ہی ہوں باقی تو سب بچے اسکول گئے ہوئے تھے۔ مجھے تو بخار تھا' وہ صرف مجھے بچانے کے لیے دیر تک جگہ ڈھونڈتے رہے اور سارا پٹرول ختم ہونے پر خود ہی جلدی سے بھاگ کر روئی کے گودام میں گر گئے۔ کیا انہوں نے جہاز اڑاتے وقت مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں چھت پر تھی نا؟" وہ ابو کی بات پر دل سے ایمان لے آئی۔

"ویسے تو سخت پہرا لگا دیا گیا تھا جہاز کے ملبے کے گرد' مگر وہ حاجی صاحب کا بیٹا بتا رہا تھا تین پاؤ تک کی گوشت کی ایک ڈھیری سی ملی ہے باقی سب خاکستر ہو گیا۔" امی نے ذرا مدہم آواز میں کہا۔

"اوں ہوں بچوں کے سامنے ایسی بات نہیں کرتے۔" ابو نے سرزنش کی۔

"ابو! خبروں میں بتایا تھا کہ مرنے والے پائلٹ کی یہ آخری پرواز تھی۔ وہ دو دن بعد چھٹی پر جا رہے تھے۔ ان کی شادی تھی۔"

"مرنا نہیں کہتے.... شہید کہتے ہیں بیٹے۔" ابو نے تنبیہہ کی۔

"شہید کیا ہوتا ہے ابو؟" یہ آنی کے لیے نیا لفظ تھا۔

"شہید...." ابو نے شعوری وقفہ لیا۔ وہ آسان سے آسان الفاظ میں معنی بتانا چاہتے تھے۔

"وہ جو اللہ کی راہ میں جان دیتے ہیں' اپنے ملک اور قوم کو بچانے کے لیے لڑتے ہیں اور لڑتے لڑتے مر جاتے ہیں' وہ شہید کہلاتے ہیں جیسے آج شہید ہونے والا پائلٹ اتنے بہت سارے انسانوں کو بچانے کے لیے اپنی جان پر کھیل گیا۔ اس نے سوچا کہ میں اکیلا ہوں اور نیچے اتنے سارے...."

"نیچے میں ابو...." آنی نے ان کا گھٹنا ہلا کر تصحیح کی۔

"ہاں بیٹے ہر وہ شخص جو کسی دوسرے کی جان بچانے کے لیے...."

"ابو.... میں.... میری جان بچانے کے لیے.... ایسے کہیں' آنی کی جان بچانے کے لیے مر جانے والے کو شہید کہتے ہیں۔"

اس نے ابو کو پورا جملہ بنا کر دے دیا۔ ان کی مشکل آسان کر دی۔ سلیس اور مکمل تشریح' وضاحت۔

ابو کی بقیہ بات منہ میں ہی رہ گئی۔ بیٹی کی غلط فہمی کو دور کرنا کسی اور وقت پر چھوڑ کر وہ اثبات میں سر ہلانے لگے۔

چھوٹے سے دماغ میں چھوٹی سی بات بٹھانا ہی اس پل مناسب لگا۔

جب وہ بڑی ہو گی تو بڑی بات خود بخود سمجھ جائے گی۔

اپنے بچپن کا ایک ناقابل فراموش واقعہ بیان کرتے کئی بار آنسہ عظیم کی آواز بھرائی تھی۔ زبان لڑکھڑائی اور آنکھ جھلملائی تھی۔ شدت جذبات سے ہونٹ لرز لرز جاتے تھے' مگر اس نے حرف بہ حرف بیان کیا تھا۔ اس کی قصہ گوئی میں تمام لوازمات موجود تھے۔

جزئیات نگاری' منظر نگاری' ڈرامائی وقفے' سسپنس کے ساتھ ساتھ تھرل ایکشن سب' مگر اس قصے میں ان

جاں نثاروں کے لیے محبت تھی، یقین تھا، اعتماد، بھروسہ.... عقیدت کیا کیا نہیں تھا۔

بولتے ہوئے کئی بار اس کے ہاتھ ٹھنڈے بھی ہوئے تھے۔ کبھی وہ سرتاپا کپکپا جاتی لڑکیاں ساکت تھیں، ایسے واقعات کو سن کر ایک منٹ کی خاموشی کے بعد ہم سب بھول جاتے ہیں۔

مگر جو لوگ ایسے واقعات کو جھیلتے ہیں یا پھر کسی نہ کسی طرح ان کا حصہ ہوتے ہیں۔ ان کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ وہ پھر زندگی کو کس آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ زندگی ان کے لیے کچھ اور ہی ہو جاتی ہے۔

وہ کچھ نظریات میں پکے ہو جاتے ہیں، کبھی نہ بدلنے کے لیے اور آنسہ عظیم کے ساتھ یہی ہوا تھا۔

ایک دنیا مخالفت و تضحیک (سچی یا جھوٹی) کا علم لے کر کھڑی ہو جاتی، مگر اس نے ایک انچ پیچھے نہ سرکنا تھا اس نے ہوش سنبھالنے سے پہلے کچھ چیزیں طے کر لی تھیں۔

کچھ خیالات جو پختہ ہو گئے تھے۔

ایک عقیدت جو نظریں اٹھانے ہی نہ دیتی تھی۔

ایک اعتماد جو کبھی ڈراتا ہی نہ تھا۔

ایک محبت جس کو جی بھر کے.... جو لطف اٹھایا وہ پھر اور کہاں۔

عینی نے پانی کا گلاس آنسہ عظیم کے لیے بھرا تھا۔

سب اسے گھونٹ گھونٹ پانی حلق سے اتارتے دیکھ رہی تھیں۔ وہ آگے کچھ اور کہنا چاہتی تھی یا بس کہہ چکی؟

"یہ بہت خاص مٹی سے ڈھلے لوگ ہوتے ہیں، ہماری ہی طرح دو ٹانگوں پر چلنے والے انسان.... دیکھنے میں ہم جیسے لگتے ہیں ہم ہی سے ہوتے ہیں، مگر اصل میں یہ انسان بھی نہیں ہوتے، فرشتے بھی نہیں۔ آپ انہیں جن بھی نہ سمجھیے گا۔ وطن، مذہب، اقدار پر نثار ہو جانے والے کوئی اور ہی مخلوق ہوتے ہیں۔"

آنسہ کے حلق میں گولا سا اٹکا اس کی آنکھوں میں تقریباً" چوبیس پچیس برس پہلے کا واقعہ ایک فلم کی طرح چل رہا تھا وہ ہوا میں اڑتے گڈے کو دیکھ رہی تھی۔

وہ گراؤنڈ کے اوپر چکر پھیریاں کھاتے اس جنگی تربیتی جہاز کو دیکھ رہی تھی۔ کتنا آسان تھا اس بے نام پائلٹ کے لیے۔ اپنے دوسرے ساتھی کو اتار کے خود وہ کسی محفوظ جگہ کو کھوجتا رہا جہاں جہاز گرائے، تو نیچے کسی کا کوئی نقصان نہ ہو اور اس تلاش لاحاصل کے وقت وہ بخوبی جانتا تھا۔ وقت کم ہوتے ہوتے ختم ہو رہا تھا، یہاں تک کہ روئی کے گودام میں جہاز کی نوک دھنس گئی۔

اس نے کو پائلٹ کو پیراشوٹ دے کر اتار دیا۔ وہ خود کیوں نہ اترا؟ چھوڑ دیتا جہاز کو ڈانواڈول.... اور خود باحفاظت اتر آتا۔

اس نے ایسا کیوں نہ کیا کسی کے پاس ہے جواب....

میرے ہیرو نے میرے لیے زندگی قربان کر دی۔

اس نے میرے خاطر جان دے دی۔ اس سے زیادہ کوئی کیا کر سکتا ہے کسی کے لیے؟"

آنسہ عظیم کو کھلے بالوں، فراک نیکر پاؤں میں پلاسٹک کی رف جوتی پہنے روڈ پر اندھا دھند بھاگتی آتی بچی دکھائی دے رہی تھی۔

جسے "گڈے" کو حاصل کرنا تھا۔

دھونکنی کی طرح چلتا سانس اور مسلسل بھاگتی آتی....

آنسہ عظیم کی آنکھیں ایک بار پھر بھر آئیں۔ اس نے اپنے کاغذ سمیٹنے شروع کر دیے تھے وہ کھڑی ہو چکی تھی۔ یہاں مزید ٹھہرنا اب مشکل لگ رہا تھا۔ مگر باہر کی جانب قدم بڑھاتے بڑھاتے وہ رک گئی۔

"میرا ہیرو ایک فوجی تھا۔

ایک نے میری خاطر جان قربان کر دی اور دوسرے کو میں پا نہیں سکی۔"

اپنی بات کہہ کر پھر آنسہ عظیم سے رکا نہ گیا۔ وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

پیچھے پھیلا سناٹا اونچی اونچی آواز میں چلا رہا تھا۔

زبان بند تھی اور دل بول رہا تھا۔

اور دل کی بولی سمجھنے کے لیے دل والا ہونا ضروری ہوتا ہے۔

عمیرہ احمد

فرزند نازنین!

ایک دفعہ ایک کشتی میں سوار ہوا ایک بادشاہ
ساتھ ایک عجمی غلام کے
اور غلام نے نہ دیکھا تھا کبھی دریا
اور نہ کبھی اٹھائی تھی کشتی کی تکلیف
لگا وہ رونے دھونے' اور کانپنے لگا اس کا بدن
کرکرا ہوگیا اس سے بادشاہ کا سارا مزہ'
کہ نہیں سہ سکتی تھی اس کی نازک طبع ایسی باتوں کو
لوگوں کی سمجھ میں نہ آئی کوئی تدبیر
تھا اس کشتی میں ایک عقل مند بھی
بولا وہ بادشاہ سے۔ "اگر ہو حکم... تو خاموش کراؤں
اس کو ایک طریقے سے؟"
کہا بادشاہ نے۔ "بڑی مہربانی ہوگی۔"
سو مطابق اس دانا آدمی کے حکم کے'

چھبیسویں قسط

لوگوں نے پھینکا غلام کو دریا میں
کھائے غلام نے چند غوطے
پھر پکڑا لوگوں نے اس کو سر کے بالوں سے
اور لائے کشتی کے آگے
وہ غلام لٹک گیا دونوں ہاتھوں سے کشتی کے دنبالے
میں
پھر جب نکلا دریا سے تو ایک گوشے میں
بیٹھ گیا اور اس کو سکون ہو گیا۔
ہوا بادشاہ کو تعجب، پوچھا اس نے
"کیا تھی دانائی اس عمل میں؟"
جواب دیا عقل مند نے کہ
غلام نے اس سے پہلے نہ اٹھائی تھی
تکلیف ڈوبنے کی اور وہ ناواقف تھا
کشتی میں محفوظ رہنے کی قدر سے
آرام کی قدر وہی کرتا ہے
جو پھنس جائے کسی مصیبت میں۔

اے پیٹ بھرے! تجھے اچھی معلوم نہیں ہوتی جو
کی روٹی۔
جو چیز تجھے بری معلوم ہوتی ہے وہ ہی میرے لیے
بھلی ہے
بہشت کی حوروں کے لیے
اعراف دوزخ ہے۔
دوزخیوں سے پوچھ'
کہ اعراف بہشت ہے!
(ایک رائے کے مطابق اعراف جنت اور جہنم کے
اس درمیانی مقام کو کہا جاتا ہے جہاں وہ لوگ کھڑے
ہوں گے جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہو جائیں گی۔)
(حکایت سعدی از کتاب گلستان سعدی)
آسمان پہ سورج سنہرے تاروں کا جال بن کر سب
کے سروں پہ تانے کھڑا تھا۔ مورچال کی سبز بیلیں اس
دھوپ میں جھلس رہی تھیں۔ حالانکہ ابھی صبح بھی
پوری طرح باسی نہیں ہوئی تھی۔ کچن کی کھڑکی سے

مکمل ناول

جھاؤنو ٹیلائیڈز کے پینلز سے گول میز دکھائی دیتی تھی جس کے گرد وہ دونوں بیٹھے تھے۔ زمر سیاہ کوٹ پہنے، گھنگریالے بال آدھے باندھے، چائے کے گھونٹ بھرتی غور سے سعدی کو دیکھ رہی تھی جو قدرے گم صم سا بیٹھا تھا۔ گہرے سبز کرتے میں ملبوس، گیلے بال برش کیے، وہ تازہ دم اور تیار تھا۔ البتہ آنکھیں اداس تھیں۔ غائب دماغی سے کپ کے کناروں پہ انگلی دائرے میں پھیر رہا تھا۔

زمر نے نرمی سے اسے پکارا۔ "سعدی!"

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"آج تم کٹہرے میں کھڑے ہو گے اور تم سے جرح کی جائے گی۔ تم نروس ہو؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"یہ موقع تو آنا ہی تھا، جب تم نے اس عدالتی جنگ کو شروع کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو میں نے تب ہی تمہیں بتا دیا تھا کہ یہ موقع آئے گا۔ تمہیں کٹہرے میں جانا ہو گا۔ پہلے میں تم سے سوال کروں گی، پھر وہ تم سے جرح کرے گا۔ تم خود کو کیسے پریزنٹ کرتے ہو، یہ تم پہ منحصر ہے۔"

"میں ٹھیک ہوں اور میں ٹھیک ہی رہوں گا۔" وہ ذرا سا مسکرایا۔

"کوئی بھی سوال جس کا جواب مشکل لگے، تو کہنا، مجھے یاد نہیں۔ جس سوال کے جواب میں سچ نہ بولنا ہو تو کہنا، جیسا کہ میں نے اپنے انٹرویو میں کہا تھا۔۔۔ اور پھر انٹرویو والی لائن دہرا دینا۔"

"یہ غلط بیانی تو ہو گی نا۔ پتا نہیں مجھ میں اور ہاشم میں کیا فرق رہ جائے گا جب ہم دونوں جھوٹ بولیں گے تو؟" وہ تلخی سے بولا۔

"محتاط الفاظ کا چناؤ جھوٹ بولنا نہیں ہوتا قانون میں۔ اور ہمیں ایک پورے معاشرے کو ایسے لوگوں سے پاک کرنے کے لیے ایسی چھوٹی موٹی غلط کاریوں کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔"

"صحیح! خود کو بہلانے کو یہ خیال اچھا ہے۔ خیر۔"

اس نے سر ہلاتے ہوئے گہری سانس لی۔ "اور اگر اس نے مجھ سے کچھ ایسا پوچھا جو۔۔۔ جو میں نے آپ کو بھی نہ بتایا ہو تب؟"

زمر چند لمحے اس کی بھوری آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ "تم نے مجھے کیا نہیں بتایا؟"

سعدی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرا کر شانے اچکائے۔ "مجھے یاد نہیں۔" اور وہ دونوں ہنس پڑے، مگر وہ ذرا فکرمند ہو گئی تھی۔

"وکیل سے کچھ نہیں چھپاتے سعدی! مجھے بتاؤ۔"

وہ آخری گھونٹ بھرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر کپ رکھ کر بولا۔ "جیسا کہ میں نے اپنے انٹرویو میں کہا تھا، مجھے یاد نہیں۔"

"اگر تم سے کچھ ایسا ہوا ہے جو جرم کے زمرے میں آتا ہے تو تم مجھے بتا سکتے ہو۔"

"میں نہیں بتانا چاہتا، لیکن اگر اس نے مجھ سے اس بارے میں پوچھا تو مجھے کیا کہنا چاہیے؟"

"سچ بولنا۔ بالکل سچ۔" وہ تاکید کرتے اٹھ گئی۔

جب وہ بیگ اور فون لیے لاؤنج میں آئی تو سامنے ندرت کے کمرے میں کھڑی حنین تیار ہوتی نظر آرہی تھی۔ قریب میں ہی فارس بھی ندرت کے ساتھ صوفے پہ بیٹھا تھا۔ زمر چوکھٹ پہ ٹھہری تو حنین نے اسے دیکھا۔ پھر فوراً بولی۔

"میں آج بھی کورٹ جاؤں گی۔ پلیز کوئی منع نہیں کرے گا۔ جب آپ وہ جعلی ای میل دکھائیں گی تو مجھے ہاشم کا چہرہ دیکھنا ہے۔"

اور وہ جانتی تھی وہ اس موقع پہ اپنے ہاتھ پہ کیا لکھ کر اسے دکھائے گی۔ سوچ کر ہی مزا آتا تھا۔ سوچ کر ہی تکلیف ہوتی تھی۔

"ہاں آجاؤ۔" پھر فارس کو دیکھا۔ "تم نہیں آؤ گے۔"

"موڈ نہیں ہے۔" اس نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔

زمر نے گہری سانس لی۔ "پتا نہیں تم کب اس

ٹرائل کو سنجیدہ لو گے۔"

"جس دن تم لوگ یہ ٹرائل ہار جاؤ گے۔" وہ تپانے والی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔ زمر ہونہہ کر کے باہر نکل گئی۔

ندرت نے خفگی سے اسے دیکھا۔ "منہ سے بدفال نہ نکالا کرو۔ کیوں ہاریں وہ مقدمہ؟ دعا کیا کرو کہ جیت جائیں۔"

"ہاں جی! بالکل ایسا ہی ہو گا۔" وہ برا سا منہ بنا کر چپ ہو گیا۔ ندرت اٹھ گئیں تو بال برش کرتی حنین اس کی طرف گھومی۔ وہ پیر میز پہ رکھے نیم دراز سا' آنکھیں چھت پہ مرکوز کیے کسی سوچ میں تھا۔

"آپ کو لگتا ہے کہ ہم ہاشم کو عدالت میں کبھی مات نہیں دے سکتے؟" فارس نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"مجھے لگتا نہیں ہے' مجھے یقین ہے۔ یہ جو کورٹ میں سارے جج بیٹھے ہوتے ہیں نا' یہ اس بات کا فیصلہ نہیں کرتے کہ کون سچا ہے۔ اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ کون زیادہ اچھا جھوٹ بولتا ہے۔"

"مگر بجائے ان کی مخالفت کرنے کے ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیے۔"

"تم کرو۔ میں دیر سے آؤں گا۔" اس نے سر جھٹکا۔ باہر کورٹ جانے کی تیاری کا شور مچ چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

اتنی شہرت بھی کہاں چاہی تھی خود سے میں نے

اپنے ہی شہر کا ہر شخص عدو میرا ہے

قصر کاردار کا لان اس صبح بارونق لگ رہا تھا۔ ملازموں کی آمدورفت لگی ہوئی تھی۔ شہرین گھوم پھر کر ایونٹ آرگنائزر کو سمجھا رہی تھی کہ اسے کون سی چیز کہاں چاہیے۔ اس کے سنہری بال پچھلے سال کی بہ نسبت لمبے ہو گئے تھے اور اونچی پونی کی صورت گردن کی پشت پہ جھول رہے تھے۔ ماتھے پہ بل لیے اور ناک چڑھائے' وہ سونیا کی سالگرہ کی دعوت کے تمام انتظامات دیکھ رہی تھی۔

اندر ڈائننگ ہال میں بیٹھی جواہرات چمچ دلیے کے پیالے میں ہلاتی' مسکراتی نظروں سے باہر دیکھ رہی تھی۔ ایک فاتحانہ نظر اپنے مقابل بیٹھے نوشیرواں پہ ڈالی (ہاشم اب سربراہی کرسی پہ بیٹھتا تھا اور وہ دونوں اس کے دائیں بائیں۔) نوشیرواں سوٹ میں ملبوس' بے دلی سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ جواہرات کو پچھلے برس کے یہ دن یاد آئے۔ تب شہری کے لیے کیسے وہ بے چین رہتا تھا۔ شکر! یہ بھوت تو اترا۔

"تو آج سعدی یوسف کٹہرے میں آئے گا اور اس سے جرح کی جائے گی۔" اس نے سعدی کا ذکر چھیڑا۔ آج بھی نوشیرواں کا حلق کڑوا ہوا مگر وہ اظہار نہیں کر سکا۔ آج اسے گولی مارنے کی خواہش بھی نہیں ہوئی۔ گولی مار کے دیکھ لی تھی۔ کوئی فائدہ نہ تھا۔

"ہاں' آج ہم حکایت سعدی سنیں گے۔" ہاشم نے طنزاً کہا تھا۔

"تمہیں یقین ہے وہ جھوٹ نہیں بولے گا؟"

"وہ سعدی ہے۔ وہ اسٹینڈ پہ جھوٹ نہیں بولے گا۔" ہاشم فون دیکھتے ہوئے اٹھ گیا تھا۔ "اور اسے ضرورت بھی نہیں ہے۔"

وہ ڈائننگ ہال عبور کر کے لاؤنج تک آیا تھا تو سامنے سے رئیس آتا دکھائی دیا۔ اس کے تاثرات دیکھ کر ہاشم رک گیا۔ لاؤنج کے کونے میں کرسی پہ بیٹھے' لیپ ٹاپ سامنے رکھ کر کام کرتے احمر شفیع کی حسیات بھی ادھر ہی متوجہ ہو گئیں۔

"سر' یہ دیکھیں! یہ کولمبو سے ہماری ٹیم کو ملا ہے۔"

ہاشم نے کاغذ پکڑتے ہوئے جیب سے عینک نکالی۔ "کیا ہے یہ؟"

"فصیح کی لاش مل گئی ہے۔ گواہوں کے مطابق وہ سعدی یوسف کو قتل کرنے گیا تھا۔ مگر سعدی نے اسے مار ڈالا۔ فصیح اب صرف غائب نہیں ہے' وہ مر چکا ہے۔"

رئیس کی آواز نے جہاں ہاشم کو چونکایا وہیں مزے اور اطمینان سے دلیہ کھاتی جواہرات کے ہاتھوں

سے پیچھے پھسلا۔ اس کا رنگ فق ہوا تھا۔ نوشیرواں بھی سر اٹھا کر دیکھنے لگا۔

"دیس از گڈ!" ہاشم دلچسپی سے کاغذ دیکھ رہا تھا۔ "لیکن فصیح کو اسے زندہ گرفتار کرنے کا حکم تھا' اس نے اسے مارنے کی کوشش کیوں کی؟"

"ہارون صاحب سے بات ہوئی ہے۔ وہ خود شاکڈ ہیں۔ فصیح ان کا دایاں ہاتھ تھا۔ وہ کبھی بھی اس کو موت کی طرف نہیں دھکیلیں گے۔"

"پھر فصیح کیوں مارنا چاہتا تھا سعدی کو؟ سیلف ڈیفنس کے علاوہ تو سعدی اسے کبھی قتل نہیں کرے گا۔" وہ سر جھکائے کاغذ پڑھتا' سوچتے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "کوئی ٹھوس ثبوت ہے کہ فصیح کو سعدی نے ہی مارا ہے؟"

"کافی شاپ کی مالکن نے بتایا ہے کہ وہ اس کے ساتھ نکلا تھا۔ سی سی ٹی وی فوٹیج میں بھی فصیح اس کو یرغمال بنا کر آگے لے جاتا دکھائی دیا تھا۔ مگر بعد میں سعدی زندہ سلامت واپس آگیا اور فصیح کی مسخ شدہ لاش کھائی سے ملی۔" احمر چہرہ اٹھائے ہکا بکا سا دیکھ رہا تھا۔

دور بیٹھی جواہرات بے اختیار اپنی گردن کی پشت ہاتھ سے دبانے لگی۔ پھر اس نے سیل اٹھایا اور آب دار کو میسج لکھا۔ "مجھے میری امانت آج رات تک مل جانی چاہیے۔"

ہوا کے دوش پہ وہ پیغام اڑتا ہوا... پہاڑ... جھیل... سرسبز میدان عبور کرتا... ہارون عبید کی رہائش گاہ کی دیواروں کے پار گھسا اور آب دار کی بیڈ سائیڈ ٹیبل پہ رکھے موبائل کو چمکا گیا۔

تھرتھراہٹ پر اس نے خود پر سے لحاف ہٹایا۔ سرخ سلکی بال تکیے پہ بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ان کو چہرے سے ہٹاتی اٹھی اور موبائل ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگی۔ پیغام پڑھ کر اس نے کچھ نہیں لکھا۔ جیسے توجہ ہی نہ دی ہو۔ عادتاً "کانٹیکٹ لسٹ کھولی۔ اور عادتاً "فارس کے نام پہ کلک کیا۔ اس کا لاسٹ سین دیکھا۔ اندازہ لگایا کہ وہ اب کیا کر رہا ہوگا اور مسکرا کر فون رکھنے لگی۔ یک دم ایک خیال آیا۔ بلی سی آنکھوں میں چمک ابھری۔ لب دانتوں میں دبائے اس نے پیغام لکھا۔

"یاد ہے فارس! میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ملکہ نے دونوں قیدیوں کے قتل کا حکم دیا ہے۔ میرے پاس ثبوت ہے۔ اگر چاہیے تو آج ڈنر پہ میں آپ کا انتظار کروں گی۔"

اور پیغام بھیج دیا۔ لبوں پہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اب تو وہ ضرور آئے گا۔ اسے یقین تھا۔

☆ ☆ ☆

میں اپنے روٹھے ہوئے قبیلے کی سازشوں میں گھرا ہوا ہوں
تم اجنبی ہو تو میرے آنگن کی وسعتوں سے ڈرے نہ رہنا

کورٹ روم میں اواخر اپریل کی دھوپ کھڑکیوں سے چھن کر اندر گر رہی تھی۔ سعدی یوسف کٹہرے میں کھڑا تھا اور زمر اس کے سامنے تھی۔ چند قدم پیچھے۔ اس سے سوالات پوچھ رہی تھی۔

"پلیز ریکارڈ کے لیے اپنا نام بتائیے۔"

"سعدی ذوالفقار یوسف خان۔"

"آپ کہاں پیدا ہوئے تھے؟" وہ سنجیدگی سے رسمی کارروائی دہرا رہی تھی۔ ہاشم خاموشی سے اسے سن رہا تھا۔ اس کے ساتھ رکھی احمر کی کرسی خالی تھی۔

باہر کچہری کے ہجوم میں ایک راہداری میں احمر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ تیز تیز۔ ہجوم میں بالکل گم۔ احتیاط سے آگے پیچھے بھی دیکھ لیتا تھا۔ پھر تیزی سے ایک موڑ مڑ کر وہ کمرے میں داخل ہوا۔ یہ ایک خالی کورٹ روم تھا۔ کرسیاں اور میزیں الٹی سیدھی پڑی تھیں۔ اندر آتے ہی اس نے دروازہ بند کیا اور پھولے سانس کے ساتھ واپس گھوما۔ سامنے ایک کرسی پہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے فارس بیٹھا تھا۔ منہ میں مسلسل کچھ چبا رہا تھا۔ سر سے پیر تک ناپتے ہوئے احمر کا جائزہ لیا۔

"تو کیا ایمرجنسی تھی اسٹیپنی؟ تمہارے مالک ادھر پاس ہی ہیں۔"

"ایک مسئلہ ہوگیا ہے۔ بلکہ دو مسئلے۔" اس نے کرسی کو فارس کے سامنے رکھا اس پہ بیٹھا اور آگے کو جھک کر' ہاتھ باہم پھنسائے پریشانی سے بتانے لگا۔

"کیا ہوا ہے؟" فارس نے گہری سانس لی۔

"ہاشم کے پاس عدالت میں پیش کرنے کے لیے خطرناک مواد ہے۔"

فارس نے ہاتھ جھلا کر گویا ناک سے مکھی اڑائی۔

"عدالت کی پروا کسے ہے؟"

"غازی! تمہیں اس کیس کو سیریس لینا ہوگا۔ ہاشم کے پاس ثبوت ہے کہ سعدی نے دو قتل کیے ہیں اور کچھ دیر بعد وہ عدالت میں سعدی سے یہ بات پوچھے گا۔"

فارس کا مسلسل چلتا منہ رکا۔ وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔ "دو قتل؟" اسے دھچکا لگا تھا۔

"ہارون عبید کے ملازم فصیح کی لاش مل گئی ہے۔ عینی شاہدین نے سعدی کو اس کے ساتھ دیکھا تھا۔ اسے سعدی نے مارا ہے۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ شدت حیرت سے ہکلایا۔

"ایسا ہو چکا ہے۔ تم لوگوں کو سعدی کو یہ بات بتانی ہوگی تاکہ وہ ذہنی طور پہ تیار رہے۔"

"دو قتل!" وہ اب بھی بے یقینی سے دہرا رہا تھا۔ پھر نفی میں سر ہلایا۔ "یہ میرے جانے کے بعد ہوا ہوگا۔ مجھے اسے وہاں نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔"

"اور تم نے اسے مشورہ دیا تھا افغانستان کے راستے سے ملک میں آنے کا؟"

فارس بالکل ساکت رہ گیا۔ "تمہیں کیسے پتا؟"

"کسی نے سعدی کا پاسپورٹ ہاشم کو بھیجا ہے۔ اس پہ سعدی کا نام حیدر ہمایوں خان ہے۔ اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ افغانستان کے راستے سے آیا ہے۔ واپس۔"

فارس بے یقینی سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ "یہ ناممکن ہے۔ سعدی اپنا پاسپورٹ ڈسپوز آف کر چکا ہے۔"

"کسی نے اس کے پاسپورٹ کے ٹکڑے جمع کر کے ہاشم کو بھیج دیے ہیں۔ افغانستان کے ذریعے آنے کا فیصلہ درست تھا' لیکن اب یہ چیز اس کو دہشت گرد بھی ثابت کر سکتی ہے۔ تمہیں اس کیس کو سیریس لینا ہوگا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" وہ اب اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بار بار پیشانی چھوتا تھا۔ نفی میں سر ہلاتا تھا۔ "سعدی کا پاسپورٹ ان کے ہاتھ نہیں لگ سکتا۔ سعدی نے خود مجھے بتایا ہے کہ وہ اسے ختم کر چکا ہے۔ سعدی ایسا غیر ذمہ دار نہیں ہے۔"

"مگر اب ایسا ہو چکا ہے۔ میں نے خود وہ پھٹا ہوا پاسپورٹ دیکھا ہے اور ہاشم نے مجھے اس کا میسج دکھا کر اسے ٹریس کرنے کو کہا' مگر میں نہیں کر سکا۔ اس شخص کا نمبر مکمل طور پہ ان کرپٹڈ ہے۔ تمہیں اب کچھ کرنا ہوگا۔ کیونکہ کوئی ہے جو اسے سعدی کے بارے میں معلومات دے رہا ہے اور یہ تمہارے قریب کا کوئی بندہ ہے۔"

فارس نے چونک کر اسے دیکھا۔ ناگواری سے اس کے ماتھے پہ بل پڑے۔ اسے جیسے برا لگا تھا۔ "ہمارے قریب ایسا کوئی بندہ نہیں ہے جو ہمارے ساتھ یوں دھوکا کرے۔"

"سب کے قریب دھوکے باز ہوتے ہیں۔ میں بھی تو ہاشم سے اس وقت دھوکا ہی کر رہا ہوں نا۔"

"نہیں۔" اس نے قطعیت سے نفی میں سر ہلایا۔ وہ شدید ڈسٹرب لگ رہا تھا۔ "ہمارے قریب ایسا کوئی نہیں ہے۔ یہ ہاشم کا کوئی بندہ ہے۔"

"مسز زمر نے مجھے بتایا تھا کہ دو ماہ پہلے تمہاری بھانجی کے کمرے سے وہ میموری کارڈ چوری ہو گیا تھا جس میں میرا اعمال نامہ موجود ہے۔"

"وہ یقیناً" کاردار کا بھیجا ہوا کوئی بندہ ہوگا۔ میں نے بہت ڈھونڈا' مگر کوئی سراغ نہیں ملا' لیکن میں نہیں مان سکتا کہ ہمارے گھر میں سے کوئی ایسا کر سکتا ہے۔"

"ہاں ہو سکتا ہے کہ باہر کا کوئی بندہ ہو، مگر میں جانتا ہوں کہ اسے کیسے پتا چلا ہو گا کہ کارڈ تمہاری بھانجی نے کہاں رکھا ہے۔" احمر نے گہری سانس لے کر کہا۔ "حنین نے کارڈ کی فائلز دیکھتے ہی مجھے کال کی تھی۔ کارداروں کے علاوہ بھی یقیناً" کوئی تمہارے فون ٹیپ کر رہا ہو گا۔ اس کال کے بعد ہو سکتا ہے کہ اس شخص نے حنین کے لیپ ٹاپ کو rat (ریٹ) کر کے اس کا ویب کیمرہ آن کر لیا ہو۔ آج کل یہ بہت آسان ہے اور اس نے دیکھ لیا ہو کہ حنین اپنے کمرے میں وہ کارڈ کہاں رکھ رہی ہے۔"

اب کے فارس نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ "کہیں یہ سب تم تو نہیں کر رہے۔" پھر سر سے پیر تک اسے دیکھا۔ "حنین نے کہا تھا اس سرخ مفلر والے آدمی کا قد چھوٹا تھا۔"

"اللہ کو مانو۔ مجھے یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" احمر برا مان گیا تھا۔ "اور اگر میں یہ کرتا تو پھر اپنی جان پہ کھیل کر تمہیں آگاہ کرنے کیوں آتا؟ سعدی کہتا ہے کہ اس کی یو ایس بی کی فائلز ڈیلیٹ کر دی گئیں، اب اس میں صرف فروزن پڑی ہے۔ سعدی کا ایئر پورٹ سے پیچھا کیا جاتا ہے اور اس کا پاسپورٹ چوری کیا جاتا ہے۔ حنین کے کمرے سے ایک کارڈ چوری ہو جاتا ہے۔ غازی یہ تمہارے قریب کا کوئی بندہ ہے۔" وہ پریقین تھا۔

فارس کے کان سرخ ہو گئے اور وہ شدید بے بس اور غصے میں نظر آرہا تھا۔ "وہ جو بھی ہے میں اسے ڈھونڈ لوں گا اور میں واقعی اس کی جان لے لوں گا۔"

"اور کیس کا کیا کرو گے؟ نوشیرواں کو سزا دلوانی ہے یا نہیں؟" فارس چند لمحے چپ رہا، پھر گہری سانس لے کر ایک عزم سے بولا۔

"پہلے مجھے اس کیس میں دلچسپی نہیں تھی لیکن اب۔۔۔ اگر ہاشم اس طرح کے اوچھے ہتھکنڈوں پہ اتر آیا ہے تو ٹھیک ہے۔ ہم سب مل کر اس کیس میں اس کو ٹف فائٹ دیں گے۔"

"گڈ!" احمر نے مسکرا کر اس کا شانہ تھپکا۔ فارس نے اپنا کندھا بےزاری سے پیچھے کیا۔

"اب جاؤ۔ تمہاری مالکن تمہیں مس کر رہی ہو گی۔" احمر جاتے جاتے مڑا اور تنک کر اسے دیکھا۔

"ظاہر ہے۔ ملازم پیشہ آدمی ہوں، مگر سوسوری۔۔۔ تم جیسے جاب لیس فارغ لوگ کیا جانیں کہ ملازمت کیا چیز ہوتی ہے۔"

"جا۔۔۔ جا۔ دماغ خراب نہ کر میرا۔" اس نے غصے سے دروازے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ شدید مضطرب نظر آرہا تھا۔

☼ ☼ ☼

چلے جو ذکر۔۔۔ فرشتوں کی پارسائی کا
تو زیر بحث مقام بشر بھی آتا ہے

"یور آنر" (آپ کا گواہ) زمر کٹہرے کے سامنے سے پیچھے اتر آئی تھی اور ہاشم کو اشارہ کیا تھا۔ اب گواہ اس کا تھا۔ جیسی چاہے جرح کرے۔

جب وہ نیچے آکر بیٹھی تو پیچھے سے کسی نے اسے ٹہوکا دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ پچھلی نشستوں پہ فارس آبیٹھا تھا اور اس کے کہنے پہ حنین اٹھ کر جنگلے تک آئی تھی اور پین سے زمر کے کندھے کو چھو کر اس طرف توجہ دلا رہی تھی۔ زمر نے فارس کو دیکھا۔ وہ قدرے مضطرب سا اسے اشارے میں کچھ بتا رہا تھا، زمر نے لبوں پہ انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور واپس گھوم گئی۔

"چڑیل۔" وہ بے بسی سے بڑبڑایا تھا۔ زمر اس کی پروا کیے بغیر سنجیدگی سے سامنے دیکھ رہی تھی جہاں ہاشم، سعدی کے مقابل، مگر چند قدم پیچھے کھڑا تھا۔ مسکراتے ہوئے اس نے چند کاغذ لہرائے۔

"کیا آپ کمار نامی اس سنہالی باشندے کو جانتے ہیں؟ یا کیا آپ فصیح نامی اس پاکستانی باشندے کو جانتے ہیں سعدی یوسف؟ کیونکہ ہمارے پاس مصدقہ اطلاعات ہیں کہ کمار کو زہر کا ٹیکہ لگا کر اور فصیح کو گردن

توڑ کر آپ نے قتل کیا ہے۔ کیا آپ اللہ کو حاضر ناظر جان کر اپنے انٹرویو کا حوالہ دیے بغیر بتائیں گے کہ آپ ان دو لوگوں کے قاتل ہیں یا نہیں؟"

بہت سی سانسیں ایک ساتھ رکی تھیں۔ حنین بالکل سن ہو گئی۔ اسامہ شل ہو گیا۔ احمر نے فکرمندی سے گہری سانس لی۔ جواہرات مسکرائی۔ نوشیرواں بے چین ہوا۔ فارس نے اضطراب سے پہلو بدلا۔ ایسے میں زمر نے گردن موڑ کر فارس کو دیکھا اور پلکیں جھپک کر اسے تسلی دی۔ صرف وہ پرسکون تھی یا سعدی جو کٹہرے میں گردن تانے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پہ اطمینان تھا۔ پھر وہ دھیرے سے بولا۔

"کیا آپ اپنا سوال دہرائیں گے مکار دار صاحب؟"

کمرہ عدالت میں پھر سے مقدس سا سناٹا چھا گیا۔

"سعدی یوسف کیا آپ نے ان دو افراد کا قتل کیا ہے؟" ہاشم نے تصاویر پھر سے دکھاتے ہوئے چبا چبا کر پوچھا۔ زمر کھڑی ہوئی۔

"آبجیکشن یور آنر۔ اس سوال کا کیس سے کیا تعلق ہے؟"

"تعلق ہے یور آنر۔ ہمیں عدالت کو دکھانا ہے کہ الزام لگانے والا خود کیسے کردار کا حامل ہے۔"

"یور آنر! اگر وکیل دفاع کو سعدی یوسف پہ قتل کا الزام لگانا ہے تو اس کے لیے وہ الگ سے پٹیشن دائر کر سکتے ہیں، لیکن قانون شہادت کے تحت وہ گواہ کو ڈس کریڈٹ کرنے کے لیے اس کے اوپر بغیر ثبوت کے ایسے الزام نہیں لگا سکتے۔" وہ بلند آواز میں بولی تھی۔

جج صاحب نے جواباً" ہاشم کو دیکھا۔ وہ فوراً" بولا۔

"یور آنر۔ قانون شہادت کے تحت اگر گواہ کا کردار کیس کی سچائی جاننے کے لیے ضروری ہے تو ایسے سوال پوچھے جا سکتے ہیں۔ مسز زمر کو قانون شہادت دہرانے کی اشد ضرورت ہے۔"

"یور آنر کیا ہمارا قانون آرٹیکل تیرہ میں یہ نہیں کہتا کہ کسی شخص سے زبردستی ان کرامنیٹنگ (یعنی ایسا سوال جس کے جواب میں مجرم کو اعتراف جرم کرنا پڑے) سوال نہیں پوچھا جا سکتا؟" وہ بحث کر رہی تھی۔

"دیگر یور آنرز" وہ ملزم کی دفعہ ہوتا ہے۔ جیسے نوشیرواں کے پاس خاموش رہنے کا حق ہے۔ سعدی یوسف اس کیس میں ملزم نہیں ہے۔ گواہ ہے۔ اور جہاں تک گواہ کی بات ہے تو قانون شہادت آرٹیکل 9 کے تحت کسی گواہ کو سیلف ان کریمینیشن کے باوجود خاموشی کا حق نہیں ہے۔ گواہ جواب دے گا۔ بھلے جواب میں اسے اعتراف جرم ہی کرنا پڑے۔ گواہ کو جواب دینا ہے۔" ہاشم دوبدو بولا۔

"دیگر یور آنر۔۔۔" زمر مزید کچھ کہنے لگی تھی کہ جج صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

"سعدی یوسف ملزم نہیں ہے گواہ ہے اور گواہ کا کردار جاننا واقعی ضروری ہے۔ اس لیے میں چاہوں گا کہ سعدی یوسف جواب دے۔ اعتراض رد کیا جاتا ہے۔"

جج نے سعدی کو اشارہ کیا۔ زمر گہری سانس لے کر بیٹھی۔ حنین نے بے اختیار دل پہ ہاتھ رکھا۔ فارس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ مٹھی لبوں پہ جمائے وہ فکرمندی سے سامنے کھڑے سعدی کو دیکھ رہا تھا۔

سعدی نے گہری سانس لی اور پھر بولا۔

"میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔"

"اور یہ بات آپ اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتے ہیں؟" ہاشم نے آواز میں تعجب بھر کے دہرایا۔

"جی ہاں۔ میں اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں نے ان دونوں آدمیوں کو قتل نہیں کیا۔"

"آپ کو معلوم ہے پرجری کیا ہوتی ہے سعدی یوسف؟ کورٹ میں جھوٹ بولنا کتنا بڑا جرم ہے؟" ہاشم اب تاسف سے پوچھ رہا تھا۔

"جی مجھے معلوم ہے۔ پرجری وہ ہوتی ہے جو ہاشم تم اپنے ہر گواہ سے یہاں کرواؤ گے، مگر میں جھوٹ نہیں بول رہا۔" اس نے اسی اعتماد سے چہرہ اٹھا کر جج

صاحب کو دیکھا۔ "میں نے اپنی پوری زندگی میں کسی انسان کو قتل نہیں کیا۔"

ہاشم نفی میں سر ہلاتا کاغذات لے کر جج کے چبوترے کی طرف آیا۔ "یور آنر' یہ دونوں قتل سعدی یوسف نے ہی کیے ہیں اور.... " مگر سعدی کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"میں نے ان دو انسانوں کی جان ضرور لی ہے یور آنر! مگر میں نے انہیں قتل نہیں کیا۔"

بہت سی سانسیں ایک دفعہ پھر رکی تھیں۔ چند لمحے کو تو ہاشم بھی سناٹے میں رہ گیا۔ جج صاحب ذرا مزید ترچھے ہو کر بیٹھے۔ وہ اب پوری طرح سے سعدی کی طرف متوجہ تھے۔

"یور آنر! کمار نامی گارڈ نے مجھے قتل کرنا چاہا تھا قید کے دوران۔ میں نے اپنے بچاؤ کے لیے اس کو مارا تھا۔ فصیح بھی مجھے قتل کرنے آیا تھا اور میں نے اپنے بچاؤ کے لیے اس کو بھی مارا۔ یور آنر! سیلف ڈیفنس کی عالمی تعریف کے مطابق یہ قتل نہیں ہوتا۔ دین میں یہ گناہ نہیں ہے۔ سو میں نے گناہ کیا ہے نہ قتل' میں نے صرف ان کو مارا ہے۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا' مگر میں ان کا قاتل نہیں ہوں۔ اپنی جان بچانے کے لیے مجھے ان کو مارنا تھا۔ یہ میرا حق تھا۔"

کمرہ عدالت میں عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ ہاشم نے بہت بار لب کھولے پھر بند کیے۔ اسے ایسے جواب کی توقع نہ تھی۔ نوشیرواں بالکل سن سا سعدی کا چہرہ ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ (وہ کیسے اتنے لوگوں کے سامنے کسی کو مارنے کا اعتراف کر سکتا ہے؟ اتنا بہادر وہ کیسے تھا؟)

ہاشم جج کی طرف متوجہ ہوا۔

"مگر ہم کیسے مان لیں کہ یہ سیلف ڈیفنس ہی تھا۔ یور آنر! سعدی یوسف ایک پاکستانی شہری ہے اور وہ دنیا میں جہاں کہیں بھی جرم کرے گا' پاکستان پینل کوڈ کا اطلاق اس پہ ہوگا۔ ملک واپس آنے پہ قانون کے مطابق اس سے تفتیش کی جائے گی اور اگر جرم ثابت ہو گیا تو سزا بھی سنائی جائے گی۔ یہ سیلف ڈیفنس تھا یا نہیں' اس کا فیصلہ بھی عدالت کرے گی۔ یور آنر! میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ سعدی یوسف کے اس اعتراف جرم کی بنا پہ ایک جے آئی ٹی تشکیل دی جائے جو اس کے ان جرائم کی تفتیش کرے اور پھر اسے پراسیکیوٹ کیا جا سکے۔"

"یور آنر!" زمر مسکرا کر کھڑی ہوئی اور چبوترے کی طرف بڑھی۔ "میرا خیال ہے کاردار صاحب کو اپنا کریمنل لاء دہرانے کی اشد ضرورت ہے۔"

سب کی نگاہیں سعدی سے ہو کر زمر کی طرف اٹھیں۔

"ایکسکیوز می؟" ہاشم نے ناگواری سے پوچھا تھا۔ زمر نے مسکرا کر کندھے اچکائے۔ "قانون شہادت کے جس آرٹیکل نائن کو مدنظر رکھتے ہوئے عدالت نے گواہ کو خاموش نہ رہنے کا حکم دیا ہے' جناب عالی! اسی آرٹیکل نائن میں لکھا ہے کہ گواہ... ملزم نہیں' گواہ... کو خاموشی کا حق حاصل نہیں ہے' چاہے اس کا بیان اس کے اپنے وجود کو ملوث جرم ظاہر کرے....." اس نے مسکرا کر ہاشم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وقفہ دیا۔ "بشرط یہ کہ اس بیان کی بنیاد پہ.... اگر دوسرے کوئی ثبوت یا گواہ نہ ہوں تو.... اس کو پراسیکیوٹ نہیں کیا جا سکتا۔" پھر جج کی طرف چہرہ کر کے فاتحانہ انداز میں بولی۔ "یور آنر ہمارا قانون کہتا ہے کہ گواہ کے اپنے اعتراف جرم پہ اس کو قانونی حفاظت حاصل ہے۔ ہاشم کاردار یا کسی کے پاس ایسے کوئی ثبوت یا گواہ نہیں ہیں جو سعدی یوسف کو مجرم ظاہر کریں۔ سعدی یوسف کے خلاف کہیں بھی کسی بھی قسم کا کوئی کیس اس ایک اعترافی بیان پہ نہیں کھولا جا سکتا۔ دراصل ہاشم کاردار اس بات کو صرف ایک اسکینڈل بنا کر سعدی کو ڈس کریڈٹ کرنا چاہتے ہیں' تو اس لیے میں چاہوں گی کہ معزز عدالت کاردار صاحب کو یہ یاد دلائے کہ عدالتی حکم نامے کے تحت کئی ہفتے سے اس ٹرائل پہ میڈیا میں بحث منع ہو چکی ہے اس لیے وہ ان باتوں کو میڈیا پہ

نہیں اٹھاسکتے۔"
ہاشم کا چہرہ بے بسی بھرے غصے سے متغیر ہوچکا تھا۔
"یور آنر' ایک آدمی اپنے منہ سے دو بندے مارنے کا اعتراف کر رہا ہے اور......"
"نہیں نہیں!" جج صاحب نے نفی میں سرہلاتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔ "مسز زمر کا پوائنٹ ویلڈ ہے۔ گواہ کو پروٹیکشن حاصل ہے' آپ نے اپنے منہ سے کہا ہے کہ سعدی یوسف اس کیس میں گواہ ہے۔ ملزم نہیں۔ اگر نوشیرواں کا ردار اپنے منہ سے اعتراف جرم کرتا تو عدالت اس کو پھانسی کی سزا فورا" سنا دیتی کیونکہ وہ اس کیس میں ملزم ہے۔ سعدی یوسف گواہ ہے اور گواہ کو قانونی حفاظت حاصل ہے۔"
"مگر یور آنر کم از کم......"
"آپ کو کوئی اور سوال پوچھنا ہے کاردار صاحب؟" اب کے جج صاحب نے تلخی سے پوچھا تھا۔ ہاشم چند لمحے غم و غصے سے وہیں کھڑا رہا۔ پھر گہری سانس لی اور سر جھٹکتا سعدی کے سامنے آیا۔
زمر مسکرا کر مڑی اور ایک چٹ جنگلے کے پیچھے کرسیوں پہ بیٹھی حنین کی طرف بڑھائی۔ حنہ جس کی جان میں جان آئی تھی' اس نے وہ چٹ فورا" سے فارس کو پاس کی جو بظاہر تنے تاثرات کے ساتھ بیٹھا تھا' مگر اعصاب اب ڈھیلے پڑ چکے تھے۔ اس نے کاغذ کھولا۔ اندر زمر نے لکھا تھا۔
"ڈیرسٹ ہسبینڈ...... یونیورسٹی کلاسز میں ہر وقت مجھے دیکھنے اور میری محبت میں گرفتار رہنے کے بجائے اگر تھوڑا بہت پڑھ لیا ہوتا تو آج یہ قانون معلوم ہوتا تمہیں...... چچ چچ!"
فارس نے استغفراللہ کہہ کر سر جھٹکا تھا۔ منہ کا ذائقہ کڑوا ہو گیا تھا۔ بازو بڑھا کر حنین کا قلم اچکا اور نیچے کچھ لکھا۔ پھر کاغذ تہہ کر کے آگے پاس کیا۔ ادھر ہاشم کی آواز گونج رہی تھی۔
"سونیا کی پچھلی سالگرہ پہ یعنی ایک سال پہلے کیا یہ درست ہے کہ آپ سب سے نظر بچا کر میرے کمرے میں گئے تھے؟"
"یہ درست نہیں ہے۔ میں نظر بچا کر نہیں' سب کے سامنے کھلم کھلا گیا تھا۔"
"کیوں؟"
زمر تک کاغذ پہنچا تو اس نے اسے کھولا۔ آدھی توجہ سعدی کی طرف تھی۔
"میں نے قانون پڑھ کے کرنا ہی کیا ہے؟ دنیا جہاں کے لوگوں کو انصاف دلانے کے لیے آپ موجود ہیں نا۔ میں تو آرام سے ڈنر کرنے جا رہا ہوں' اپنے سے پیچھے بیٹھی خوب صورت لڑکی کے ساتھ۔ وہ کہہ رہی ہے کہ اسے ایک ثبوت دینا ہے مجھے۔"
زمر نے اب کے گردن موڑ کر اسے گھورا تو آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ فارس نے آنکھوں میں سادگی لیے شانے اچکا دیے۔ زمر نے "ہونہہ" کر کے منہ واپس پھیر لیا۔ ادھر سعدی کہہ رہا تھا۔
"میں باتھ روم گیا تھا' اور چند منٹ میں واپس آگیا تھا۔"
"تو آپ میرے گھر سے کچھ چرا کر نہیں نکلے تھے؟"
"میں نے کوئی نیکلس یا زیور نہیں چرایا تھا۔ نہ کوئی نقدی وغیرہ۔"
"سعدی یوسف خان' مجھے صرف اتنا بتائیں کہ جب آپ نے گھر جا کر اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس میں سے کوئی نیکلس نکلا تھا یا نہیں؟"
"چونکہ میں نے کوئی نیکلس نہیں چرایا تھا اس لیے میں نے جب کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس میں سے کوئی نیکلس نہیں نکلا۔" اس نے مزے سے دہرا دیا۔ حنین نے گہری سانس لی۔ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ نیکلس حنہ نے اس کے کوٹ سے نکالا تھا' خود اس نے نہیں۔
"آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ خیر میں کیا کر سکتا ہوں۔ چلیے۔ یہ تصویریں دیکھیے' سعدی!" ہاشم اب اس کو پروجیکٹر اسکرین پہ چند شاٹس دکھا رہا تھا۔ "یہ ہارون عبید کے اس ہوٹل کے بیسمنٹ کی تصاویر ہیں جہاں مبینہ طور پہ آپ کو قید رکھا گیا' بقول آپ کے'

لیکن جب میڈیا کے نمائندے وہاں گئے تو یہاں جالے لگے تھے اور پرانا کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ اس بارے میں کیا کہیں گے؟" سعدی نے ایک نظر اسکرین کو دیکھا۔

"میرے یہاں سے نکلنے کے قریباً" ایک ماہ بعد میڈیا کے نمائندے یہاں گئے۔ ایسا سیٹ اپ لگانے کے لیے ایک دن بھی بہت ہوتا ہے۔"

"تو آپ ابھی بھی مصر ہیں کہ نوشیرواں کاردار نے آپ کو یہاں قید رکھا؟"

ہاشم نے مصنوعی تعجب ظاہر کیا۔ وہ کن اکھیوں سے زمر کو دیکھتا رہا' اس کے اٹھ کر آبجیکشن بولنے کا انتظار کرتا رہا' مگر وہ اطمینان سے بیٹھی قلم دانتوں میں دبائے رہی۔ اس نے اپنا گواہ تیار کر کے بھیجا تھا۔

"ذرا اس تصویر کو زوم کیجیے کاردار صاحب۔ یہ اس طرف سے۔" سعدی اطمینان سے انگلی اٹھا کر کہہ رہا تھا۔ ہاشم نے سر کو خم دیا اور متعلقہ جگہ سے زوم کیا۔

"یہ کونے میں دیوار۔۔۔۔" سعدی اشارہ کر کے جتانے لگا۔ "جی بالکل ان گندے کاٹھ کباڑ کے ڈبوں کے پیچھے دیوار پہ چند لکیریں نظر آرہی ہیں۔ عدالت میں جمع کروائی گئی تصاویر میں بھی یہ لکیریں واضح ہیں۔ ہارون عبید کے آدمیوں نے ان کو اس لیے چھوڑ دیا کہ شاید یوں یہ دیوار مزید خستہ لگے مگر یور آنر یہ پوری 247 لکیریں ہیں۔ 21 مئی سے 23 جنوری تک کے دن میں نے گن رکھے تھے۔ میں روز ایک لکیر کا اضافہ کرتا تھا۔ آپ ان کو گنوا کر دیکھ لیں۔ یہ اتفاق نہیں ہو سکتا کہ یہ بھی اتنی ہی ہوں جتنے دن میں قید میں رہا ہوں۔" وہ اعتماد اور سکون سے بول رہا تھا۔ ہاشم ایک دم لاجواب ہو گیا تھا۔ جج صاحب اب دلچسپی سے اس تصویر کو دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے فائل میں ایک نقطہ نوٹ کیا۔

"سعدی یوسف آپ کا کہنا ہے کہ آپ کو کاردارز کے آدمی نے پاسپورٹ دیا اور یوں آپ ملک واپس آگئے۔" ہاشم نے موضوع بدلا۔

"جی کاردارز میں سے ہی کوئی تھا۔"

حنین نے فوراً" ہی فارس کو دیکھا۔ (آدھا کاردار) وہ ڈھٹائی سے سامنے دیکھتا رہا۔

"لیکن آپ کے پاسپورٹ کے مطابق آپ افغانستان میں بھی رکے تھے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہاں آپ کا کیا کام تھا؟" اور یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی فائلوں کے درمیان سے ایک شفاف پیکٹ نکالا اور اوپر جج صاحب کے سامنے رکھا۔ سعدی بالکل سن رہ گیا۔ پاسپورٹ ٹکڑے ٹکڑے تھا۔ یہ وہی پاسپورٹ تھا جو اس نے پھینکا تھا۔ اب کے ہاشم نے فاتحانہ نظروں سے سعدی کو دیکھا۔

"کیا آپ کے افغان طالبان گروہوں سے تعلقات ہیں سعدی یوسف اور یہ سارا ڈراما آپ فساد پھیلانے کو کر رہے ہیں؟"

"ایسا کچھ نہیں ہے۔" سعدی بولا تو اس کی آواز غصے سے کانپی تھی۔

"آبجیکشن یور آنر۔ اس بات کا کیس سے کیا تعلق؟" وہ فوراً" کھڑی ہوئی۔

"اوور رولڈ۔ تعلق تو ہے۔" جج صاحب نے ہاتھ اٹھا دیے۔

"یور آنر! سعدی یوسف نے کہا کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ اگلی سماعت پہ دفاع اس بات کے خلاف Rebuttal (تردید) ثبوت پیش کرے گا جو یہ ثابت کر دے گا کہ سعدی یوسف طالبان کے آلہ کار کے سوا کچھ نہیں ہے۔" ہاشم نے سرد مہری سے جج صاحب کو اطلاع دی۔

"یور آنر میں دہشت گرد نہیں ہوں۔ میں نیسکام کا ایک انجینئر ہوں۔ میرے ساتھ زیادتیاں ہوئی ہیں۔" وہ پھٹ پڑا تھا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ "میں انصاف مانگنے آیا ہوں اس عدالت میں' یہ مجھے ایسے دہشت گرد برانڈ کیسے کر سکتے ہیں؟" اس کی آنکھیں گلابی پڑ رہی تھیں۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ زمر نے اسے کٹہرے سے اترنے کا اشارہ کیا۔ ہاشم نظر انداز کر کے اب اختتامی فقرے دہرا رہا تھا۔ وہ دل برداشتہ سا وہاں سے اترا۔

فارس اپنی نشست سے گھوما اور مڑ کر آبدار کو دیکھا۔

"آپ کے پاس واقعی کچھ ہے مجھے ڈنر پہ دینے کے لیے؟" سنجیدگی سے پوچھا۔ وہ تفاخر سے مسکرائی۔

"جی۔ ایک ٹائی پن کیمرے میں ریکارڈ مسز کاردار کا وہ حکم نامہ جو ثابت کرتا ہے کہ فصیح، سعدی کو مارنے گیا تھا۔ چاہیے تو جو وقت اور جگہ میں ٹیکسٹ کر رہی ہوں ادھر آجائیے گا۔ میں دو لوگوں کی ٹیبل بک کروا چکی ہوں۔"

"مجھے زبان دیں کہ آپ اسے ڈنر پہ ساتھ لائیں گی۔"

"وعدہ!" اس کی آنکھیں بہت محبت سے چمکی تھیں۔ وہ خاموش رہا۔

کورٹ روم سے سب سے پہلے آبدار نکلی تھی۔ پھر کاردارز۔ نوشیرواں نکلتے ہوئے بالکل شل سا کہہ رہا تھا۔ "اس نے دو قتل کا اعتراف کیا مگر اسے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ کیا پاگل پن ہے یہ؟"

"سوری سر مگر اسے of the Land Law کہتے ہیں۔" احمر اس کو سمجھاتا ہوا باہر جا رہا تھا۔ "یہ اس لیے ہوتا ہے تاکہ پولیس یا کوئی اور کسی سے جبری اعتراف جرم نہ کروا سکے۔ اور..." ان کی آوازیں مدہم ہوتی گئیں۔

وہ پانچوں ایک ساتھ باہر نکلے تھے۔ راہداری میں تیز بہتے ہجوم کے باوجود وہ رکے ہوئے تھے۔

"آپ نے بھائی...... دو لوگ......" حنین کہتے کہتے رک گئی۔ یہ وقت نہیں تھا ایسی باتوں کا۔ کیونکہ پہلی دفعہ سعدی پریشان لگ رہا تھا، اور فارس کو از سر نو غصہ چڑھ گیا تھا۔

"تم نے مجھے کہا تھا کہ تم نے وہ پاسپورٹ ڈسپوز آف کر دیا ہے۔ یہ ڈسپوز آف کیا ہے تم نے؟" وہ دبا دبا ساغرایا، ساتھ میں اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور بھی رہا تھا۔

"میں نے کر دیا تھا۔ مختلف جگہوں پہ پھینکا تھا۔ کسی کو کیا پتا میں ادھر آ رہا ہوں۔ کیسے کسی نے اس کو اٹھایا۔ پھر جوڑا۔" وہ سخت پریشان ہو گیا تھا۔

"اٹس او کے۔ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔" زمر نے بھاؤ سے کہتے ہوئے تسلی دی۔ "یہ تمہاری سیلف ڈیفنس موو تھی۔ تمہیں کوئی اس پہ کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتا۔ ہمیں اس وقت ڈاکٹر سارہ پہ فوکس کرنا ہے۔ ان کو گواہی دینی ہوگی، ہر حال میں۔"

فارس نے ایک ملامتی نظر ان دونوں پہ ڈالی اور سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ حنین اس کے پیچھے لپکی۔ شور ہجوم اور اس ساری چہل پہل کے درمیان میں سے گزرتی، وہ اس کی رفتار سے جا ملی۔

"تو ہاشم اب اس پاسپورٹ کے ذریعے بھائی کو دہشت گرد ثابت کرے گا؟ بھائی بہت ہرٹ ہوگا ماموں! ہم اس کا ہرٹ کیسے کم کریں؟" وہ فکرمند اور ناخوش لگتی تھی۔ فارس نے رفتار ہلکی کر دی، پھر چند گہری سانسیں اندر کھینچیں۔

"ہمیں اب اس بات کو یقینی بنانا ہوگا حنین کہ تمام گواہ درست گواہی دیں۔ اور سب سے پہلے ہمیں سارہ کو راضی کرنا ہوگا۔ ہمیں زمر اور سعدی کی مدد کرنی ہوگی اور اس ٹرائل کو سنجیدہ لینا ہوگا۔" وہ اب اسے سمجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ حنہ سر ہلاتی سن رہی تھی۔

"ٹیم زمر کی مدد کرنا...... سو بورنگ۔" وہ ناراضی سے بولی تھی۔

کچہری کے باہر بھی سیاہ شیشے والی کارز کی طویل قطار لگی تھی۔ جواہرات کو گو کہ ہر پیشی پہ آنے کی ضرورت نہ تھی لیکن وہ ہر دفعہ نیا سیاہ ڈیزائنر ڈریس اور نئی جیولری پہن کے ضرور آتی۔ اسے معلوم تھا کہ ہاشم جیت جائے گا، سو وہ اس سارے دورانیے میں بھرپور میڈیا کی توجہ سے فائدہ اٹھا رہی تھی۔

اس وقت بھی وہ اپنی کار میں آکر بیٹھی تو احمر فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا موبائل دیکھ رہا تھا۔ جواہرات نے ایک نظر نوشیرواں اور ہاشم کی گاڑیوں کو آگے نکلتے دیکھا پھر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"یہ آبدار فارس وغیرہ کے ساتھ کیوں بیٹھی

تھی؟"

"وہ تو دو ماہ سے ہر پیشی پہ آکر ادھر ہی بیٹھ جاتی ہیں۔ ظاہر یہ کرنا چاہتی ہیں کہ ہمارے ساتھ نہیں بیٹھنا ان کو۔" وہ موبائل سے کھیلتا ہوا بولا۔ کار اب سڑک پہ دوڑ رہی تھی۔

"اور تم کہاں تھے؟ آتے ساتھ ہی غائب ہو گئے۔ پھر تم اور فارس باری باری کورٹ روم میں داخل ہوئے۔ ہاں احمر؟" وہ نرم مگر گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ احمر نے پورے سکون سے چہرہ موڑا۔

"غازی نے بلایا تھا مجھے۔ وہ بات کرنا چاہتا تھا۔" وہ پورے اعتماد سے اسے بتا رہا تھا۔ "وہ اس مقدمے سے خوش نہیں ہے۔ آپ کے لیے یہ پیغام بھجوایا ہے کہ ڈاکٹر سارہ کو تنگ نہ کیجیے گا ورنہ وہ ہر حد تک جائے گا۔"

"تمہارا دوست رہا ہے۔ کچھ اور نہیں پوچھا اس نے تم سے؟"

"مگر میں اتنی آسانی سے بتانے والوں میں سے ہوتا تو آپ کی کار کی فرنٹ سیٹ پہ نہ بیٹھا ہوتا۔" مسکرا کر تابعداری سے بولا تھا۔ جواہرات کے لب بھی مسکراہٹ میں ڈھل گئے۔ سر کو خم دیا اور باہر دیکھنے لگی۔ اسے احمر پہ پورا اعتبار تھا۔

☆ ☆ ☆

جو سیلابوں کی رو میں بہہ گئے ہیں
کرے گا کون ان قبروں کا ماتم؟

سارہ کے گھر کے لونگ روم میں اس وقت شدید تناؤ کی سی کیفیت تھی۔ ایسے جیسے ہر شخص کی گردن سے ڈوریاں بندھی ہوں، اور ان ڈوریوں نے ساری فضا میں کھنچاؤ پیدا کر دیا ہو۔ کوئی ڈھیلا پڑنے کو آمادہ ہی نہ ہوتا تھا۔

"سارہ! اگر تم نے وہ سب کچھ دیکھا تھا تو تمہیں کسی سے تو کہنا چاہیے تھا۔" ندرت ملال سے کہہ رہی تھیں۔ پچھلے ڈھائی ماہ میں وہ یہ بات کئی دفعہ دہرا چکی تھیں۔ سامنے صوفوں پہ موجود زمر، فارس، حنین اور خود ذکیہ بیگم سب خاموش تھے۔ جب ندرت بولتیں تو وہ اسے دیکھتے، جب سارہ بولتی تو اسے۔ ٹینس کے میچ کی طرح نگاہیں دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں واپس آتیں۔

"آپا! آپ سب کچھ جاننے کے باوجود ایسا کیسے کہہ سکتی ہیں۔" سامنے والے سنگل صوفے پہ فکرمند، اور بے بسی بھرا دبا دبا غصہ لیے بیٹھی سارہ نے شاکی انداز میں کہا تھا۔ وہ ابھی آفس سے آئی تھی۔ بال جوڑے میں بندھے تھے۔ پرس ساتھ ہی رکھا تھا۔ چہرے پہ تھکان تھی مگر آنکھوں میں خفگی بھی تھی۔ "خاور نے مجھے ہراساں کیا تھا۔ وہ لوگ میرے بچوں کو مار دیتے، کیا یہی چاہتے ہیں آپ لوگ؟"

"اچھا ٹھیک ہے وہ سب پیچھے رہ گیا۔ لیکن اب تو سارہ، تم عدالت میں پیش ہو جاؤ ورنہ سعدی کا کیس بہت کمزور ہو جائے گا۔" ندرت نے رسان سے سمجھانا چاہا۔

"میں کیسے عدالت میں جا کر یہ سب کہوں؟ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ آپ لوگ مجھے سمجھانے کے بجائے خود کیوں نہیں سمجھتے؟" وہ ڈری ہوئی نہیں تھی، وہ ان کی عقلوں پہ متعجب تھی۔

"سارہ! انہوں نے جو سعدی کے ساتھ کیا، تم اس کے لیے کوئی گواہی نہیں دو گی کیا؟"

"تاکہ جو سعدی کے ساتھ کیا ہے، وہی میرے بچوں کے ساتھ کریں؟ کیا اب بھی آپ لوگوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔" اس نے حیرت سے ان سب کو دیکھا۔

"میرا شوہر مرا۔ فارس کی بیوی مری۔ زمر کے ساتھ جو ہوا۔ سعدی کے ساتھ جو ہوا۔ اب بھی آپ لوگ ان کے خلاف جانا چاہتے ہیں؟" وہ حیرت سے اپنی سبز آنکھیں پھیلائے کہہ رہی تھی۔

"سارہ!" فارس ہلکا سا کھنکارا۔ پھر ذرا آگے کو ہو بیٹھا۔ "ہم چاہتے ہیں کہ دوبارہ کسی کے ساتھ ایسا نہ ہو اس لیے ان کو سزا دلوانی چاہیے۔"

"یہی وارث کی منطق تھی، یہی زمر، سعدی اور تم

نے کیا۔ تم لوگ میرے بچوں کو اب ایک نئے تجربے کی بھینٹ چڑھانا چاہتے ہو؟" وہ صدمے سے بول رہی تھی۔

"ڈاکٹر سارہ! آپ کو کورٹ نے سمن کیا ہے' آپ کو آنا تو پڑے گا۔ اسٹینڈ پہ کھڑے ہو کر حلف تو لینا ہوگا۔ پھر جھوٹ بولیں گی کیا آپ؟" زمر جو ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھی مسلسل نیلی انگوٹھی گھما رہی تھی' رسان سے بولی۔

"سوری زمر! لیکن میں کسی عدالت میں نہیں جا رہی۔ اور پلیز مجھے ان جج مینٹل نظروں سے نہ دیکھیں۔ آپ میری جگہ نہیں ہیں۔ اس لیے نہیں سمجھ سکتیں۔"

"ڈاکٹر سارہ! میں آپ کی جگہ پانچ سال پہلے تھی اور میں نے کورٹ میں گواہی دی تھی۔ میں چھپ کر گھر نہیں بیٹھ گئی تھی۔ گواہی چاہے غلط تھی یا صحیح تھی' چھپائی نہیں تھی میں نے!"

"آپ نے فارس کے خلاف گواہی دی تھی' کاردارز کے خلاف نہیں۔ بھری عدالت میں کاردارز کو قاتل نہیں کہا تھا آپ نے؟"

"میں پچھلے دو ماہ سے بھری عدالت میں کاردارز کو ہی قاتل بول رہی ہوں سارہ' اور میں ابھی تک زندہ ہوں۔ مجھے ایک دفعہ بھی انہوں نے دھمکی نہیں دی۔ اتنے ہائی پروفائل کیس میں ہاشم جیسے لوگ گواہوں یا وکیلوں کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ وہ ہم سے ڈرے ہوئے ہیں۔ ہمیں ان سے نہیں ڈرنا۔"

زمر اسی انداز میں کہہ رہی تھی۔ سارہ نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ کچھ سننے کو تیار نہ تھی۔ "آپ نہیں سمجھ سکتیں زمر! آپ کے دو چھوٹے چھوٹے بچے نہیں ہیں جن کے لیے آپ کو ڈرنا پڑے۔"

لاؤنج میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ فارس نے بے اختیار نگاہیں چرائی تھیں۔ پتا نہیں کس سے۔ حنہ کے دل کو کچھ ہوا۔ ندرت نے پہلو بدلا۔ مگر زمر اسی طرح آرام سے بیٹھی رہی۔ آنکھوں کے تاثرات پرسکون رہے۔

"جی سارہ! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میرے دو بچے نہیں ہیں۔ میرے تین بچے ہیں اور میں یہ سب ان ہی کے لیے کر رہی ہوں۔"

حنہ مسکرا دی۔ بہت سی ڈوریاں جیسے ٹوٹ گئیں۔ تناؤ گویا فضا میں گھل گیا۔ بہت سے لوگوں نے سکون کی سانس لی۔ سارہ چند لمحے کو تو بول نہیں سکی' پھر اٹھ گئی۔

"مجھے ایک میٹنگ میں جانا ہے۔ اور میں مزید یہ بات نہیں کرنا چاہتی۔" پھر ایک ملامتی نظر فارس پہ ڈالی۔ "اب تم بھی مجھے سیف راستہ نہیں دینا چاہتے کیونکہ تمہیں بھی اب اس ٹرائل والی منطق سے اتفاق ہو گیا ہے' ہے نا۔"

"آپ کے لیے گواہی دینا بہتر ہے سارہ۔" وہ نرمی سے بولا تھا۔ سارہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔ سب خاموش رہ گئے۔ ماحول افسردہ ہو گیا۔ پھر فارس کھنکھارا۔

"میں بھی چلتا ہوں۔ مجھے بھی...." زمر کو دیکھا۔ "کسی کے ساتھ ڈنر کرنا ہے۔"

زمر یوسف جو چند لمحے پہلے تک پرسکون بیٹھی تھی' اب کے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا تو ان سے آگ کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔

"تو ڈنر کے ٹائم جانا۔ ابھی سے کیوں جا رہے ہو؟"

"اچھا ہے نا۔ ذرا گپ شپ لگانے کا وقت مل جائے گا۔ کبھی کبھی تو ایسا بہانا ملتا ہے۔" تھوڑی کھجاتے ہوئے وہ سادگی سے بولا تھا۔

(دو نمبر آدمی!) وہ بڑبڑا کر رخ موڑ گئی۔ سارا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ وہ اب اپنا والٹ اور چابیاں اٹھا رہا تھا۔ زمر کا بہت دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسے روک لے مگر اب منت تو کر نہیں سکتی تھی۔

(اب یہ اس کے ساتھ ڈنر کرے گا۔ پتا نہیں کتنے گھنٹے۔ اچھا بہانا ہے۔ ہونہہ ثبوت مائی فٹ۔ دو نمبر قسم کے بہانے۔) وہ کتنی ہی دیر خاموش بیٹھی کلستی رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

سوچ کا آئینہ دھندلا ہو تو پھر وقت کے ساتھ
چاند چہروں کے خدوخال بگڑ جاتے ہیں

ہوٹل کی لابی میں معمول کی گہما گہمی تھی۔ دیو ہیکل دیواروں اور عالیشان ستونوں سے مزین لابی میں اونچے فانوس لٹک رہے تھے' زرد روشنیوں نے خوابناک سا ماحول بنا رکھا تھا۔ ایک طرف اونچے شیشے کے پار مصنوعی آبشار بہہ رہی تھی۔ پانی اوپر سے نیچے آکر حوض میں گرتا بہت دلفریب معلوم ہو رہا تھا۔ شیشے کی دیوار کے قریب جہاں بہت سے سیاح رک رک کر آبشار کے ساتھ تصاویر بنوا رہے تھے وہاں نوشیرواں بھی کھڑا تھا۔ مگر اس کی پشت شیشے کی طرف تھی۔ وہ آبشار کو نہیں' اپنے فون کو دیکھ رہا تھا۔

دفعتاً" سامنے سے شہرین آتی دکھائی دی۔ اس کے سنہری بال اونچی پونی میں بندھے تھے' اور آنکھوں میں شدید بے چینی کا تاثر تھا۔ تیز تیز قدم اٹھاتی وہ اس کے قریب آئی۔

"تھینک گاڈ تم آگئے۔" شور کے باعث اسے بلند آواز میں نوشیرواں کو مخاطب کرنا پڑا تھا۔ شیرو نے بے گانگی سے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تم نے کہا تھا کہ اس کا تعلق میرے کیس سے ہے' اسی لیے آیا ہوں۔ بولو۔"

شہرین نے افسوس سے اسے دیکھا۔ "تم ہاشم کی طرح ہوتے جا رہے ہو۔ ابھی ایک سال پہلے کی بات ہے جب تم مجھ سے......" اس نے سر جھٹکا۔ "اچھا آؤ' کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

"بیٹھ کر بات کرنے سے تمہاری کڑوی باتوں میں مٹھاس نہیں گھل جائے گی۔ جو بتانا ہے' یہیں بتاؤ۔"

شہرین نے سینے پہ بازو لپیٹ لیے اور تندی سے اسے دیکھا۔ "تمہیں مجھ سے ذرا احتیاط سے بات کرنی چاہیے۔ یہ مت بھولو کہ تم میرے سامنے اعترافِ جرم کر چکے ہو اور کورٹ نے مجھے گواہی کے لیے بلایا ہے۔"

"تو جاؤ دے دو گواہی۔" اس نے شانے اچکائے تھے۔ اس کے انداز میں کچھ عجیب سی بے پروائی تھی۔

"میں نے گواہی دی تو تم جیل میں پڑے ہو گے۔ ڈرو اس وقت سے۔"

نوشیرواں نے فون سے نگاہ ہٹا کر اسے دیکھا' وہ بھی ابرو اچکانے والے انداز میں۔

"اعترافِ جرم اتنی بڑی بات نہیں ہوتی شہرین۔ میں نے آج دیکھا سعدی کو..... اپنی آنکھوں سے دیکھا۔" دو انگلیوں سے اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔ "اس نے بھری عدالت میں کہا کہ اس نے دو بندے قتل کیے ہیں۔ لیکن کسی نے اس حقارت اور نفرت سے نہیں دیکھا جیسے اس روز کلب میں لوگوں نے مجھے دیکھا تھا۔ میری گولی سے وہ مرا تو نہیں تھا' میں اقدامِ قتل کا مجرم ہوں' قتل کا تو نہیں۔ اس نے تو دو افراد.... دو انسان مار دیے اور کسی نے اس کو ایسے نہیں دیکھا۔ قانون' پولیس' سب اس کو پروٹیکٹ کر رہے ہیں۔ یہ کہنا کہ میں نے کسی کو مارا ہے' اتنی بڑی بات نہیں تھی شہری۔ غلطیوں سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ ان کو فیس کرنا چاہیے۔ یا تو ہاشم بھائی کی طرح ان کے لیے ایک ہزار تاویلیں گھڑلینی چاہئیں یا پھر.... سعدی کی طرح ان کا اعتراف کر کے ان کو اون کرنا چاہیے۔ اپنے خوف اور ڈر کو اون کرنا چاہیے۔"

شہرین نے بے زاری سے اس کی بات کاٹی۔ "شیرو میں تمہارے خلاف گواہی نہیں دوں گی' اگر تم مجھے اپنی کمپنی میں شیئر زادو...."

"پتا ہے شہری میں کتنے مہینوں سے' بلکہ ایک سال سے مختلف قسم کے واہموں اور خوف کا شکار رہا ہوں۔ سرخ شربت دیکھوں تو خون نظر آتا تھا۔" وہ سر اٹھائے اوپر جھولتے فانوس پہ نگاہیں جمائے کہہ رہا تھا۔ وہ عجیب سی ذہنی کیفیت میں تھا۔ "کتے کو ماروں تو لگتا تھا انسان کو مار دیا ہے۔ ہاتھوں پہ سرخ دھبے نظر آتے تھے' گیلے دھبے۔ خون ہر جگہ تھا۔ میں برے خواب دیکھتا تھا۔ مگر پتا ہے کیا شہری.... آج میں نے دیکھ لیا ہے۔" اوپر اٹھی اس کی آنکھوں میں فانوس کی جھلملاتی روشنیاں اتر آئی تھیں۔ "میں نے دیکھ لیا ہے کہ بہادر وہی ہوتا ہے۔ جو اپنے خوف کو دبوچ لے اور

پھر پھونک مار کر اس کو راکھ کی طرح اڑا دے۔ خوف سے بھاگنا مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔ خوف کے اندر غوطہ کھانا اور پھر اس سے نکل آنا انسان کو اصل آزادی دیتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں آزاد ہونے جا رہا ہوں۔ مجھے...،

دائیں سے بائیں وہ ہوٹل کی طویل لابی کی اونچی چھت سے لٹکتے فانوس پہ نظر ڈالتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"مجھے روشنی نظر آنے لگی ہے۔ اور جب تک میں اپنے آپ سے سچ نہیں بولوں گا' میں آزاد نہیں ہو سکتا۔ اب مجھے روشنی نظر آنے لگی ہے۔ ہاں اب... اب کچھ سمجھ میں آنے لگا ہے۔"

شیرین منہ کھولے اسے یوں دیکھ رہی تھی گویا اس کا دماغ چل گیا ہو۔

"شیرو! دیکھو میری بات سنو' تم خواہ مخواہ گلٹی ہو کر اپنا کیس مت خراب کرو۔ یوں تم..."

"تھینک یو۔ میری بات سننے کے لیے۔ اب میرا دماغ کلیئر ہوا ہے۔" وہ سرہلاتا' اس کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ وہ ابھی تک کسی دوسری دنیا میں تھا۔ جیسے دل و دماغ بہت سی آلائش سے پاک ہو گئے ہوں۔

عرصے بعد اسے ایک روشنی کی امید نظر آئی تھی اور یہ روشنی دکھانے والا بھی سعدی تھا ایک دفعہ پھر وہ اس سے آگے نکل گیا تھا مگر آج حسد محسوس نہیں ہوا تھا

☆ ☆ ☆

سخن ورو اس منافقت سے تو خود کشی کا شعار سیکھو
زبان کا زخم زخم ہوتا' حروف کا کھردرے نہ رہنا

ہارون عبید کی رہائش گاہ شام کے مبہم اندھیروں سے ڈھکی دکھائی دیتی تھی۔ ڈرائنگ روم سے گفتگو کی آوازیں آرہی تھیں۔ ان کو نظر انداز کر کے تم گول سیڑھیوں کو پھلانگتے اوپر جاؤ اور آبدار کے دروازے کی کی ہول سے اندر جھانکو تو وہ اس طرف پشت کیے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی نظر آرہی تھی۔ آئینے میں اس کا عکس جھلملا رہا تھا۔ سرخ بال... سیدھے سرخ بال کمر پہ گرے ہوئے تھے اور اس نے سرخ چھوٹا سا رومال ہیئر بینڈ کی طرح ماتھے سے ذرا اوپر سر پہ لپیٹ رکھا تھا۔ وہ کلائی میں چوڑا سا وائٹ گولڈ بریسلٹ پہنے ہوئی تھی۔ لباس سلور سلک کا تھا اور دیگر جیولری بھی وائٹ گولڈ کی تھی۔ اس سارے سفید پن میں سرخ اس کا رومال تھا یا پھر لپ اسٹک۔ وہ مسکرا کر چہرہ مختلف زاویوں سے دیکھتی آئینے میں اپنا جائزہ لے رہی تھی۔... دفعتاً" اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا۔

فارس کا پیغام سامنے ہی چمک رہا تھا۔

"آٹھ بجے تک آنا ٹھیک رہے گا؟" اور جواب میں آبدار کا "لیس" لکھا نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر سے گھڑی دیکھنے لگی۔ ابھی پورا گھنٹہ پڑا تھا۔

نیچے واپس آؤ تو لاؤنج میں مخالف صوفوں پہ ہاشم اور ہارون بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ ہارون صوفے کی پشت پہ بازو پھیلائے بیٹھے چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے بغور ہاشم کو دیکھ رہے تھے جو ذرا ڈھیلا ہو کر بیٹھا تھا۔ آنکھوں کو سکیڑے کسی غیر مرئی نقطے کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے کسی انجان شخص کو پہچاننے کی سعی کر رہا ہو۔

"تمہاری پوزیشن دن بدن کمزور ہوتی جا رہی ہے ہاشم!" ہارون ہمدردانہ لہجے میں گویا ہوئے۔ گھاگ نگاہیں ہاشم کے چہرے سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔ "تمہارے دوست تمہارے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہو رہے ہیں۔"

ہاشم نے چونک کر ان کو دیکھا۔ بھنویں سکڑیں۔ "کیا کسی نے کچھ کہا ہے؟"

"بہت سے لوگ' بہت سی باتیں کہہ رہے ہیں۔ تمہارے ساتھ اب وہ مزید کام نہیں کریں گے۔ اسلحہ خریدنے کے لیے پیسہ وہ کسی اور سے لانڈر کروانے کے آپشن پہ غور کر رہے ہیں۔ تم... ایک... ڈوبتا ہوا... ٹائی ٹینک ہو... ہاشم!"

ہاشم کے چہرے پہ تلخ مسکراہٹ بکھری۔ "ہونہہ۔" اس نے سر جھٹکا۔ "مجھے ڈبونا اتنا آسان نہیں ہے' ہارون۔"

"سنا ہے تمہارے اور سعدی یوسف کے کیس کا جج کافی ایماندار اور سخت ہے۔ بڑے بڑے فیصلے کیے ہیں اس نے ماضی میں۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ کم از کم سعدی اسے خرید یا ڈرا نہیں سکتا۔"

"پھر تم بھی اسے نہیں خرید سکتے۔" ہارون کے لہجے میں تعجب در آیا۔

"اوہ ہارون! تم کس دنیا میں رہتے ہو۔ مجھے جج کو خریدنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ قانون نوشیرواں کے ساتھ ہے۔ قانون، ملزم کا ساتھ دیتا ہے ہمیشہ۔ ملزم قانون کی محبوب اولاد ہوتا ہے۔ قانون کے جھول اسے بری کروادیں گے بہت جلد۔ رہے ہمارے دوست، تو ان سے کہنا، اگر میں ڈوبا تو سب کو لے کر ڈوبوں گا۔" کالر کھڑا کر کے وہ رعونت سے بولا تھا۔

"خیر، تم سعدی کو فصیح کے قتل کے جرم میں پکڑوا نہیں سکتے کیا؟"

"تکوائری تو ہو گی مگر ایک بات مجھے تنگ کر رہی ہے۔ سعدی نے کہا تھا کہ اس نے سیلف ڈیفنس میں قتل کیا ہے۔" وہ سوچتے ہوئے بول رہا تھا۔ "یعنی فصیح نے اس کو مارنے کی کوشش کی۔ پہلے گارڈ کمار نے بھی اس کو مارنے کی کوشش کی تھی۔ میری ناک کے نیچے دو لوگ اس کو کیوں قتل کرنا چاہیں گے ہارون؟" اور چبھتی ہوئی آنکھیں ہارون کے چہرے پہ جمادیں۔

ہارون اسی طرح ٹھنڈے انداز میں اسے دیکھے گئے۔

"ہو سکتا ہے سعدی جھوٹ بول رہا ہوں۔"

"مجھے لگتا ہے مجھ سے کوئی اور جھوٹ بول رہا ہے۔"

"تو پھر اپنی ناک کے نیچے رہنے والوں سے سوال کرو۔ مجھ سے نہیں۔" ہارون مسکرا کر بولے تھے۔

ہاشم اپنی چبھتی نظروں سے انہیں دیکھے گیا۔

"اگر تمہاری کوئی انوالومنٹ نکلی ہارون تو...."

"وہ وقت گزر گیا جب تم میرے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر مجھے دھمکاتے تھے ہاشم۔! جاؤ، اپنے بھائی کو بچانے کی فکر کرو۔" ہارون کے چہرے پہ اب بھی وہی سپاٹ پن، وہی سرد مسکراہٹ تھی۔ ہاشم کا رد دار کو اندر تک جیسے کسی نے جلا ڈالا تھا مگر اس بات کا جواب وہ دے نہیں پایا تھا۔

وہ جس وقت باہر پورچ کی طرف جا رہا تھا، اسے لان عبور کر کے آتی آب دار دکھائی دی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو آمنے سامنے دیکھ کر ٹھٹکے تھے۔ دونوں کے قدم ٹھہر گئے تھے۔ نگاہیں ملیں۔ ہاشم نے سر سے پیر تک اسے دیکھا۔ وہ کافی تیار اور سجی سنوری لگ رہی تھی۔ سُرخ لپ اسٹک زیادہ واضح تھی۔

"ریڈ۔" وہ مسکرایا۔ زخمی سا انداز تھا۔ آب دار سر جھٹک کر آگے بڑھنے لگی۔ ہاتھ میں کلچ تھا، سامنے کار تیار تھی جس کا دروازہ کھولے کھڑے ڈرائیور نے چابی ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی گویا آپی کے حوالے کرنی تھی کہ وہ خود ڈرائیو کر کے جائے۔ ہاشم نے ہر چیز کو غور سے دیکھا۔ وہ اس کے قریب سے گزرنے لگی تو وہ بولا۔

"پوچھ سکتا ہوں اتنا خاص کون ہے، جس سے ملنے جا رہی ہو؟"

آب دار لمحے بھر کو ٹھہری۔ چہرہ سنجیدہ اور سپاٹ رہا۔ "نہیں۔" کار کی طرف دیکھتے ہوئے خشک مزاجی سے بولی اور آگے بڑھ گئی۔

ہاشم کی نظروں نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا۔ اس کے اندازے کے عین مطابق وہ اکیلی ڈرائیو کر کے جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ بھی کیا لوگ ہیں محسن جو وفا کی خاطر!
خود تراشیدہ اصولوں پہ بھی اڑ جاتے ہیں

اطالوی ریسٹورنٹ کے برآمدے میں بچھی میزوں میں سے ایک پہ آبدار عبید بیٹھی تھی۔ کمر پیچھے ٹکائے، اور کہنی کرسی کے ہتھے پہ جما کر اپنے ایئر رنگ سے کھیلتی، وہ منتظر نظروں سے داخلی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لان میں لگی میزوں پہ موجود افراد پہ بھی بار بار اس کی نظر بھٹکتی۔ کبھی کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھتی۔ وہ ابھی تک نہیں آیا تھا مگر ابھی وقت پڑا تھا۔

ایک فاتحانہ مسکراہٹ اس کے لبوں پہ کھیل رہی تھی۔

مورچال میں آٹھ بجے والے ڈرامے کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ ندرت مسلسل اونچا اونچا ڈانٹ کر اسامہ کو خاموش ہونے کے لیے کہہ رہی تھیں 'جو سارا اسکول کا کام لاؤنج میں بیٹھ کر ہی کرنے کی ٹھانے ہوئے تھا۔ ساتھ میں مسلسل بڑے ابا کو بتا رہا تھا کہ حسینہ کو صداقت نے کتنا قیمتی سام سنگ کا اسمارٹ فون لے کر دیا ہے۔ اسے یقین تھا کہ یہ چائنہ والا نہیں بلکہ خالص اصلی والا ہے۔ ندرت نے چپل اٹھائی تو وہ خاموش ہوا۔

سعدی قانون کی موٹی سی کتاب اٹھائے لاؤنج کے ایک کونے میں بیٹھا خاموشی سے پڑھ رہا تھا۔ اور ان سب سے لاتعلق زمر اپنے کمرے میں اسٹڈی ٹیبل پہ بیٹھی تھی۔ بار بار گھڑی دیکھتی 'چہرے پہ بے چینی بھی تھی اور غصہ بھی۔

"کیا اب وہ اس کے ساتھ بیٹھا ہوگا؟ ڈنر منگوا رہا ہوگا۔ ثبوت کے تو بس بہانے ہیں۔ موقع چاہیے فارس کو بس۔" وہ سخت خفا لگ رہی تھی۔ بار بار موبائل اٹھاتی پھر رکھ دیتی۔

"میں کیوں فون کروں؟ مجھے پروا تھوڑی ہے۔ ہونہہ۔" وہ مسلسل خود سے بولے جا رہی تھی۔

ریستوران میں واپس آؤ تو وہاں کھانے کی اشتہاء انگیز خوشبو پھیلی تھی۔ آبدار اسے داخلی دروازے سے ہی نظر آگئی۔ اس نے گہری سانس لی اور قدم اس کی طرف بڑھا دیے۔

آپی نے یقیناً" اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ مگن سی' مسکراتی ہوئی' سوچ میں گم بیٹھی نظر آرہی تھی۔ اس نے آبدار کو نگاہوں میں رکھتے ہوئے لان پار کیا' بہت سی میزوں کے درمیان سے راستہ بنایا اور پھر برآمدے کے زینے عبور کیے۔ چند ڈگ مزید بھرے' یہاں تک کہ آبدار کی میز سامنے آگئی۔ اس نے قدم روک لیے۔ آپی کے بالکل سامنے۔

وہ جو مگن سی بیٹھی تھی' آہٹ پہ چونکی۔ پھر مسکراتی ہوئی نظریں اٹھائیں' مگر جیسے ہی آبدار نے سامنے موجود ذی نفس کو دیکھا اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ آنکھوں میں الجھن سی ابھری۔

"سوری..... آپ کون؟" جانتے بوجھتے بھی اس نے سوال کیا۔

سامنے کھڑی حنین نے مسکرا کے کرسی کھینچی۔

"میں حنین یوسف ہوں' مجھے فارس غازی نے بھیجا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ کیس میں ہماری مدد کرنا چاہتی ہیں کسی اہم ثبوت کے ساتھ۔ میں وہی لینے آئی ہوں آپ سے۔" اپنا پرس نیچے رکھا اور دونوں کہنیاں میز کی سطح پر رکھ کر چہرہ ہتھیلیوں پہ گرائے' وہ معصومیت سے بولی۔

"اوہ..... فارس!" وہ ششدر رہ گئی تھی۔

"وہ تو مجھے ڈراپ کر کے چلے گئے۔ وہ اکثر اسی طرح مجھے ڈراپ کرتے ہیں' اور عموما" اسی وقت کسی کا قتل ہو جاتا ہے۔ بس خدا کرے آج کوئی جان سے نہ جائے۔" جھرجھری لے کر وہ بولی تھی۔

آبدار کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ ماتھے پر سلوٹیں در آئیں۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اندر غصے کے ابال اٹھنے لگے تھے۔

"میں نا اچھی خاصی ایبی کیورین ہوں۔ فوڈی! صحیح قسم کی فوڈی۔ اس لیے اپنا آرڈر تو میں فورا" کر رہی

ہوں۔ آپ کیا لیں گی؟" حنین مینو بک اٹھا کر ویٹر کو اشارہ کرتے سادگی سے پوچھ رہی تھی۔ آبدار نے تندی سے اسے دیکھا۔ ماتھے پہ کٹے بال اور لمبے بالوں کی فرنچ چوٹی گوندھے' وہ لیمن کلر کے لان کے نفیس سے جوڑے میں ملبوس سادہ سی لڑکی تھی۔ گندمی رنگت کی حامل مگر چمکتی سیاہ آنکھوں والی۔ آبدار سر جھٹک کر موبائل اٹھا کر کال ملانے لگی۔ حنین اسی بے نیازی سے ویٹر کو آرڈر لکھوا رہی تھی۔

"آپ آرڈر نہیں کریں گی؟" معصوم حنین نے پلکیں جھپک کر پوچھا۔

"تم یہاں کیوں آئی ہو؟" وہ خشک لہجے میں بولی۔

"کیونکہ آپ کے پاس کوئی اہم ثبوت ہے' جو آپ ہمیں دینا چاہتی ہیں۔ ماموں نے کہا' جا کر آپ سے لے لوں۔ اس لیے میں آگئی۔"

"جو دینا ہے' وہ میں ان کو ہی دوں گی' تمہیں نہیں۔ خیر' تمہیں کچھ اور نہیں کہنا تو میں چلتی ہوں۔" وہ اٹھنے لگی۔

"ویسے تو میں اپنا بل خود ادا کروں گی۔ جی ایس ٹی ملا کر پورے دو ہزار پچاس بنیں گے۔ دو ہزار ہیں میرے پاس۔ آپ پچاس روپے ادھار دے دیں' ٹرائل پہ' جب آپ سے ملوں گی تو دے دوں گی واپس۔ پھر آپ بے شک چلی جائیں۔" حنین نے پھر سے آنکھیں جھپکائیں۔

آبدار نے ایک تیکھی نظر اس پہ ڈالی' کلچ کھولا' اندر سے کریڈٹ کارڈ نکالا اور میز پہ رکھ دیا۔ نظر اٹھا کر ویٹرز کو دیکھا جو سرونگ کی تیاریوں میں نظر آتے تھے۔ چونکہ ہدایات کڑی تھیں اس لیے اس کے "مہمان" کے آتے ہی وہ چوکنے ہو گئے تھے۔ ان کو معلوم نہیں تھا کہ یہ مہمان' مطلوبہ شخص نہیں ہے۔

"پے منٹ ہو جائے گی۔ تم کھانا کھاؤ۔" وہ بے زاری سے بولی تو حنین نے شانے اچکائے۔

"آپ کی مرضی!" اور نیپکن گود میں بچھایا۔ چھری کانٹا درست کر کے رکھا۔ "ویسے چاہیں تو ماموں سے ایک دفعہ پوچھ لیں۔ وہ بہت پر یقین تھے کہ آپ وہ فلیش ڈرائیو دیے بغیر نہیں جائیں گی۔"

آبدار کو اس کے مشورے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ پہلے ہی موبائل پہ نمبر ملا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ جیسے ہی فارس نے کال پک کی' وہ میز کے پیچھے سے نکل کر ذرا دور چلی آئی۔

"آپ کہاں ہیں؟" ریستوران کے برآمدے میں کھڑی' ناراضی سے وہ فون پہ پوچھ رہی تھی۔

"کام سے نکلا ہوا ہوں۔ کیوں؟"

"آپ کو خود یہاں آنا تھا۔ اس کو کیوں بھیجا؟"

گردن موڑ کر ایک خفا نگاہ حنین پہ ڈالی جو چہرہ ہتھیلیوں میں گرائے بیٹھی' مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھی۔ آبی کو نئے سرے سے غصہ آنے لگا۔

"اگر کچھ واقعی ضروری ہے آپ کے پاس تو اسے دے دیں۔ آگے آپ کی مرضی۔"

"ڈر گئے کیا مجھ سے؟" وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا۔

"میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں اور نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے آپ کسی مصیبت میں پڑیں۔"

"مصیبت میں تو میں پڑ چکی ہوں۔" وہ تلخی سے مسکرا کر بولی۔ "بہر حال میں اس کو کچھ نہیں دے رہی۔ بلکہ میں جا رہی ہوں یہاں سے۔"

"مرضی آپ کی۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" دوسری طرف سے لائن ڈیڈ ہو گئی۔ آبدار واپس آئی تو ماتھے کے بل گہرے ہو چکے تھے۔ کھانا میز پہ لگ چکا تھا اور حنہ مزے سے شروع بھی کر چکی تھی۔

"میرے بھائی کا انٹرویو کرنے کے بعد بھی آپ اصل گیم سمجھ نہیں سکیں' ہے نا؟" لزانیہ کا بڑا سا ٹکڑا اپنی پلیٹ میں نکالتی حنین نے مگن سے انداز میں پوچھا تھا۔

"سوری؟" وہ کھڑے کھڑے کلچ میں موبائل رکھتی چونکی۔

"نہیں آیا سمجھ میں؟" حنہ نے حیران نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ چند لمحے لے کر منہ کا لقمہ چبایا۔ پھر سافٹ ڈرنک کا گھونٹ بھرا۔ پھر چہرہ اٹھایا۔ آبدار

اسی طرح شش و پنج میں کھڑی تھی۔

"یہی تو سارا مسئلہ ہے آبدار صاحبہ۔ فارس غازی ہم سے اپنا کام ایسے نکلواتے ہیں کہ ہمیں لگتا ہے یہ ہمارا ہی تو آئیڈیا تھا۔ آپ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ چچ چچ۔ میں سمجھاتی ہوں آپ کو۔" رک کر کانٹے میں پھنسا پنیر' پاستا اور قیمے کا ٹکڑا منہ میں رکھا۔ لذیذ اشیاء زبان کو چھوتے ہی گویا اندر گھل گئیں۔ اس نے نوالہ تسلی سے کھایا پھر بولی۔

"آپ ہارون عبید کی بیٹی ہیں نا' اور فارس ماموں کو معلوم تھا کہ ہارون صاحب کا سعدی بھائی کے اغوا میں ہاتھ ہے' تو انہوں نے بس اتنا کیا کہ بھائی کے میموریل ڈے پہ میری تقریر سے پہلے ڈاکٹر توقیر بخاری سے کہا کہ اپنی تقریر میں اتنا کہہ دیں کہ سعدی یوسف کلینکل ڈیتھ کا شکار ہوا تھا۔ فارس غازی کو پتا تھا کہ یہ فقرہ ہارون عبید کی بیٹی کو کلک کر جائے گا۔ وہ سعدی یوسف کو ڈھونڈے گی اور اس کو فالو کرتے ہوئے ہم اسے ڈھونڈ لیں گے۔ آپ کو بھائی نے بتایا کہ وہ کسی کلینکل ڈیتھ میں نہیں گیا' صرف خواب دیکھا تھا اس نے مگر آپ نہیں مانیں۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ اغوا کے وقت سعدی یوسف تو ہوش میں آیا ہی نہیں تھا' پھر ڈاکٹر توقیر بخاری کو کیسے پتا کہ اس نے کچھ دیکھا یا نہیں؟ آپ کرتی ہیں نا ایسے لوگوں کا انٹرویو۔ یوں آپ نے بھائی کو ڈھونڈا اور ہم بھی بھائی تک پہنچ گئے۔ اب آیا سمجھ میں؟ آپ کو استعمال کیا ہے فارس غازی نے۔" وہ کھاتے ہوئے بولتی جا رہی تھی' جیسے خبرنامہ پڑھ کر سنا رہی ہو۔ آبی متحیر سی کھڑی تھی۔ سن۔ بالکل۔ پھر وہ آہستہ سے بیٹھی۔

"تو وہ ہمیشہ سے مجھ پہ نظر رکھے ہوئے تھا۔" وہ بولی تو آواز میں تفاخر سا تھا۔ حنین نے ہاتھ روک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اسے برا نہیں لگا تھا۔ اسے ناز ہوا تھا۔

"آپ تو کسی اور کی بھی نظر میں ہیں۔"

"کس کی؟" وہ چونکی۔

"ہاشم کی۔" وہ بولی تو دل گیلی لکڑی کی طرح سلگ گیا۔ آواز کانپی۔ آنکھوں میں کرب سا ابھرا۔ دل کھویا تھا اور واپس حاصل بھی کر لیا تھا مگر کھونے کا درد اور واپسی کے جتن کی اذیت آج بھی ویسی ہی تھی۔

"یہاں ہاشم کا کیا ذکر؟" آبدار نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ حیران ہوئی تھی۔ حنین چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ ان ہی کھوجتی رشک بھری نظروں سے۔ پھر لبوں سے پھسلا۔

"کیا ہے آپ میں' جو اسے کہیں اور دیکھنے ہی نہیں دیتا۔"

آبدار دھیرے سے مسکرائی' پھر آگے کو ہوئی اور حنہ کی سادہ چمک دار آنکھوں میں جھانکا۔ "چھوٹی لڑکی! کیا تمہیں ہاشم پہ کرش ہے؟"

حنین اسی طرح اسے دیکھے گئی۔ بولی کچھ نہیں۔ البتہ اس کے رخسار گلابی ہوئے تھے۔

"ہاشم کو متاثر کرنے کے لیے سامنے والے میں "کلاس" ہونی چاہیے۔" وہ پیچھے کو ٹیک لگاتے ہوئے' خبردار کرنے کے سے انداز میں گویا ہوئی۔ "خوب صورتی ہونی چاہیے۔ متاثر کن اسٹائل ہونا چاہیے۔ ذہانت اور اعتماد ہونا چاہیے۔ ایسی لڑکی جو اس کی کہنی تھام کر جب چلے تو ایک دنیا اس کو دیکھے۔ وہ ڈھیروں دولت اور جاہ و حشم کی مالک ہو۔ اس کا اعلا خاندان ہو۔ وہ شاہزادیوں جیسی ہو۔ وہ کیریئر وومن ہو۔ بڑے بڑے میدان مارے ہوں اس نے۔ سیمی ناز اور ورکشاپس میں تقریر کرے تو ایک دنیا اس سے متاثر ہو۔ اس سے کم پہ وہ کبھی راضی نہیں ہوتا۔ شہرین اپنی جوانی میں ایسی ہی تھی۔"

"اور آپ بھی ایسی ہی ہیں۔" وہ اسے تکتے ہوئے بے خودی کے عالم میں بولی تھی۔ آبدار نزاکت سے مسکرائی۔

"میں تمہارا دل نہیں توڑنا چاہتی' مگر تم ایسی بالکل بھی نہیں ہو۔ وہ تمہیں کبھی نہیں چاہے گا۔ وہ ہر کسی کو نہیں چاہ لیتا۔"

حنین ہلکا سا مسکرائی۔ "مجھے اس کی خواہش بھی نہیں ہے' میرے لیے یہی کافی ہے کہ مجھ سے فارس

غازی محبت کرتے ہیں، اور وہ ہر کسی سے محبت نہیں کرلیتے۔ بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں ان کی محبت، دوستی اور اعتماد جیتنے کے لیے۔ وہ مجھے اپنی "ٹیم" کہتے ہیں۔ میں اداس بیٹھی ہوں تو محسوس کرلیتے ہیں اور میں خوش بیٹھی ہوں تو ہمیشہ میری خوشی بانٹتے ہیں۔ مجھے ایسی باتیں بھی بتادیتے ہیں جو زمر کو نہیں بتاتے۔ میں خوش ہوں کہ مجھ سے محبت کرنے والے بہت اچھے انسان ہیں۔"

آبدار کی مسکراہٹ پھیکی پڑگئی تھی مگر اس نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔ "تم ان کی بھانجی ہو۔ یہ تو نیچرل ہے۔"

"گویا آپ یہ کہہ رہی ہیں کہ میرے اندر چاہے جانے والی کوئی خوبی نہیں ہے؟"

"میرا تم سے کیا مقابلہ ہے!" وہ مسکرادی اور پھر شانے اچکائے۔ عجب ادائے بے نیازی تھی۔

"تو پھر مجھے وہ ثبوت نہیں دیں گی آپ؟" حنین پلیٹ پرے دھکیل کر ٹشو سے ہاتھ اور ہونٹ صاف کرتے ہوئے بولی۔ آبدار نے مسکرا کر نفی میں گردن ہلائی۔

"فارس غازی سے کہو، اسے اگر وہ چاہیے تو خود آکر مجھ سے لے۔ میں دے دوں گی مگر صرف اسی کو۔ تم میرے پیر بھی چھوؤ تب بھی میں تمہیں نہیں دوں گی۔"

"آپ کی مرضی ورنہ میں تو آپ کے پیر چھونے والی تھی!" حنین مایوسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور پرس کندھے پر لٹکایا۔

"کھانا اچھا تھا مگر اتنا اچھا نہیں۔ اٹالین میں دیسی ٹچ آرہا تھا۔ بل آپ ادا کردیجیے گا۔ میں تو ویسے بھی کسی قابل نہیں۔" اور کندھے اچکا کر مڑگئی۔ آبدار نے سر جھٹکا۔ اس کی نظروں نے دور جاتی حنین کا آخر تک پیچھا کیا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کے آخری جملوں میں طنز سا محسوس ہوا تھا۔

بل ادا کرنے کے بعد اس نے کریڈٹ کارڈ واپس رکھنے کے لیے پرس کھولا تو ایک دم ٹھٹک گئی۔ اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

پرس کی اندرونی زپ کھلی تھی اور وہ خفیہ جیب خالی تھی۔ وہ خفیہ جیب جس میں اس نے وہ ٹائی پن ڈرائیو رکھی تھی۔

"کہاں گئی!" آبدار بدحواسی سے پرس کو کھنگالنے لگی۔

باہر پارکنگ میں فارس کی کار کا فرنٹ ڈور کھول کر حنین اندر بیٹھی اور ٹائی پن کیمرہ اس کی طرف بڑھادیا۔

"چارمنٹ بھی نہیں لگے مجھے۔ پہلے اس کا پرس کھلوایا۔ پھر جب وہ آپ سے بات کرنے کے لیے سائیڈ پہ گئی تو اسے نکال لیا۔ مجھے لگا تھوڑی احتیاط سے چھپائے گی اسے مگر وہ محترمہ تو اپنے شاہانہ زعم میں کافی لاپرواہ ثابت ہوئی ہیں۔ اب بیٹھ کر سوچ رہی ہوگی کہ کون کتنا قابل ہے۔ ہونہہ۔"

وہ خفگی سے بڑبڑائی۔ فارس نے ایک ہاتھ میں تھما کیمرہ پکڑا اور دوسرے سے ڈرائیو کرتا آگے لے گیا۔ تھوڑی دور جا کر اس نے گاڑی روکی، چھت پہ لگی لائٹ آن کی اور غور سے اس ڈیوائس کو دیکھا۔ پھر جیب میں رکھ لی۔

"ویسے آپ خود بھی ان سے مل کر یہ لے سکتے تھے۔" کافی دیر بعد حنین ونڈ اسکرین کے پار نگاہیں جمائے، سوچتے ہوئے بولی۔

"جب آپ کو یہ معلوم ہو حنین، کہ کسی سے آپ کا ملنا یا بات کرنا آپ دونوں کو فتنے میں مبتلا کرسکتا ہے تو پھر اس راستے سے احتراز برتنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ بہانے بہانے سے اس سے ملا جائے اور خود کو صفائیاں دی جائیں کہ یہ آخری بار ہے، اس دفعہ بات کرکے اس قصے کو ختم کرنا ہے مجھے۔ ایسے نہیں ہوتا۔ جب تعلق توڑنا ہوتا ہے تو کسی خدا حافظ، کسی الوداع کے بغیر اسی لمحے توڑا جاتا ہے۔" وہ سادہ سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ حنین کو بہت کچھ یاد آگیا مگر بظاہر بشاشت سے بولی۔

"صاف کہیں نا۔ بیوی سے ڈرتے ہیں آپ۔"

"بیوی سے کون نہیں ڈرتا یار!" اس نے جھرجھری

کی لی۔ وہ ہنس دی۔ پھر راستہ دیکھتے ہوئے بولی۔
"اب ہم کہاں جارہے ہیں؟"
"تمہیں گھر ڈراپ کرکے میں فاطمی صاحب کے پاس جارہا ہوں۔"
حنین ٹھٹکی۔ "الیاس فاطمی!! وارث ماموں کا باس؟" یہ نام ذہن میں پانچ سال سے بیٹھا ہوا تھا۔
"ہوں۔ وہ گواہوں کی لسٹ میں ہے۔ اس لیے مجھے اس سے ملنا ہے مگر سنو! گھر جاکر زمر کو مت بتانا کہ میں اس سے ملنے گیا ہوں۔" یاددہانی کرائی۔
"تو انہیں کیا بتاؤں کہ آپ کس سے ملنے گئے ہیں۔"
"جس سے تم مل کر آرہی ہو۔" وہ محظوظ ہوا تھا۔
حنین کے ابرو خفگی سے بھنچے۔ "اس کمینی حرکت کو کیا کہوں میں؟"
"اسے تم فارس ازم کہو۔ خیر سے زمر بی بی ڈیزرو کرتی ہیں۔ اب اترو۔" گھر آگیا تھا۔ فارس نے اس کو مسکرا کر اترنے کا اشارہ کیا۔ حنین خفا سی اتر گئی۔ وہ مسکراتے ہوئے کار آگے لے گیا۔ اسے جیسے سوچ کر ہی مزا آرہا تھا۔

☼ ☼ ☼

شدت غم میں بھی زندہ ہوں تو حیرت کیسی؟
کچھ دیے تند ہواؤں سے بھی لڑ جاتے ہیں

وہ ایک عجیب رات تھی۔ بے چین۔ مضطرب۔ ڈھیر سارا ذہنی دباؤ لیے ہوئے۔
وہ سونیا کی سالگرہ میں جانے سے پہلے وارث سے ملا تھا۔ حنین اس کے ساتھ تھی۔ اسے حنین کو اس کی کسی دوست سے ملوانے جانا تھا۔ یہ بھی ایک بہانا تھا۔ زمر سے ملنے کا بہانا نہ ڈھونڈنے کا بہانا۔ جب کوئی تعلق نہیں رکھنا تو کیا بار بار اس کا سامنا کیا جائے؟ یہی سوچ کر وہ راہ فرار اختیار کررہا تھا۔ حنین کار میں بیٹھی تھی اور وہ باہر کھڑا تھا۔ وارث سے اس کی بات تب ہی ہوئی تھی۔ وہ کچھ پریشان تھا۔ ظاہر نہیں کررہا تھا مگر پریشان تھا۔
"میرا باس مجھ سے استعفیٰ مانگ رہا ہے۔"
اس وقت لوگ آس پاس تھے۔ وہ جلدی میں تھا۔ اس کو سمجھا نہیں سکتا تھا۔ اتنا وقت ہی نہیں تھا۔ مگر اس نے بار بار کہا تھا۔
"تم انتظار کرو۔ میں کرلوں گا سب کچھ ٹھیک۔ بس تم استعفیٰ نہیں دوگے۔"
آخری دفعہ جب اس نے وارث کا چہرہ دیکھا تو اس پہ ایک امید سی تھی۔ سخت پریشانی کے درمیان موہوم سی امید۔ ایک مان۔ اعتبار سا تھا کہ فارس سنبھال لے گا۔ اور وارث سر کو اثبات میں خم دیتے ہوئے اپنی کار کی طرف مڑ گیا تھا۔ یہ آخری دفعہ تھا جب اس نے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ زندہ چہرہ۔
وہ حنین کو ہوٹل لے آیا۔ اس کی دوست سے پے در پے سوالات کرتے ہوئے بھی اسے مسلسل کوفت ہورہی تھی۔ ذہنی طور پہ وہ وارث کے مسئلے میں اٹکا ہوا تھا۔ سالگرہ کی تقریب سے واپس آکر بھی وہ ایسا ہی الجھا ہوا تھا۔ زرتاشہ کو ہاشم نے کچھ کہہ دیا تھا' وہ اس پر خفا ہورہی تھی۔ فارس کا کھولتا دماغ مزید ابلنے لگا تھا۔ اسے خود بھی یاد نہیں کہ اس رات اس نے کس کس کو جھڑکا تھا۔ علیشا' حنین' زرتاشہ' ہاشم۔ سارا غصہ اور چڑچڑا پن اس لیے تھا کہ وہ وارث سے مل نہیں سکا تھا۔ اسے ٹھیک سے سمجھا نہیں سکا تھا۔
زرتاشہ آف موڈ کے ساتھ سوئی تھی۔ وہ مسلسل وارث کو کال کررہا تھا مگر اس کا فون بند تھا۔ اس رات وہ سویا نہیں تھا بلکہ بالکونی میں بیٹھا رہا تھا۔ پیر لمبے کر کے میز پہ رکھے' وہ سوچے جارہا تھا۔ سامنے ہاشم کے کمرے میں ایک لیمپ آن تھا۔ پردوں کی جھری سے صاف دکھائی دیتا تھا' ہاشم بھی صوفے پہ لمبے پیر کرکے بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور وہ کسی اور ہی کیفیت میں لگتا تھا۔
فارس پھر بالکونی میں ٹہلنے لگا۔ دائیں سے بائیں۔ بائیں سے دائیں۔ وہ بے چین تھا۔ جانے کون سی چیز بے سکون کررہی تھی۔ دل خراب تھا۔ دماغ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ کیا کرے۔ کس سے کہے؟

وہ عجیب بھاری سی رات تھی۔ گویا دل پہ کوئی بھاری سل پڑی ہو جس کو اٹھائے تو کیسے اٹھائے؟ گرائے تو کیسے گرائے؟ کوئی سرا ہاتھ نہ آتا تھا۔ صبح صادق ابھی ٹھیک سے نمودار بھی نہیں ہوئی تھی جب اس نے بنا کچھ کھائے پیے حتیٰ کہ منہ دھوئے بغیر چابی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔ اسے وارث سے ملنا تھا۔ جلد از جلد۔ کہیں دیر نہ ہو جائے۔ کہیں کچھ ہو نہ جائے۔ عجیب سے واہمے آتے تھے ذہن میں۔

مگر وارث اپنے اسپتال کے کمرے میں نہیں تھا۔ صرف اس کا جسم تھا۔ پنکھے سے جھولتا ہوا۔ وہ بھاگا اور اس کے پیر پکڑ لیے' گردن کو سہارا دیا' مگر اس گردن کو ٹوٹے کئی گھنٹے بیت چکے تھے۔ وہ اب نہیں رہا تھا۔

اگلے چند دن یوں گزرے گویا آنکھوں کے سامنے لال دھند سی چھائی ہو۔ عجب کرب تھا' عجب درد تھا۔ پہلے دن وہ صدمے سے چپ رہا تھا۔ وارث کی بیٹیوں کو روتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ویران آنکھوں سے سب دیکھتا رہا۔ ویران دل سے سنتا رہا۔ پھر جب وہ وارث کی بیٹی کے ساتھ اس کی قبر کے سامنے بیٹھا تو اس روز سارے احساسات جاگنے لگے تھے۔ غم پہ غصہ غالب آنے لگا تھا' اتنا کہ لگتا تھا دل پھٹ جائے گا۔ تب اس نے عہد کیا تھا۔ قسم کھائی تھی کہ وہ انتقام لے گا۔ شاید تب وہ انتقام کو انصاف کے مترادف سمجھتا تھا۔ وہ ضرور اپنے بھائی کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچائے گا' اس کا عہد تھا خود سے اور جتنا وہ اس بارے میں سوچتا تھا' اتنا غصہ عود کر آتا تھا۔ دل چاہتا تھا' ساری دنیا کو تہس نہس کر دے۔ جلا کر راکھ کر دے۔ کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ عقل پہ پڑا سرخ پردہ اتنا موٹا تھا کہ سارا منظر دھندلا گیا تھا۔

وہ اور سعدی زمر کے پاس گئے۔ اب اسے پروا نہ تھی کہ وہ اس کی کون تھی۔ اب صرف یہ اہم تھا کہ وہ خود کون تھی۔ وہ پراسیکیوشن آفس میں ایک اہم عہدے پہ تھی۔ وہ اس کیس کو دیکھ سکتی تھی' وہی کچھ کر سکتی تھی۔ مگر اس کا رویہ بھی خشک سا تھا۔ وہ جیسے چھٹی لے کر جانے کے بعد زبردستی واپس بلائی گئی تھی۔ اس کے لیے تو یہ روز کی بات تھی۔ آج ایک قتل ہوا تو آج دو۔ وہ بے تاثر انداز میں معمول کا کام کرتی رہی۔

ابتدا اس نے فارس پہ شک سے کی۔ اس وقت وہ غصے میں اتنا اندھا ہو جانے والا آدمی تھا کہ زمر بی بی کے انداز پہ اس کا دماغ کھول اٹھا تھا۔ وہ غیر جانب داری سے اپنا کام نپٹا رہی تھی مگر وہ مضطرب تھا' بے چین تھا۔ وہ چاہتا تھا جلد از جلد قاتل پکڑا جائے۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی کہ وہ پولیس آفیسر نہیں ہے' جسے چودہ دن میں تفتیش مکمل کرنی ہو اور چالان جمع کروانا ہو' وہ وکیل ہے اور وکیلوں کی تفتیش تو مہینوں' سالوں چلتی ہے۔ ان دنوں وہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ کوشش کے باوجود بھی نہیں۔ دماغ پہ چڑھی سرخ دھند نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تک سلب کر دی تھی۔

اسے سب سے زیادہ غصہ زمر پہ آرہا تھا۔ ملال یا صدمہ نہیں۔ صرف غصہ۔ وہ اس پہ کیوں شک کر رہی تھی؟ ٹھیک ہے وہ اسے اپنی ایلی بائی سے ملوا دے گا مگر وہ اس پہ شک کر کے اچھا نہیں کر رہی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ زمر سب سے پہلے اس کو ہر شک اور شبہ سے پاک کر کے پھر آگے بڑھنا چاہتی تھی تاکہ کوئی اس پہ انگلی نہ اٹھائے کیونکہ وارث کا موبائل اور پھندا اسی کی کار سے ملا تھا' مگر سرخ دھند اسے کچھ سوچنے نہیں دیتی تھی۔

کوئی اس پہ شک کیسے کر سکتا ہے؟ سب اندھے ہیں کیا؟ وہ اپنے بھائی کا قاتل کیسے ہو سکتا ہے' یہ اتنا فضول تھا جس پہ فارس غازی کے خیال میں کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا اس لیے اس نے اس امکان کو ذہن سے خارج کر رکھا تھا۔ مگر یقین کرنا کسے تھا' صرف شک ہی کافی ہوتا ہے۔ آدمی کو "ملزم" صرف شک بناتا ہے۔ یقین تو مجرم بناتا ہے۔ وہ ملزم بننے جا رہا تھا اور وہ خود اپنی قسمت سے لاعلم تھا۔ سارا دھیان صرف ایک چیز میں اٹکا تھا۔ وارث کا باس۔ الیاس فاطمی۔ صرف وہی جانتا ہے کہ وارث کو کس نے اور

کیوں مارا ہے؟"

✡ ✡ ✡

کشتی جاں ہے کہ ڈوبے چلی جاتی ہے فراز
اور ابھی درد کا دریا نہیں طغیانی پر

الیاس فاطمی اپنی اسٹڈی میں بیٹھا تھا۔ کمپیوٹر کے سامنے فائلوں کا انبار لگا تھا جس کے صفحات کا وہ اسکرین پر نظر آتے ہندسوں سے موازنہ کررہا تھا۔ اسٹڈی میں سفید بتیاں جلی تھیں۔ کھڑکی کے بلائنڈز بند تھے۔ پیچھے ریکس میں ترتیب سے رکھی کتابیں نظر آتی تھیں۔ وہ عینک لگائے کام میں پوری طرح منہمک تھا۔ مگر اس آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔ کوئی آہٹ سی تھی شاید۔

وہ چونک کر آگے پیچھے دیکھنے لگا۔ پھر عینک اتار کر فائل پہ دھری اور کرسی سے اٹھا۔ احتیاط سے ادھر ادھر دیکھتا باہر آیا۔ راہداری اور سیڑھیاں نیم روشن تھیں۔ سارا گھر خاموش تھا اور گہرے سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ لاؤنج، کچن، لابی، اس نے باری باری ہر جگہ دیکھی۔ دروازوں کے تالے اور کھڑکیوں کی چٹخنیاں چیک کیں۔ سب مقفل اور پرسکون تھا۔ وہ سر جھٹکتا واپس اسٹڈی میں داخل ہوا، دروازہ بند کیا اور جیسے ہی واپس گھوما اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

سامنے اس کی کرسی پہ وہ بیٹھا تھا۔ پیر لمبے کر کے اس کی اسٹڈی ٹیبل پر رکھے تھے، یوں کہ جوگرز فائلوں کو چھو رہے تھے، اور ٹیک لگائے بازوؤں کا تکیہ بنا کر گردن کے پیچھے رکھا ہوا تھا۔ نظریں اس پر جمی تھیں اور جب اسے متوجہ پایا تو سر کو خم دے کر سلام کیا۔

"کیا حال ہیں فاطمی صاحب؟"

فاطمی کی نظریں اس کے وجود سے ہوتی ہوئیں میز تک گئیں، جہاں بریٹا پستول رکھا تھا۔ فارس نے نظروں سے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ فاطمی نہیں ہلا۔ ذرا کھڑا رہا۔ اس کا ذہن ممکنہ آپشنز پہ تیزی سے کام کررہا تھا۔ ہاتھ ڈور ناب پہ ہنوز جما تھا۔

"اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو چپ چاپ یہاں آکر بیٹھ جاتا کیونکہ اگر تم شور کر کے کسی کو بلاؤ گے تو بات پھیلے گی۔ ہاشم سنے گا تو سمجھے گا کہ تم اور میں ملے ہوئے ہیں اور یہ صرف ایک کور اپ تھا، ایک بھونڈی کوشش جس سے تم اس پہ یہ ثابت کررہے تھے کہ تم مجھ سے ملے ہوئے نہیں ہو۔ وہ مزید تم پہ شک کرے گا۔"

فاطمی نے ڈور ناب چھوڑ دیا۔ اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورتا ہوا وہ سامنے آیا اور کرسی کھینچی۔

"کیا چاہتے ہو تم؟ ہاشم کو اپنی اور میری کورٹ میں ہونے والی ملاقات کا جانے کس ڈھنگ سے بتایا ہے تم نے کہ وہ میری ایک ایک موو پہ نظر رکھنے لگا ہے۔ اب کیا چاہتے ہو تم؟"

"بیٹھ جاؤ۔ اپنا ہی گھر سمجھو۔" فارس نے پھر سے اشارہ کیا۔ اس کی سنہری آنکھوں میں سکون تھا اور بے نیازی بھی۔

فاطمی چند لمحے کھڑا رہا، پھر بیٹھ گیا۔ ایک گہری سانس لی۔ "کیا چاہتے ہو تم؟"

"تمہیں پرسوں کورٹ میں پیش ہونا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم وہاں سچ بولو۔"

"میرا اس کیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" وہ بھڑک کر بولا تھا۔

"تعلق تو ہے اور تم کورٹ میں اس کے بارے میں بتاؤ گے اور پھر تم۔" فارس نے پیر نیچے کیے، آگے کو ہو کر بیٹھا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "تم اپنی جاب سے استعفیٰ دے دو گے۔"

فاطمی کی آنکھیں پہلے حیرت اور پھر ناگواری سے پھیلیں۔ "میں استعفیٰ کیوں دوں؟"

"کیونکہ میں ایسا کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ میں ایسا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں تمہارے کیس کا جج، جیوری اور جلاد ہوں۔" وہ سرد آنکھیں اس کے چہرے پہ گاڑے ہوئے بولا۔ "آج میں تم سے استعفیٰ مانگ رہا ہوں، الیاس فاطمی!"

"اور اگر میں نے ایسا نہ کیا تو کیا کرو گے؟ مجھے زہر دو گے؟ میری بیٹی کو مارو گے؟ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں اسے باہر سیٹل کراچکا ہوں۔" وہ

تمہاری پہنچ سے اب بہت دور ہے۔" وہ حقارت سے بولا تھا۔

"مجھے تمہاری بیٹی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ مگر ہاں تمہارے بیٹے سے ہے۔ تمہارا لاڈلا بیٹا جس کی کار کے لیے تم نے میرے بھائی کو مصلوب کیا تھا۔ جو باوجود کوشش اور سفارشوں کے مقابلے کا امتحان پاس نہیں کرسکا اور آج کل اسی پرائیویٹ فرم کو چلا رہا ہے جسے اس نے دو ڈھائی سال پہلے بنایا تھا۔ مجھے تمہارے بیٹے سے سروکار ہے۔"

"کیا کرو گے تم میرے بیٹے کا؟" وہ چونکا تھا مگر ڈرا نہیں تھا۔

"سمپل۔ میں اس کے کمرے میں اسے پنکھے سے لٹکا کر اس کی گردن توڑ دوں گا۔ جان کے بدلے جان۔ گردن کے بدلے گردن۔ اب فیصلہ تم کو کرنا ہے۔" پستول اٹھا کر جیب میں اڑسا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک لمحے کے لیے بھی الیاس فاطمی سے نظریں نہیں ہٹائیں۔

"تم ایسا نہیں کرو گے۔ میرے بیٹے کا کوئی قصور نہیں ہے۔" وہ بے تابی سے بولا مگر خوف زدہ اب بھی نہیں تھا۔

"میں نے کہا نا، فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ عدالت میں سچ بولو ورنہ تمہیں تمہارے لاڈلے بیٹے کی لاش بہت جلد پنکھے سے جھولتی ملے گی۔" پھر ہاتھ ماتھے تک لے کر سلام کیا۔

"پھر ملتے ہیں۔" اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ چند لمحے بعد ویسا ہی سناٹا چھا گیا۔ الیاس فاطمی اسی طرح بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے پہ غصہ بھی تھا، اور تفکر بھی۔ مگر خوف نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

فارس اس ہاؤسنگ سوسائٹی کی تاریک اسٹریٹ پہ قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا جب جیب میں رکھا فون تھرتھرایا۔ اس نے چلتے چلتے اسے نکالا۔ اسکرین دیکھ کر لب مسکرا اٹھے اس نے فون کان سے لگایا۔

"جی، حکم۔"

"کہاں ہو؟" خفا خفا سا پوچھا گیا۔

"اسی کے ساتھ ہوں۔" وہ مسکراہٹ دبا کر بولا۔

زمر خاموش ہو گئی۔ پھر لہجہ سرسری سا بنایا۔ "مجھے پوچھنا تھا کہ......"

"بڑا اچھا ریسٹورنٹ ہے یہ۔ پہلے بھی آیا ہوا ہوں میں یہاں، مگر آج زیادہ خوب صورت لگ رہا ہے۔ پتا نہیں کیوں۔ ہاں تم کیا کہہ رہی تھیں۔"

زمر نے ضبط سے گہری سانس لی۔ "میں تم سے پوچھ رہی تھی کہ تمہاری بلیو شرٹ......"

"یار! ویسے بہت اچھا کھانا ہے ادھر کا۔ اور یہ کینڈلز بھی بہت اچھی ہیں۔ یا شاید میرا موڈ اچھا ہے۔ پتا نہیں کیوں، میں کافی انجوائے کر رہا ہوں۔"

"فارس!" اس نے بمشکل ابلتے غصے کے اوپر بند باندھا۔ "کل کے لیے تمہارے کون سے کپڑے استری کرواؤں۔ اگر تم بتا دو تو میں صداقت کو۔"

"تم ایسے ہی اس لڑکی کو اتنا غلط سمجھتی ہو۔ ایک معصوم سی خواہش تھی اس کی یہاں کھانا کھانے کی اور وہ میں نے پوری کر دی۔"

"اس نے تمہیں وہ ثبوت دیا یا نہیں۔" وہ تیزی سے بولی۔

"اوہ۔ وہ تو میں بھول گیا۔ اصل میں باتوں میں اتنا مگن ہو گیا تھا کہ......"

"تم!" زمر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کو فون پہ ہی شوٹ کر دے۔ "تم نا، آج رات گھر نہ آنا۔"

"مطلب، اجازت دے رہی ہو اس کے گھر رکنے کی۔" سادگی سے پوچھا تھا۔ زمر نے آنکھیں بند کر کے کنپٹی سہلائی۔ پھر آنکھیں کھولیں اور تیکھے لہجے میں گویا ہوئی۔

"تمہارے کپڑے اب میں کوئی استری وستری نہیں کروا رہی۔ خود کرنا۔ ہونہہ۔" اور فون کھٹ سے رکھ دیا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور تنفس تیز تیز چل رہا تھا۔

"دو نمبر آدمی!"

☼ ☼ ☼

اگلی صبح شہر پہ اتری تو ایسی گرم اور حبس آلود کہ گویا پتھروں کو بھی پگھلا دے گی۔ مقامی چھٹی کی وجہ سے سارہ کو آفس نہیں جانا تھا۔ وہ یونہی سستی سے بستر میں لیٹی رہی۔ اے سی بھی بند نہیں کیا۔ امل اور نور کب کی اٹھ چکی تھیں اور یقیناً" اس وقت ناشتا کر رہی تھیں۔ سارہ تکیے پہ سر رکھے چھت کو تکتی رہی۔ رہ رہ کر زمر اور فارس پہ غصہ آرہا تھا۔ کوئی بھی اس کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ سب خود غرض بنے ہوئے تھے۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں ڈوبی کبھی خفگی سے کسی دور غیر مرئی نقطے کو دیکھتی، کبھی سر جھٹکتی۔ اسے ساری دنیا سے شکایتیں تھیں۔

پشاور کے جس پلازہ پہ سورج اس وقت اپنی ساری حدت برسا رہا تھا، اس میں موجود لوگ کہیں سے بھی سست نہیں لگتے تھے۔ زیر تعمیر پلازہ کے سیمنٹ زدہ ستون، اور پے در پے منزلوں پہ لگے مٹی اور بجری کے ڈھیر سے ایک طرف نظر ڈالو تو ایک بالائی منزل پہ ہاشم کاردار کھڑا دکھائی دیتا تھا۔ وہ پلازہ کے ایک وسیع و عریض ہال کے دہانے پہ کھڑا تھا جس کی کھڑکی کی جگہ خلا تھا۔ (ابھی چار دیواری، دروازے، کھڑکیاں تعمیر نہیں ہوئے تھے، صرف ڈھانچہ سا ستونوں کے ذریعے کھڑا تھا۔) اور اس وسیع خلا سے گویا نیچے سارا شہر دکھائی دیتا تھا۔

ہاشم نیچے نظر آتے منظر سے بے نیاز، برہم موڈ میں کھڑا تھا۔ نیوی بلیو کوٹ پہنے، بال جیل سے جمائے، وہ ماتھے پہ بل لیے سامنے والے شخص کو گھور رہا تھا، جو کان کھجاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"یہ آپ سے کس نے کہا کہ ہم آپ پہ اعتماد نہیں کرتے یا آپ کا متبادل ڈھونڈ رہے ہیں؟"

"لوگ باتیں کر رہے ہیں۔" وہ دانت پہ دانت جما کر بولا تھا۔

"کاردار صاحب! ایسا کچھ نہیں ہے۔ ہمیں آپ کے ساتھ ہی کام کرنا ہے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ اس سعدی یوسف ٹرائل سے آپ کی پوزیشن خراب ہوئی ہے، لیکن ہم آپ کے دوست ہیں، ہم آپ کو مشکل سے نکالنے کے لیے ہر ممکن تعاون کریں گے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ "مجھے اس لڑکے سعدی یوسف کو دہشت گرد ثابت کرنا ہے۔ اس کی سب سے بڑی کوالٹی یہ ہے کہ وہ صرف تھرکول کا انجینئر نہیں ہے، وہ ایک راکٹ سائنٹسٹ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ میزائل ٹیکنالوجی کے معاملے میں بہت اچھا ہے۔ ایسے لوگ ماچس کی ڈبی سے بھی بم بنا سکتے ہیں۔ مجھے اس کو ٹی ٹی پی کا بم میکر ثابت کرنا ہے اور آپ کو میری مدد کرنی ہوگی۔"

"ہو جائے گا ثابت، آپ فکر ہی نہ کریں۔ آپ بتائیں، آپ کو ہم سے کیا چاہیے۔" وہ پوری ذمہ داری سے اسے یقین دلا رہا تھا۔

سیکڑوں میل دور... اسلام آباد میں سارہ اپنے کمرے سے بے دلی سے نکلی تھی۔ بالوں کو جوڑے میں باندھا اور پیروں کو نرم فر کے بنے چپلوں میں گھسیٹتی وہ سست روی سے ڈائننگ ٹیبل تک آئی۔ ذکیہ بیگم پچھلے چند دنوں سے، کسی فوتگی کے باعث گاؤں گئی ہوئی تھیں۔ آج کل میں واپسی تھی۔ ان کے بغیر گھر اداس لگتا تھا۔

ملازمہ اسے دیکھتے ہی ناشتے کا پوچھنے لگی۔

"بچوں نے ناشتا کیا ہے؟" اس نے پھلوں کی ٹوکری سے مطلوبہ پھل ڈھونڈتے ہوئے پوچھا۔

"جی کر لیا تھا۔"

"ابھی کہاں ہیں؟"

"باہر لان میں کھیل رہی ہیں۔"

"اتنی گرمی میں کون سا کھیل، کھیل رہی ہیں؟ ویسے تو سارا دن موبائل اور ٹیبلیٹ ہوتے ہیں ہاتھ میں۔ جاؤ ان کو اندر لے کر آؤ۔" وہ خفا ہوئی تو ملازمہ فوراً" باہر کو لپکی۔

سارہ موبائل فون پہ انگلی... پھیرتی ای میلز دیکھنے لگی، دوسرے ہاتھ میں سیب تھا جسے وہ کھا رہی تھی۔ تب ہی ملازمہ دوڑتی ہوئی آئی۔

"ڈاکٹر صاحب... ڈاکٹر صاحب..." سارہ نے چونک کر چہرہ اٹھایا۔ وحشت زدہ بوکھلائی ہوئی ملازمہ ہانپتی

کانپتی اس کی طرف آرہی تھی۔ سارہ کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ سارے واہمے، سارے ڈر درست ثابت ہونے والے تھے۔

"بچیاں باہر نہیں ہیں۔ چوکیدار کہہ رہا ہے وہ ذرا دیر کو باتھ روم گیا تھا، پھر واپس آیا تو بچے نظر نہیں آئے، وہ سمجھا اندر چلی گئی ہیں۔"

سیب، سیل فون، ہر شے اس کے ہاتھ سے پھسلی تھی۔ وہ اسی طرح باہر بھاگی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا اور سانس رک رک کر آرہی تھی۔

لان ویران پڑا تھا۔ برآمدہ خالی تھا۔ پورچ میں کھڑا چوکیدار افسوس سے ہاتھ مل رہا تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں بھی کچھ تھا۔ سارہ حواس باختہ سی اس کی طرف بھاگی۔

"کہاں ہیں امل اور نور؟" آواز گھٹی گھٹی سی نکلی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح پیچھے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے نہیں پتا ہی نہیں چلا بیگم صاحب۔ یہ دیکھیں یہ گیٹ کے اندر پڑا ملا ہے۔"

سارہ نے تقریباً" جھپٹنے کے سے انداز میں وہ کاغذ تھاما۔

"آپ کے بچوں کو آپ کی اجازت کے بغیر لے کر جانے کے لیے بہت معذرت، مگر پرسوں کی تاریخ کو یادگار بنانے کے لیے یہ ضروری تھا۔ H"

"پیچ! پرسوں... تاریخ!" سارہ کا دل دور اندر ڈوبتا جا رہا تھا۔ اس کی بیٹیوں کو کون لے کر گیا تھا۔ سب عیاں ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆
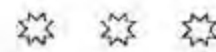
مور چال میں بھی وہ سست سی صبح نمودار ہو رہی تھی۔ چھٹی کے باعث ندرت کو ریستوران جلدی جانا تھا، اس لیے وہ کچن میں کھڑی حسینہ کو جلدی جلدی ہدایات دے رہی تھیں۔ ساتھ ہی پرس میں موبائل اور بٹوہ بھی اڑس رہی تھیں۔

"آج ایک اہم برنچ اور پھر دو سالگرہ کی تقاریب ہیں، میں گھر کا چکر نہیں لگا سکوں گی تم یوں کرنا کہ..."

ان کی آواز باہر ڈائننگ روم تک آرہی تھی۔ جہاں زمر لاتعلق سی کرسی پہ بیٹھی چائے کے گھونٹ بھرتی اپنا موبائل دیکھ رہی تھی۔ اور وہ اس کے مقابل کہنیاں میز پہ ٹکا کر بیٹھا، مگ ہاتھ میں لیے آنکھیں اس پہ جمائے ہوئے تھا۔ پھر دفعتاً" وہ کھنکھارا...

وہ نظر انداز کیے رہی۔

"کل رات میں..."

"ابا! آپ نے اخبار پڑھ لیا تو مجھے دے دیں۔" وہ کرسی پہ پیچھے کو گھومی اور لاؤنج میں بیٹھے ابا کو پکارا۔ وہ عینک ناک پہ لگائے، اخبار کھولے، سر جھکائے جواباً" بولے۔

"تم کب سے صبح صبح اخبار پڑھنے لگیں۔ ساری خبریں تو موبائل پہ پڑھ لیتی ہو۔"

فارس ہلکا سا مسکرایا۔ "یہ دیکھنا چاہ رہی ہیں کہ شاید میری تیسری شادی کی خبر لگی ہو۔" جہاں زمر نے مڑ کر اسے گھورا، وہاں ابا نے بھی نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ فارس کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ "مذاق کر رہا تھا۔" اور ذرا رخ موڑ کر چائے پینے لگا۔ (سارا خاندان ہی...)

دفعتاً" اس کا سیل فون بجنے لگا۔ اس نے عام سے انداز میں موبائل اٹھایا، پھر ذرا ٹھہرا... "سارہ کا فون ہے۔" ہلکا سا بڑبڑایا۔ زمر چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"شاید وہ پریپ ویٹنس (گواہی) کے لیے آنا چاہتی ہوں۔" زمر کو اب بھی امید تھی۔

فارس نے موبائل کان سے لگایا اور بشاشت سے ہیلو کہا۔ دوسری طرف سے اس کے الفاظ سن کر اس کی رنگت بدلی۔ ابرو اکٹھے ہوئے۔ چونک کر زمر کو دیکھا۔ پھر... "جی... جی..." کرتا اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

کسی ان ہونی کا احساس تھا یا کیا، زمر اس کے پیچھے لپکی۔ جب تک وہ اندر آئی، وہ فون رکھ چکا تھا اور والٹ اور چابیاں اٹھا رہا تھا۔ چہرے پہ شدید پریشانی تھی۔

"کیا ہوا؟" فارس چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر دبی آواز میں بولا۔

"وارث کی بیٹیاں... صبح صبح کوئی ان کو لے گیا

ہے۔ سارہ بہت رو رہی ہیں۔ ہمیں ان کے پاس جانا ہو گا۔"

"اوہ میرے اللہ!" اس کا دل دہل گیا تھا۔ "میں ندرت بھابھی کو....." وہ مڑنے لگی تھی کہ فارس نے بازو سے پکڑ کر اسے روکا۔

"ان کو اور بڑے ابا کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ حنین اور اسامہ ویسے بھی سو رہے ہیں۔ خواہ مخواہ بات مزید بگڑے گی۔ صرف سعدی کو بلاؤ اور ہم تینوں وہاں جاتے ہیں۔ میں پولیس کو کال کرتا ہوں۔" پھر وہ چابیاں اٹھائے باہر کو لپکا تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆

دوپہر کا سورج آگ برسا برسا کے بھی تھک نہیں رہا تھا۔ گویا سب کے دل اندر تک جلا ڈالے گا۔ لاؤنج میں صرف سارہ کے رونے کی آواز تھی۔ ذکیہ بیگم مسلسل اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھیں مگر وہ روئے جا رہی تھی۔ زمر سامنے مغموم سی بیٹھی تھی اور سعدی بالکل خاموش' سر جھکائے ہوئے تھا۔ وہ سارہ سے نظریں تک نہیں ملا پا رہا تھا۔

دفعتاً" فارس موبائل جیب میں رکھتا اندر داخل ہوا۔

"ہمیں پولیس اسٹیشن جانے کی ضرورت نہیں ہے' پولیس اپنی پوری کوشش کر رہی ہے۔ مختلف جگہوں پہ ناکہ بندی کی جا رہی ہے' سی سی ٹی وی کیمروں کی فوٹیج کے ذریعے پتا چلانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ کس کار میں سوار تھے۔ ایک دفعہ گاڑی مل جائے' تو پھر ان کو ڈھونڈنا آسان ہو گا۔"

پھر وہ اس کے سامنے بیٹھا جس کی آنکھیں رو' رو کر گلابی ہو رہی تھیں۔

"سارہ! ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم ان کو شام سے پہلے ڈھونڈ کر لے آئیں گے۔"

سارہ نے بھیگی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ "فارس! میں اپنے بچوں کے بغیر کیا کروں گی۔ کیا اسے اللہ سے ڈر نہیں لگتا؟ وہ میرے بچے کیسے لے جا سکتا ہے۔"

"ہاشم سے ہر بات کی امید کی جا سکتی ہے۔" زمر نے جھرجھری لی تھی۔

"نہیں....." سعدی نے سختی سے نفی میں سر ہلاتے چہرہ اٹھایا۔ "ہاشم کسی کے بچے نہیں اٹھا سکتا۔ ہاشم..... میرا مطلب ہے..... وہ چھوٹے بچوں کو اس میں انوالو نہیں کرے گا۔"

"تمہیں اب بھی ہاشم سے امید ہے۔" زمر نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "وہ بچوں کو یتیم کر سکتا ہے دوسروں کی بہنوں کو استعمال کر سکتا ہے' کسی کے بچے کو ہسپتال سے اغوا کر سکتا ہے' مگر ہاں وہ بچوں کو اٹھوا نہیں سکتا۔"

"پتا نہیں۔" سعدی نے سر جھٹکا۔

"اس نے نوٹ پہ اپنے نام کا حروف سائن کیا ہے سعدی۔" سارہ روتے ہوئے بولی تھی۔ "اور وہ نوٹ پرنٹڈ ہے' ہم اس سے کچھ ثابت نہیں کر سکتے' مگر وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔" پھر اس نے فارس کو دیکھا۔ "پلیز' میرے بچے واپس لا دو' کچھ کرو فارس....."

"میں آپ سے کہہ رہا ہوں نا سارہ! وہ شام سے پہلے گھر ہوں گے۔ آپ تھوڑا سا حوصلہ کریں۔" وہ اسے مسلسل تسلی دے رہا تھا۔ سعدی اٹھ کر ایک دم باہر نکل گیا۔ زمر چند لمحے بعد اس کے پیچھے گئی۔

وہ برآمدے میں رکھی کرسی پہ بیٹھا دور آسمان کو دیکھتا' کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ بہت اداس لگتا تھا جیسے اس کا بہت کچھ سورج کی حدت میں بھاپ بن کر اڑ گیا ہو۔ کھو گیا ہو۔

"ہاشم ایسا کر سکتا ہے سعدی۔"

"ہاں واقعی..... اس دنیا میں کوئی کچھ بھی کر سکتا ہے۔" سعدی نے تلخی سے سر جھٹکا۔ وہ اس کے کندھے کے پیچھے کھڑی رہی' بیٹھی نہیں اور وہ اسی طرح دور آسمان کو دیکھتا رہا۔

"تو تم نے دو لوگوں کی جان لی تھی!" اس نے موضوع چھیڑا۔ سعدی کے اندر اداسی سی اتر گئی' مگر بہت ضبط سے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"سیلف ڈیفنس....."

"ہاشم تم پہ حملہ کرواسکتا ہے تو کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"وہ سب ہاشم نے نہیں' اس کی ماں نے کرایا تھا۔"

"کیوں؟" وہ چونکی۔ یہ بات اس کے لیے نئی تھی۔

"وہ مجھ سے خوف زدہ تھیں۔ میرے پاس ایک راز ہے ان کا۔"

"کیسا راز؟" عقب سے آتے فارس نے پوچھا۔ وہ بھی اس بات پہ چونکا تھا۔ زمر نے مڑ کر اسے دیکھا۔ دونوں نے حیران نظروں کا تبادلہ کیا' مگر سعدی اسی طرح بیٹھا رہا۔

"ابھی بتانے کا فائدہ نہیں ہے اور اس وقت تو قطعاً" نہیں۔" پھر اس نے آنکھوں کو انگلیوں سے مسلا۔ "مجھے سارہ خالہ کو کبھی یوں فورس نہیں کرنا چاہیے تھا گواہی کے لیے۔ یہ سب... میری غلطی ہے۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں ذمہ دار ہوں اس سب کا۔"

فارس نے اکتا کر اسے دیکھا۔ "شٹ اپ' پلیز! اب تم کچھ نہیں بولو گے۔" اور واپس اندر کی طرف مڑ گیا۔

ماحول ہنوز بوجھل تھا اور وہ دونوں بالکل چپ کھڑے تھے۔ کہنے کو گویا کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس شام قصر کاردار میں رنگ و بو کا سیلاب سا نظر آتا تھا۔ سارے گھر اور سبزہ زار کے درختوں کو خوب صورت روشنیوں سے سجایا گیا تھا۔ وسیع و عریض لونگ روم اور ڈائننگ ہال میں سونیا کی سالگرہ کی پارٹی زور و شور سے جاری تھی۔ اگلے ہفتے سونیا کو اسکول ٹرپ کے ساتھ باہر جانا تھا' اس لیے سالگرہ آٹھ دن پہلے منعقد کی گئی تھی۔ کیک کٹ چکا تھا۔ مہمان ٹولیوں کی صورت گھر اندر ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ احمر کان میں لگے آلے کو درست کرتا سیکورٹی کے امور کا جائزہ لے رہا تھا۔ غرض معمول کی مصروفیات جاری تھیں۔ ایسے میں جواہرات مسکرا کر چند حضرات سے کہہ رہی تھی۔

"میں یقیناً" اس دنیا کی خوش قسمت ترین عورت ہوں۔ جس کے دو جوان بیٹے اس کے دونوں بازو بنے ہوں' اس کا سہارا ہوں اور ماشاء اللہ دونوں اپنے بزنس میں سیٹ بھی ہوں' اس سے زیادہ لکی کون ہوگا؟" وہ تفاخر سے کہہ رہی تھی اور سامنے والے تائید کر رہے تھے۔

ادھر ہاشم دو افراد سے ہنستے ہوئے باتوں میں مگن تھا۔ آنکھ کے کنارے سے وہ آب دار کو بھی دیکھ رہا تھا جو سب لوگوں کے درمیان بھی الگ تھلگ سی کھڑی دکھائی دیتی تھی۔ وہ بار بار اپنے موبائل کو دیکھتی' جیسے بور ہو رہی ہو۔ ایکوا تھیم کی پارٹی میں جہاں ہر شخص نے سمندری مخلوق جیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ (کیونکہ سونیا کا نیا کرش فائنڈنگ ڈوری کے ٹریلر کے بعد سمندری مخلوق تھی۔) آب دار نے نیمو کا نارنجی رنگ زیب تن کر رکھا تھا' مگر سر کا رومال سرخ ہی تھا۔ وہ اداس اور بور نظر آتی تھی۔ ہاشم گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کن اکھیوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ خود مکمل سفید سوٹ میں ملبوس تھا اور سونی کے پوچھنے پہ اس نے کہا تھا کہ وہ آئس برگ ہے۔ برف کا تودہ' جو نیلے سمندر میں سر اٹھا کر کھڑا ہوتا ہے۔ نہ پگھلتا ہے' نہ ٹوٹتا ہے اور بڑی بڑی کشتیوں کو ڈبو دیتا ہے۔ سونی اسے کافی دیر خاموش ہو کر دیکھتی رہی تھی۔

"میرا میسج ملا آب دار؟" جواہرات کی آواز پہ آبی چونک کر مڑی۔ سامنے بنی سنوری مسکراتی ہوئی جواہرات کھڑی تھی۔ لباس شارک کے جیسا سلور تھا اور آنکھوں میں بھی ویسی ہی تندی تھی۔

"مل گیا تھا اور میں نے اس ویڈیو کو تباہ کر دیا۔ مکمل ختم۔ اب کوئی آپ کو اس کے ذریعے بلیک میل نہیں کر سکتا۔ اس لیے بے فکر رہیے۔" بے زاری سے گویا ہوئی۔

☆ ☆ ☆

"مجھے یقین نہیں ہے۔" جواہرات بظاہر مسکرا کر بولی تھی۔

"تو میں کیا کروں؟" وہ شانے اچکا کر اکھڑے سے انداز میں بولی تھی۔

یہاں سے ہاشم کو آوازیں سنائی نہ دیتی تھیں مگر انداز سارے عیاں تھے۔ وہ ان دونوں کے بیچ کی ساری حدت محسوس کرسکتا تھا۔ سو اپنے مصاحبین سے معذرت کر کے آبدار کی طرف آیا۔

"ریڈ! تم ٹھیک ہو؟" نرمی سے اسے پکارا۔ جواہرات اس کی آواز سنتے ہی آگے بڑھ گئی۔ البتہ آب دار اسے دیکھ کر جبراً" ذرا سا مسکرائی۔

"ہاں۔ بالکل۔" پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔ "سونیا کی سالگرہ کی تقریبات کی بہت شہرت سنی تھی کراچی میں۔ یہ پہلی دفعہ ہے کہ میں اس شرکت میں کر رہی ہوں اور کافی لطف اندوز ہو رہی ہوں۔"

"گڈ۔" وہ مسکراتے ہوئے اسے غور سے دیکھ کر بولا۔ "مجھے بار بار ایسا لگتا ہے، تم کسی کے میسج یا کال کے انتظار میں ہو۔"

آب دار کی رنگت ذرا بدلی، مگر سنبھل کے مسکرائی۔ "بابا نہیں آئے نا۔ تو سوچ رہی ہوں' ان کے آنے کی امید رکھوں یا نہیں۔"

"اچھا۔" اس نے سر خم کر دیا۔ مگر اسے یقین نہیں آیا تھا۔ یہ تڑپ یہ بے تابی سب بہت عیاں تھا۔

دور کھڑی شہرین نے گلاس سے گھونٹ بھرتے ہوئے تیکھی نظروں سے اس منظر کو دیکھا تھا۔ ہاشم ایک نئی اڑان کی تیاریوں میں تھا۔ یوں شہری کا تعلق اس محل سے ٹوٹنے کے قریب تھا۔ یہ شہزادی اسے کہاں داخل ہونے دے گی دوبارہ؟ اب وہ کیسے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹے' اس کا ذہن ناکام قسم کے تانے بانے بُن رہا تھا۔ فرسٹریشن سی فرسٹریشن تھی۔ وہ کیا کرے؟

☼ ☼ ☼

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ سارہ کے لاؤنج میں بیٹھے افراد کی سوگواری میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کسی نے بتیاں نہیں جلائی تھیں۔ پورچ اور ٹی وی کی روشنی نے ہی کمرے کو مدھم سا روشن' مدھم سا اندھیرا کر رکھا تھا۔ ایسے میں فارس بیرونی دروازے سے داخل ہوا تو سعدی بے اختیار کھڑا ہوا' سارہ نے بھی امید سے اسے دیکھا۔ اس کے آنسو اب خشک تھے مگر آنکھیں سرخ تھیں' ان میں امید بھی تھی اور خوف بھی۔

"کیا ہوا؟ کچھ پتا چلا۔"

فارس نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔

"کسی نے انہیں جاتے نہیں دیکھا' کسی جگہ نہیں ہیں وہ۔"

سارہ اسے دیکھتی رہی۔ آنکھیں جھپکے بغیر بس خشک آنکھیں اس پہ جمائے رکھیں۔ وہ سعدی کو کیس بتا رہا تھا۔ پولیس کے ناکے' سی سی ٹی وی ٹریل۔ یہ وہ۔

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔" ایک دم سارہ پھٹ پڑی تھی۔ سب نے چونک کر اسے دیکھا۔ "تم سب ذمہ دار ہو۔" وہ نفرت سے فارس اور سعدی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تھی۔

"تم لوگوں نے میرے بچوں کو ایک اور تجربے کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ یہ سب تم لوگوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ اسی لیے نہیں رکھتی تھی میں تم سے کوئی تعلق۔ اسی لیے تمہاری طرف آنا جانا چھوڑ رکھا تھا کیونکہ تم لوگوں کی وجہ سے' میں مصیبت میں پڑوں گی' میرے بچے نقصان اٹھائیں گے۔ تم لوگوں نے دھکیلا ہے ہمیں اس سب میں۔"

لاؤنج میں سناٹا چھا گیا۔ کوئی کچھ نہیں بول پا رہا تھا۔

"سارہ وہ بچوں کو نقصان نہیں پہنچائے گا' تھوڑا سا صبر کریں' ہم۔۔۔" فارس نے کہنا چاہا۔

"صبر؟" وہ ایک دم اٹھی' کشن پرے پھینکا اور فارس کو دیکھ کر غرائی۔ "کتنا صبر؟ آٹھ ماہ صبر کروں جیسے سعدی کی ماں نے کیا؟ آٹھ ماہ سے پہلے تو نہیں چھوڑیں گے وہ میرے بچوں کو۔ نہ کوئی کال آئے گی نہ تاوان مانگا جائے گا۔ میں تو پہلے ہی نہیں دے رہی

تھی گواہی' پھر کیوں اٹھایا میرے بچوں کو۔" آنسو پھر سے اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ بہنے لگے تھے۔

"میں نے تو بار بار کہا تھا سب کو کہ میں گواہی نہیں دوں گی۔ پھر کیوں کی میری گود خالی۔"

"آپ کوئی گواہی مت دیں سارہ بس دعا کریں ہم انہیں ڈھونڈ لیں ہے۔" زمر نے کہنا چاہا مگر اس نے سر جھٹک دیا۔ اب جیسے کسی کی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کا غم اب غصے میں بدلنے لگا تھا۔

فارس جو ابھی تک کھڑا تھا خاموشی سے۔ واپس مڑا تو سعدی بول اٹھا۔

"آپ کدھر جا رہے ہیں؟"

"ہاشم سے ملنے۔" وہ سپاٹ، سرد سے انداز میں بولا تھا۔

"میں بھی آؤں گا۔" وہ اس کی طرف لپکا تو زمر داخل کر آگے آئی۔

"پاگل ہو تم سعدی! اس کے گھر دعوت ہے آج ایک دنیا ہوگی وہاں۔ تم نہیں جا سکتے ادھر۔ تم اس سے نہیں مل سکتے۔"

"مگر مجھے جانا ہے۔" وہ دکھی لگتا تھا۔

"تم یہیں رکو، صرف میں جا رہا ہوں۔ میں نے کہا نا واپس بیٹھو۔" فارس نے سختی سے منع کیا تو سعدی برے موڈ کے ساتھ صوفے پہ بیٹھا۔

وہ باہر نکلا ہی تھا کہ اسے پیچھے قدموں کی آواز آئی۔ وہ اکتا کر گھوما۔

"سعدی! میں نے کہا ہے نا تم..." وہ ٹھہر گیا۔ سارہ پیروں میں چپل ڈالتی آنکھیں رگڑتی آ رہی تھی۔

"میں تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔"

"ہرگز نہیں سارہ!" وہ تیزی سے پریشان ہو کر بولا تھا۔ سارہ نے رک کر اسے دیکھا تو آنکھوں سے آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔

"تم مجھے روک سکتے ہو؟ تم مجھے روک سکتے ہو کیا؟" اور فارس کو احساس ہوا، واقعی وہ اسے نہیں روک سکتا۔ وہ اس وقت صرف ایک ماں تھی۔

☆ ☆ ☆

قصر کاردار کے لونگ روم میں اونچے سروں میں بجتی موسیقی اپنے عروج پہ تھی۔ کھانا کھایا جا رہا تھا۔ قہقہے گونج رہے تھے۔ ایسے میں ان سب سے بے نیاز نوشیرواں اپنے کمرے میں بے سدھ لیٹا، چھت کو تک رہا تھا۔ باہر کا ماحول اسے بے زار کر رہا تھا۔ وہ تیار تک نہیں ہوا تھا۔ یونہی شب خوابی کے لباس میں لیٹا تھا۔ دراز آدھی کھلی نظر آتی تھی، اور اندر رکھی پڑیاں ملفوف دکھائی دیتی تھیں' سفید پاؤڈر کی طلب سے دراز کھولی مگر بے زاری سے وہیں چھوڑ دی۔ آج اس سے بھی دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ اب کوئی غم یوں مٹانے سے نہیں مٹتا تھا۔ اب کیا دوا کی جائے اس مرض کی؟

نیچے لاؤنج میں آئیں تو ہاشم ایک دفعہ پھر آب دار کے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔ دونوں نے ہاتھوں میں پلیٹیں اٹھا رکھی تھیں اور وہ بات کرنے کے ساتھ کھا بھی رہے تھے۔

"نہیں۔ کیس لڑ رہا ہوں۔" اس نے نگاہیں آب دار کے چہرے پہ جمائے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ آب دار نے نگاہیں چرائیں۔

"نہیں۔ نکال رہا ہوں اپنے خاندان کو اس میں سے،" وہ اسے باور کرا رہا تھا۔

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں اب آگے بڑھ چکی ہوں۔" وہ ادھر ادھر دیکھتی ایک دم بے چین سی لگنے لگی تھی۔

"مگر یہ سب تم چاہتی تھیں۔" آب دار نے تندی سے اسے دیکھا۔

"لیکن کیا تم نے میرے کہنے پہ یہ کیا؟ ہرگز نہیں۔ اب مجھے نہیں پتا کہ تم نے یہ کیوں کیا مگر تم نے مجھے صاف انکار کر دیا تھا' مائی ڈیئر گریم ریپر! اور اب تم خود کو اس اسکینڈل سے نکال لو تو بھی کیا۔ تمہاری پارٹی میں اس دفعہ اتنے لوگ نہیں آئے کہ تم لان بھر سکو۔ اور جو آئے ہیں' وہ مسلسل ٹرائل کی باتیں کر رہے ہیں۔"

ہاشم کی گردن میں گلٹی سی ڈوب کر ابھری۔ اس سے پہلے کہ وہ بہت ضبط سے کچھ کہتا، کان میں لگا آلہ کچھ بولا۔ ہاشم کے تاثرات اچنبھے میں بدلے۔

"فارس؟ آر یو شیور؟ وہ ادھر کیوں آیا ہے؟" کان پہ ہاتھ رکھ کے کف لنک میں لگے آلے میں بولا تھا۔ وہ جتنا حیران ہوا تھا' آبی اتنی ہی چونکی تھی۔

"فارس آیا ہے؟" وہ بے اختیار بولی تھی۔

ہاشم تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ وہ چند لمحے تو ہکا بکا کھڑی رہی پھر اس کے پیچھے بھاگی۔

گیٹ کے باہر نیچے کو جاتی سڑک پہ کار کھڑی تھی اور دو افراد دروازے کے ساتھ کھڑے نظر آرہے تھے۔ ان کے گرد آدھ درجن گارڈز چوکنے سے کھڑے تھے۔ گویا ادھر وہ کوئی حرکت کریں' ادھر وہ انہیں شوٹ کردیں۔ ہاشم تیز قدموں سے چلتا داخلی چوکی تک آیا۔ اسے دیکھ کر سب اس طرف متوجہ ہوئے۔

"کیا مسئلہ ہے؟ کیا ہو رہا ہے؟" گھر کی بیرونی چار دیواری کی بتیوں کے باعث سارا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ ہاشم گیٹ کے قریب آیا اور اسے کھولا۔

فارس اس کے پکارنے پہ اس طرف گھوما۔ ہاشم کے کندھے کی اوٹ سے آب دار نے دیکھا۔ وہ رف سی جینز اور پوری آستین کی شرٹ میں ملبوس تھا۔ اس کی آنکھوں میں غصہ تھا اور ماتھے پہ گہری سلوٹیں۔ وہ تیر کی سی تیزی سے ہاشم کی طرف لپکا اور اسے گریبان سے پکڑا۔

"کدھر ہیں اہل اور نور؟ ہاں؟" وہ غرایا تھا۔ جہاں آب دار سُن رہ گئی وہاں بہت سی رائفلیں اس کی طرف تن گئیں۔

"off Hands"

ہاشم نے جھٹکے سے اس کے ہاتھوں کو نیچے جھٹکا۔ اور ایک قدم پیچھے گیا۔ ایک گارڈ نے گیٹ بند کردیا۔ ایسے میں سارہ بھر کر گیٹ کے قریب آئی۔

ہاشم اب سلاخوں والے دروازے کے پار کھڑا تھا۔ وہ اس سے دو فٹ فاصلے پہ رکی اور سرخ انگارہ آنکھیں اس پہ جمائے بلند آواز میں غرائی۔

"میرے بچے کہاں ہیں؟"

ہاشم نے کالر جھاڑتے ایک نظر اسے دیکھا' دوسری اپنے کندھے کے پیچھے کھڑی حیران سی آب دار پہ ڈالی۔ پھر برہمی سے بولا۔ "مجھے نہیں پتا' آپ کیا کہہ رہی ہیں۔"

"ہاشم کاردار... تمہارے آدمی صبح میری بچیوں کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔ میں... ان کی ماں... ان کے باپ کے قاتل سے پوچھنے آئی ہوں کہ وہ دونوں کہاں ہیں۔" وہ چلا کر بولی تھی۔

فارس اس کے عین پیچھے آ کھڑا ہوا تھا۔ ایک گارڈ اس کے چلانے پہ برہمی سے اس کی طرف بڑھنے لگا تو فارس نے فوراً جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ایک دم سے بہت سی رائفلوں کے لوڈ ہونے کی آواز آئی۔ فارس نے آہستہ سے ہاتھ باہر نکالا تو اس میں سیل فون تھا۔

"اگر تم لوگوں نے ہمارا ساتھ ذرا سا بھی غلط سلوک کرنے کی کوشش کی تو میں ایک بٹن دباؤں گا اور سوشل میڈیا پہ یہاں کی لائیو کوریج جانا شروع ہوجائے گی۔ ہزاروں لاکھوں لوگوں کے سامنے تم اور تمہارے بندے آن ائیر ہوں گے' اس لیے بندوقیں... نیچے... کرو۔" وہ جھڑک کر بولا تھا۔ آب دار صرف اس کا چہرہ تک رہی تھی۔ وہ ابھی تک سُن تھی۔

"ہوا کیا ہے؟" ہاشم نے بے زاری سے اس کی بات کاٹی' ساتھ ہی گارڈز کو اشارہ کیا' انہوں نے اسلحہ نیچے کرلیا۔

"ہاشم! میرے بچے کہاں ہیں؟" وہ پھر حلق کے بل چلائی تھی۔

"میں آپ سے پوچھ رہا ہوں ڈاکٹر صاحبہ! کہ ہوا کیا ہے۔" وہ چبا چبا کر بولا تھا۔

"ہاشم!" وہ ایک قدم مزید آگے آئی' اور ان آہنی سلاخوں کو تھاما جو دونوں کے بیچ حائل تھیں۔ نگاہیں لمحے بھر کے لیے بھی اس کے چہرے سے ہٹائے بغیر وہ غرائی تھی۔

"تم کیا سمجھتے ہو' میں کوئی ڈرپوک عورت ہوں۔ بزدل ہوں۔ تم نے سمجھا کیا ہے مجھے؟ ایک کم ہمت عورت؟" حقارت سے اس نے سر جھٹکا۔

"ہاشم کاردار! میں وہ عورت ہوں جس کے نیچے دو ہزار مرد تھر کے ان صحراؤں میں کام کرتے ہیں، جہاں تمہارا یہ ائیر کنڈیشنڈ پہ پلنے والا جسم دس منٹ میں پگھل جائے۔ میں وہ عورت ہوں جو میزائل بناتی ہے، بم بناتی ہے۔ میں اگر محتاط تھی، تمہارے ساتھ مصلحت سے کام لے رہی تھی، تو اس کو تم میری کمزوری مت سمجھنا۔ میری انگلیوں کے چند کلک اور ایک ڈرون کی مار ہے تمہارا یہ سارا محل۔ میں اس قابل ہوں ہاشم! کہ تمہیں تمہارے اس محل سمیت زمین بوس کرنے میں مجھے چند کلکس اور ایک ڈرون کی ضرورت ہوگی۔ اور یقین مانو، میرے خلاف کوئی ایف آر بھی نہیں کٹے گی، کیونکہ میں حساس ادارے کی سائنس دان ہوں۔ میرے پاس بہت سے پروٹیکٹر ہیں۔ سو میری سنو اگر....." انگلی اٹھا کر تنبیہہ کی۔ "میرے بچے ایک گھنٹے کے اندر اندر واپس گھر نہ آئے تو تم دیکھنا میں تمہارے ساتھ کیا کرتی ہوں۔"

"کلاس معاف۔" ہاشم پرسکون سا کھنکھار کر بولا۔ "مگر آپ لوگ یہ ڈرامہ کہیں اور جا کر کریں تو زیادہ بہتر ہوگا سوشل میڈیا پہ ہٹس لینے کے لیے اس طرح کے ناٹک کرنا انتہائی گری ہوئی حرکت ہے۔ میں ....بچوں سے جنگ کرنے والا آدمی نہیں ہوں۔" حقارت سے ان کو دیکھا اور پھر ہاتھ بڑھا کر اشارہ کیا۔ "ناؤ گیٹ لاسٹ پلیز۔ میں ذرا مصروف ہوں۔" اور واپس مڑ گیا۔ سارہ ابھی تک اونچی آواز میں کچھ بول رہی تھی۔ شاید بددعائیں دے رہی تھی۔ فارس اب اسے واپس لے جا رہا تھا مگر وہ غصے سے چلائے جا رہی تھی۔

ہاشم چند قدم چل کر رکا۔ اور چونک کے آب دار کو دیکھا۔ وہ پیچھے آتے آتے رک گئی۔ تھی بالکل ششدر، گم صم۔

"تم نے ان کے بچے اغوا کر لیے؟" وہ بے یقین تھی۔

"اوہ کم آن۔" وہ کراہا تھا۔ "یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں نے کسی کو اغوا نہیں کیا۔"

آب دار نے ایک ملامتی نظر اس پہ ڈالی اور نفی میں سر ہلایا۔ "سعدی کی دفعہ بھی تم نے یہی کہا تھا۔"

ہاشم چند لمحے کے لیے کچھ بول نہیں سکا۔ اس کے منہ پہ جیسے آب دار نے ایک دفعہ پھر بیلچہ دے مارا تھا۔ وہ اس کو تاسف سے دیکھتی آگے بڑھ گئی تھی، اور وہ بالکل منجمد کھڑا رہ گیا تھا۔ برف کے مجسمے جیسا ٹھنڈا اور بے جان۔

☆ ☆ ☆

سارہ جب واپس گھر میں داخل ہوئی تو وہ کافی تھکی تھکی دکھائی دے رہی تھی۔ فارس خاموشی سے اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ رات اترنے لگی تھی اور ساری امیدیں دم توڑتی جا رہی تھیں۔ انہیں آتے دیکھ کر سعدی اور زمر بے اختیار کھڑے ہو گئے تھے۔

"کچھ پتا چلا؟ کیا کہا اس نے؟" سعدی نے پوچھا تھا۔ زمر چپ رہی۔ بالکل چپ۔

فارس نے محض نفی میں سر ہلایا۔ سارہ چپ چاپ صوفے پہ بیٹھ گئی۔ گھٹنوں پہ ٹھوڑی پہ جمائے اور خشک آنکھوں سے دور خلا میں دیکھنے لگی۔

سب خاموش ہو گئے۔ لاؤنج میں عجیب وحشت زدہ سناٹا چھا گیا۔ سانسوں کی آواز سنائی دیتی تھی، یا خشک آنسوؤں کی۔

"پولیس....." زمر نے فارس پہ نگاہیں جمائے یک لفظی استفسار کیا۔ اس نے گہری سانس لی۔

"کچھ معلوم ہوگا تو وہ بتائیں گے۔ ابھی تک تو کچھ پتا نہیں چلا۔" زمر اسے دیکھتی رہی۔ کچھ بولی نہیں۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔

جانے کتنے لمحے گزرے، کتنی گھڑیاں بیتیں جب باہر آوازیں سنائی دیں۔ ہلچل۔ بولنے کی آوازیں، گاڑی کے کھلتے بند ہوتے دروازے، انجن کے جلنے رکنے کی آواز، مل کی آواز، فارس تیزی سے اٹھا مگر سارہ اس سے پہلے ہی ننگے پیر باہر بھاگی تھی۔ برآمدے میں آ کر وہ رک گئی گویا منجمد ہو گئی۔

گیٹ سے امل اور نور اندر داخل ہو رہی تھیں۔ وہ

ساتھ میں مسلسل بولتی جارہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں گفٹ پیکس تھے، اور شاپنگ بیگز بھی، سارہ یک ٹک ان کو دیکھے گئی۔ پھر کوئی سکتہ سا ٹوٹا، وہ بھاگی، اور ان دونوں کو خود سے لپٹا لیا۔ ان کے چہرے چھوئے بالوں پہ ہاتھ پھیرا، پریشانی سے وہ ان کو جیسے ٹٹول رہی تھی۔

"تم ٹھیک ہو؟ تم لوگ کدھر تھے؟ انہوں نے تمہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟" وہ بے تابی سے پوچھ رہی تھی۔ بچیاں اس کے اس انداز پہ ایک دم الجھن کا شکار ہوگئیں۔ اور تب ہی سارہ کو احساس ہوا کہ گیٹ سے کوئی اور بھی اندر داخل ہو رہا ہے۔ بجلی کی سی تیزی سے اس نے چہرہ اٹھایا۔

"ہم ان کو نقصان کیوں پہنچائیں گے سارہ خالہ؟" اندر داخل ہوتی حنین بہت برا مان کر بولی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بھی شاپنگ بیگز اور گفٹ ریپر کی رول شدہ شیٹس تھیں۔ سارہ نے بچیوں کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ وہ متحیر سی کھڑی ہوئی۔ بے یقینی سے حنین اور اس کے پیچھے آتے سیم کو دیکھا۔

"حنین... بچے تمہارے ساتھ تھے؟" پیچھے سے سعدی حیران سا آگے آیا تھا۔ زمر اور فارس نا سمجھی کے عالم میں برآمدے میں ہی رک گئے تھے۔

"ہا!" سعدی کو دیکھ کر بچیوں نے خوف سے چیخ ماری۔ "اوہ نو۔"

"آپ ادھر کیا کررہے ہیں بھائی؟" حنین پریشانی سے چلائی تھی۔ پھر ان تینوں کزنز نے اپنے ہاتھ میں پکڑے گفٹس کو دیکھا۔ "سارا سرپرائز خراب کردیا۔"

"تم... تم لے کر گئی تھیں ان کو حنین؟" سارہ کے لب بے یقینی سے پھڑپھڑائے تھے۔

"کیا مطلب؟ آپ کو میرا نوٹ نہیں ملا؟ سوری میں نے آپ سے پوچھا نہیں، مگر صبح صبح پروگرام بنا، اور ہم لوگ جلدی میں تھے۔ کل بھائی کی سالگرہ ہے نا، ہم نے سرپرائز برتھ ڈے پارٹی کی تیاری کرنی تھی۔ صبح سے شاپنگ کررہے ہیں، اور پھر ریسٹورنٹ کے اوپر والے ہال کو سجایا۔ اف پورے دن کی محنت اور سارا سرپرائز ختم ہوگیا۔" وہ روہانسی ہو کر کہہ رہی تھی۔

"حنین! تم میرے بچوں کو مجھ سے پوچھے بغیر کیسے لے جاسکتی ہو؟" سارہ حلق کے بل چلائی تھی۔ حنہ نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ ایک دم سعدی اور سارہ اس پہ ایک ساتھ غصہ کرنے لگے تھے۔

"حنین! تم اتنی غیرذمہ دار ہو۔"

"حنین، تمہیں احساس ہے، تم نے کیا کیا ہے۔"

"کیا یار۔ میری کزنز ہیں۔ میں لے جاسکتی ہوں۔ اور امی تھیں ریسٹورنٹ میں ہمارے ساتھ۔ وہ تو آج سگنل نہیں آرہے تھے، نہ مال میں نہ ریسٹورنٹ میں ورنہ میں کال کردیتی۔ کیا ہوگیا؟ آپ لوگ غصہ کیوں کررہے ہیں؟"

"ماما! آج اتنا مزہ آیا۔"

"لیکن اب تو سارا سرپرائز خراب ہوگیا۔" وہ تینوں لڑکیاں ایک ساتھ بول رہی تھیں۔ اور اسامہ بھی شامل ہوگیا تھا۔

"آپ کو چوکیدار چاچا نے نہیں بتایا؟ شاید یہ اس وقت ادھر تھے نہیں۔ ورنہ ہمارے ساتھ ریسٹورنٹ کا ڈرائیور تھا اور..."

وہ چاروں بچے اس وقت بڑوں کے شدید عتاب اور لعن طعن کے زیر اثر تھے۔ روہانسے ہو رہے تھے کہ آپ نے ہمارا سارا سرپرائز خراب کردیا۔ مگر سارہ سن نہیں رہی تھی۔ وہ ڈانٹے جارہی تھی، اٹل کو تو اس نے ایک تھپڑ بھی لگا دیا تھا۔ فارس کچھ کہنے کے لیے آگے بڑھا تو زمر نے اسے بازو سے تھام کر اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ قدرے حیران ہوا مگر اس کے انداز میں کچھ تھا جو وہ اس کے پیچھے آیا۔

لاؤنج میں آکر وہ اس کی طرف گھومی اور سینے پہ بازو لپیٹ کر تندی سے اسے دیکھتی ہوئی بولی۔ "یہ کیا تھا؟"

"کیا مطلب کیا تھا؟ ایک غلط فہمی تھی۔" وہ حیران ہوا تھا۔

"پتا ہے میں صبح سے سوچ رہی تھی کہ تم ایسے بھاگ دوڑ نہیں کررہے جیسے تمہیں کرنا چاہیے۔ ہر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

چیز پولیس پہ چھوڑے بیٹھے ہو مگر تمہارے اور سارہ کے جانے کے بعد میں نے ایس پی صاحب کو کال کی' اور پھر متعلقہ تھانے میں فون کیا تو معلوم ہوا کہ آپ نے سرے سے پولیس کو کال ہی نہیں کی تھی۔ اور صبح آپ نے مجھے منع کیا کہ میں ندرت بھابھی کو نہ بتاؤں اور ماشاء اللہ تہجد کے وقت سے آپ جاگے ہوئے تھے آج' اور آپ نے بولا کہ حنین اور اسامہ سو رہے ہیں جبکہ وہ تو صبح سے نکلے ہوئے تھے۔ سو میرا نہیں خیال کہ یہ کوئی غلط فہمی تھی۔"

"اچھا تو مجھے گرفتار کریں' پراسیکیوٹر صاحبہ!" وہ اس کی طرف جھک کر تپانے والے انداز میں بولا تھا۔

"یہ سب تمہارا پلان تھا' ہے نا۔" وہ دبا دبا سا غرائی تھی۔ احتیاط سے دروازے کو بھی دیکھ لیتی جس کے باہر وہ سب ابھی بھی بول رہے تھے۔ "تم سارہ کو اتنا خوف زدہ کر کے کیا کرنا چاہ رہے تھے۔"

"آپ کے حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔ کیوں؟ آپ نے نہیں کہا تھا کہ آپ چاہتی ہیں سارہ گواہی دیں۔"

"میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ اس کے بچے اغوا کرلو۔"

"اغوا کس نے کیے؟ وہ اپنے کزنز اور اپنی پھپھو کے ساتھ تھے۔ اور وقت پہ واپس بھی آگئے۔"

"اگر سارہ کو ٹینشن سے کچھ ہو جاتا تو؟ کون ذمہ دار ہوتا؟" وہ صدمے میں تھی۔ "تم اتنے بے حس کیسے ہو سکتے ہو۔ وہ تمہارے بھائی کی بچیاں ہیں۔"

"جس سارہ کو میں جانتا تھا' وہ وارث کی موت سے پہلے کی سارہ تھی' وہ بہت بہادر اور باہمت عورت تھی۔ مگر اس کے خوف نے اسے اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ جو ڈوبنے سے ڈرتا ہو زمر' اسے پانی میں پھینک دینا چاہیے اور پھر چند ڈبکیاں دے کر نکال لینا چاہیے۔ اس کا سارا خوف زائل ہو جائے گا۔ پھر اسے پتا چلے گا کہ پانی اس سے زیادہ طاقت ور نہیں تھا۔ اور تب ہی اسے کشتی میں محفوظ رہنے کی قدر کا احساس ہو گا۔ وہ جان جائے گا کہ وہ خود کتنا خطرناک ہے' کتنا بڑا سروائیور ہے۔ میں صرف سارہ کو اس خوف سے نکالنا چاہتا تھا۔"

"تم پاگل ہو گیا؟ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو...؟" وہ شدید غصے سے بولی تھی۔ دروازے پہ آہٹ ہوئی تو وہ دونوں فوراً "سیدھے ہوئے۔ سارہ مسلسل برہمی سے بولتی اندر آرہی تھی۔

"انتہائی غیر ذمہ دارانہ رویہ تھا یہ تمہارا حنین۔ اور تم دونوں' کیا تم ماں سے پوچھے بغیر کہیں بھی چلی جاؤ گی؟" وہ ڈپٹ رہی تھی۔ کیسے کیسے خیالات آتے رہے تھے اسے۔ اور وہ شاپنگ کر رہی تھیں؟ سالگرہ کے لیے اہتمام کر رہی تھیں؟

نور نے منمنانے کی کوشش کی (حنہ نے کہا تھا ماما کو نہیں بتانا) مگر اہل نے اسے کہنی مار کے چپ کروایا۔ (گرلز سیکریٹس۔ یو نو)

"ماما! سارا سرپرائز خراب ہو گیا ہمارا۔" اہل اب الٹا اس پہ غصہ ہو رہی تھی۔ سارہ ان کو لے کر آگے چلی گئی تھی اور سعدی باہر کھڑا ندرت کو فون کر کے ان کی خبر لے رہا تھا۔ ایسے میں حنین ان دونوں کے پاس آکھڑی ہوئی اور معصومیت سے بولی۔

"سوری' بس وہ سگنلز کا پرابلم رہا آج تو..." زمر نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

"ارے ہاں' تم کتنی معصوم ہو' تمہیں تو کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ یہ جو دو چار آلوں کو جوڑ کر تم لوگ جیمر زبنا لیتے ہو' وہ تو لگائے ہی نہیں ہوں گے تم نے ریسٹورنٹ میں تاکہ سگنلز بند ہو جائیں۔" حنین نے فوراً "فارس کو دیکھا' اس نے آنکھوں سے اشارہ کیا۔ وہ پھر سر جھکاتے ہوئے گویا ہوئی۔

"اصل میں زمر..."

"چپ!" وہ گھرک کر بولی۔ سارہ واپس آرہی تھی۔ اور وہ بیک وقت غصے' اطمینان اور اکتاہٹ کا شکار تھی۔

"کل ہم سالگرہ پہ آئیں گے فارس' لیکن میں..." وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر حتمی لہجے میں بولی۔ "گواہی' کورٹ ٹرائل' ان الفاظ کو سننا بھی نہیں چاہتی دوبارہ۔ میرا نام تم لوگ گواہوں کی فہرست سے

خارج کرو' اور آئندہ مجھے کوئی کورٹ سمن نہ جاری ہو' سنا تم نے۔"

"ایسا ہی ہوگا۔" فارس نے سینے پہ ہاتھ رکھ کر اسے بھرپور تسلی دی تھی۔ سارہ نے گہری سانس لی۔

"میں کھانا لگواتی ہوں۔ بہت ہی ہیکٹک دن رہا آج کا۔ اب بیٹھ جاؤ۔ چلو یہ سب بھول کر کھانا کھاتے ہیں۔" وہ جھنجلائی ہوئی سی کچن کی طرف بڑھ گئی۔

سعدی فون بند کرتا ان کی طرف آیا اور ایک نظر سارہ کو آگے جاتے دیکھا۔ پھر سوالیہ نظروں سے فارس کو دیکھا۔ "کیا کہہ رہی تھیں وہ؟"

"وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ گواہی دیں گی' لیکن ابھی ان سے اس بارے میں کوئی بات نہ کی جائے۔" سعدی تو سعدی' زمر اور حنین نے بھی بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"انہوں نے یہ نہیں کہا فارس!"

"انہوں نے یہی کہا ہے۔ ٹرسٹ می!" اس نے مطمئن سے انداز میں یقین دلایا تھا۔

"اب تو وہ بالکل گواہی نہیں دیں گی' تھینکس ٹو یو۔" غصے سے حنین کو دیکھا۔ "ہمارا سب سے اہم گواہ گنوا دیا ہے تم نے۔" اور سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

حنین نے ناک سکوڑ کر "ہونہہ" کیا اور فارس کی طرف گھومی۔ "میرا خیال ہے آپ کو تیسری شادی کر ہی لینی چاہیے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے!" وہ گہری سانس لے کر ملال سے بولا تھا۔ پھر گھڑی دیکھی۔ "میں ایک فون کر لوں۔" اور موبائل نکالتا آگے بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼
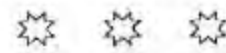
قصر کی رونق ماند پڑ چکی تھی۔ مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ جواہرات اپنے کمرے میں بیٹھی زیورات اتار رہی تھی۔ شارک جیسا سلور گاؤن پیروں کو ڈھانپتا فرش پہ پھول کی مانند بکھرا پڑا تھا۔ باہر ملازم کیٹرنگ کا سامان سمیٹ رہے تھے اور گھر کو درست حالت میں لا رہے تھے۔ ایسے میں ہاشم اپنے کمرے کو جاتی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ انداز میں تھکان تھی۔ تب ہی اس کا موبائل تھرتھرایا۔ اس نے نکال کر دیکھا تو لبوں پہ تلخ مسکراہٹ بکھر گئی۔ فارس غازی کالنگ۔

"کل جب میں جج صاحب کو بتاؤں گا تمہاری اس حرکت کا' کہ کیسے تم لوگوں نے میرے گیٹ پہ ڈراما کیا' تو تمہارا کیس مزید خراب ہوگا۔" وہ فون کان سے لگائے مسکرا کر بولتا کمرے میں داخل ہوا' اور دوسرے ہاتھ سے کوٹ اتارنے لگا۔

"نہیں! تم ایسا نہیں کرو گے۔" فارس غازی مطمئن سا بولا تھا۔ "بلکہ پولیس جو فصیح کے قتل کی انکوائری کر رہی ہے' اس کو بھی تم رکوا کے اپنا دعوا واپس لے لو گے۔"

"اور میں ایسا کیوں کروں گا فارس؟" اس نے گہری سانس لے کر پوچھا تھا۔

"کیونکہ ایک ثبوت ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ سعدی یوسف نے وہ قتل سیلف ڈیفنس میں کیا تھا۔"

"تمہارے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں ہے۔" اس نے کوٹ ایک طرف رکھا اور حقارت سے بولا۔

"میرے پاس نہیں ہے' واقعی۔ کیونکہ اب وہ تمہارے پاس ہے۔"

"کون سا کھیل' کھیل رہے ہو تم؟" ہاشم بے زار ہوا' مگر وہ چونکا بھی تھا۔

"شاید تم نے اپنی ٹائی پن نہیں دیکھی۔ کیا پارٹی ابھی تک ختم نہیں ہوئی؟"

ہاشم نے بری طرح چونک کر گردن نیچے جھکائی۔ اس کی سلور ٹائی پہ سیاہ ٹائی پن ننھی تھی۔ جو کافی اوپری لگ رہی تھی۔ اس نے تو آج ٹائی پن سرے سے پہنی ہی نہیں تھی' تو یہ....؟ اسے فارس کا اپنا گریبان پکڑنا یاد آیا۔

"میں تمہیں یہ فائل ای میل بھی کر سکتا تھا' لیکن وہ کیا ہے کہ احمر شفیع سے خطرہ رہتا ہے' وہ ہر آنے جانے والی میل پہ نظر رکھے ہوئے ہوتا ہے۔ وہ تم سے زیادہ تمہاری ماں کا وفادار لگتا ہے مجھے' اس لیے مجھے امید تھی کہ وہ اسے تم تک پہنچنے نہیں دے گا۔ لیکن

چونکہ میں تمہارا کزن ہوں' اور مجھے تم سے ہمدردی ہے' سومیں چاہتا ہوں کہ تم اسے ضرور دیکھو۔"

"کیا ہے یہ؟" وہ سختی سے بولا تھا۔ ٹائی پن اتار کر اب وہ اسے انگلیوں سے ٹٹول کر دیکھ رہا تھا۔

"تمہاری ماں کا اعمال نامہ!" اور لائن ڈیڈ ہوگئی۔ ہاشم کے کان سرخ ہوئے' ابرو بھینچ گئے۔ اس کے منہ سے گالیاں نکلیں۔ پھر تیزی سے اسٹڈی ٹیبل کی طرف آیا' ٹیبلٹ اٹھایا اور یو ایس بی کا پلگ اس میں گھسایا۔ وہ کوئی پھندا' کوئی وائرس کچھ بھی ہو سکتا تھا' مگر اس کا ماتھا کسی شے کی بنیاد پہ ٹھنک رہا تھا۔

اسکرین روشن ہوئی اور اس پہ جواہرات کار دار کے آفس کا منظر عیاں ہوا' وہ اندر آنے والے کیمرہ مین کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ آواز سے وہ فصیح لگتا تھا۔ ہاشم دم سادھے سنتا گیا۔ اس کا سانس گویا رک چکا تھا۔

"خاور کی زنجیریں کھول دو' اسے سعدی کے ساتھ گھلنے ملنے دو۔ وہ دونوں ہمارے لیے بے کار ہیں' میرا بیٹا یہ بات نہیں سمجھ رہا' اس لیے اب وقت آگیا ہے کہ ہم خود کوئی قدم اٹھائیں کیونکہ میرا تجربہ کہتا ہے وہ دونوں فرار کا سوچ رہے ہوں گے۔" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے جواہرات کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ سارے الفاظ گڈمڈ ہو رہے تھے۔

"مگر ہو سکتا ہے فصیح کہ کسی دن خاور سعدی کو قتل کردے اور پھر خودکشی کرلے۔" اسکرین پہ مسکراتی ہوئی جواہرات کہہ رہی تھی۔ ہاشم اپنی جگہ سے اٹھا۔ ٹیب ہاتھ میں تھا۔

"تم کرو گے فصیح! اور اتنی صفائی سے کرو گے ایک رات یہ سب کہ اگلی صبح ان دونوں کی لاشیں ملنے کے بعد تم یہ کہہ سکو گے کہ تم تو اس جگہ تھے ہی نہیں۔ میرے بیٹے کو خبر بھی نہیں ہوگی۔"

ہاشم کو سانس نہیں آرہی تھی۔ اس کی رنگت غیض و غضب سے سرخ پڑ رہی تھی۔ وہ ٹیب ہاتھ میں لیے دھڑ دھڑ زینے اتر رہا تھا۔ بار بار آستین سے پیشانی صاف کرتا۔ اسے پسینہ بھی آرہا تھا۔

جواہرات کے کمرے کا دروازہ اس نے جوتے کی ٹھوکر سے کھولا تھا۔ وہ جو سنگھار میز کے سامنے بیٹھی تھی' چونک کر گردن گھمائی۔ حیرت سے اسے دیکھا۔

"تمہیں کیا ہوا؟" ہاشم نے ٹیبلٹ اس کے سامنے جا کر پٹخا۔

"یہ کیا ہے ممی؟" اس کے سر پہ کھڑا اسے گھورتے ہوئے وہ غرایا تھا۔

گردن پہ موئسچرائزر ملتے جواہرات کے ہاتھ سست ہوئے۔ اس نے ایک نظر ٹیبلٹ کی اسکرین پہ چلتی ویڈیو کو دیکھا اور پھر چہرہ اٹھا کر ہاشم کو دیکھا۔

"کیا ہے یہ؟" اس کی رنگت دھیرے دھیرے بجھ رہی تھی۔

"آپ نے فصیح کو حکم دیا تھا ان دونوں کو مارنے کا؟"

جواہرات نے تھوک نگلا اور ٹشو نکال کر ہاتھ پونچھنے لگی۔

"میں نے جو بھی کیا تھا' بہت سوچ سمجھ کر تم دونوں کے لیے کیا تھا۔" وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بول رہی تھی۔ جب سے آبدار کے پاس اس ویڈیو کی موجودگی کا اسے پتا چلا تھا' وہ خود کو اس لمحے کے لیے تیار کرتی آئی تھی۔

"ممی!" ہاشم نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "آپ یہ سب کیسے کر سکتی ہیں؟"

"اگر یہ سب ہو جاتا تو ہم آج اس مسئلے میں نہ ہوتے۔" وہ جواباً" اسے جھڑک کر بولی تھی۔ "نہ کوئی گواہ بچتا نہ کوئی ثبوت۔ یہ سب تمہیں کرنا چاہیے تھا۔ مگر تم نے نہیں کیا تو اپنے خاندان کی حفاظت کے لیے مجھے یہ قدم اٹھانا پڑا۔ اور مجھے ایسے مت دیکھو۔ میں تمہاری ماں ہوں' اپنے خاندان کے لیے مجھے جو ٹھیک لگے گا' میں کروں گی۔"

"آپ نے مجھے دھوکا دیا' آپ نے میری پیٹھ پیچھے اتنا بڑا کام کر دیا۔ ہارون کو راز دار بنایا مجھے نہیں۔" وہ غصے اور صدمے سے نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بہت ٹوٹی کرچیاں تھیں۔

"آپ دھوکے میں اس حد تک جا سکتی ہیں، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

جواہرات کا دل کانپا، مگر وہ بظاہر خود کو سنبھالے اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کا بازو تھامنا چاہا۔ "ہاشم! میں نے یہ تمہارے لیے کیا تھا۔"

"ہاتھ مت لگائیں مجھے۔" وہ اپنا بازو پیچھے کرتے ہوئے غرایا تھا۔

"میں نے ممی، آپ لوگوں کے مسئلے حل کرنے میں اپنی خوشیاں، اپنی محبت سب کو ثانوی کر دیا۔ ممی، آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا، یوں دھوکا نہیں دیا، اور آپ.... آپ میرے ساتھ اس حد تک خیانت کی مرتکب ہو سکتی ہیں۔"

"ہاشم! میری بات ٹھنڈے دماغ سے سنو۔" اب کے اس کی آواز بھی کانپی تھی۔ آنکھوں میں آنسو چمکے تھے۔ مگر ہاشم نے نفی میں سر ہلایا۔

"سعدی سچ کہتا تھا۔ وہ دونوں جیل سے اس لیے بھاگے تھے کیونکہ آپ ان کی جان لینا چاہتی تھیں۔ اور کیا کیا جھوٹ بولے ہیں آپ نے مجھ سے؟ کیا میرے باپ کو بھی خاور نے مارا ہے یا خاور کی ڈھال تلے کسی اور کو بچا گئی ہیں آپ؟" وہ حلق کے بل چلایا تھا۔ غصہ، پسینہ، آنکھوں میں اترا خون۔ جواہرات اندر تک دہل گئی۔

"ہاشم! تم اپنی ماں پہ شک کر رہے ہو۔"

"یقین تو اب کبھی نہیں کروں گا آپ پہ۔ کبھی نہیں۔" وہ غصے سے چیخا تھا۔

وہ بے اختیار آگے بڑھی۔ "ہاشم! ایک دفعہ میری بات سنو میں...."

"میں نے کہا، مجھے ہاتھ مت لگائیں۔ اکیلا چھوڑ دیں مجھے۔" غصے سے بازو چھڑاتا وہ باہر نکل گیا۔

جواہرات کے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ وہ تہی دست، تہی داماں کھڑی رہ گئی تھی۔ اس کی ساری دنیا لمحوں میں بکھر گئی تھی۔

وہ جو کچہری میں روز سجتی تھی، تو وہ نرا ڈرامہ تھی۔ اصل عدالت تو اب لگی تھی۔ جہاں نہ وکالت چلی تھی، نہ صفائیاں اور وہ سارے فیصلے سنا کر چلا گیا تھا۔ وہ دل تھام کر زمین پہ بیٹھتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح فوڈلی ایور آفٹر پہ ٹھنڈی سی اتر رہی تھی۔ ساری رات بارش ہوتی رہی تھی اور اس بارش نے گویا ساری زمین دھو ڈالی تھی۔ ریستوران کے اوپری ہال کے شیشے کی دیوار پہ بوندوں کے سوکھ جانے کے نشان اب بھی موجود تھے۔ وہ ہال غباروں اور دیواروں لگے خوب صورت بیک ڈراپ سے سجا تھا۔ میز پہ تحفے، کیک کا بچا کھچا حصہ، برتن وغیرہ رکھے تھے۔ آگے پیچھے بہت سی کرسیاں رکھی تھیں جن پہ وہ لوگ ٹولیوں کی صورت بیٹھے تھے۔ تقریب گویا ختم ہونے کے قریب تھی، اور کھانا کھایا جا چکا تھا۔ خیر کھانا کیا تھا، سنڈے برنچ تھا۔ پرسوں کے بجائے آج ہی کر لی گئی تھی دعوت، یوں اس برس نہ سونیا کی سالگرہ اصل تاریخ پہ منائی گئی نہ سعدی کی۔

ایک طرف دو کرسیاں ترچھی کر کے رکھی تھیں۔ ایک پہ زمر بیٹھی پلیٹ اٹھائے کیک کو کانٹے سے توڑنے میں مگن تھی۔ دوسری پہ فارس ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا سوفٹ ڈرنک کے گھونٹ بھرتا دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں اس رات...." ذرا کھنکھار کر گویا ہوا۔

"آپ دارے ملنے...." زمر نے نظریں اس کی طرف پھیریں۔ بس اس کے تاثرات دیکھنے کی دیر تھی، وہ سادگی سے بولا۔ "آپ دارے ہی ملنے گیا تھا۔"

"پتا ہے میں تمہارے کپڑے دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ اس نے بھی یہی رنگ پہن رکھا تھا۔"

اب کے زمر نے مشکوک نظروں سے اسے گھورا۔ "پچھلے دو دن میں تم اس کے کپڑوں کے پانچ رنگ بتا چکے ہو مجھے۔ اب تو مجھے اس بات پہ یقین بھی نہیں آ رہا۔ تم سچ مچ گئے بھی تھے یا...." کچھ سوچ کر مسکرائی۔ "ہاشم نے دروازے سے ہی بھگا دیا؟"

"ہونہہ۔ اس کی اتنی مجال۔" وہ بڑبڑا کر گویا برا مانتا

ہوا رخ پھیر گیا۔

"ویسے ہے تو وہ تمہارا کزن، لیکن ایک بات ہے اس کی کلاس نہ اس کا گریس، اس کا مخالف کو مسکرا کر چت کر دینے کا انداز، یہ سب تم میں اس جیسا نہیں ہے۔ میں سوچتی ہوں ہاشم اگر اچھا آدمی ہوتا تو میں اس کی سب سے بڑی فین ہوتی۔" فارس نے سافٹ ڈرنک کا گلاس میز پہ پٹخ دیا اور خفگی سے اسے دیکھا جو معصومیت سے بولے جا رہی تھی۔

"اگر تم نے ہاشم کی باتیں ہی کرنی ہیں تو میں اٹھ کر جا رہا ہوں۔"

"جلتے ہو اس سے؟" ایک اور سوال۔ وہ جواب دیے بنا اسے گھورتے ہوئے اٹھا اور آگے بڑھ گیا۔ زمر مسکراہٹ دبائے کیک کا بقیہ حصہ کھانے لگی۔ اب آیا تھا اصل مزا۔

ان سے ہٹ کر دیکھو تو ایک طرف ٹولی بنا کر حنین اور اس کی دونوں کزنز بیٹھی تھیں اور وی کے نشان بنا کر سیلفی لے رہی تھیں۔ سارہ، ندرت اور ذکیہ بیگم بھی خوش گوار موڈ میں گفتگو میں مگن تھیں۔ ایسے میں صرف سعدی تھا جو ایک ٹیبل کے گرد اکیلا بیٹھا موبائل پہ مصروف تھا۔ وہ اداس تھا اور خاموش تھا۔ فارس اس کے قریب آکر بیٹھا تو اس نے محض سر اٹھا کر اسے دیکھا، پھر دوبارہ موبائل کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"پراسیکیوشن آفس سے کال آئی تھی۔ مجھے اب کسی قسم کی انکوائری کے لیے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ غالباً" ہاشم نے اپنا دعوا اور تعاون واپس لے لیا ہے۔ وہ فصیح کی لاش تھی، یا گواہوں نے میرے بارے میں کچھ کہا، سب واپس لے لیا ہے اس نے تھینک یو۔"

فارس نے محض سر کو خم دیا گویا شکریہ قبول کیا پھر کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔ "مسز کاردار کا کون سا راز ہے تمہارے پاس؟"

"میں اس پر بات نہیں کرنا چاہتا۔ کچھ راز دوسروں کی زندگیاں بھی خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔"

"ہم نے ایک فیصلہ کیا تھا سعدی کہ ہم ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپائیں گے۔"

"میں اس فیصلے کے وقت آپ کے ساتھ نہیں تھا۔" وہ مغموم سا مسکرایا۔ فارس خاموش ہو گیا۔

پیچھے سے ندرت کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ تینوں لڑکیوں کو ظہر کی نماز کے لیے اٹھا رہی تھیں۔

"اٹھتے ہیں نا امی۔" حنین نے تابعداری سے کہتے ہوئے ایک اور تصویر بنائی۔

"تم لوگ تو جوان ہو۔ جلدی جلدی اٹھ سکتے ہو، پھر اتنی دیر کیوں لگاتے ہو؟" وہ گھٹنوں پر زور دے کر اٹھتے ہوئے بولیں۔ "جوانی میں دین بائی چوائس ہونا چاہیے، بائی چانس نہیں۔ جس جذبے اور دل سے تم لوگ اس عمر میں عبادت کر سکتے ہو نا، یہ بڑھاپے میں نہیں ہو گا۔ غلط لگتا ہے تم لوگوں کو کہ بوڑھے ہو کر عبادت کی ساری کمی پوری کر لو گے۔ بڑھاپے میں روز کیلشیم کھانا جوانی کے دنوں کے روز تین گلاس خالص دودھ پینے کے برابر نہیں ہو سکتا۔ روح بھی ہڈیوں کی طرح ہے۔ جوانی سے اسے عبادت پہ پالو گے تو بڑھاپے میں درد اور تکلیف کم ہو گی۔"

"اٹھ جاؤ نا، اس سے پہلے کہ امی یہ مہذب زبان بدل کر اپنی نارمل ٹون میں واپس آجائیں۔" سیم نے حنہ کی طرف جھک کر مشورہ دیا تھا۔ جو امی نے سن لیا تھا۔ وہ جوتا اتارنے جھکی تھیں۔

"بے غیرت، بے ہدایتے، تجھے تو میں ابھی بتاتی ہوں۔" "سیم فوراً" نیچے کی طرف بھاگا تھا۔ بہت سے قہقہے بلند ہوئے تھے۔

"سوری! میں کل کچھ زیادہ ہی بول گئی تھی۔" سارہ، سعدی کے ساتھ آکر بیٹھی اور نرمی سے بات شروع کی۔ وہ مغموم مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔ پس منظر کی ساری آوازوں سے بے نیاز، وہ اس کے سامنے بیٹھی، اب سادگی سے اپنا مدعا بیان کرنے لگی تھی۔ فارس اٹھ گیا۔

"مجھے لگا میں جو کر رہی ہوں، وہ زیادہ بہتر ہے۔ خاموش رہ کر اپنا کام کیے جاؤ، اور اپنے پراجیکٹ کو کامیاب بنا کر کاردارز کو اس مقام پہ شکست دو۔ پانچ، ٹو

انرجی سے بامقصد کام کرو۔ مصلحت پسندی' احتیاط' تھوڑی سی بزدلی' یہ سب تھا میرے اندر' مگر مجھے ہمیشہ لگا کہ میں صحیح انتخاب کررہی ہوں۔"

"سارہ خالہ!" وہ اسی اداس مسکراہٹ سے اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ "ویسے تو اللہ کا قرآن سارے کا سارا بہت خوب صورت ہے' لیکن کچھ آیات دل پہ کسی اور ہی طرح سے اثر کرتی ہیں۔ میں آپ کو بتاؤں میری سب سے پسندیدہ آیت کون سی ہے؟"

اگر حنین سامنے ہوتی تو ہر روز اپنی پسند بدلنے پہ اسے دو چار فتوے تو ٹھونک ہی دیتی مگر سارہ مسکرا کر اسے دیکھتی اور سنتی گئی۔

جب اللہ تعالیٰ نے شیطان کو جنت ـــــــ سے دھتکار کر دنیا میں بھیجا اور اسے مہلت دی تو اس نے کہا۔

سورہ اعراف کی آیت۔

"اچھا تو جس طرح تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے۔ میں بھی اب تیری "سیدھی" راہ پر ان انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا۔ آگے اور پیچھے۔ دائیں اور بائیں' ہر طرف سے ان کو گھیروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔"

وہ سانس لینے کو رکا۔ سارہ اسے سنے گئی۔ پوری توجہ سے۔

"میں سوچتا ہوں' ابلیس جب جانتا تھا کہ اللہ کا راستہ "سیدھا" ہے تو اس نے کیوں چھوڑا اسے؟ اور اگر چھوڑنا ہی تھا تو اسے سیدھا راستہ بولا؟ شاید ابلیس نے مستقیم سے مراد درست نہیں بلکہ straight (سیدھا) لیا ہو۔ سیدھے راستے کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے ذرا سا ترچھا چلو تو شروع میں تو بس سیدھی لائن سے ذرا سا فاصلہ پیدا کرلیتا ہے انسان لیکن جیسے جیسے آگے بڑھتے جاؤ' آپ سیدھی لائن سے مزید دور ہٹتے جاتے ہیں۔ 90 ڈگری کی لکیر سے ایک ڈگری ہٹو تو آگے جاکر آپ سیدھی لائن سے بہت دور نکل جاتے ہیں۔ پھر آپ کو صراط مستقیم والی منزل نہیں ملتی۔ راستہ بدلتا ہے تو منزل بدل جاتی ہے۔ اور اس راستے سے ہمیں ادھر ادھر ہٹانے کے لیے شیطان کئی طریقوں سے ہم پہ حملہ آور ہوتا ہے۔ سب سے پہلے وہ آگے سے آتا ہے۔ آگے مستقبل ہوتا ہے۔ وہ ہمیں مستقبل کا خوف دلاتا ہے۔ یہ کرو گے تو تمہارا کیریئر نہیں بنے گا۔ تمہاری فیملی کا کیا ہوگا۔

(سارہ کا سر جھک گیا۔)

تمہاری شادی نہیں ہوگی' تم یہ اچھا کام کرو گے تو بالکل اینٹی سوشل ہوجاؤ گے۔ پھر وہ ہمارے پیچھے سے آتا ہے۔ ہمیں ماضی کے کام یاد دلا کر ان کے گلٹ میں ایسا مبتلا کرتا ہے کہ ہم کوئی اچھا کام کرنے کے قابل ہی نہیں رہتے۔ وہ کہتا ہے' تمہارے تو ماضی میں اتنے افیئر رہے' اب تو تمہاری شادی بھی اپنے جیسے بدکردار سے ہوگی۔ تم نے ماں باپ کا اتنا دل دکھایا' اب تو تم کبھی ہدایت پا ہی نہیں سکتے۔ تم نے نمازیں چھوڑدیں' اب تو تم کبھی نیک ہو ہی نہیں سکتے۔

اس کے بعد وہ دائیں سے آتا ہے' ہمیں اچھے کاموں کی ترغیب دیتا ہے اور ہم سے گناہ کرواتا ہے۔ ثواب کا جھانسہ دے کر بدعتیں کرواتا ہے۔ نئے نئے دین میں داخل ہونے والوں سے کہتا ہے اسلام تو ساری خواہشات مارنے کا نام ہے' سوٹاٹ پہ سوؤ اور روکھی سوکھی کھاؤ۔ جو رشتہ دار حرام کا کھاتا ہے۔ اس سے قطع تعلق کرلو۔ سب سے پہلے ماں باپ کو ان کے گناہوں پہ ٹوکو' ہر وقت دوسروں کے عیب پہ ان کو نصیحت کرو' اور ایسے کئی غلط کام وہ ہمیں "دین" کا نام دے کر کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

ان تینوں راستوں کے بعد وہ آتا ہے بائیں سے ہم سمجھتے ہیں کہ وہ صرف آتا ہی بائیں سے ہے۔ مگر شیطان کا یہ آخری راستہ ہوتا ہے۔ وہ ہمیں برے کاموں کی ترغیب دیتا ہے۔ جھوٹ' چوری' قتل' فحش کام' یہ سب وہ آخر میں کرتا ہے جب اس کو ہمارے بگڑنے میں کوئی شک نہیں رہ جاتا۔ وہ ان کاموں سے شروع کبھی نہیں کرتا۔ آدم علیہ السلام اور بی بی حوا کے پاس بھی وہ "آگے" سے آیا تھا۔ ان کو مستقبل کا ایک دل فریب خواب دکھایا تھا۔ سو شیطان والے کام صرف

"غلط" کام نہیں ہوتے، بلکہ مستقبل کا خوف، ماضی کا غم اور نیکی میں انتہا پسندی بھی شیطان کا جھانسہ ہوتی ہے؟"

"تو پھر قصور ہمارا ہوا یا شیطان کا؟" وہ گہری سانس لے کر بولی تھی۔ وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"شیطان تو صرف کہتا ہے، کرتے تو ہم خود ہیں۔ ہم سب آپ کو کہتے رہے "گواہی دیں"، آپ نے نہیں بات مانی۔ انسان اپنے آپ کو خوب جاننے والا ہوتا ہے۔ لیکن اس سب کا یہ مطلب نہیں کہ شیطان کے آگے ہم بے بس ہیں۔ کیا آپ نے نوٹ نہیں کیا، شیطان نے چار سمتوں کا ذکر کیا ہے۔ آگے، پیچھے، دائیں، بائیں۔ مگر دو راستے اس نے کھلے چھوڑ دیے۔ اوپر اور نیچے کا راستہ۔"

"اس نے انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا "اوپر ہے دعا کا راستہ اور نیچے۔" اس نے نیچے کی جانب انگلی موڑی۔ "نیچے ہے سجدے کا راستہ۔ وہ ان دو راستوں پہ نہیں بیٹھ سکتا۔ جانتی ہیں اس نے اپنے چار راستے کہہ کر کیا کہا اللہ سے؟ اس نے کہا "آپ انسانوں کی اکثریت کو شکر گزار نہیں پائیں گے۔" تو سارہ خالہ! سارے مسئلوں کا حل ہے شکر۔ اور شکر کہتے ہیں قدر دانی کو۔

جو کشتی میں بچے رہنے کی عافیت کی قدر کرتا ہے، اسے ڈوبنے کا خوف نہیں ہوتا۔ جو گمراہی کے بعد ہدایت پالینے کی قدر کرتا ہے اور زیادہ سے زیادہ نیکیاں کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے، ماضی کے گناہ اس کو غم زدہ نہیں کرتے۔

جو اپنے دین کی آسانیوں کی قدر کرتا ہے، شیطان اس کو دین کے نام پہ بہکا نہیں سکتا اور چونکہ قدر دان انسان دوسرے کی ایک خامی کو دیکھ کر اس کی ساری خوبیوں کی قدر کرنا نہیں چھوڑتا تو وعظ و نصیحت کے نام پہ شیطان اس سے دوسرے انسانوں کے جذبات نہیں مجروح کروا سکتا۔

اور جس کو اللہ کی قدر ہوتی ہے، وہ برے اور فحش کاموں کی طرف نہیں لپکتا کیونکہ ایسی تسکین کا کیا فائدہ جس کو لے کر بندہ اللہ کو کھو دے۔ تو جو قدر کرنا جانتا ہے، جان کی امان کیا رشتوں کی، دولت اور وقت کیا ہدایت کی "اس کے اوپر اور نیچے کے راستے کھلے رہتے ہیں اور وہ اس کی ڈھال بن جاتے ہیں۔ جو ہے، اس کی قدر کیجیے۔ پھر جو نہیں ہے، وہ نہ آپ کو ڈرائے گا نہ غم زدہ کرے گا۔"

اور یہ کہہ کر وہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔

"میں نے اپنے ہاتھوں سے دو آدمی مارے ہیں سارہ خالہ! اور یہ کرنے کے بعد میں ماضی کے گلٹ میں اتنی دور تک گھر گیا تھا کہ مجھے لگتا تھا اب میں خود کو دوبارہ حاصل نہیں کر سکوں گا اور میں سوچتا تھا کہ جو لڑکا میں چند سال پہلے تھا، وہ مجھے اب دیکھے گا تو کیا سوچے گا؟ مگر سارہ خالہ! وہ لڑکا اس سب سے نہیں گزرا تھا جس سے میں گزرا ہوں، اس لیے میں اب اپنے فیصلوں کی قدر کرنا چاہتا ہوں۔ دو انسانوں کی جان نہیں لی میں نے بلکہ ایک انسان کی، یعنی اپنی جان بچائی ہے ان سے۔ یہ برا کام نہیں تھا۔ میں اپنے احساس ندامت سے نکل رہا ہوں۔ آپ بھی اپنے خوف سے نکل آئیں۔"

سارہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ سعدی پر جمی اس کی نظروں میں ننھے تارے چمک رہے تھے۔

"میں گواہی دوں گی سعدی!" وہ ایک عزم سے بولی تھی۔ "میں سچ بولوں گی کورٹ میں۔ اور میں نہیں جانتی کہ اس کے بعد ہاشم میرے اور میرے بچوں کے ساتھ کیا کرے گا، لیکن اگر بہت سی ماؤں کے بچوں کو بچانے کے لیے یہ قدم ضروری ہے تو ٹھیک ہے۔ ہم جگر آزماتے ہیں۔"

"اور اسے تیر آزمانے دیتے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولا تھا۔ بہت سا بوجھ کندھوں سے ہٹا تھا۔ روشنی بس تھوڑی دور دکھائی دے رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

قصر کاردار کے ڈائننگ روم میں سربراہی کرسی پہ

ہاشم بیٹھا اتوار کا لیٹ ناشتا کر رہا تھا۔ ساتھ بیٹھی بجھی بجھی سی جواہرات صرف چائے کے گھونٹ بھر رہی تھی اور دوسری جانب بیٹھا نوشیرواں اچنبھے سے ہاشم کو دیکھ رہا تھا۔

"سو آپ ممی سے اس لیے خفا ہیں کیونکہ ممی نے سعدی کو مروانے کا حکم دیا؟ اسی سعدی کو بھائی! جسے میں نے گولیاں ماری تھیں اور آپ نے اسپتال سے اغوا کروایا تھا۔" وہ جتا کر بولا تھا۔

"ممی نے مجھے دھوکا دیا' اور یہ بھولنے میں مجھے کچھ وقت لگے گا۔" وہ ماں کو نظرانداز کرکے درشتی سے بولا تھا۔ جواہرات کی آنکھ سے آنسو ٹوٹ کر گرا۔

"میں نے ساری عمر تم دونوں کے لیے لگادی اور آخر میں مجھے یہ صلہ ملا بہت اچھا' میرے بیٹے!" وہ دکھی صورت بنائے کہہ رہی تھی۔

"یہ Cardvictim کھیلنا میرے اوپر اثر نہیں ڈالتا مسز کاردار۔" وہ رکھائی سے کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

جواہرات نے گیلی آنکھوں سے نوشیرواں کو دیکھا۔ "کیا تم بھی مجھ سے خفا ہو؟ میں نے جو کیا' تمہارے لیے کیا۔"

"میرے لیے؟ اگر اسے سعدی مرجاتا تو کل کو ڈاکٹر سارہ تو یہی گواہی دیتیں نا کہ نوشیرواں نے اسے گولیاں ماری ہیں۔ میں تو قاتل بن جاتا۔ اپنے گناہوں پہ دوسروں کو "وجہ" بنانے کے بجائے ان کو خود فیس کریں ممی۔"

وہ بھی اکھڑا اکھڑا سا کہہ کر ناشتا کرنے لگا۔ جواہرات ابھی اسے سخت سست سنانے ہی لگی تھی کہ ہاشم زینے پھلانگتا واپس آتا دکھائی دیا۔ چند کاغذ اور قلم اس نے جواہرات کے سامنے لا پٹخے۔

"ان پہ دستخط کریں۔"

"یہ کیا ہے؟" وہ حیران ہوئی۔

"آپ کمپنی میں اپنے شیئرز میرے نام منتقل کررہی ہیں' آپ بورڈ آف ڈائریکٹرز سے استعفیٰ دے رہی ہیں اور آپ اپنے بینک اکاؤنٹس میں مجھے جوائنٹ ہولڈر بنا رہی ہیں۔ آج کے بعد آپ آفس نہیں آئیں گی' نہ ہی میری اجازت کے بغیر ایک دھیلا بھی خرچ کرسکیں گی۔ اپنی تمام جائیداد کا پاور آف اٹارنی آپ میرے نام منتقل کررہی ہیں۔"

وہ ایک ایک کاغذ کی تفصیل بتاتا گیا۔ جواہرات کا چہرہ سرخ ہوا۔ آنکھوں میں غصہ در آیا۔ آنسو وغیرہ سب عنقا ہوگئے۔

"تم میرے ساتھ یہ کیسے کرسکتے ہو؟"

"آپ ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ آپ کے لیے میں زیادہ اہم ہوں یا یہ سب مادی چیزیں تو دستخط کریں اور ثابت کردیں۔" ہاشم اب کے ذرا دھیمے لہجے میں بولا تھا۔ وہ اس کے سر پہ کھڑا تھا' اور جواہرات ششدر سی بیٹھی ان کاغذوں کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے نفی میں سرہلایا۔

"میں ان پہ سائن نہیں کروں گی۔" وہ غرائی تھی۔ "کیا کرلوگے تم' ہاں؟"

"میں یہ کروں گا۔" ہاشم ہتھیلی میز پہ رکھ کر جھکا' پین اٹھایا اور دھڑا دھڑ ان کاغذات پہ دستخط کرتا گیا۔ ہو بہو جواہرات کے دستخط۔ جواہرات کا سانس رک گیا۔ آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہوگئیں۔

"تم۔۔۔"

"تھینک یو ممی! آج کے بعد آپ کو آفس آنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ کاغذ سمیٹتا سیدھا ہوا اور پلٹ گیا۔ جواہرات نے بے یقینی سے نوشیرواں کو دیکھا۔ "یہ غیر قانونی ہے۔"

"تو گرفتار کروادیں بھائی کو۔" وہ بھی بے زاری سے بولتا اٹھ گیا تھا۔ جواہرات یک ٹک اس کی شکل دیکھے گئی۔

اس کو جائیداد سے بے دخل کرنے کی پاداش میں جان سے مارا تھا نا اس نے اورنگ زیب کو؟ کیا اس اولاد کے لیے؟ کیا یہ دن دیکھنے کے لیے؟

وہ ششدر سی بیٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس دوپہر گرمی کا زور گویا ٹوٹ سا گیا تھا۔ صبح پھر

بارش ہوئی تھی اور موسم ٹھنڈا مگر حبس آلود ہو گیا تھا۔ ایسے میں کمرۂ عدالت میں بھی گھٹن سی تھی مگر کارروائی اتنی دلچسپ جا رہی تھی کہ محسوس نہ ہوتا تھا۔ زمر کٹہرے میں کھڑی سارہ سے سوال پوچھ رہی تھی اور فارس پچھلی نشستوں پہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا تھا۔ کبھی وہ سارہ کو دیکھتا، کبھی اپنے قریب مگر دوسری رو میں بیٹھے الیاس فاطمی کو۔ آج دو اہم گواہ پیش ہوئے تھے اور فارس غازی کافی مطمئن نظر آتا تھا۔

"اور آپ کو یقین ہے کہ وہ کرنل خاور ہی تھا جس نے آپ کے گھر آکر آپ کو دھمکایا۔" زمر پوچھ رہی تھی۔ کٹہرے میں کھڑی سارہ نے سفید لباس پہن رکھا تھا اور چہرہ بھی سفید مگر سپاٹ سا لگ رہا تھا۔ نظریں اعتماد سے زمر پہ جمائے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"جی۔ وہ وہی تھا۔"

زمر واپس گھومی اور ہاشم کو اشارہ کیا۔ Your Witness (آپ کا گواہ) وہ کوٹ کا بٹن بند کرتا اٹھا اور اپنے چمکتے ہوئے جوتے فرش پہ آگے بڑھاتا سارہ کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"ڈاکٹر سارہ..... ہم نے آپ کا پورا بیان بہت تحمل سے سنا۔" وہ رسان سے اس کی آنکھوں پہ نظریں جمائے کہہ رہا تھا۔ "اب آپ سے میں کچھ سوال پوچھنا چاہوں گا تاکہ عدالت خود فیصلہ کر سکے کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون۔ کیا آپ جواب دینے میں کمفو ٹیبل ہیں؟"

"ایسے ظاہر مت کرو ہاشم! جیسے تمہیں میری بہت پرواہ ہے، میرے بچوں کے باپ کو جس سنگ دلی سے مروایا تھا، اسی سنگ دلی سے جرح کرو۔ میں تیار ہوں۔" وہ رکھائی سے بولی تھی۔

ہاشم ہلکا سا مسکرایا اور سر جھٹکا۔ "خیر..... آگے چلتے ہیں۔" ہاتھ باہم پھنسا کر کھڑے سارہ کو دیکھتے ہوئے اس نے چہرے پہ سنجیدگی طاری کی۔

"آپ کا کہنا ہے کہ سعدی یوسف کے ساتھ اس رات آپ نے میرے موکل کو دیکھا تھا۔"

"جی ہاں۔ یہی تھا۔" سارہ نے پیچھے کرسیوں پہ بیٹھے شیرو کی طرف اشارہ کیا جو سپاٹ شکل بنائے بیٹھا تھا۔ آج جواہرات موجود نہیں تھی۔

"جس وقت آپ کے بقول نوشیرواں نے سعدی کو گولی ماری، کیا آپ نے اس وقت اس کے ہاتھ میں پستول کو جھٹکا کھاتے دیکھا تھا؟"

"میں وہیں تھی ہاشم! میں کبھی خوف سے سر اندر کر لیتی۔ اور کبھی باہر نکالتی، اس کو پستول پکڑے، اس کو بولتے، سعدی کو بوٹ سے مارتے، میں نے سب دیکھا تھا۔"

"ڈاکٹر سارہ! جب گولی پستول سے نکلتی ہے تو آگ کا شعلہ سا ساتھ نکلتا ہے اور پستول جھٹکا کھاتا ہے۔ میں آپ سے پوچھ رہا ہوں کیا آپ نے وہ لمحہ دیکھا تھا یا نہیں؟"

سارہ نے گہری سانس لے کر آنکھیں بند کیں۔ "وہاں کوئی اور نہیں تھا اور نوشیرواں کی ساری باتیں سنی تھیں میں نے، وہی تھا سعدی کا حملہ آور اور....."

"ڈاکٹر سارہ! آپ نے وہ لمحہ دیکھا تھا یا نہیں؟ ہاں یا ناں؟" وہ درشتی سے اونچا سا بولا تھا۔ زمر نے بے اختیار لب کاٹے تھے۔

"نہیں!" سارہ کی آواز دھیمی ہو گئی۔

"او کے۔ بات ختم۔ آپ نے نوشیرواں کو گولی چلاتے نہیں دیکھا تھا۔" وہ سر ہلا کر کہہ رہا تھا۔ "ڈاکٹر آپ بائی پروفیشن ایک اہم پراجیکٹ کی ہیڈ ہیں، ایک حساس ادارے کی سائنس دان ہیں، آپ کی انگلیوں کے چند کلکس کی مار ہے ڈرون پروگرام، آپ تو راکٹ سائنٹسٹ ہیں۔ آپ جیسی عورت اتنے ماہ کیوں خاموش رہی؟" وہ حیرانی سے کہہ رہا تھا۔

"کیونکہ آپ اور آپ کا خاندان مجھ سے زیادہ طاقت ور اور بااثر ہے۔ اور چونکہ آپ کے دست راست نے مجھے میرے گھر میں گھس کر ہراساں کیا تھا اس لیے میں خوف زدہ ہو گئی تھی۔"

"اچھا اب آپ خوف زدہ کیوں نہیں ہیں؟"

سارہ ہلکا سا مسکرائی۔ "اب بھی ہوں۔ بہت

زیادہ۔ اگر کیس کا فیصلہ سعدی کے حق میں نہ ہوا تو تم ہمارے ساتھ کیا کرو گے' میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔ لیکن اب میں ڈر ڈر کے بھی تھک چکی ہوں۔ اس لیے میں تمہیں اور تمہارے بھائی کو ان کے منطقی انجام تک پہنچانا چاہتی ہوں۔"

وہ اس کی بات مکمل ہونے کا انتظار کیے بغیر کہنے لگا۔

"کیا یہ سچ ہے کہ آپ اپنے شوہر کی مبینہ طور پہ خودکشی کے بعد ڈاکٹر مہرین وقار سے سائیکاٹرک سیشن لیتی رہی ہیں؟"

"ڈیم اٹ!" زمر نے سر جھکا کر پیشانی مسلی تھی۔ سعدی نے پریشانی سے اسے دیکھا مگر اب وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

"جی ہاں کبھی کبھار... میں بیوہ ہوئی تھی۔ میری جاب تھی۔ بچے چھوٹے تھے اور مہرین میری فرینڈ ہے۔" سارہ حیران ہوئی تھی۔

"کیا یہ بھی سچ ہے کہ ڈاکٹر مہرین نے آپ کو چند اینٹی ڈپریسنٹ تجویز کیے تھے جو آپ باقاعدگی سے لیتی ہیں۔"

"آج کل کون سا پراجیکٹ ڈائریکٹر سائنس دان یا کون سی کیریئر وومن ہے' جو اینٹی ڈپریسنٹ نہیں کھاتی؟"

"آپ اینٹی ڈپریسنٹ لیتی ہیں یا نہیں لیتیں؟"

"ہاں' ٹھیک ہے میں لیتی ہوں مگر۔"

"اور اینٹی ڈپریسنٹ کے سائیڈ افیکٹس میں...

paranoia Visionblurry۔

یہ سب شامل ہوتا ہے۔ اس رات بھی آپ کے جسم کے اندر اینٹی ڈپریسنٹ کا مادہ گھلا ہوا تھا۔ نوشیرواں کو گولی چلاتے آپ نے نہیں دیکھا' پھر بھی مصر ہیں کہ وہی مجرم ہے۔ ایک عورت جس کی ذہنی حالت اور بصارت مکمل طور پہ درست نہیں ہے' وہ رات کے اندھیرے میں' جبکہ اس کالونی میں بجلی بھی نہیں تھی' ڈاکٹر سارہ کا کسی کو دیکھ کر پہچان لینا' انتہائی احمقانہ بات لگتی ہے یور آنر۔" وہ اب جج صاحب سے مخاطب تھا۔ زمر ایک دم کھڑی ہوئی۔

"ہاشم! آپ کو کیسے پتا؟"

"کیا؟" ہاشم اس کی طرف گھوما۔

"یہی کہ اس کالونی میں اس وقت بجلی نہیں تھی؟ کیونکہ جب سعدی کو وہاں سے اٹھایا گیا' تب تو بجلی آ گئی تھی' اور اس کالونی کے تمام گھر زیر تعمیر تھے' آس پاس کی کئی گلیاں زیر تعمیر اور ویران تھیں' وہاں کوئی بندہ تو تھا نہیں' تو آپ کو کس نے بتایا کہ وہاں اس وقت بجلی نہیں تھی؟"

نوشیرواں نے چونک کر زمر کو دیکھا تھا' البتہ ہاشم کے اطمینان میں فرق نہیں پڑا۔ "سعدی یوسف نے اپنے بیان میں کہا تھا شاید۔"

"میں نے اپنے بیان میں ایسا کچھ نہیں کہا۔" وہ بلند آواز میں بولا تھا۔

"بجلی والی بات ہاشم کہیں آئی ہی نہیں تو آپ کو کیسے معلوم؟" وہ دوبدو کہہ رہی تھی۔ ہاشم نے ہلکا سا ہنس کر سر جھٹکا۔

"میں اپنا ہوم ورک مکمل کرتا ہوں مسز زمر! مجھے معلوم ہے کہ وہاں اس وقت بجلی نہیں تھی جب نیاز بیگ نے سعدی یوسف پہ حملہ کیا۔"

"تمہارے بھائی نے بتایا ہے تمہیں ہاشم' مان لو۔" سارہ حقارت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ جج صاحب کو اپنا ہتھوڑا بجانا پڑا تھا۔ ایک دم شور سا جو اٹھ گیا تھا۔ ایسے میں کافی سے لطف اندوز ہوتے فارس کے تاثرات بدلے۔ وہ چونک کر بائیں طرف دیکھنے لگا جہاں چند کرسیاں چھوڑ کے ایک شخص آ کر بیٹھا تھا۔ اس نے نسواری رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا' آنکھوں پہ گول عدسوں کا چشمہ لگایا ہوا تھا اور بال گیلے کر کے سر پہ جمے تھے۔ ہاتھ میں ایک لائٹر تھا جسے وہ بار بار کھول بند کر رہا تھا۔ نشست سنبھال کر وہ اب تسلی سے ساری کارروائی ملاحظہ کر رہا تھا۔

فارس فوراً" اپنے فون پہ جھکا۔ "یہ آدمی کون ہے؟" لکھ کر احمر کو بھیجا۔

ہاشم کی نشست کے قریب بیٹھے احمر کی جیب

تھرتھرائی تو اس نے فون نکالا اور ذرا ترچھا ہو کر میسج دیکھا۔ پھر آہستہ سے گردن موڑی اور پچھلی نشست سے کچھ اٹھا کر اپنے سامنے رکھا۔ ایک بھرپور نگاہ نووارد پہ بھی ڈالی۔

"کوئی رپورٹر ہو شاید۔"

"اس کی تصویر لے کر بھیجو' میں پتا کرواتا ہوں۔ رپورٹر نہیں ہے۔ رپورٹرز تو اس جانب بیٹھتے ہیں۔"

"راجر باس!" احمر نے چند منٹ بعد اسے اپنی ایک سیلفی بھیجی جو اس نے ابھی ابھی اتاری تھی۔ پیچھے وہی شخص نظر آرہا تھا۔ فارس نے وہ تصویر ایک نمبر پہ سینڈ کی اور ساتھ لکھا۔ "یہ شخص کون ہے؟ اس کی تصویر فیشل ریکگنیشن میں ڈالو۔ اور اس سے منسلک کوئی پاسپورٹ یا شناختی کارڈ ملے تو مجھے بھیجو۔" ساتھ میں وہ گاہے بگاہے اس شخص پہ بھی ایک الجھی ہوئی نظر ڈال لیتا تھا۔ کون ہو سکتا ہے یہ؟

"شاید وہ پاسپورٹ اور میموری کارڈ....." وہ بار بار کچھ سوچتا' پھر نفی میں سر ہلاتا۔ پھر بمشکل اس نے دھیان سامنے جاری کارروائی کی جانب مبذول کیا۔

سارہ اب اتر آئی تھی اور الیاس فاطمی کٹہرے میں کھڑا تھا۔ گردن کو اکڑا کر سیدھا اٹھائے' وہ رعونت سے زمر کو دیکھ رہا تھا جو کاغذات کا پلندہ لیے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

"فاطمی صاحب! ہاشم کاردار سے آپ کا کیا تعلق ہے؟"

ہاشم ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھے اب دلچسپی اور غور سے جاری منظر دیکھ رہا تھا۔

"میرا ان صاحب سے کوئی ذاتی تعلق نہیں ہے۔"

زمر جو مصروف سے انداز میں اگلا سوال پوچھنے جا رہی تھی' بے اختیار رکی۔ جیسے حیران ہوئی ہو۔ لاجواب ہوئی۔ جیسے وہ اس جواب کی توقع نہ کر رہی ہو۔ اس نے مڑ کر فارس کو دیکھا' جو اب سیدھا ہو کر بیٹھا تھا اور خفگی سے فاطمی کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا آپ ذاتی طور پہ ہاشم کاردار کے دوست نہیں ہیں؟ کیا آپ کی ان سے ملاقات نہیں ہوتی رہتی؟" اس کے انداز میں بے چینی سی تھی۔

"نہیں' میں ان صاحب سے یکسر ناواقف ہوں۔ آپ کے پاس کیا ثبوت ہے وکیل صاحبہ کہ میری ان سے ملاقات ہوتی رہی ہے؟"

"فاطمی صاحب کیوں جھوٹ بول رہے ہیں؟ آپ نے خود ہمیں یہ معلومات دی تھیں۔ کیا یہ درست نہیں ہے کہ پچھلے ایک سال میں آپ اور ہاشم ان مقامات پہ ان تاریخوں میں ملے تھے؟" وہ اب ایک کاغذ ہاشم کے سامنے رکھتے ہوئے چند تاریخیں بتا رہی تھی۔ ہاشم نے کاغذ اٹھا کر غور سے پڑھا پھر نظریں اٹھا کر اتنے ہی غور سے فاطمی کو دیکھا۔

"یہ غلط ہے۔ اور میں نے آپ کو کوئی معلومات نہیں دیں۔"

"مگر آپ نے خود ہمیں بتایا تھا کہ آپ کے بیٹے کا اسپائی ویئر استعمال کر کے کرنل خاور نے اس کیس کی اہم سی سی ٹی وی فوٹیجز مختلف اداروں کے ریکارڈز سے مٹائی تھیں۔ کیا یہ درست نہیں ہے؟"

"میرے بیٹے کا ایسا کوئی سافٹ ویئر نہیں ہے۔ یہ سب الزام ہے۔" زمر نے پلٹ کر پھر سے بے بسی سے فارس کو دیکھ کر شانے اچکائے جیسے وہ سخت خفا ہو۔ وہ بس تند و تیز نظروں سے فاطمی کو گھورے جا رہا تھا۔

"اور کیا یہ درست نہیں ہے کہ ہاشم نے اس کیس میں گواہی نہ دینے کے لیے آپ کو کے مینز میں ایک نیا اکاؤنٹ کھلوا کر دیا تھا اور....."

"آپ کے پاس کسی چیز کا ثبوت نہیں ہے۔ آپ لوگ صرف شہرت کے طالب ہیں۔" وہ برہمی سے کہہ رہا تھا۔

زمر فوراً" تیزی سے جج صاحب کی طرف رخ کر کے بولی۔ "یو آنر! میں الیاس فاطمی کو بطور ایک پراسیکیوشن اپ گیو ونٹس کرتی ہوں۔ فاطمی صاحب آپ جا سکتے ہیں۔"

جج صاحب نے ہاشم کو دیکھا جو اب بھی بہت غور سے اس سارے تماشے کو دیکھ رہا تھا۔ زمر کی پریشانی' اس کا واپس جا کر سر جوڑے سعدی سے گفتگو کرنا' دونوں کا جھنجلاہٹ سے نفی میں سر ہلانا' پیچھے بیٹھے

فارس کا فاطمی کو گھورتا۔ وہ ایک ایک حرکت دیکھ رہا تھا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے' الیاس فاطمی ان سے ملا ہوا ہے اور مکر رہا ہے۔" احمر نے اس کے قریب سرگوشی کی۔

ہاشم ہلکا سا مسکرایا اور گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"نہیں۔ وہ ان کے ساتھ نہیں ملا ہوا۔ یہ سب اداکاری کر رہے ہیں۔ مجھے یہ امپریشن دے رہے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ یہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہ رہے ہیں۔ یہ معلومات ان کو میرا کمپیوٹر وغیرہ ہیک کر کے آسانی سے مل گئی ہوں گی۔ رہی آخری اکاؤنٹ والی بات تو ہو سکتا ہے وہ تم نے ان کو بتائی ہو۔"

مسکرا کر احمر کو دیکھا۔ وہ لمحے بھر کو کچھ بول نہیں سکا تھا۔ "سر نہیں آپ کے والد کے ساتھ....."

"میرے والد مر چکے ہیں اور میں آئندہ سے اپنی چھٹی حس پہ بھروسہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں پر یقین نہیں ہوں کہ تم تھے یا نہیں لیکن تم فائرڈ ہو۔ اپنا سامان اٹھاؤ اور آج کے بعد مجھے میرے گھر یا میری ماں کے گرد بھی نظر نہ آؤ۔"

مسکرا کر مگر چبا چبا کے کہتا وہ احمر پہ گویا ٹھنڈا پانی ڈال گیا۔ احمر بالکل شل بیٹھا رہ گیا۔ ہاشم نے چہرہ واپس جج صاحب کی طرف موڑ دیا تھا۔ اس کے انداز کی سختی اور قہر..... احمر اپنی چیزیں ابھی سے سمیٹنے لگا تھا۔

الیاس فاطمی اب کٹہرے سے اتر کے نیچے آ گیا تھا اور کرسیوں کے پاس سے گزرتا دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جس لمحے وہ فارس کی کرسی کے قریب آیا' لمحے بھر کو ٹھہرا۔ فارس نے صرف خشمگیں نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا مگر وہ اسے اتنی ہی تندی سے گھور رہا تھا۔

"تم میرے بیٹے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ یہ ملک چھوڑ کر جا چکا ہے۔ امریکہ جیسے ملک میں نہ تم اس کا پیچھا کر سکتے ہو' نہ اس کو بال برابر نقصان پہنچا سکتے ہو۔" گھمنڈی انداز میں کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ کمرہ عدالت سے نکل کے وہ راہداری میں چلتا جا رہا تھا جب اسے اپنے پیچھے مانوس آہٹ کا احساس ہوا۔ فاطمی نے

پلٹ کر دیکھا' فارس اس کے عقب میں کھڑا تھا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے' وہ عدالتی کمرے والے تاثرات کے برعکس بالکل پرسکون سا لگ رہا تھا۔

"کیا ہے؟"

"میں قاتل نہیں ہوں' نہ میں تمہارے بیٹے کو مارنا چاہتا تھا۔"

"اچھا..... اور کچھ؟" وہ خشک سے انداز میں بولا اور کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔

"میرا ایک بھائی تھا الیاس صاحب' اور وہ ایک اچھا آدمی تھا۔ وہ سچ بولتا تھا۔ ایمان داری سے اپنا کام کرتا تھا۔ لیکن پھر اس کو اس دنیا سے جانا پڑا۔ اسے پنکھے سے لٹکا کر' ہاتھ پاؤں باندھ کر اس کی گردن توڑی گئی لیکن تمہارا بیٹا' تمہارا لاڈلا بیٹا ایک مہنگی کار کا خواہش مند تھا۔" وہ بولا تو اس کی آواز دھیمی تھی اور اس میں زمانوں کا دکھ سمویا ہوا تھا۔ "اس کے ناز نخرے اٹھانے والے باپ نے میرے بھائی کو بیچ دیا' اور کار خرید لی۔ یہ سب کچھ آج جہاں ہم ہیں اور جہاں تم ہو' یہ سب تمہارے بیٹے کی ایک کار کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس کی ایک اندھی خواہش کی وجہ سے۔ تو سزا تو اس کو بھگتنی ہو گی۔"

"تم..... میرے خاندان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ اب اس ملک میں نہیں ہے۔"

"میں اس کو مارنا نہیں چاہتا تھا' وہ بس بہت عرصے سے امریکہ واپس نہیں جا رہا تھا۔ میں صرف اسے واپس بھیجنا چاہتا تھا تاکہ جب غیر قانونی اسپائی ویئر کے لیے امریکی مٹی استعمال کرنے پہ ایف بی آئی اس کو گرفتار کرے تو وہ امریکہ میں موجود ہو۔ جس وقت تم اپنی گواہی دے رہے تھے' اس سے تین گھنٹے پہلے تمہارا بیٹا گرفتار ہو چکا ہے۔ چند گھنٹوں میں تم تک آفیشل خبر بھی پہنچ جائے گی۔ ایف بی آئی کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ وہ چھوٹی سے چھوٹی ٹپ کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔"

"واٹ دا....." الفاظ اس کے لبوں پہ ٹوٹ گئے۔ وہ بالکل سن سا فارس غازی کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ فارس وہ

قدم آگے آیا' ہمدردی اور تاسف سے فاطمی کے شانے کی گرد جھاڑی' پھر اس کی ٹائی کی ناٹ ذرا کسی' نادیدہ سلوٹ ہاتھ پھیر کے دور کی' اور اسی ملال سے کہنے لگا۔

"وہ تمہارا اکلوتا بیٹا ہے اور فیڈرل کورٹ میں اس پہ ایک طویل مقدمہ چلنے والا ہے۔ اس کا مسلمان ہونا اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ اب تمہیں وہاں جانا ہوگا' یہاں سے استعفیٰ دے کر' اور وہ ساری دولت جو تم نے میرے بھائی کو بیچ کر بنائی تھی' الیاس فاطمی اب تم اس کی ایک ایک پائی جوڑ کر امریکہ کے مہنگے وکیلوں کی فیسیں بھرنے میں لگے رہو گے۔ اور اس کے بعد بھی اس کے رہا ہو جانے کی امید کم ہوگی۔ سو اب تم اپنے آفس جاؤ اور وہ کرو جو میں نے کہا تھا۔" اس کے کان کے قریب چہرہ لے جا کر وہ دھیرے سے بولا۔

"اپنا استعفیٰ لکھو' الیاس فاطمی! مجھے تمہارا استعفیٰ چاہیے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو' بکواس کر رہے ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" اس کا سکتہ ٹوٹا تھا۔ وہ غصے سے اس پہ غرایا اور پھر موبائل نکالتا تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اب وہ پریشانی سے کسی کو کال ملا رہا تھا۔ اس کی رنگت بدل رہی تھی' اور وہ بار بار بے یقینی سے نفی میں سر ہلاتا تھا۔ پسینے کے ننھے قطرے اس کی پیشانی پہ بکھرے تھے اور فارس غازی سینے پہ بازو لپیٹے' ملال سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اسے لگا تھا کہ وہ یہ منظر دیکھ کر اچھا محسوس کرے گا۔

مگر وہ کچھ بھی محسوس نہیں کر پا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼
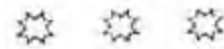
وہ شام جب شہر پہ اتری تو اس میں بارش کے بعد کی گیلی مٹی کی سوندھی سی خوشبو رچی بسی تھی۔ ایسے میں سعدی یوسف فوڈلی ایور آفٹر کے نیچے والے ریسٹورنٹ ایریا میں کھڑکی کے ساتھ بیٹھا تھا' اور سامنے لیپ ٹاپ کھلا رکھا تھا۔ اسے کل سے اپنی جاب پہ واپس جانا تھا اور وہ اس وقت اسی کی تیاری کر رہا تھا۔ ریسٹورنٹ کے باہر اب ایک اور لڑکا پھولوں کا اسٹال لگاتا تھا۔ گل خان اور اس کا خاندان دو ماہ قبل بہت سے افغان باشندوں کے ساتھ ڈی پورٹ کر دیا گیا تھا۔

سعدی کام کرنے کے بجائے کتنی دیر باہر نظر آتے ان پھولوں کو دیکھتا رہا تھا۔ پرانے لوگ آہستہ آہستہ جا رہے تھے' نئے لوگ آ رہے تھے' اور ہر گزرتے دن ہم سب بھی تو ایک نئے انسان میں ڈھلتے جاتے ہیں۔ وہ انسان جس کو بعض دفعہ پہچاننا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسا انسان جس کے بارے میں ہمیشہ سوچا تھا کہ ہم یہ تو نہیں بنیں گے۔ مگر قسمت کے آگے سب بے بس تھے۔

"اونہوں۔ غم نہیں کرنا۔" سعدی نے نفی میں سر ہلا کر خود کو ٹوکا۔ پھر کام کی طرف توجہ مبذول کرنی چاہی۔ مگر فون بجنے لگا۔ اس نے اٹھا کے دیکھا۔ ایک نیوز چینل کے رپورٹر کی طرف سے پیغام آیا تھا کہ آٹھ بجے والے شو میں اس کو لائیو لائن پہ لیں گے۔ اسے عدالت میں کیس کی پیروی کرنے کا کوئی فائدہ ہے بھی کہ نہیں' اس موضوع پہ بات کرنی ہوگی۔

چھوٹے گھنگھریالے بالوں والا لڑکا اداسی سے اس پیغام کو دیکھے گیا۔ کیا عدالت میں کیس کی پیروی کرنے کا' اپنے اور اپنے خاندان والوں کے سرعام رسوا کرنے کا' ان کو کتنے لوگوں کی بندوقوں کی تان پہ لے آنے کا کوئی فائدہ تھا؟ کیا ساحر وکلاء کے دلائل کا کوئی توڑ تھا؟ سچ اور حق پہ ہونے کے باوجود کیس مسلسل ہارنے کی پوزیشن میں ہونا' اور اپنے ہر ثبوت کا ہاشم کے ہاتھوں مشکوک بنائے دینا۔ کیا اس سب سے نجات کا کوئی راستہ تھا؟

اس کے پاس ان سوالوں کے کوئی جواب نہ تھے۔ اس نے خاموشی سے فون آف کر دیا اور لیپ ٹاپ کی طرف توجہ مبذول کر دی۔ اسے خاموشی سے اپنا کام کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

☆ ☆ ☆

اس صبح ہاشم اپنے آفس میں بیٹھا تھا۔ کرسی پہ پیچھے کو ٹیک لگائے' وہ چھت کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ فون پہ الیاس فاطمی کے لاتعداد پیغام اور کالز کو وہ مکمل طور پر نظرانداز کیے ہوئے تھا۔ وہ اس شخص سے کسی قسم کا تعلق فی الحال افورڈ نہیں کرسکتا تھا۔

"سر!" رئیس نے اندر جھانکا۔ ہاشم چونک کر سیدھا ہوا' پھر اسے بلایا۔

"عدالتی سماعت کا وقت ہونے والا ہے۔ لیکن اگر آپ کے پاس چند منٹ ہوں تو...." وہ ایک موبائل ہاتھ میں لیے اندر آیا۔ "آپ نے کہا تھا کہ آپ کو مس آبدار کا موبائل چاہیے۔ ان کے ایک ملازم نے یہ کام کردیا ہے۔ ہو بہو اس جیسا موبائل ری پلیس کردیا ہے' مگر وہ ڈیڈ ہے۔ اور یہ میں آپ کے لیے لے آیا تھا۔ اس پر پاس ورڈ وغیرہ نہیں لگا ہوا۔"

اس نے موبائل اوب سے اس کے سامنے رکھا۔ ہاشم نے ہاتھ جھلا کر اس کو واپس جانے کو کہا اور پھر موبائل اٹھالیا۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر اسکرین روشن کی۔

واٹس ایپ سامنے ہی تھا۔ اس نے chats کھولیں۔ فہرست میں اوپر ایک نام جگمگا رہا تھا۔

فارس غازی۔

اس نے انگوٹھا اس نام پہ دبایا۔ سامنے ایک طویل گفتگو کھل گئی' جس میں پیچھے آب دار کے ان گنت پیغام تھے۔ جن کا اس نے جواب نہیں دیا تھا۔ وہ گفتگو اوپر کرتا گیا۔ اس کے جبڑے کی رگیں کھنچتی گئیں۔ پیشانی کی سلوٹیں بڑھتی گئیں۔ سانس کی رفتار تیز ہوتی گئی۔

قریباً" گھنٹے بھر بعد وہ کمرہ عدالت میں داخل ہوا تو اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ کسی خواب کی سی کیفیت میں وہ ڈگ بھرتا آگے بڑھ رہا تھا۔ استغاثہ کی کرسیوں پہ اسے ان کا سارا خاندان نظر آیا تھا۔ آج سعدی' زمر اور فارس کے ساتھ حنین اور اسامہ کے علاوہ ندرت بھی بیٹھی دکھائی دیتی تھیں۔ آبدار بھی ان کے قریب ہی موجود تھی۔ اس نے اپنی طرف کی کرسیوں پہ نگاہ دوڑائی۔ نوشیرواں اور جواہرات وہاں خاموش بیٹھے تھے۔

وہ بھاری قدم اٹھاتا اپنی نشست کی طرف بڑھ گیا۔ عدالتی کارروائی شروع ہونے میں چند منٹ رہتے تھے' وکلا اپنی فائلوں کو پڑھ رہے تھے' کورٹ رپورٹر ٹائپنگ کے لیے تیار ہو رہا تھا' صحافی حضرات فون پہ لگے ہوئے تھے۔ ایسے میں وہ تمام لوگ اس بات سے ناواقف تھے کہ کمرہ عدالت میں موجود ایک شخص بہت جلد اسی کمرے میں موجود ایک دوسرے شخص کا قتل کرنے ــــ جا رہا ہے۔

(باقی آئندہ ماہ۔ ان شاء اللہ)

آبِ حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کردیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایئر رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں' جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کررہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے' جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سراغ ملا ہے۔

J۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پارہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال

کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ نینسی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک صرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتادیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کررہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کردی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کردیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی، اس نے اس بھی انکار کردیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہورہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

بائیسویں قسط

وہ خانہ کعبہ کے سامنے کھڑا تھا... اور وہ وہاں مقام ملتزم کے سامنے کھڑا تھا... کتنی بار وہ یہاں آیا تھا اور کتنی بار یہاں آکر کھڑا ہوا تھا۔ اسے اب گنتی بھی بھول چکی تھی' لیکن ہر بار کی طرح اس بار بھی وہ وہاں اسی حالت میں کھڑا تھا... ہیبت کے عالم میں... عجز کی کیفیت میں... دنیا کی کوئی جگہ سالار سکندر کو مٹی نہیں کرتی تھی' صرف وہ جگہ تھی جو اسے خاک بنا دیتی تھی اور وہ "خاک" بننے ہی وہاں آتا تھا... ہر بار اپنی اوقات جاننے اور اس کی یاددہانی کے لیے... ہر بار جب دنیا اسے کسی چوٹی پر بٹھاتی تھی تو وہ اپنے فخر اور تکبر کو دفنانے یہاں آتا تھا... آج بھی آیا تھا... بلکہ بلایا گیا تھا۔

خانہ کعبہ کا دروازہ کھولا جارہا تھا... سیڑھی لگی ہوئی تھی... اور وہ دنیا کے مختلف خطوں سے آئے ان دس مسلمانوں میں شامل تھا' جنہیں خانہ کعبہ کے اندر ہونے والی صفائی کی سعادت کے لیے چنا گیا تھا... اور یہ اعزاز اس کے حصے کس نیکی کے عوض آیا تھا' یہ ابھی تک سمجھ میں اس کی نہیں آرہا تھا۔ کرم اور کرم تو اس پر اللہ کا ہمیشہ رہا تھا' لیکن اس کے باوجود وہ اپنے نامہ اعمال میں ایسی کوئی نیکی کھوج رہا تھا جو ایسے کرم کا باعث بنتی۔

وہ شاہی خاندان کا مہمان بن کر پچھلے سالوں میں کئی بار عمرے کی سعادت حاصل کرچکا تھا۔ امامہ کے ساتھ بھی' اس کے بغیر بھی... مگر یہ دعوت نامہ جو وہاں سے اس بار آیا تھا۔ وہ سالار سکندر کو کسی اور ہی کیفیت میں لے گیا تھا۔ ایسا انعام اور اتنا انعام... ایسا کرم اور اتنا کرم... وہ خطاکار اور گناہ گار تھا۔ ایسا کیا کربیٹھا تھا کہ وہ اسے درگزر کررہا تھا' یوں عطا کررہا تھا' وہ بھی جو وہم و گمان میں بھی نہ آنے والی باتیں ہوں۔

وہ اس دعوت نامے کو آنکھوں سے لگا کر روتا رہا تھا... کیا صاف کرنا تھا اس نے وہاں جاکر... سب صفائی تو اس کے اپنے اندر ہونے والی تھی اور ہوتی آرہی تھی۔

امامہ بھی وہاں تھی' ایک دوسری قطار میں ان ہی افراد کی فیملیز کے ساتھ... وہ اسے بھی ساتھ لایا تھا اور وہ اسے رشک سے دیکھ رہی تھی' اس کے علاوہ وہ اور کیا کرسکتی تھی۔ اس کے گھر امریکہ سے آنے والا وہ "مہمان" اس بار اس کے لیے ایسی سعادت لانے والا تھا۔ اس کا اندازہ تو اسے تھا ہی نہیں۔ وہ اسے ہمیشہ سرپرائز کرتا تھا' بغیر بتائے آجاتا تھا جب کبھی بھی اسے وقت ملتا تھا... دو دن کے لیے' تین دن کے لیے... اس بار بڑے عرصے کے بعد اس نے امامہ کو اپنی آمد کے بارے میں پہلے سے بتایا تھا۔

"تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے۔" اس نے امامہ سے کہا تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح سرپرائز بوجھ گئی تھی' ایسا کبھی نہیں ہوا تھا اس نے وہ پہیلیاں نہ بوجھی ہوں جو سالار اس کے سامنے رکھتا تھا۔

"تم مجھے عمرے پر لے کر جاؤ گے۔" اس نے کئی اندازے لگانے کے بعد اس سے فون پر کہا اور اس کے ہنسنے پر امامہ نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

"مجھے پتا تھا۔"

لیکن جس سعادت کے لیے اللہ نے اسے اس بار بلایا تھا' اسے اس کا اندازہ نہیں تھا' وہ اسے نہیں بوجھ سکی تھی اور جب اس صبح اس نے بالآخر امامہ کو وہ دعوت نامہ دکھایا تھا تو وہ گنگ ہوکر رہ گئی تھی اور پھر وہی ہوا تھا جو ہوتا آیا تھا' جو ہونا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔

"تم اس لیے رو رہی ہو کہ یہ دعوت نامہ تمہارے لیے نہیں ہے؟" سالار نے اس کے بہتے آنسو روکنے کے لیے جیسے اسے چھیڑا۔

"نہیں میں صرف اس لیے رو رہی ہوں کہ..." وہ آنسوؤں کے درمیان رکی۔ "اللہ تم سے اتنا پیار کیوں کرتا ہے۔" وہ پھر رونے لگی تھی۔ "حسد نہیں ہے' رشک ہے... تمہارا اعزاز ہے' لیکن مجھے لگ رہا ہے میرے سر پر تاج بن کر سجا ہے۔" وہ آنسوؤں کے بیچ کہتی جارہی تھی۔

"جو بھی اعزاز ہیں' تمہاری وجہ سے ہی آئے ہیں امامہ... پہلے بھی... اب بھی... کوئی اور زندگی کا ساتھی ہوتا تو یہ سب نہ ہوتا۔" اس نے جواباً اس سے کہا تھا۔

اور اب خانہ کعبہ کے کھلتے ہوئے دروازے سے وہ سالار سکندر کو سیڑھیاں چڑھ کر اندر جاتا دیکھ رہی تھی۔ وہ اندر جانے والا آخری شخص تھا۔

معجزہ ہی تھا' وہ زندہ تھا.... صحت مند' تندرست' چاق و چوبند... اس عمر میں بھی بیس بائیس گھنٹے کام کرتے رہنے کی سکت کے ساتھ۔

ڈاکٹرز کہتے تھے اس کی زندگی معجزہ تھی اور اس کی ایسی صحت مند زندگی معجزے سے آگے کی کوئی شے... بیالیس سال کی عمر میں اسے ٹیومر ہوا تھا اور وہ اب چھپن سال کا تھا۔ جو ٹیومر اسے ہوا تھا۔ وہ سات سے دس سال کے اندر انسان کو ختم کر دیتا تھا اور وہ چودہ سال سے زندہ تھا۔ ہر چھ مہینے کے بعد اپنی رپورٹس کو دیکھتا تھا... اس کے دماغ میں موجود ٹیومر آج بھی تھا... اسی جگہ پر... اسی سائز میں... اور بس...

وہ رب جو سمندروں کو باندھ دیتا تھا اور انہیں ان کی حدوں سے باہر نکلنے نہیں دیتا تھا۔ اس کے سامنے وہ چند ملی میٹر کا ایک ناسور کیا شے تھا؟

موت اور اس کے بیچ زندگی نہیں دعائیں آکر کھڑی ہوئی تھیں اور سالار سکندر کو خانہ کعبہ کے اندر داخل ہوتے ہوئے بھی یہ یاد تھا کہ وہ کس کی دعاؤں کی وجہ سے وہاں آج بھی اپنے قدموں پر کھڑا تھا۔ وہ امامہ ہاشم کے علاوہ کسی اور کی دعائیں ہو ہی نہیں سکتی تھیں جو اسے زندگی بن کر یوں لگی تھیں۔

"کتنے سال سے میں نے اپنے لیے کوئی دعا ہی نہیں کی۔ جو بھی دعا کی ہے تمہارے اور بچوں سے شروع ہو کر تم اور بچوں پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ جب تک مجھے اپنا آپ یاد آتا ہے.... مجھے دعا ہی بھول جاتی ہے۔" وہ اکثر اس سے ہنستے ہوئے کہا کرتی تھی۔ یوں جیسے ایک ماں اور بیوی کی پوری کہانی لکھ دیتی تھی۔

"دیکھو اللہ تمہیں کہاں کہاں بلاتے ہیں' کہاں کہاں دعا کرنے کا موقع دے رہے ہیں۔" یہاں آتے ہوئے امامہ نے بڑی حسرت سے اس سے کہا تھا اور اب خانہ کعبہ کے اندر کھڑے وہ اس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ اسے جہاں بھی بلاتا تھا' وہ اسے ہر اس جگہ پر امامہ کو بھی یاد رکھواتا تھا۔ جیسے اسے جتاتا اور بتاتا ہو کہ اسے کسی درجے والی عورت کا ساتھ عطا کیا گیا تھا۔

اس گھر کے اندر کی دنیا اور دنیا تھی۔ اس کائنات کا حصہ ہوتے ہوئے بھی وہاں کروڑوں نہیں آئے تھے' لاکھوں نہیں' ہزاروں نہیں.... بس ہر صدی میں چند سو... اور ایک وہ صدی تھی جب وہاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آئے تھے۔ اپنے وجود کے علاوہ تو اسے وہاں صاف کرنے والی کوئی شے نظر ہی نہیں آرہی تھی۔

"تم اندر جا کے کیا مانگو گے سالار؟" اس نے خانہ کعبہ آتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

"تم بتاؤ کیا مانگوں؟" سالار نے جواباً" اس سے پوچھا۔

"پتا نہیں' کچھ بھی میں ہی نہیں آرہا۔" وہ رونے لگی... اور اس دعوت نامہ کو دیکھنے کے بعد بار بار یہی ہو رہا تھا' وہ بار بار بات کرتے ہوئے رونے لگتی تھی۔ جیسے دل بھر آتا ہو... جیسے خوشی کی حد ختم ہو جاتی ہو۔

"تم سارے ستونوں کو ہاتھ لگا کر آنا... ساری دیواروں کو... ان کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی چھوا ہو گا' کسی نہ کسی کو... پھر تم باہر آؤ گے تو سب سے پہلے میں تمہارا ہاتھ چھوؤں گی۔" وہ بچوں جیسے انداز میں کہہ رہی تھی۔

اور خانہ کعبہ کے اندر اس کی دیواروں' ستونوں کو آب زم زم سے دھوتے' چھوتے سالار سکندر کی سمجھ میں آگیا تھا' امامہ ہاشم کیوں یاد آتی ہے ایسی ہر جگہ پر... کیوں دعا والی ہر جگہ پر سب سے پہلے اس کے لیے دعا کرنا یاد آتا تھا۔ کیوں کہ وہ عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھا... خالص... غرض کے بغیر تھا... قربانیوں سے گندھا تھا' یہ کیسے ممکن تھا' وہاں سے جواب نہ ملتا... بھلا دیا جاتا۔

"تم نے اندر جا کر میرے لیے کیا مانگا؟" اس کے باہر آنے پر امامہ نے عجیب بے تابی سے اس سے پوچھا تھا۔ وہ ابھی اس کے پاس آیا ہی تھا' اس کے دونوں ہاتھ پکڑے وہ اب اس سے پوچھ رہی تھی۔

"مانگا ہے کچھ... بتا نہیں سکتا۔" سالار نے جواباً" عجیب مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "جب پوری ہو جائے گی دعا پھر بتاؤں گا۔" اس نے اسے جیسے اگلا سوال کرنے سے روک دیا تھا۔ "میں جانتی ہوں' کیا مانگا ہے... لیکن میں بھی بتاؤں گی نہیں' دیکھتی ہوں قبول ہوتی ہے تمہاری دعا یا نہیں۔" امامہ نے جواباً" عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے کہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اسفند کی موت کی اطلاع عائشہ عابدین کو دینا جبریل سکندر کی ذمہ داری نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ اس بچے کی ماں سے ملنے آیا تھا اور عائشہ عابدین کو دیکھتے ہی کچھ دیر کے لیے وہ گنگ ہو گیا تھا۔ کچھ ایسا ہی حال عائشہ عابدین کا تھا' وہ دونوں کئی سالوں بعد ایک دوسرے سے ملے تھے اور ملتے ہی ایک دوسرے کو پہچان گئے تھے' اور اب یہ شناخت جیسے ان کے حلق کا کانٹا بن گئی تھی۔

عائشہ کو یقین نہیں آیا تھا کہ امریکہ کے بہترین اسپتال میں بہترین ڈاکٹر کے ہاتھوں بھی اس کے بچے کی جان جاسکتی تھی۔ وہ خود ڈاکٹر تھی' اسفند کی چوٹ کی نوعیت اور سنگینی کو جانتی تھی' لیکن وہ خود جس اسپتال میں کام کررہی تھی' وہاں اس نے اس سے بھی زیادہ سنگین اور پیچیدہ نوعیت کے آپریشنز کے بعد بھی مریضوں کو صحت یاب ہوتے دیکھا تھا۔ لیکن اس کا اپنا بیٹا ان خوش قسمت لوگوں میں شامل کیوں نہیں ہوسکا تھا۔ اس سوال کا جو جواب عائشہ عابدین نے ڈھونڈا تھا' وہ ایک لمبے عرصے تک اسے بھوت بن کر چمٹا رہا تھا۔

اس نے غم کو پہلی بار مجسم حالت میں دیکھا تھا' اس شخص کی شکل میں جو اسے اس کی متاع حیات چھن جانے کی خبر سنانے آیا تھا۔ اور یہ وہ شخص تھا جس کے سراب نے عائشہ عابدین کو اس عذاب میں ڈالا تھا جس میں وہ تھی۔

ایک ڈاکٹر کی طرح جبریل اسے بتا گیا تھا کہ آپریشن کیوں ناکام ہوا' اسفند کی حالت کیوں بگڑی.... کیوں نہیں سنبھل سکی.... اور ان تمام تفصیلات کو دہراتے ہوئے جبریل سکندر کے لاشعور میں ڈاکٹر ویزل کے ہاتھ کی وہ حرکت بار بار آتی رہی' بار بار سر جھٹکنے کے باوجود.... وہ ایک بت کی طرح گم صم اس کی بات سنتی رہی جیسے وہ اس کے بیٹے کے بارے میں نہیں کسی اور کے بارے میں بات کر رہا تھا۔

"آپ کے ساتھ کوئی اور ہے؟" اپنی بات کے جواب میں ایک مکمل خاموشی رکھنے کے باوجود جبریل اس سے ایک بار پھر پوچھے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اسے وہ اس وقت نارمل نہیں لگ رہی تھی اور اسے احساس ہوا تھا کہ اسے اس کی فیملی میں کسی اور سے بات کرنی چاہیے تھی۔ یا اگر اب کرسکتا تھا تو اب کرے۔

عائشہ عابدین نے اس کی بات کے جواب میں نفی میں سر ہلا دیا۔ جبریل اس کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا' وہ اس سے اگلا سوال کیسے کرے.... سوال ہونے کے باوجود.... خاندان نہیں تھا تو کہاں تھا.... وہ کیا سنگل پیرنٹ کے طور پر اسفند کی پرورش کر رہی تھی؟ شوہر اگر نہیں بھی تھا تو کوئی خاندان کا اور فرد تو ہوتا.... اس کی ماں اور بہنیں.... وہ مزید کچھ نہیں سوچ سکا.... عائشہ نے یک دم اس سے کہا تھا۔

"آپ جائیں.... میں مینیج کرلوں گی سب کچھ۔" اس کی آواز جیسے کسی گہرے کنویں سے آئی تھی۔ اسے پتا تھا وہ "سب کچھ" کیا تھا اور جبریل کو بھی اندازہ تھا' وہ کس طرف اشارہ کر رہی تھی۔

ایک روتی بلکتی ہوئی ماں کو تسلی دینا آسان کام تھا' لیکن بظاہر ہوش و حواس میں نظر آتی ایک خاموش گم صم ماں کو تسلی دینا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ صرف چند منٹوں کے لیے اس بچے کی فیملی سے ملنے آیا تھا اور اب یہ ملاقات ختم کرنا اس کے لیے پہاڑ بن گیا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کسی مریض کو مرتے نہیں دیکھا تھا' لیکن کسی بچے کو پہلی بار مرتے دیکھا تھا۔ عائشہ عابدین سے مل کر اس کا رنج کچھ اور بڑھا تھا۔ وہ اس آپریشن کو لیڈ نہیں کر رہا تھا' نہ ہی وہ اسفند کی موت کا ذمہ دار تھا' اس کے باوجود یہ احساس اس کا ساتھ چھوڑنے پر تیار نہیں تھا کہ اس آپریشن میں ڈاکٹر ویزل سے کچھ غلطی ہوئی تھی' آپریشن کے فوراً" بعد ڈاکٹر ویزل اور اس کی بات چیت نہیں ہوسکی تھی۔ وہ عجیب اضطراب اور پریشانی کے عالم میں وہاں سے گئے تھے۔ سب کا اندازہ تھا وہ اس آخری آپریشن کی ناکامی سے اپ سیٹ ہوئے تھے' صرف جبریل تھا' جس کا خیال تھا وہ خود بھی اپنی غلطی کا اندازہ لگا چکے تھے لیکن اب اس صورت حال کے درمیان وہ پھنسا کھڑا تھا۔ ضمیر کی چبھن اور انسانی ہمدردی.... لیکن اس سے بھی بڑھ کر شناسائی کا وہ پرانا تعلق جو اس کے اور عائشہ عابدین کے درمیان نکل آیا تھا۔

"کوئی دوست ہے یہاں آپ کا؟" جبریل اب اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ اسے ابھی تک یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ اسے پہچانی ہے یا نہیں اور اسے اس صورت حال میں اپنا تعارف کروانا چاہیے یا نہیں۔

"نہیں۔" عائشہ نے سر جھکائے اسے دیکھے بغیر کہا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھے ان پر نظریں جمائے' سر جھکائے بیٹھی تھی۔ جبریل اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ "میرا خیال ہے' ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔" اپنا

ہاتھ اس کی کرسی کے ہتھے پر رکھتے ہوئے جبریل نے اس سے کہا تھا۔ وہ اسے رلانا نہیں چاہتا تھا' لیکن اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اسے اندازہ ہوا تھا کہ اسے اس وقت پھوٹ پھوٹ کر رونے کی ضرورت تھی۔ سکتے کی وہ کیفیت غیر فطری تھی۔

"میں جبریل سکندر ہوں.... نساء کا کلاس فیلو اور دوست.... اور مجھے بہت افسوس ہے کہ ہم اسفند کو نہیں بچا سکے۔" وہ مدھم آواز میں اس کا ہاتھ تھپکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ عائشہ نے گردن موڑ کر بھی اس کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس وقت کسی کو پہچاننا نہیں چاہتی تھی' خاص طور پر ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کو۔

"مجھے بتائیں میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟" جبریل نے اس کے ہاتھوں کی ٹھنڈک محسوس کی تھی' یوں جیسے اس نے برف کو ہاتھ میں لیا تھا' وہاں کا ٹمپریچر بھی عائشہ عابدین کے وجود کی ٹھنڈک کو غائب کرنے میں ناکام ہو رہا تھا۔

"پلیز مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ میری وجہ سے اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ آپ ڈاکٹر ہیں' کسی کو آپ کی ضرورت ہوگی۔" اس نے رک رک کر اس سے کہا تھا۔ وہ اب اپنے دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں کے بیچ دبا کر بیٹھ گئی تھی۔ یوں جیسے یہ چاہتی نہ ہو کہ کوئی اس کا ہاتھ پکڑے' اسے تسلی دے۔ کرسی کے کونے پر بیٹھی اپنے وجود کو جوتوں کے پنجوں پر ٹکائے وہ آگے پیچھے جھول رہی تھی' یوں جیسے کسی گہری سوچ میں' کسی ذہنی انتشار میں ہچکولے کھا رہی ہو۔

وہ پہلی بار تھا کہ جبریل نے عائشہ عابدین کو غور سے دیکھا تھا۔ بے حد حیرانی کے عالم میں.... سیاہ جینز اور سیاہ ہی جیکٹ میں ملبوس گردن کے گرد ایک گرے رنگ کا مفلر لپیٹے اس کی ہم عمر وہ لڑکی اب اس کی ہم عمر نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے کندھوں سے نیچے تک لہراتے سیاہ چمک دار بالوں میں جگہ جگہ سفید بال تھے۔ اس کی رنگت زرد تھی اور آنکھیں سرخ.... یوں جیسے وہ عادی رونے والوں میں سے تھی یا پھر ساری ساری رات جاگنے والوں میں سے.... اس کے سر پر وہ حجاب بھی نہیں تھا جو سالوں پہلے اس کی پہچان تھا۔

ڈاکٹر نورین الٰہی کے خاندان میں وہ حجاب لینے والی پہلی اور واحد لڑکی تھی اور بے حد اچھی خاندانی اقدار رکھنے کے باوجود جبریل جانتا تھا کہ نسا اور اس کے خاندان کا رجحان مذہب کی طرف نہیں تھا۔ صرف عائشہ عابدین تھی' جو مذہبی رجحان اور بے حد واضح طور پر ایسی ہی پہچان بھی رکھتی تھی اور اس کی وجہ شاید اس کا پاکستان میں قیام پذیر ہونا تھا' یہ جبریل کا اندازہ تھا۔ عائشہ سے اس کی کبھی اتنی تفصیلی ملاقاتیں نہیں ہوئیں کہ اسے اس کی شخصیت کا صحیح اندازہ ہو پاتا۔

وہ جس عمر میں اس سے ملا تھا۔ وہ ٹین ایج تھی اور اس عمر میں اسے بات بات پر مسکراتے اور بلش کرنے والی وہ لڑکی عنایہ اور رئیسہ جیسی ہی لگی تھی۔ اس نے اس سے زیادہ غور اس پر نہیں کیا تھا' اس کے باوجود کہ وہ اس کے فیس بک پر موجود تھی اور کبھی کبھار اس کی تصویروں کو لائک کرتی نظر آتی تھی' پھر وہ غائب ہو گئی تھی۔ اسے نسا سے پتا چلا تھا کہ میڈیسن کی تعلیم کے دوران ہی اس کی شادی ہو گئی تھی اور اس وقت جبریل نے مبارک باد کا میسیج اس کی وال پر لگانا چاہا تو اسے پتا چلا کہ وہ اب اس کے کانٹیکٹس میں نہیں تھی۔ عائشہ عابدین سے اس کا وہ پہلا تعارف بس یہیں تک ہی رہا تھا۔ نسا اور وہ بہت جلد دو مختلف اسٹیٹس کے ہاسپٹلز میں چلے گئے تھے۔ ان کے درمیان ایک دوست اور کلاس فیلو کے طور پر موجود رشتہ بھی کچھ کمزور پڑنے لگا تھا۔ نسا اب کہیں انگیجڈ تھی اور جبریل اپنے پروفیشن میں بے حد مصروف.... اور اس بے حد تیز رفتار سے گزرنے والی زندگی میں عائشہ عابدین کسی اسپیڈ بریکر کی طرح آئی تھی۔ جبریل نے اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اپنا سیل فون نکال کر اس میں سے نسا کا نمبر ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ چند لمحوں میں اسے نمبر مل گیا تھا۔

"کیا میں نسا کو فون کر کے بلاؤں؟" اس نے عائشہ سے کہا۔

"نہیں...." جبریل اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔ وہ عجیب تھی یا ہو گئی تھی' جبریل کی سمجھ میں نہیں آیا' یا پھر یہ صدمہ تھا جس نے اسے یوں بے حال کر دیا تھا۔

جبریل کو لوگوں پر ترس آتا تھا ہمیشہ ہی.... ہمدردی اس کی گھٹی میں تھی' لیکن اس کے باوجود وہ ایک مصروف ڈاکٹر تھا۔ ایک ایک منٹ دیکھ کر چلنے والا.... اس نے وہاں بیٹھے بیٹھے سوچا تھا.... وہ اسپتال کے متعلقہ شعبے سے کسی کو یہاں بھیجتا ہے' تاکہ وہ عائشہ عابدین کی مدد کرے اور اس کے خاندان کے دوسرے افراد سے رابطہ کر سکے۔ وہ اٹھنے لگا تھا جب اس نے عائشہ عابدین کی آواز سنی تھی۔

"آپ کو پتا ہے' میرے ساتھ یہ سب کیوں ہوا ہے؟" وہ رک کر اسے دیکھنے لگا' وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی' لیکن خود کلامی کے انداز میں بول رہی تھی۔

"کیونکہ میں اللہ کی نافرمان عورت ہوں' اللہ نے مجھے سزا دی ہے۔ احسن سعد ٹھیک کہتا ہے۔"

جبریل اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ عائشہ عابدین نے جیسے وہ بوجھ اتار کر اس کے سامنے پھینکنے کی کوشش کی تھی جو اس کے لیے آزار بن گیا تھا۔ احسن سعد کون تھا' جبریل نہیں جانتا تھا اور وہ اس کے بارے میں جو کہتا تھا' جبریل اس کی وجہ سے بھی ناواقف تھا۔ مگر اس کے وہ دو جملے اس دن اس کے پیروں کی زنجیر بن گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

گاڑی پورچ میں آکر رکی اور اندر سے امامہ بڑی تیز رفتاری سے باہر نکلی تھی۔ گاڑی تب تک رک چکی تھی اور اس کی اگلی سیٹ سے ایرک اتر رہا تھا۔ پہلی نظر میں امامہ اسے پہچان نہیں سکی۔ وہ واقعی بدل گیا تھا۔ لمبا تو وہ پہلے بھی تھا' لیکن اب وہ پہلے کی طرح بہت دبلا پتلا نہیں رہا تھا۔

اس کے ہاتھوں میں دو گلاب کی کلیوں اور چند سبز شاخوں کا ایک چھوٹا سا بکے تھا.... ہمیشہ کی طرح.... امامہ کو یاد تھا وہ بچپن میں بھی اسے اسی طرح ایک پھول اور دو پتوں والی شاخیں اکثر دیتا تھا.... جب بھی اس سے کسی خاص موقع پر ملنے آتا تھا.... اور بعض دفعہ وہ پورا "گلدستہ" اس کے گھر کے لان سے ہی بنایا گیا ہوتا تھا۔

ایرک اسے سلام کے بعد گلے ملنے کے لیے بے اختیار آگے بڑھا' پھر جھینپ کر خود ہی ٹھٹکا' شاید اسے کوئی خیال آگیا تھا۔ امامہ نے آگے بڑھ کر تھپکنے والے انداز میں اس کے گرد بازو پھیلایا تھا۔

"میں تمہیں پہچان ہی نہیں سکی' تم بڑے ہو گئے ہو۔ بہت بدل بھی گئے ہو۔" اس نے ایرک سے کہا' وہ مسکرایا۔

"لیکن آپ نہیں بدلیں... آپ ویسی ہی ہیں۔"

وہ ہنس پڑی تھی۔ "سننے میں کتنا اچھا لگتا ہے کہ کچھ نہیں بدلا.... حالانکہ سب کچھ بدل گیا ہے۔ میں بھی بوڑھی ہو گئی ہوں۔" وہ ہنس رہی تھی۔

"بڑھاپے کی Defination (تعریف) اب شاید بدل گئی ہوگی۔" ایرک نے برجستگی سے کہا' وہ پھر ہنس پڑی۔

"یہ آپ کے لیے۔" ایرک نے اسے وہ چھوٹا سا گلدستہ تھمایا تھا۔

"تمہاری عادتیں نہیں بدلیں.... لیکن پھول بدل گیا ہے۔" امامہ نے گلدستہ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"کیونکہ ملک بدل گیا ہے۔" اس نے برجستہ کہا۔

"ہاں یہ بھی ٹھیک کہا تم نے.... سامان کہاں ہے تمہارا؟" امامہ کو ایک دم خیال آیا وہ گاڑی سے اس گلدستے اور ایک چھوٹے بیگ کے علاوہ خالی ہاتھ اترا تھا۔

"ہوٹل میں.... میں وہیں رہوں گا' بس آپ سے ضروری ملاقات کرنی تھی' اس لیے آیا ہوں۔" ایرک نے اس کے ساتھ اندر جاتے ہوئے کہا۔

"پہلے تم ہمیشہ ہمارے پاس آیا کرتے تھے اور یہیں رہتے تھے' اب کسی اور کے پاس آئے ہو کیا؟" امامہ کو لگا تھا وہ شاید پاکستان اپنے کسی پیشہ ورانہ کام سے آیا تھا۔

"نہیں۔ کسی اور کے پاس تو نہیں آیا لیکن بس مجھے لگا اس بار کسی ہوٹل میں رک کر بھی دیکھنا چاہیے۔" وہ بات گول کر گیا تھا۔ وہ لنچ کا وقت تھا اور اس نے صبح جب فون پر اس سے ملاقات کے لیے بات کی تھی تو امامہ نے دوپہر کے کھانے پر خاص اہتمام کیا تھا۔ ایرک کو جو چیزیں پسند تھیں' اس نے بنوائی تھیں اور ایرک نے اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے بڑے شوق سے کھانا کھایا تھا۔

کھانے کے دوران گپ شپ میں ایرک اور اس کے درمیان ہر ایک کے بارے میں بات ہوئی تھی سوائے عنایہ کے.... ایرک نے اس کا ذکر تک نہیں کیا تھا اور امامہ نے یہ بات نوٹس کی تھی.... حوصلہ افزا تھی یہ بات' لیکن پتا نہیں کیوں اسے غیر معمولی لگی تھی.... اور اس کی چھٹی حس نے اسے جو سگنل دیا تھا۔ وہ ٹھیک تھا۔

کھانے کے بعد چائے کا آخری گھونٹ لے کر کپ رکھتے ہوئے ایرک نے اپنے بیگ سے ایک لفافہ نکال کر اس کے سامنے میز پر رکھ دیا تھا۔ امامہ ابھی چائے پی رہی تھی۔ وہ بری طرح تھکی تھی۔

"یہ کیا ہے؟"

"آپ دیکھ لیں۔"

اس نے امامہ سے کہا' پلک جھپکتے اس خوب صورت لفافے کو کھولنے سے بھی پہلے... اس کے چہرے سے مسکراہٹ یک دم غائب ہوئی تھی۔ وہ اس ایک لمحے سے بچنا چاہ رہی تھی اور وہ پھر بھی سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ لفافے کے اندر ایک خوب صورت کاغذ پر بے حد خوب صورت طرز تحریر میں ایرک نے وہی لکھا ہوا تھا جس کا اسے خدشہ تھا۔ وہ عنایہ کے لیے اس کی طرف سے ایک رسمی پروپوزل تھا۔ اس وعدے کے ساتھ کہ وہ اسے بہت خوش رکھے گا اور اس آفر کے ساتھ کہ وہ اس پروپوزل کے لیے ان کی تمام شرائط قبول کرنے پر تیار ہے۔"

امامہ کی نظریں کچھ دیر اس کاغذ پر جمی رہیں اور ایرک کی اس پر۔ پھر امامہ نے کاغذ کو اس لفافے میں واپس ڈال کر اسے میز پر رکھ دیا تھا۔ ایرک سے اب نظر ملانا اور سامنا کرنا یک دم مشکل ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا' وہ سنجیدہ تھا اور گفتگو کا آغاز اسی نے کر دیا تھا۔

آپ نے کئی سال پہلے مجھ سے کہا تھا۔ میں پڑھ لکھ کر کچھ بن جاؤں پھر آپ سے اس بارے میں بات کروں اور تب تک میں عنایہ سے بھی اس موضوع پر کبھی بات نہ کروں دیکھیں۔ میں نے آپ کی دونوں شرائط پوری کی ہیں۔" اس نے کہا اور اس کے دونوں جملوں نے امامہ کے لیے جواب کو اور بھی مشکل کر دیا تھا۔

"میں جانتا ہوں مسز سالار' آپ کے لیے میں ایک بہت مشکل انتخاب ہوں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ایک برا انتخاب ثابت نہیں ہوں گا۔" ایرک نے جیسے اس کی مشکل بھانپتے ہوئے خود ہی اسے یقین دلانے کی کوشش کی تھی۔

وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی' وہ اچھا لڑکا تھا۔ برا ہوتا تو اسے برا بھلا کہنا کتنا آسان ہوتا... امامہ نے دل میں سوچا۔

وہ اپنی طرف سے انکار کی ہر وجہ ختم کر آیا تھا... مسلمان بھی ہو گیا تھا' ایک اچھے پروفیشن میں بھی تھا۔ خاندانی اعتبار سے بھی اچھا تھا۔ امامہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ پھر بھی اسے انکار کیا کہہ کے کرے... یہ کہہ کے کہ اسے خوف اور خدشات تھے' اس کے نومسلم ہونے کے حوالے سے... یا یہ کہے کہ وہ صرف ایک پاکستانی سے عنایہ کی شادی کرنا چاہتی تھی جو اس کے اپنے کلچر سے واقف ہو... اس کے ذہن میں اس وقت جوابات جیسے بھاگ رہے تھے اور کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو تسلی بخش ہوتا لیکن اس کے باوجود... ایک جواب تو ایرک کو دینا ہی تھا۔

"تم بہت اچھے ہو ایرک۔" امامہ نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"عبداللہ!" اس نے امامہ کو بیچ میں ٹوک کر جیسے اس کی تصحیح کی۔

وہ ایک لحظہ کے لیے خاموش ہوئی پھر اس نے جیسے بڑی مشکل سے اس سے کہا۔ "عبداللہ... تم بڑے اچھے لڑکے ہو اور میں تمہیں پسند کرتی ہوں لیکن عنایہ کے حوالے سے ابھی کوئی فیصلہ کرنا مشکل ہے' میں نہیں جانتی۔ عنایہ تمہارے پروپوزل کے حوالے سے کیا سوچتی ہے... اس کی پسند' ناپسند بے حد اہم ہے۔"

وہ جملہ ادا کرتے ہوئے بھی امامہ کو احساس ہو رہا تھا وہ ایک بے تکی بات کر رہی تھی... اگر بات عنایہ کی پسند ناپسند کی تھی' تو پھر رشتہ پکا تھا۔ ایرک کے لیے اس کی پسندیدگی بہت واضح تھی۔

"میں نے عنایہ سے پہلے اس لیے بات نہیں کی کیوں کہ آپ نے مجھ سے وعدہ لیا تھا' میں یہ بات جب بھی کروں گا' آپ سے ہی کروں گا۔" اس نے امامہ کی بات کاٹ کر جیسے اسے یاد دہانی کرائی تھی۔

"میں سالار سے بات کروں گی' تم دو ہفتے پہلے آجاتے تو ان سے تمہاری ملاقات ہو جاتی۔ وہ یہیں تھے کچھ دن۔" امامہ نے جواباً کہا تھا۔ فوراً "ہاں" کہہ دینے سے یہ بہتر تھا۔

"وہ جہاں بھی ہوں گے' میں ان سے ملنے جا سکتا ہوں میں جانتا ہوں وہ بڑے مصروف ہیں لیکن پھر بھی۔" ایرک نے اس سے کہا۔ "آپ کو تو میرے پروپوزل پر کوئی اعتراض نہیں ہے نا؟" وہ یک دم خوش ہوا تھا اور اس کے چہرے سے چھلکنے

والی خوشی اور اطمینان نے جیسے امامہ کو احساس جرم میں مبتلا کر دیا تھا۔

"میں نے تمہیں بتایا ہے عبداللہ تم بہت اچھے ہو' لیکن میری خواہش ہے کہ عنایہ کی شادی جس سے بھی ہو' وہ صرف نام کا مسلمان نہ ہو' نیک ہو' دین دار ہو' سمجھ بوجھ رکھنے کے ساتھ ساتھ دین کی تعلیمات پر عمل بھی کرتا ہو۔" امامہ نے اس سے کہنا شروع کیا۔ وہ بے حد سنجیدہ تھی۔ وہ اس کی بات بے حد غور سے سن رہا تھا۔

"مرد کو دین کا پتا نہ ہو تو عورت کے لیے بہت مسئلہ ہو جاتا ہے۔ یہ ایک پوری نسل کی تربیت کی بات ہوتی ہے۔ ہم لوگ لبرل مسلمان ہیں لیکن بے دین اور بے عمل نہیں ہیں اور نہ ہی ایسے ہونا چاہتے ہیں' نہ اپنی اگلی نسلوں کے لیے یہ چاہتے ہیں۔ مجھے نہیں پتا تم کتنے باعمل ہو اور اسلام کے بارے میں تمہارے نظریات کتنے واضح ہیں لیکن عنایہ بہت مذہبی ہے... میں نہیں چاہتی اس کی شادی ایسی جگہ ہو جہاں میاں بیوی کے درمیان جھگڑے کی وجہ مذہبی اعتقادات اور ان پر عمل کا ہونا یا نہ ہونا ہو۔" وہ کہتی جا رہی تھی۔

"تمہیں شاید پتا نہ ہو لیکن میں بھی نو مسلم تھی۔ اپنے مذہب کو ترک کر کے اسلام کی صحیح تعلیمات اختیار کی تھیں میں نے... فیملی گھر سب چھوڑا تھا... بڑے مسائل کا سامنا کیا تھا... یہ آسان نہیں تھا۔" اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ وہ رکی' اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے وہ ہنسی یوں جیسے اپنے آنسوؤں کو چھپانا چاہتی ہو۔

"یہ آسان کام نہیں تھا۔" اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ "لیکن سالار نے بہت آسان کر دیا میرے لیے... وہ باعمل مسلمان ہے اور میں اپنی بیٹی کے لیے اس کے باپ جیسا مسلمان ہی چاہتی ہوں' زندگی میں اتنی تکلیفیں برداشت کر کے اتنی لمبی جدوجہد کے بعد میں اپنی اگلی نسل کو پھر سے بے دین اور بے عمل دیکھنا نہیں چاہتی۔ تم مسلمان تو ہو لیکن شاید اسلام کی تعلیمات میں اتنی دلچسپی نہ ہو کیوں کہ تمہارے مسلمان ہونے کی وجہ ایک لڑکی سے شادی ہے۔ شادی ہو جائے گی تمہاری دلچسپی دین میں ختم ہو جائے گی۔ کچھ عرصہ بعد شاید تمہیں یہ بھی یاد نہ رہے کہ تم مسلمان ہو۔ حرام اور حلال کے درمیان جو دیوار ہم اٹھا کر رکھتے ہیں۔ تمہارے لیے وہ اٹھانا ضروری نہ ہو۔ محبت بہت دیر پا چلنے والی شے نہیں ہے۔ اگر دو انسانوں کے بیچ عادات' اعتقادات اور خیالات کی خلیج ہو تو۔"

ایرک نے اس کی گفتگو کے درمیان اسے ایک بار بھی نہیں ٹوکا تھا۔ وہ صرف خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

"تم کسی ویسٹرن لڑکی سے شادی کر لو تو تمہاری بہت اچھی نبھے گی۔" وہ اب اسے جیسے مشورہ دیتے ہوئے راستہ دکھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔

"کوئی اچھی مسلمان لڑکی جو وہیں سے ہو۔"

"وہ جو بھی ہو گی' آپ کی بیٹی تو نہیں ہو گی مسز سالار۔" اس بار اس نے اس لمبی گفتگو کے دوران پہلی بار امامہ کو ٹوکا' امامہ خاموش ہو گئی۔

"آپ نے اچھا کیا یہ سب کچھ کہا مجھ سے... جو بھی آپ کے خدشات ہیں' میں اب انہیں دیکھ سکتا ہوں اور آپ کو وضاحت بھی دے سکتا ہوں۔ نو سال ہو گئے ہیں مجھے عبداللہ بنے... لیکن مجھے لگتا ہے مسلمان میں بہت پہلے سے تھا تب سے جب آپ لوگوں کے خاندان سے ملنا شروع ہوا تھا..." وہ بہت سوچ سوچ کر ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہا تھا۔

"میں بہت زیادہ باعمل اور باکردار مسلمان نہیں ہوں۔ آپ کے بیٹوں جیسا تو بالکل بھی نہیں ہوں لیکن اپنے آس پاس نظر آنے والے بہت سے مسلمانوں سے بہتر ہوں۔ نو سال میں میں نے اپنے دین کے حوالے سے صرف حرام اور حلال ہی کو نہیں سمجھا اور بھی بہت کچھ سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے پتا ہے آپ ختم نبوت پر یقین نہیں رکھتی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی تسلیم نہیں کرتی تھیں۔

پھر آپ تائب ہو کر مسلمان ہوئیں... مجھ سے یہ مت پوچھیے گا کہ یہ مجھے کس نے بتایا لیکن میں یہ جانتا ہوں اور اس لیے آپ سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ آپ مجھ سے زیادہ ہمدردی رکھیں گی۔ آپ کی طرح میں بھی اپنی اگلی نسل کو اچھا انسان اور مسلمان دیکھنا چاہتا ہوں... صرف مسلمان نہیں اس لیے آپ کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں... ایک اچھی دین دار عورت ہی ایک اچھے گھرانے کی بنیاد رکھتی ہے... یہ بھی دین نے ہی بتایا ہے مجھے۔"

امامہ اس کی باتیں سن رہی تھی' عبداللہ اس کے انکار کو بہت مشکل کرتا جا رہا تھا۔ وہ جو بھی اس سے کہہ رہا تھا' وہ لگی

لیٹی کے بغیر کہہ رہا تھا۔

"مجھے عنایہ بہت اچھی لگتی ہے' محبت کرتا ہوں اس سے لیکن شادی کا فیصلہ صرف محبت کی وجہ سے نہیں کیا نہ ہی مذہب کی تبدیلی محبت کا نتیجہ ہے..... میری زندگی میں آپ اور آپ کی فیملی کا ایک بہت پازیٹو رول رہا ہے..... میں آپ لوگوں کے مذہب سے بعد میں متاثر ہوا تھا' آپ لوگوں کی انسانیت اور مہربانی سے پہلے متاثر ہوا تھا..... اور میری زندگی کے ایک بہت مشکل فیز میں مجھے آپ لوگوں کا حسنِ سلوک یاد ہے' ایک ایک چیز۔ آپ کہیں تو میں دہرا سکتا ہوں میں اس مذہب کے حصار میں آگیا تھا جو ایسے خوب صورت انسان بنانے کی صلاحیت اور قدرت رکھتا تھا میں اس وقت بہت چھوٹا تھا' آپ لوگوں کے لیے جو محسوس کرتا تھا' اسے آپ لوگوں کو بتا نہیں سکتا تھا۔ اب اتنے سالوں بعد مجھے موقع ملا ہے تو میں بتا رہا ہوں۔"

وہ رکا..... سر جھکائے بہت دیر خاموش رہا۔

"آپ لوگ میری زندگی میں نہ آتے تو میں ایک بہت برا انسان بنتا..... پاپا کی موت کے بعد میں ویسے ہی تھا جیسے سمندر میں ایک چھوٹی سی کشتی جس کی کوئی سمت نہیں ہوتی..... ڈوب جاتی تو ڈوب جاتی..... میں اس وقت بہت دعا کیا کرتا تھا کہ مسٹر سکندر کو کچھ نہ ہو' ان کا ٹریٹمنٹ صحیح ہو جائے کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا آپ کے گھر میں وہ تکلیف آئے جس سے میں اور میری فیملی گزر رہی تھی....." وہ چپ ہو گیا۔ امامہ بھی بول نہیں سکی..... پانی دونوں کی آنکھوں میں تھا اور درد بھی..... اور دونوں یہ دونوں چیزیں چھپانے کی کوشش میں تھے۔

"میں پاکستان صرف آپ سے بات کرنے اور یہ سب بتانے کے لیے آیا ہوں۔ کہ آپ نے اپنی بیٹی کی تربیت بہت اچھی کی ہے۔ وہ بہت عزت اور حیا والی ہے اور میں نے اتنے سالوں میں اس کے لیے محبت کا جذبہ رکھنے کے باوجود ان حدود کا احترام کیا ہے۔ جو آپ نے اس کے لیے طے کی ہیں اور جسے اس نے کبھی نہیں توڑا۔ میں آپ کی بیٹی کو اتنی ہی عزت اور احترام کے ساتھ اپنی زندگی اور گھر کا حصہ بنانا چاہتا ہوں۔"

عبداللہ نے اپنے بیگ سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکال کر اس لفافے کے اوپر رکھ دی جو اس نے میز پر رکھا تھا۔ اس خوب صورت لفافے کے اوپر ایک خوب صورت سرخ ڈبیا میں عنایہ سکندر کا نصیب تھا جو اتنا ہی خوب صورت تھا۔ نم آنکھوں کے ساتھ امامہ اس ڈبیا سے نظریں نہیں ہٹا سکی۔ اس کی مرضی سے کبھی کچھ نہیں ہوتا تھا' لیکن جو بھی ہوتا تھا وہ بہترین ہوتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"رنگ خوب صورت ہے پر نقلی ہے۔" حمین نے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے' فش اور چپس کھاتے ہوئے ڈبیا کو رئیسہ کی طرف سرکایا' جو سلاد کا ایک پیالہ کھاتے ہوئے اس کی بات سن رہی تھی۔ کھلی ہوئی ڈبیا کو بند کرتے ہوئے اس نے اسی ہاتھ سے اپنے گلاسز ٹھیک کیے اور بڑے تحمل سے کہا۔

"میں جانتی ہوں۔" وہ فش اور چپس تقریباً" نگل رہا تھا اور ساتھ ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی پر رگبی کا ایک میچ دیکھ رہا تھا۔

رئیسہ ویک اینڈ گزارنے وہاں آئی تھی' امریکہ واپس آنے کے بعد اور اگلے دن عنایہ بھی وہاں پہنچ رہی تھی اور اس وقت ایک فاسٹ فوڈ سے ہوم ڈیلیوری سروس کے ذریعے منگایا گیا ——— کھانا کھانے میں مصروف تھے جب رئیسہ نے وہ انگوٹھی اسے دکھائی تھی۔

"تم نے کسی کو دینی ہے یا تمہیں کسی نے دی ہے؟" حمین نے میچ دیکھتے دیکھتے چلی ساس کی بوتل تقریباً" اپنی پلیٹ میں خالی کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"ہشام نے دی ہے۔" رئیسہ نے کسی تمہید کے بغیر مدھم آواز میں بے حد سنجیدگی سے کہا۔ اس بار حمین نے اسکرین سے نظریں ہٹائی تھیں۔

"جب وہ واپس آئے گا تو میں اسے واپس کر دوں گی۔" اس نے ایک لمحے کے توقف کے بعد اسی سانس میں کہا۔

"مطلب؟" حمین اب سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"اس نے مجھے پرپوز کیا ہے لیکن میں نے اس کا پروپوزل قبول نہیں کیا۔ میں چاہتی ہوں پہلے دونوں فیملیز آپس
میں بات کریں۔" ریئسہ نے اسے مختصراً" بتایا۔
"لیکن ہشام تو ابھی اپنی فیملی کے ساتھ بحرین میں ہو گا۔ اس کی فیملی کیا وہاں سے آکر بات کرے گی؟" حمین نے
جواباً" اس سے پوچھا۔ وہ دونوں ہشام اور اس کی فیملی کے حوالے سے بات کر رہے تھے۔
تین دن پہلے بحرین میں ہونے والے رائل فیملی کے اس فضائی حادثے میں وہاں کے حکمران اور اس کی فیملی کے چھ افراد
کی ہلاکت ہوئی تھی۔ بحرین کا حکمران ہشام کا تایا تھا اور اس حادثے کی اطلاع ملنے کے فوری بعد ہشام اپنی فیملی کے ساتھ
بحرین چلا گیا تھا۔ ریئسہ بھی اس کے ساتھ ہی امریکہ واپس آئی تھی۔
"ہشام تو آجائے گا اگلے ہفتے لیکن اس کی فیملی ابھی رہے گی وہاں۔" ریئسہ نے اس سے کہا۔
"تو پھر کیا ہو گا؟" حمین نے دوبارہ چپس کھانا شروع کرتے ہوئے کہا۔
"اسی لیے تو تم سے بات کر رہی ہوں 'تم بتاؤ۔" ریئسہ نے اسے جواباً" کہا۔
"ممی کریں گی صاف صاف دو ٹوک انکار۔" چلی ساس میں مچھلی کا ٹکڑا ڈبوتے ہوئے حمین نے جیسے مستقبل کا نقشہ دو
جملوں میں اس کے سامنے کھینچا۔
"ہاں مجھے پتا ہے۔" ریئسہ نے گہرا سانس لیا۔
"تمہیں پسند تو نہیں ہے نا؟" حمین نے اس سے اس طرح سرسری سے انداز میں پوچھا جیسے یہ کوئی عام سی بات
تھی۔
"ہے۔" اس نے یک لفظی جواب دیا اور ایک پورا زیتون اٹھا کر نگلا۔
"ٹو بیڈ" (بہت برا) حمین نے جیسے افسوس کرنے والے انداز میں کہا۔
"عنایہ اور عبداللہ کا پتا ہے تمہیں اس کے باوجود تم نے....."
ریئسہ نے اس کی بات کاٹی۔ "ہشام پیدائشی مسلمان ہے۔"
"لیکن بحرینی ہے بلکہ عرب ہے۔" حمین نے اسے بات مکمل کرنے کا موقع نہیں دیا تھا۔
"ویسے تو وہ امریکی ہے۔" ریئسہ نے جیسے مدافعانہ انداز میں کہا۔
"امریکی تو ممی کو ویسے ہی زہر لگتے ہیں۔" حمین نے بے حد اطمینان سے تصویر کا ایک اور تاریک پہلو اسے دکھایا۔
"اسی لیے تو تم سے بات کر رہی ہوں۔" ریئسہ نے جلا دکھانا بند کر دیا۔
"تم ایک بات بتاؤ 'تمہیں وہ صرف پسند ہے یا محبت وغیرہ ہے؟" ریئسہ نے اسے جواباً" گھورا۔
"صرف جنرل نالج کے لیے پوچھ رہا ہوں۔" حمین نے مدافعانہ انداز میں بے اختیار کہا۔
"یہ جنرل نالج کا سوال نہیں ہے۔" ریئسہ نے جتانے والے انداز میں کہا۔
"کامن سینس کا ہو گا پھر..... وہ تو میری ویسے ہی خراب ہے۔" پلیٹ صاف کرتے ہوئے حمین نے بے حد اطمینان
سے کہا۔
"تم کچھ کر سکتے ہو یا نہیں؟" ریئسہ نے اس کو اگلا جملہ بولنے سے پہلے کہا۔
"میں صرف کوشش کر سکتا ہوں لیکن اس کا فائدہ نہیں..... لیکن سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ تم میری ملاقات
ہشام سے کراؤ..... میں دیکھنا چاہتا ہوں تمہارے حوالے سے وہ دراصل کتنا سیریس ہے۔"
"وہ میں کروا دوں گی 'وہ مسئلہ نہیں ہے۔" ریئسہ نے کچھ مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔
"اور اگر ممی پاپا بابا نہیں مانتے پھر.....؟" حمین نے یک دم اس سے کہا۔ وہ خاموش بیٹھی رہی 'پھر اس نے کہا۔
"مجھے وہ اچھا لگتا ہے لیکن ایسی جذباتی وابستگی نہیں ہے کہ میں اسے چھوڑ نہ سکوں۔"
"اچھے کی امید رکھنی چاہیے لیکن بدترین کے لیے تیار رہنا چاہیے..... بابا کو اعتراض نہیں ہو گا 'لیکن ممی کا میں کہہ
نہیں سکتا 'کوشش کروں گا..... لیکن ہشام نے اپنی فیملی سے بات کی ہے تمہیں پروپوز کرنے سے پہلے؟ کیوں کہ اگر اس کی
فیملی کو کوئی اعتراض ہوا تو ممی بابا میں سے کوئی بھی اس پروپوزل پر غور نہیں کرے گا۔" حمین کو بات کرتے کرتے خیال

آیا تھا۔

"اپنی فیملی سے بات کر کے ہی اس نے مجھ سے بات کی ہے' اس کی فیملی کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔" رئیسہ نے اسے جیسے یقین دہانی کرائی۔

حمین اس کی بات سنتے ہوئے اپنے میز پر دھرے فون کی اسکرین پر کچھ دیکھ رہا تھا اور اپنی انگلی سے اسکرین کو اسکرول کر رہا تھا' رئیسہ کو لگا اس نے اس کی بات غور سے نہیں سنی۔

"تم میری بات سن رہے ہو؟" رئیسہ نے جیسے اسے متوجہ کیا۔

"ہاں.... میں ہشام کو سرچ کر رہا ہوں۔" اس نے جواباً کہا۔

"کیا؟" رئیسہ چونکی۔

"ہشام کو اور اس کی فیملی کو پتا ہے کہ تم اڈاپٹڈ ہو؟" حمین اسی طرح سکرین اسکرول کر رہا تھا....

"ہشام کو پتا ہے تو ظاہر ہے اس کی فیملی کو بھی پتا ہو گا۔" وہ ایک لمحہ کے لیے ٹھٹکی اور پھر بولی۔

"اوہ...." حمین اپنے فون کی اسکرین پر کچھ پڑھتے پڑھتے بے اختیار چونکا تھا۔

"کیا ہوا؟" رئیسہ چونکی۔

"تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے اور شاید بری بھی۔" حمین نے ایک گہرا سانس لے کر سر اٹھایا اور اسے دیکھا اور پھر اپنا فون اس کے سامنے رکھ دیا۔

☆ ☆ ☆

وہ شخص دیوار پر لگی رئیسہ کی تصویر کے سامنے پچھلے پندرہ منٹ سے کھڑا تھا۔ پلکیں جھپکائے بغیر' ٹکٹکی باندھے اس لڑکی کا چہرہ دیکھتے ہوئے.... چہرے میں کوئی شباہت تلاش کرتے ہوئے.... سالار سکندر کے شجرہ میں دبے آتش فشاں کی شروعات ڈھونڈتے ہوئے.... اگر وہ اس شخص کو نشانہ بنا سکتا تھا تو اسی ایک جگہ سے بنا سکتا تھا۔ وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا.... خود کلامی.... ایک اسکینڈل کا تانا بانا تیار کرنے کے لیے ایک کے بعد ایک مکروفریب کا جال.... وجوہات.... حقائق کو چھپانے.... وہ ایک گہرا سانس لے کر اپنے عقب میں بیٹھے لوگوں کو کچھ ہدایات دینے کے لیے مڑا تھا۔

سی آئی اے ہیڈ کوارٹرز کے اس کمرے کی دیواروں پر لگے بورڈز' چھوٹے بڑے نوٹس' چارٹس' فوٹو گرافس اور ایڈریسز کی چٹوں سے بھرے ہوئے تھے۔

کمرے میں موجود چند آدمیوں میں سے تین اس وقت بھی کمپیوٹر پر مختلف ڈیٹا کھنگالنے میں مصروف تھے' یہ کام وہ پچھلے ڈیڑھ ماہ سے کر رہے تھے۔ اس کمرے میں جگہ جگہ بڑے بڑے ڈبے کھلے پڑے تھے جو مختلف فائلز' ٹیپس' میگزینز اور نیوز پیپرز کے تراشوں اور دوسرے ریکارڈ سے بھرے ہوئے تھے۔ کمرے میں موجود ریکارڈ کیبنٹس پہلے ہی بھری ہوئی تھیں' کمرے میں موجود تمام ڈیٹا ان کمپیوٹرز کی ہارڈ ڈسکس میں بھی محفوظ تھا۔

کمرے میں موجود دو آدمی پہلے ڈیڑھ ماہ سالار سکندر کے بارے میں آن لائن آنے والا تمام ریکارڈ اور معلومات اکٹھی کرتے رہے تھے۔ کمرے میں موجود تیسرا شخص سالار اور اس کی فیملی کے ہر فرد کے ای میلز کا ریکارڈ کھنگالتا رہا تھا۔ چوتھا شخص اس کی فیملی اور مالی معلومات کو چیک کرتا رہا تھا۔ اس ساری جدوجہد کا نتیجہ ان تصویروں اور شجرہ نسب کی صورت میں ان بورڈز پر موجود تھا۔

وہ چار افراد دعوا کر سکتے تھے کہ سالار اور اس کی فیملی کی پوری زندگی کا ریکارڈ اگر خدا کے پاس موجود تھا تو اس کی ایک کاپی اس کمرے میں بھی تھی۔ سالار کی زندگی کے بارے میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو ان کے علم میں نہیں تھی یا جس کے بارے میں وہ ثبوت نہیں دے سکتے تھے۔

سی آئے کے اسٹنگ آپریشنز سے لے کر اس کی ٹین ایج کی گرل فرینڈز تک اور اس کے مالی معاملات سے لے کر اس کی اولاد کی پرسنل اور پرائیوٹ لائف تک ان کے پاس ہر چیز کی تفصیلات تھیں۔

لیکن سارا مسئلہ یہ تھا کہ ڈیڑھ دو ماہ کی اس محنت اور پوری دنیا سے اکٹھے کیے ہوئے اس ڈیٹا میں سے وہ ایسی کوئی چیز

نہیں نکال سکے تھے جس سے وہ اس کی کردار کشی کر سکتے۔ وہ ٹیم جو پندرہ سال سے اس طرح کے مقاصد پر کام کرتی رہی تھی۔ یہ پہلی بار تھا کہ وہ اتنی سرتوڑ محنت کے باوجود اس شخص اور اس کے گھرانے کے کسی شخص کے حوالے سے کسی قسم کا اسکینڈل ڈھونڈ نہیں پائی تھی۔ دو سو پوائنٹنس کی جو چیک لسٹ انہیں دی گئی تھی ' وہ دو سو کراسز سے بھری ہوئی تھی اور یہ ان کی زندگی میں پہلی بار ہو رہا تھا۔ انہوں نے ایسا صاف ریکارڈ کسی کا نہیں دیکھا تھا۔

کسی حد تک ستائش کے جذبات رکھنے کے باوجود وہ ایک آخری کوشش کر رہے تھے.... ایک آخری کوشش.... کمرے کے ایک بورڈ سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے بورڈ تک جاتے جاتے وہ آدمی سالار کے فیملی ٹری کی اس تصویر پر رکا تھا۔ اس تصویر کے آگے کچھ اور تصویریں تھیں اور ان کے ساتھ کچھ بلٹ پوائنٹس..... ایک دم جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگا تھا۔ اس نے اس لڑکی کی تصویر کے نیچے اس کی تاریخ پیدائش دیکھی پھر مڑ کر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کو وہ سال بتاتے ہوئے کہا۔

''دیکھو اس سال ان ڈیٹس پر یہ کہاں تھا؟''

کمپیوٹر پر بیٹھے ہوئے آدمی نے چند منٹوں کے بعد سکرین پر نمودار ہونے والی تحریر پڑھتے ہوئے کہا۔

''پاکستان!''

سوال کرنے والے آدمی کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آئی تھی۔

''کب سے کب تک؟''

اس آدمی نے اگلا سوال کیا ' کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے ہوئے شخص نے کی بورڈ پر انگلیوں کو حرکت دیتے ہوئے سکرین پر دیکھتے ہوئے اسے تاریخیں بتائیں۔

''آخر کار ہمیں کچھ مل ہی گیا۔'' اس آدمی نے بے اختیار ایک سیٹی بجاتے ہوئے کہا تھا۔ انہیں جہاز ڈبونے کے لیے تارپیڈو مل گیا تھا۔

یہ پندرہ منٹ پہلے کی روداد تھی۔ پندرہ منٹ بعد وہ اب جانتا تھا کہ اسے اس آتش فشاں کا منہ کھولنے کے لیے کیا کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو مٹھیوں کی طرح بھینچ کر کھولا ' ایک بار.... دوبار.... تین بار.... پھر اپنی آنکھوں کو انگلیوں کی پوروں سے مسلا.... کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے ' اپنی لمبی ٹانگوں کو اسٹڈی ٹیبل کے نیچے رکھے فٹ ہولڈر پر سیدھا کرتے ہوئے وہ جیسے کام کرنے کے لیے ایک بار پھر تازہ دم ہو گیا تھا.... پچھلے چار گھنٹے سے مسلسل اس لیپ ٹاپ پر کام کرتے رہنے کے باوجود جو اس وقت بھی اس کے سامنے کھلا ہوا تھا اور جس پر چمکتی گھڑی اس وقت سوئزر لینڈ میں رات کے ڈھائی بج جانے کا اعلان کر رہی تھی۔ وہ ڈیوس میں ورلڈ اکنامک فورم کا 'کی نوٹ سپیکر' تھا جس کی تقریر کل دنیا کے ہر بڑے چینل اور اخبار کی شہ سرخی بننے والی تھی تین بج کر چالیس منٹ پر اس نے بالآخر اپنا کام ختم کیا۔ لیپ ٹاپ کو بند کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا ' وہ موسم سرما تھا اور ڈیوس میں سورج طلوع ہونے میں ابھی وقت تھا.... اتنا وقت کہ وہ چند گھنٹے کے لیے سو جاتا.... اور چند گھنٹوں کی نیند اس کے لیے کافی تھی ' نماز کے لیے دوبارہ جاگنے سے پہلے....

وہ اس کی زندگی کا معمول تھا اور اتنے سالوں سے تھا کہ اسے معمول سے زیادہ عادت لگنے لگا تھا۔ صوفے کے سامنے موجود سینٹر ٹیبل پر سوئزر لینڈ اور امریکہ کے کچھ بین الاقوامی جریدوں کی کاپیز پڑی تھیں اور ان میں سے ایک کے سرورق پر حمین سکندر کی تصویر تھی۔

''ینگ گلوبل لیڈرز 500 کی فہرست میں پہلے نمبر پر براجمان ' اپنی مخصوص شرارتی مسکراہٹ اور چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کیمرہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے۔

ایک لمحے کے لیے سالار کو ایسا لگا تھا جیسے وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا.... اسی اعتماد ' دلیری اور وقار کے ساتھ جو اس کا خاصہ تھا۔

سالار سکندر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لہرائی' اس نے جھک کر وہ میگزین اٹھایا تھا.... وہ ورلڈ اکنامک فورم میں پہلی بار آ رہا تھا.... اور دنیا کے اس موقر فورم کا جیسے نیا پوسٹر بوائے تھا۔ وہاں پڑا کوئی میگزین ایسا نہیں تھا جس میں اس نے حمین سکندر یا اس کی کمپنی کے حوالے سے کچھ نہ پڑھا ہو۔

"Devilishly' Handsome' Dangerously' Meticulous"

سالار سکندر کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوئی.... وہ ہیڈلائن حمین سکندر کے بارے میں تھی جس سے اس کی ملاقات کل اسی فورم میں ہونے والی تھی' جہاں اس کا بیٹا بھی خطاب کرنے والا تھا۔ اس نے اس میگزین کو دوبارہ سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔

اس کے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑا سیل فون کھٹکا' بستر پر بیٹھتے ہوئے سالار نے اسے اٹھا کر دیکھا۔ وہ واقعی شیطان تھا' خیال آنے پر بھی سامنے آجاتا تھا....

''جاگ رہے ہیں''۔ وہ حمین سکندر کا ٹیکسٹ تھا' اسے باپ کی روٹین کا پتا تھا۔ وہ خود بھی بے خوابی کا شکار تھا۔

''یس!'' سالار نے جواباً'' ٹیکسٹ کیا۔

''بڑی اچھی فلم آرہی تھی' سوچا آپ کو بتادوں۔'' جواب آیا۔

سالار کو اس سے ایسے ہی کسی جواب کی توقع تھی۔

دوسرا ٹیکسٹ آیا جس میں اس چینل کا نمبر بھی تھا جس پر وہ مووی آرہی تھی' اس کی کاسٹ کے ناموں کے ساتھ جس میں چارلیز تھیرن کا نام جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ وہ باپ کو تنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔ سالار کو اندازہ ہو گیا تھا۔

''مطلع کرنے کا شکریہ''

سالار نے زیرلب مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ٹیکسٹ کا جواب دیا۔ اس کی بات کا جواب نہ دینا اس سے زیادہ بہتر تھا۔

''میں سنجیدگی سے شادی کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

اگلا جملہ بے سروپا تھا۔ سالار سکندر گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ ورلڈ اکنامک فورم کا ینگ سٹار سپیکر تھا جو اپنی تقریر سے ایک رات پہلے باپ سے رات کے اس وقت اس طرح کی بے تکی باتیں کر رہا تھا۔

''واہ! کیا بات ہے اسے بھی TAI میں چلا دو۔'' اس نے اسے جوابی ٹیکسٹ کیا اور پھر گڈ نائٹ کا میسج.... کھٹاک سے ایک مسکراہٹ اس کی اسکرین پر ابھری تھی.... دانت نکالتے ہوئے۔

''آئی ایم سیریس....'' سالار فون رکھ دینا چاہتا تھا' لیکن پھر رک گیا۔

''آپشن چاہییے یا ایڈوائس؟'' اس نے اس بار بے حد سنجیدگی سے اسے ٹیکسٹ کیا۔

''مشورہ۔'' جواب اسی تیز رفتاری سے آیا۔

''ٹی وی بند کر کے سو جاؤ۔'' اس نے جواباً'' اسے ٹیکسٹ کیا۔

''بابا! میں صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ رئیسہ اور عنایہ کی شادی سے پہلے میرا شادی کرنا مناسب نہیں' خاص طور پر جب جبریل کی شادی کا فی الحال کوئی امکان نہیں۔''

وہ اس کے اس جملے پر اب کھٹکا تھا.... اس کی باتیں اتنی بے سروپا نہیں تھیں جتنا وہ انہیں سمجھ رہا تھا۔ رات کے اس پہر وہ فلم سے اپنی شادی اور اپنی شادی سے عنایہ اور رئیسہ کی شادی کا ذکر لے کر بیٹھا تھا تو کوئی مسئلہ تھا.... اور مسئلہ کیا تھا' یہ سالار کو ڈھونڈنا تھا۔

''تو؟'' اس نے اگلے ٹیکسٹ میں جیسے کچھ اور اگلوانے کے لیے دانہ ڈالا۔ جواب خاصی دیر بعد آیا.... یعنی وہ اب سوچ سوچ کر ٹیکسٹ کر رہا تھا۔ وہ دونوں باپ بیٹا جیسے شطرنج کی ایک بساط بچھا کر بیٹھ گئے تھے۔

''تو بس پھر ہمیں عنایہ اور رئیسہ کے حوالے سے کچھ سوچنا چاہیے۔'' جواب سوچ سمجھ کر آیا تھا' لیکن مبہم تھا۔

''رئیسہ کے بارے میں یا عنایہ کے بارے میں؟'' سالار نے بڑے کھلے الفاظ میں اس سے پوچھا۔ حمین کو شاید باپ سے اس بے دھڑک سوال کی توقع نہیں تھی' وہ امامہ نہیں تھا جس کو وہ گھما پھرا لیتا تھا' وہ سالار سکندر تھا جو اسی کی طرح

لمحوں میں بات کی تہ تک پہنچ جاتا تھا۔

"رئیسہ کے بارے میں۔" بالآخر اسے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہنا پڑا' سالار کے لیے جواب غیر متوقع نہیں تھا۔ لیکن حیران وہ اس کی ٹائمنگ پر ہوا تھا۔

"تم خود رئیسہ کے لیے بات کر رہے ہو یا رئیسہ نے تمہیں بات کرنے کے لیے کہا ہے؟" سالار کا اگلا ٹیکسٹ پہلے سے بھی ڈائریکٹ تھا۔ حمین کا جواب اور بھی دیر سے آیا۔

"میں خود کر رہا ہوں۔" سالار کو اس کے جواب پر یقین نہیں آیا۔

"رئیسہ کہیں انوالوڈ ہے؟" اس نے اگلا ٹیکسٹ کیا.... جواب ایک بار پھر دیر سے آیا اور یک دم سالار کو احساس ہوا کہ یہ بات چیت دو افراد کے درمیان نہیں ہو رہی تھی.... تین لوگوں کے درمیان ہو رہی تھی.... وہ' حمین اور رئیسہ....

وہ تاخیر جو حمین کی طرف سے جواب آنے پر ہو رہی تھی' وہ اس لیے ہو رہی تھی۔ کیوں کہ وہ سالار کے ساتھ ہونے والے سوال جواب رئیسہ کو بھی بھیج رہا تھا اور پھر اس کی طرف سے آنے والے جوابات اسے فارورڈ کر رہا تھا۔ وہ ان دونوں کی بچپن کی عادت تھی' ایک دوسرے کے لیے ترجمان کا رول ادا کرنا.... اور زیادہ تر یہ رول رئیسہ ہی اس کے لیے کیا کرتی تھی۔

"کوئی اسے پسند کرتا ہے۔" جواب دیر سے آیا تھا لیکن اس کے ڈائریکٹ سوال کے جواب میں بے حد ڈپلومیٹک انداز میں دیا گیا تھا اور یہ حمین کا انداز نہیں تھا۔ یہ رئیسہ کا انداز تھا۔

"کون پسند کرتا ہے....؟ ہشام؟" سالار نے جواباً" بے حد اطمینان سے ٹیکسٹ کیا۔ اسے یقین تھا اس کے اس جوابی سوال نے دونوں بہن بھائی کے پیروں تلے سے کچھ لمحوں کے لیے زمین نکالی ہو گی۔ ان کو یہ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ سالار اتنا "باخبر" ہو سکتا ہے۔

حسب توقع ایک لمبے وقفے کے بعد ایک پورا منہ کھولے ہنستی ہوئی اسمائلی آئی تھی۔

"گڈ شاٹ۔" یہ حمین کا جواب تھا۔

"رئیسہ سے کہو آرام سے سو جائے.... ہشام کے بارے میں آمنے سامنے بیٹھ کر بات ہو گی.... میں اس وقت آرام کرنا چاہتا ہوں اور تم دونوں اب مجھے مزید کوئی ٹیکسٹ نہیں کرو گے۔" سالار نے ایک وائس میسج حمین کو بھیجتے ہوئے فون رکھ دیا۔ وہ جانتا تھا اس کے بعد وہ واقعی بھوتوں کی طرح غائب ہو جائیں گے.... خاص طور پر رئیسہ۔

☆ ☆ ☆

جبریل نیند سے فون کی آواز پر ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ اسے پہلا خیال ہاسپٹل کا آیا تھا لیکن اس کے پاس آنے والی وہ کال ہاسپٹل سے نہیں آئی تھی۔ اس پر نسا کا نام چمک رہا تھا۔ وہ غیر متوقع تھی۔ ایک ہفتہ پہلے اسفند کی تدفین کے دوران اس کی ملاقات نسا سے ایک لمبے عرصے کے بعد ہوئی تھی اور اس کے بعد اس طرح رات کے اس وقت آنے والی کال....

کال ریسیو کرتے ہوئے دوسری طرف سے اس نے جبریل سے معذرت کی تھی کہ وہ رات کے اس وقت اسے ڈسٹرب کر رہی تھی اور پھر بے حد اضطراب کے عالم میں اس نے جبریل سے کہا تھا۔

"تم عائشہ کے لیے کچھ کر سکتے ہو؟"

جبریل کچھ حیران ہوا۔ "عائشہ کے لیے 'کیا؟"

"وہ پولیس کسٹڈی میں ہے۔"

"واٹ؟" وہ ہکا بکا رہ گیا "کیوں؟"

"قتل کے کیس میں۔" وہ دوسری طرف سے کہہ رہی تھی۔

جبریل سکتہ میں رہ گیا۔ "کس کا قتل؟" وہ اب رونے لگی تھی۔

"اسفند کا۔" جبریل کا دماغ گھوم کر رہ گیا۔

وہ یخنی میں ڈوبے ہوئے روٹی کے ٹکڑے' چمچے سے اپنے باپ کو کھلا رہا تھا' اس کا باپ لقمے کو چبانے اور نگلنے میں تقریباً" دو منٹ لے رہا تھا۔ وہ ہر بار صرف اتنی ہی یخنی پیالے میں ڈالتا جس میں ایک ٹکڑا ڈوب جاتا پھر چمچے سے اس

ٹکڑے کو باپ کے منہ میں ڈالنے کے بعد وہ بے حد تحمل سے پیالے میں نیا ٹکڑا ڈالتا جو گرم یخنی میں پھولنے لگتا تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں یخنی اس پیالے میں ڈالتا تو یخنی اب تک ٹھنڈی ہو چکی ہوتی۔ یخنی کا ایک پیالہ پینے میں اس کا باپ تقریباً" ایک گھنٹہ لگاتا تھا۔ ٹھنڈی یخنی میں ڈوبے ہوئے روٹی کے ٹکڑے بھی وہ اسی رغبت سے کھاتا جیسے وہ ان گرم لقموں کو کھا رہا تھا۔

سکندر عثمان کے ذائقے کی حس آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی' گرم اور ٹھنڈی خوراک میں تمیز کرنا وہ کب کا بھول چکے تھے۔ صرف ان کی دیکھ بھال کرنے والے فیملی کے افراد تھے جو اس فرق کو ان کے لیے اب بھی برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ اب بھی خوراک کو ان کے لیے ممکنہ حد تک ذائقہ دار بنا کر دے رہے تھے' یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اس ذائقے سے لطف اندوز ہو سکتے تھے نہ اس ذائقے کو یاد رکھ سکتے تھے۔

باپ کو کھانا کھلانے کے ساتھ ساتھ سالار اور امامہ نے بھی وہیں بیٹھے بیٹھے کھانا کھایا تھا۔ وہ جب بھی یہاں آتا تھا' تینوں وقت کا کھانا باپ کے کمرے میں اسے کھانا کھلاتے ہوئے ہی کھاتا تھا اور اس کی عدم موجودگی میں یہ ہی کام امامہ اور بچے کرتے تھے۔ ان کے گھر کا ڈرائنگ روم ایک عرصہ سے نہ ہونے کے برابر استعمال ہو رہا تھا۔ اس کے ماں باپ کا بیڈ روم اس کی فیملی کے افراد کی بہت ساری سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ یہ اس شخص کو تنہائی سے بچانے کی ایک کوشش تھی جو کئی سالوں سے اس کمرے میں بستر تک محدود تھا اور الزائمر کی آخری اسٹیج میں داخل ہو چکا تھا۔

ٹرالی میں پڑا نیپکن اٹھا کر اس نے سکندر عثمان کے ہونٹوں کے کونے سے نکلنے والی یخنی کے وہ قطرے صاف کیے جو چند لمحے پہلے نمودار ہوئے تھے۔ انہوں نے خالی آنکھوں سے اسے دیکھا جن سے وہ اسے ہمیشہ دیکھتے تھے۔ وہ انہیں کھانا کھلاتے ہوئے جواب کی توقع کے بغیر ان سے بات کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس کے باپ کی خاموشی کے وقفے اب گھنٹوں پر محیط ہونے لگے تھے۔ گھنٹوں کے بعد کوئی لفظ یا جملہ ان کے منہ سے نکلتا تھا جس کا تعلق ان کی زندگی کے کسی سال کی کسی یاد سے ہوتا تھا اور وہ سب اس جملے کو سال کے ساتھ جوڑنے کی کوشش میں لگ جاتے تھے۔

سکندر عثمان کھانا کھاتے ہوئے ہمیشہ یک ٹک اسے دیکھتے تھے۔ اب بھی دیکھ رہے تھے۔ سالار جانتا تھا اس کا باپ جیسے ایک اجنبی کا چہرہ پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان کو کھانا کھلانے کی کوئی احتیاط' کوئی محبت' کوئی لگن ان کی یادداشت میں کہیں محفوظ نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ایک اجنبی کے ہاتھ سے کھانا کھا رہے تھے اور ان کے ختم ہوتے ہوئے دماغی خلیے اس اجنبی کے چہرے کو کوئی نام دینے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔

سالار جانتا تھا اس کے باپ کو اس کے ہاتھ سے کھایا ہوا وہ دوپہر کا کھانا بھی یاد نہیں ہو گا۔ وہ جتنی بار اس کے کمرے میں آتا ہو گا' وہ اپنے باپ کے لیے ایک نیا شخص' ایک نیا چہرہ ہو گا اور صرف وہی نہیں' اس کی فیملی کے باقی سب افراد بھی۔ سکندر عثمان شاید حیران ہوتے ہوں گے کہ ان کے کمرے میں بار بار نئے لوگ کیوں آتے تھے.... وہ اپنے گھر میں "اجنبیوں" کے ساتھ رہ رہے تھے۔

اس نے یخنی کا آخری چمچ اپنے باپ کے منہ میں ڈالا۔ پھر پیالہ ٹرالی میں رکھ دیا۔ اب وہ اپنے باپ کو چمچ سے پانی پلا رہا تھا۔ اس کا باپ لمبا گھونٹ نہیں لے سکتا تھا۔ امامہ کچھ دیر پہلے کمرے سے اٹھ کر گئی تھی۔ اس کا سامان پہلے ہی ایئرپورٹ جا چکا تھا۔ اب باہر ایک گاڑی اس کے انتظار میں کھڑی تھی جو اسے تھوڑی دیر میں ایئرپورٹ لے جاتی۔ اس کا اسٹاف بے صبری سے اس کمرے سے اس کے برآمد ہونے کا منتظر تھا۔

سالار نے گلاس واپس رکھتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ کر اپنے باپ کی گردن کے گرد پھیلا ہوا نیپکن ہٹایا۔ پھر کچھ دیر تک سکندر عثمان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے وہ بیٹھا رہا۔ آہستہ آہستہ اس نے انہیں اپنی روانگی کا بتایا تھا اور اس تشکر و احسان مندی کا بھی جو وہ اپنے باپ کے لیے ہمیشہ محسوس کرتا تھا' خاص طور پر آج.... سکندر عثمان خالی نظروں سے اسے دیکھ اور سن رہے تھے۔ وہ جانتا تھا وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ لیکن یہ ایک رسم تھی جو وہ ہمیشہ ادا کرتا تھا۔ اس نے اپنی بات ختم کرنے کے بعد باپ کے ہاتھ چومے پھر انہیں لٹا کر کمبل اوڑھا دیا' اور کچھ دیر بے مقصد بیڈ کے پاس کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ اس کے بعد پتا نہیں کب وہ اپنے باپ کے پاس آنے کے قابل ہوتا۔ سالار یہ نہیں جانتا تھا وہ آخری کھانا تھا جو اس نے اپنے باپ کے ساتھ کھایا تھا۔

تاش کا ترپ کا پتا پھینکا جانے والا تھا اور "مہلت" ختم ہونے والی تھی۔ (باقی آئندہ ماہ۔ ان شاءاللہ)

تخلیق کار

میرے گھر کی بالکنی میں
تنکوں کے چھوٹے سے گھر میں
پنکھ سمیٹے، آنکھیں میچے
وہ جو چپ چپ سی بیٹھی ہے
اک انجانی کبوتری ہے
وہ شاید بہری ہے
اس نے ریل کی سیٹی سنی نہیں ہے
گھبرا کے وہ اڑی نہیں ہے
وہ شاید اندھی ہے
اسے پتا نہیں ہے
چھاؤں کدھر ہے، دُھوپ کہاں ہے
اس کا جہاں ہے
انڈوں کے چوزے بننے تک
وہ بہری ہے، وہ اندھی ہے
کبوتری ہر ماں جیسی ہے

ندا فاضلی

تو بگڑتا بھی ہے، خاص اپنے ہی انداز کے ساتھ
پھول کھلتے ہیں ترے شعلۂ آواز کے ساتھ

ایک بار اور بھی کیوں عرضِ تمنا نہ کروں
کہ تو انکار بھی کرتا ہے عجب ناز کے ساتھ

لے جو ٹوٹی تو صدا آئی شکستِ دل کی
رگِ جاں کا کوئی رشتہ ہے رگِ ساز کے ساتھ

تو پکارے بھی تو چمک اُٹھتی ہیں میری آنکھیں
تیری صورت بھی ہے شامل تری آواز کے ساتھ

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

احمد ندیم قاسمی

شگفتہ جاہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت جبیر بن مطعمؓ نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"رشتے داروں سے تعلق توڑنے والے اور ان سے بدسلوکی کرنے والے کو جنت کے اندر داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔"

زندگی،

زندگی کب سے ہے اور کب تک ہے کون جانے۔ ازل سے ابد تک۔ ازل سے پہلے اور اس کے بعد بھی زندگی ہے۔ تخلیق سے پہلے یہ خالق کے ارادے میں زندہ تھی۔ اور تکمیل کے بعد یہ خالق کے روبرو حاضر کر دی جائے گی۔ زندگی بہرحال زندگی ہی رہے گی۔

(واصف علی واصف)

عظیم ماں،

تھامس ایڈیسن مشہور عالم سائنس دان جب بچہ تھا، وہ اسکول سے آیا اور ایک سربمہر لفافہ اپنی والدہ کو دیا۔ "استاد نے دیا تھا کہ اپنی ماں کو دے دو۔"

ماں نے کھول کر پڑھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پھر اس نے باآواز بلند پڑھا۔ "تمہارا بیٹا ایک جینئس ہے۔ یہ اسکول اس کے لیے بہت چھوٹا ہے اور اتنے اچھے استاد نہیں کہ اسے پڑھا سکیں۔ سو آپ اسے خود ہی پڑھالیں۔"

سالوں بعد جب تھامس ایڈیسن ایک سائنس دان کے طور پر دنیا بھر میں مشہور ہو گیا تھا اور والدہ وفات پا چکی تھی۔ وہ اپنے خاندان کے پرانے کاغذات میں کچھ ڈھونڈ رہا تھا کہ اسے وہی خط ملا۔ اس پر لکھا تھا۔

"آپ کا بیٹا انتہائی غبی اور ذہنی ناکارہ ہے۔ ہم اسے مزید اسکول میں نہیں رکھ سکتے۔"

اس دن ایڈیسن نے اپنی ڈائری میں لکھا۔
"تھامس ایلوا ایڈیسن ایک ذہنی ناکارہ بچہ تھا۔ پر ایک عظیم ماں نے اسے صدی کا سب سے بڑا سائنس دان بنا دیا۔"

اقصیٰ ناصر۔ کراچی

حکمت،

- احمقوں کی فارغ البالی ان کی ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔ جو شخص گرمی میں جمع کرتا ہے، عقل مند ہے۔ پر جو کٹائی کے وقت سوتا ہے، باعث شرم ہے۔
- سچے ہونٹ ہمیشہ قائم رہیں گے لیکن جھوٹی زبان دم بھر کی ہے۔ صاحب فہم پر ایک جھڑکی احمق پر سو کوڑوں سے زیادہ اثر رکھتی ہے۔ جو بات سننے سے پہلے اس کا جواب دے یہ اس کی حماقت اور خجالت ہے۔ احمق بھی جب تک خاموش ہے عقل مند گنا جاتا ہے۔
- جھگڑے کی شروعات پانی پھوٹ نکلنے کی مانند ہے اس لیے لڑائی سے پہلے جھگڑے کو چھوڑ دو۔
- احمق کی تعظیم کرنے والا گویا پتھر کو جواہر کے ڈھیر میں رکھتا ہے۔
- دشمن سے ہر وقت بچتے رہو مگر دوست سے اس وقت بچو جب وہ تمہاری بے جا تعریف کرنے لگے۔
- انسان کی فطرت اس کے چھوٹے چھوٹے کاموں سے معلوم ہوتی کیونکہ بڑے کام کو وہ باقاعدہ منصوبے سے کرتا ہے۔

گڑیا شاہ۔ کہروڑ پکا

دُہرا فائدہ ،

شبنم نے ندیم سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ تو ندیم نے اپنے محبت نامے واپس مانگ لیے۔

"تم اپنے محبت نامے واپس کیوں لینا چاہتے ہو؟" شبنم نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا تمہیں ڈر ہے کہ میں خطوط کے ذریعے تمہیں بلیک میل کروں گی؟"

"نہیں، مجھے ایسا کوئی خوف نہیں ہے۔ دراصل میں نے محبت نامے ایک معروف ادیب سے بھاری معاوضے پر لکھوائے تھے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ آئندہ بھی میرے کام آتے رہیں۔ کم از کم یہ احساس تو ہو کہ پیسے وصول ہو گئے۔" ندیم نے قدرے ہچکچاہٹ کے بعد جواب دیا۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

قبل مسیح ،

٭ 3,400 قبل مسیح مصر میں جانوروں کی شکل کے برتن بنائے گئے۔

٭ 3,400 قبل مسیح مشرق وسطیٰ میں السی کا پودا کپڑوں کی بنائی میں استعمال ہونے لگا۔ مصری اون استعمال نہیں کرتے تھے۔

٭ 3,300 قبل مسیح مصریوں نے تحریر کا فن دریافت کیا۔ یہ تصویری رسم الخط تھا۔ جو اشیاء، آوازوں اور خیالات پر مبنی تھا۔

٭ 3,000 قبل مسیح سومیروں نے دنیا میں پہلی لائبریری قائم کی جس کے لیے مٹی کی تختیوں پر لکھی گئی کتابیں استعمال کی گئیں۔

(تاریخ کا سفر)

دعائے سحر، انا احسیب۔ فیصل آباد

عورت ،

ایک ہاتھ میں لپ اسٹک
دوسرے میں موبائل
ایک کان ککر کی سیٹی پر
دوسرا واٹس ایپ کی نوٹیفکیشن پر
ایک آنکھ ٹی وی پر
دوسری شوہر کی حرکتوں پر
کون کہتا ہے عورت کی زندگی آسان ہے

دل بھی نگر تھا ،

ہم اتنی دور کہاں تھے کہ پھر پلٹ نہ سکیں
سوادِ شہر سے کوئی صدا نہیں آئی
سنا تھا دل بھی نگر تھا رسا بسا بھی تھا
جلا تو آج بھی اہلِ وفا نہیں آئی

فوزیہ ثمر بٹ۔ گجرات

اسکول جانا ہے ،

ایک خاتون اپنے بیٹے کو بستر سے اٹھا رہی تھیں۔

"اسکول کا وقت ہو گیا ہے۔ جلدی اُٹھو تمہیں اسکول جانا ہے۔"

"ممی میں اسکول نہیں جاؤں گا۔ مجھے اسکول سے سخت نفرت ہے۔ بچے مجھے پسند نہیں کرتے۔ ٹیچرز مجھے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی ہیں بلکہ اسکول کا سارا اسٹاف ہی مجھے ناپسند کرتا ہے۔"

"مگر تمہیں اسکول جانا ہے۔" اس کی ممی نے کہا۔ "تم اب بچے نہیں ہو، چالیس برس کے ہو اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو۔"

ہانیہ عمران۔ گجرات

عہد و پیماں ،

نئی نویلی دُلہن نے شادی کے چند روز بعد اپنے شوہر سے اٹھلا کر پوچھا۔

"سنو جی! کیا واقعی تم مجھ سے بے حد محبت کرتے ہو اور تاعمر اسی طرح مجھ کو چاہتے رہو گے۔ تمہاری محبت میں کبھی کمی نہیں آئے گی۔"

"بے شک ڈیرا"، شوہر نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ مگر پھر اپنا سر کھجاتے ہوئے کہنے لگا۔ "لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ہر لڑکی مجھ سے اسی قسم کے سوالات کیوں کرتی ہے۔"

عذرا ناصر۔ کراچی

اچھی بات،

پریشان ہونے والوں کو کبھی نہ کبھی سکون مل جاتا ہے لیکن پریشان کرنے والے ہمیشہ سکون کی تلاش میں رہتے ہیں۔

ثمینہ اکرم۔ بہار کالونی

حکمت کے موتی،

- عقل مند لوگوں کی غلطیوں سے سبق سیکھتے ہیں جبکہ بے وقوف اپنی غلطیوں سے سبق سیکھتے ہیں۔
- غصہ کرنے کا مطلب ہے، ہم دوسروں کی غلطیوں کا انتقام اپنے آپ سے لیتے ہیں اور یہ کتنی حیرت انگیز اور مضحکہ خیز بات ہے۔ (پوپ الیگزینڈر)
- دوست کمزور ہو جائیں تو دشمن خود بخود طاقت ور ہو جاتے ہیں۔ (واصف علی واصف)
- احتیاط دانشمندی کی سب سے بڑی بیٹی ہے۔ (وکٹر ہوگیو)
- قلت عقل کا اندازہ کثرت کلام سے ہوتا ہے۔ (بو علی سینا)
- تعلیم کا مقصد علم حاصل کرنا نہیں بلکہ علم کی قوت بیدار کرنا ہے۔ (ہربرٹ اسپنسر)
- لوگ اپنی ضروریات پر غور کرتے ہیں، قابلیت پر نہیں۔ (نپولین)
- ضمیر ہمارے اندر کی آواز ہے جو ہمیں متنبہ کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ (مینکن)

صدف عمران۔ کے ڈی اے سوسائٹی

اقوال دانش،

- موجودہ دور میں انسانیت کا خطرناک دشمن انسان ہے۔ (شیکسپیئر)

- صاف گوئی سے نقصان بہت تھوڑا ہوتا ہے مگر فائدہ بہت ہے۔ (لارڈ میکالے)
- اگر تمہیں پرستش کرنے والے اور دل پسند نوکر کی تلاش ہے تو اپنا خادم خود بنو۔ (بنجامن فرینکلن)

ندا طارق۔ فیصل آباد

صدف،

- وکیل ہی وہ لوگ ہیں جنہیں قانون سے لاعلمی کی سزا نہیں ملتی۔ (جرمی)
- کامیابی کا سب سے بڑا راز ہر حالت کے لیے تیار رہنا ہے۔ (ہنری فورڈ)
- کامیابی کا راز تو میں نہیں بتا سکتا لیکن ناکامی کا راز ضرور بتا سکتا ہوں۔ اور وہ ہے ہر کسی کو خوش کرنے کی کوشش۔ (ہربرٹ سوپ)
- بڑھاپا ایک بری عادت کی مانند ہے جس کے لیے مصروف شخص کے پاس وقت نہیں۔ (موریس)

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

ہرمن میلول کہتا ہے،

- دنیا ایک جہاز ہے جو سمندر میں چل رہا ہے اس کا سفر کبھی پورا نہیں ہوتا۔
- دنیا میں جتنے آلات ہیں ان میں انسان سب سے جلدی خراب ہوتا ہے۔
- جتنی چیزیں انسان کو ذلیل کرتی ہیں وہ سب بے جسم ہوتی ہیں۔
- مہذب آدمی بیمار پڑے تو اسے اچھے ہونے میں چھ مہینے لگتے ہیں۔ جنگلی بیمار ہو تو ایک دن میں ٹھیک ہو جاتا ہے۔

ندا، قفضہ۔ فیصل آباد

خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

فرزانہ مغل ——— واہ کینٹ

طوفان کر رہا تھا میرے عزم کا طواف
دنیا سمجھ رہی تھی کشتی بھنور میں ہے

انیقہ انا ——— چکوال

دنیا کو سنبھالیں کہ دل زار کو دیکھیں
ہم نیم نفس کون سے بیمار کو دیکھیں
آنکھوں میں چکا چوند ہے سینے میں اندھیرا
سورج سے نبھائیں کہ شب تار کو دیکھیں

ثمرہ ہاشمی ——— کندیاں

مجھے روکے گا تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں
خموش اے دل! بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

اقرا صادق ——— بہاول پور

میرا سارا شہر ہی بہہ گیا
میرے سارے لوگ ہی اتر گئے

مدیحہ نورین مہک ——— برنالی

جب بھی ہوتی ہے گھر سے وحشت مجھے
در و دیوار پہ تیری تصویر لگا دیتا ہوں

آبرو چوہدری ——— سرگودھا

گزرے پھولوں اور تتلیوں کے سنگ جو ہیں لمحے
یاد آ کے ہمیں اکثر اب تڑپاتے ہیں
خزاں کے پتوں کی طرح بکھر گئی زندگی
اب بہار کے پھول میرا مذاق اڑاتے ہیں

عظمیٰ شفیق ——— جڑانوالہ

بہتر ہے اسے گھر کے کسی طاق میں رکھ دو
ٹوٹا ہوا دل لے کے کہاں جانے لگے ہو
آشوب نظر سے بھی بھڑکتی ہے کبھی آنکھ
تم یہ نہ سمجھنا اسے یاد آنے لگے ہو

نوال افضل گھمن ——— کراچی

کسی مانوس لمحے میں کسی مانوس چہرے سے
محبت کی نہیں جاتی، محبت ہو ہی جاتی ہے

فہمیدہ گل ——— لاڑکانہ

کچھ وقت کی روانی نے ہمیں یوں بدل دیا محسن
وفا پر اب بھی قائم ہیں، محبت چھوڑ دی ہم نے

گڑیا شاہ ——— کہروڑ پکا

عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا، وہ دل نہیں رہا

سلمیٰ سجل شاہ ——— اٹک

ساری عمر ہم یہی بھول کرتے رہے
دھول چہرے پہ تھی اور آئینہ صاف کرتے رہے

چوہدری فرح آبرو ——— گجرات

ہم ہی وفا شکن تھے چلو ہم ہی بے وفا
تم تو وفا شناس تھے، تم کیوں بدل گئے

ملائکہ کوثر ——— بسم اللہ پور

پھر میرے شہر سے گزرا وہ بادل کی طرح
دست گل پھیلا ہوا ہے میرے آنچل کی طرح

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ——— کراچی

وہ حیران ہیں ہمارے ضبط پہ کہہ دو قتیل ان سے
جو دامن پر نہیں گرتا، وہ آنسو دل پہ گرتا ہے

حرا قریشی ——— ملتان

رنگ و بو کی جگہ دھول ہے خاک کی
پھول گلزار سے خار کھاتے رہے
سانس لینے کی فرصت کہاں تھی ادا
یاد آنے کو وہ یاد آتے رہے

امت الصبوح

خواتین کی ڈائری

نمرہ اقراء کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ نظم ان لوگوں کے لیے ہے جن کی صلاحیتیں، ذہانت حالات کی نذر ہوئیں۔

بے دھیانی

میں ٹھنڈے توے کی روٹی ہوں
مجھے بے دھیانی میں ڈالا گیا
مجھے بے دردی سے پلٹا گیا
میرے کتنے ٹکڑے اکھڑ گئے
میں ٹھیک سے سینکی جا نہ سکی
میں کسی چنگیر میں آ نہ سکی
میرا پسنا، گندھنا اور پکنا
بے کار گیا، میں ہار گئی
اک بے دھیانی مجھے مار گئی

انجم کی ڈائری سے

زیست بھی عجیب پہیلی ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ زندگی ہماری سوچ سے نہیں مل پاتی اور کبھی کبھی ہماری سوچ زندگی سے میل نہیں کھاتی۔ میری ڈائری میں تحریر یہ غزل حساس دل لوگوں کے نام۔

یہ جو ننگ تھے، یہ جو نام تھے، مجھے کھا گئے
یہ جو خیال پختہ جو خام تھے، مجھے کھا گئے

کبھی اپنی آنکھ سے زندگی پہ نظر نہ کی
وہی زاویے کہ جو عام تھے، مجھے کھا گئے

وہ جو مجھ میں ایک اکائی تھی وہ نہ جڑ سکی
یہی ریزہ ریزہ جو کام تھے، مجھے کھا گئے

جو کھلی کھلی تھی عداوتیں مجھے راس تھیں
یہ جو زہر خند سلام تھے، مجھے کھا گئے

سیدہ لوبا سجاد کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ نظم اُن سب قارئین کے لیے جو سب میں موجود ہو کر بھی موجود نہیں ہوتے۔

مجھ سے یہ لوگ کہتے ہیں
کہاں دل چھوڑ آئے ہو؟
بہت چپ چاپ رہتے ہو
نہ ہنستے ہو نہ سنورتے ہو
نہ کوئی بات کرتے ہو
ہمیشہ کھوئے رہتے ہو
اُداسی آنکھوں میں لے کر
ہراک چہرے کو تکتے ہو

کوئی جب یاد آتا ہے
ٹھنڈی آہ بھرتے ہو
تو کھل کر کیوں نہیں کہتے
کسی کو یاد کرتے ہو
کہ تم بھی پیار کرتے ہو

ساروی شبیر کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر سلیم کوثر کی یہ غزل آپ سب کی نذر۔

غم زندگی دے راہ میں، شب آرزو تیری چاہ میں
جو اُجڑ گیا وہ بسا نہیں جو بچھڑ گیا وہ ملا نہیں

جو دل و نظر کا سرور تھا مرے پاس رہ کر بھی دور تھا
وہ اک گلاب امید کا میری شاخ جاں پہ کھلا نہیں

میرا ہمسفر جو عجیب ہے، تو عجیب تر ہوں میں بھی
مجھے منزلوں کی خبر نہیں، اسے راستوں کا پتا نہیں

بس اک کاروانِ سرِ راہ گزر، میں ہارا ہوں تو اس لیے
کہ قدم تو سب سے ملا لیے، میرا دل کسی سے ملا نہیں

سیدہ نیست زہرا کی ڈائری سے

محبتوں کے شاعر ساحر لدھیانوی اپنی نظم "خوبصورت موڑ" میں تعلق توڑنے اور اجنبی بن جانے پر زور دے رہے ہیں لیکن کیا ایسا ہوتا ہے کہ کہہ دینے سے کوئی ہم سے دور، دل کا اجنبی بن جائے۔ ممکن تو نہیں، ہوتا کسی کو بھولنا۔ ساحر لدھیانوی نے کتنے زبردست اچھوتے انداز میں بیان کیا۔ پڑھیے اور محسوس کیجیے۔

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں
نہ میں تم سے کوئی امید رکھوں دل نوازی کی
نہ تم میری طرف دیکھو غلط انداز نظروں سے
نہ میرے دل کی دھڑکن لڑکھڑائے میری باتوں سے

نہ ظاہر ہو تمہاری کشمکش کا راز نظروں سے
چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں
تمہیں بھی کوئی الجھن روکتی ہے پیش قدمی سے
مجھے بھی لوگ کہتے ہیں کہ یہ جلوے پرائے ہیں
میرے ہمراہ بھی رسوائیاں ہیں میرے ماضی کی
تمہارے ساتھ بھی گزری ہوئی راتوں کے سائے ہیں
چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں
تعارف روگ بن جائے تو اس کا بھولنا بہتر

تعلق بوجھ بن جائے تو اس کو توڑنا اچھا
وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن
اسے اک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا
چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں۔

آپ ہماری دیرینہ قاری ہیں۔۔۔۔۔ پچھلے ماہ آپ کا ایک خط موصول ہوا تھا' مگر بہت تاخیر سے۔ اسی لیے رسالے میں جگہ نہ بنا سکا ویسے ہم نے اسے پڑھ لیا تھا۔ اتنے عرصے' سے ہمارا پرچا پڑھتی ہیں' مگر تبصرہ صرف دو ناولوں پر کیا ہے' امید ہے آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ آئیں گی۔ پروردگار سے دعا ہے کہ آپ کے شوہر کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین۔

فریال آرائیں۔۔۔۔ جام پور' ڈیرہ غازی خان

22 اپریل کو اپنے والدین کے ہمراہ عمرہ کی سعادت حاصل کرنے گئی۔ خیر تو جب جا رہی تھی خیال آیا کہ 12 مئی کو واپسی ہے۔ میرے پیارے رسالے ختم نہ ہو جائیں۔ سوچا جس ڈھابے والے سے لیتی ہوں اس کو ایڈوانس جمع کرواتی جاؤں پھر سوچا ابھی تو پائی پائی کی ضرورت ہے۔ اللہ مالک ہے جب واپس آؤں گی تو اللہ کرے بچے ہوئے ہوں تو جب 12 مئی کی صبح ہم لوگ پاکستان آگئے تو سب سے ملنے کی خوشی اپنی جگہ' رسالوں کا خیال اپنی جگہ۔ بلکہ ایک دوبار مدینہ میں بھی خیال آیا' جب جام پور کا مشہور ٹریفک چوک آیا۔ میری نظر اٹھی تو بس اٹھی رہ گئی۔ سامنے ہی دشمن جاں لٹک رہے تھے۔ "انا" فانا" گاڑی رکوائی۔ وہ تو شکر ہے ایک سسٹر' ایک ماموں اور تھے۔ میری ٹھوڑی تک سہرے تھے پھولوں کے۔ ہمارے ہاں رواج ہے پھولوں والے سہرے پہنانے کا جب کوئی حج یا عمرہ کرکے آئے۔ گاڑی رکوائی۔ اپنے پیارے رسالے لیے۔ ان کو بیگ میں رکھا تاکہ کوئی دیکھنے کے لیے بھی نہ لے۔

ج۔ پیاری فریال! عمرہ کی مبارک باد اور خواتین ڈائجسٹ سے اتنی محبت کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ بلاشبہ یہ آپ کی محبت ہے جو ہمیں خواتین کو مزید بہتر بنانے کا حوصلہ دیتی ہے۔

مدیحہ نوید۔۔۔۔ اختر کالونی' کراچی

خواتین کے ٹائٹل بہت اچھے ہوتے ہیں اور سلسلے وار ناولز تو سب ہی بیسٹ ہیں' مگر مجھے لگتا ہے آپ کی ساری توجہ اب سلسلے وار ناولز پر ہی رہ گئی ہے۔ افسانے تو چلو ایک آدھ بہتر نکل ہی آتا ہے' مگر مکمل ناولز' ناولٹ تو بالکل بورنگ ہوتے ہیں۔ سائرہ رضا مجھے بہت پسند ہیں' مگر ہر ماہ

نادیہ جہانگیر

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ' 37- اردو بازار' کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

مسرت اسلم۔۔۔۔ لاہور

جب خواتین آیا تھا تب سے پڑھتی ہوں' مطالعہ ہم سب بہن بھائیوں کو وراثت میں ملا ہے جب تک کچھ پڑھ نہ لیں' سوتے نہیں ہیں۔ خواتین سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے' جب جب کسی معاملے میں پریشان ہوئی خواتین نے میری رہنمائی کی۔ آسیہ رزاقی' رضیہ بٹ' رفعت سراج اور اب عمیرہ احمد زبردست لکھنے والی ہیں۔ ان کے قلم میں بہت زور ہے۔ آب حیات بہترین ناول ہے اور نمل' نمرہ احمد کا ایک مکمل دین کی راہ دکھانے والا ہے۔ نمرہ احمد بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ عمیرہ احمد کا پیر کامل بھی پڑھا ہے۔ یہ میں نے اپنی بچیوں کو بھی پڑھوایا۔ خواتین میں کرن کرن روشنی میں سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔ میرے شوہر کو فالج ہوا ہے آپ لوگوں سے درخواست ہے کہ دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔

ج۔ محترمہ مسرت اسلم! یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ

نہیں۔ عائشہ ناز نیا نام تھا میں نے تو پہلی بار ہی پڑھا ہے، مگر رخ مریم اور تیمور کے بوئے ہوئے بیج سے خوب خوش ہوئے۔ صدف آصف کبھی بہت اچھا تو کبھی مناسب لکھتی ہیں، مگر آؤٹ اسٹینڈنگ نہیں جیسا کہ حیا بخاری ہیں، افسانہ لکھیں یا ناول ان کی تحریر ہر طرح سے مکمل ہوتی ہے کہیں ادھورا پن محسوس نہیں ہوتا۔ آب حیات میں بہت لمبی چھلانگ لگائی ہے نئی نسل پورا تو اناور خت بن گئی ہے۔ مجھے تو ابھی سے تیسرے حصے کا انتظار ہے۔ نمرہ جی کی ایکشن اسٹوری بھی عروج پر ہے جس میں سعدی کی ہیروئن کا انتظار ہے۔ افسانوں میں صباحت یاسمین نے عورت کو خوب خراج تحسین پیش کیا بہت مزہ آیا پڑھ کر۔ حاجرہ ریحان کے افسانے کا ٹاپک بہت اچھا تھا۔ انداز تحریر بھی اچھا تھا، مگر آخری لائن میں کہ میں آصف کے ساتھ زیادہ محفوظ ہوں عجیب سی لگی۔ یہاں حفاظت کی نہیں دیکھ بھال کی ہیکیئر کی بات ہونی چاہیے تھی۔ بنت سحر مجھے پسند ہیں مگر املی اچھا نہیں لگا۔

ج - پیاری ملیحہ! آپ خاطر جمع رکھیں۔ ہم شیطان کی باتوں میں آنے والے نہیں۔ ویسے آپ کا خط ہم سمجھ نہ سکے۔ آپ نے افسانوں کی تعریف کی ہے اور ناول کی بھی اور ساتھ یہ شکوہ بھی کہ ہم صرف سلسلہ وار ناولوں پر توجہ دیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہماری مصنفین اب زیادہ تر طویل تحریریں لکھ رہی ہیں اور مکمل ناول اور ناولٹ کی کمی ہمیں بھی محسوس ہوتی ہے، لیکن یہ غلط ہے کہ ہم صرف سلسلہ وار ناول پر توجہ دیتے ہیں۔

فہمیدہ گل..... لاڑکانہ

مجموعی طور پر خواتین ڈائجسٹ ایک شاہکار ہے، ہماری محبت اور دلچسپی کا گراف جو پہلے ہی بلند تھا مزید بڑھ گیا ہے۔ نمرہ احمد کی نمل جس طرح لکھی گئی ہے، اس طرح کسی نے نہیں لکھا۔ یہ صرف پیار میں گھریلو سیاست پر نہیں ہے۔ نمرہ جی فارس اور زمر میں تھوڑا رومانس دکھایے، بہار کی دستک، زندگی اک کہانی اور کبھی عشق ہو تو بہت اچھی لگیں۔

ج - پیاری فہمیدہ! مصروفیت کے باوجود آپ نے وقت نکال کر ہمیں خط لکھا، بہت شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

سدرہ فاروق، عظمیٰ فاروق..... ضلع رحیم یار خان

نمل بہت لمبا ہوتا جارہا ہے۔ حالانکہ اس کی وجہ سے رسالہ لیتی ہوں۔ آب حیات بھی بہت اچھا جارہا ہے۔ مختصر سا تعارف، میرے تعلق رحیم یار خان کی تحصیل لیاقت پور کے ایک گاؤں سے ہے۔ گاؤں میں ایک لڑکیوں کا ہائی اور لڑکوں کا پرائمری اسکول ہے یہاں کے لوگ بہت ملنسار اور محنتی ہیں۔ لیاقت پور کو دنیا کی سب سے بڑی گڑ کی منڈی کہتے ہیں۔

ج - پیاری سدرہ! نمل اب اختتامی مراحل میں ہے۔ آپ کے گاؤں کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی۔

حیاء شہابی..... کنری پاک سندھ

سب سے پہلے تو میں تعریفی کلمات لکھوں گی عمیرہ احمد کے لیے جن کی وجہ سے مجھ میں قلم اٹھانے کا شوق پیدا ہوا۔ اف ف ف..... کہانی کا نام ہی اتنا اچھا اور کہانی اس سے بھی کہیں زیادہ اچھی لگی۔ مزا آگیا پڑھتے ہوئے اور رہی بات نمرہ جی کی اسٹوری کمال کی تو اس ناول نے تو دھوم مچادی ہر جگہ بس جب پڑھنے لگیں تو بنا سانس روکے ہی پڑھتے چلے گئے۔ آمنہ ریاض کا دشت جنون کافی اچھا ناول ہے سب کہانیاں پڑھ کر میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں ہر ماہ آپ کو کمنٹس دوں لیکن ہمارا چھوٹا شہر ہے۔ یہاں ایک ہی دکان پہ ڈائجسٹ آتے ہیں اور وہ بھی پانچ تاریخ کے بعد ہی آتے ہیں اس لیے اگر میں ڈائجسٹ پورا پڑھ کر خط لکھ کر ارسال کروں تو وہ شائع نہیں ہو پاتے اس لیے نہیں بھجواتی۔

ج - پیاری حیا! آپ اور باقی قارئین جو تبصرہ لکھنا چاہیں۔ دل کھول کر ضرور لکھیں اور ہمیں بھیج دیں۔ اس سے ہمیں آپ لوگوں کی پسند ناپسند کا اندازہ ہوتا ہے۔ خط کی اشاعت میں تو بہت ساری باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے، مگر پرچے کو آپ لوگوں کے ذوق کے مطابق ترتیب دینے میں آپ کی آرا اور فرمائشوں کا خصوصی خیال رکھا جاتا ہے۔

ہاجرہ عمران خان..... لاہور

جن ہاتھوں میں تاریکی دور کرنے کے لیے چراغ ہیں، وہ ہاتھ بے حد قیمتی ہیں۔ ان ہاتھوں میں آپ کے ہاتھ بھی ہیں۔ یہ ہاتھ سلامت رہیں تاقیامت رہیں۔

میں اپنا تبصرہ حیا بخاری کی تحریر "چاند ہم نوا ہوا" سے شروع کروں گی۔ جس کی گل پرو بے حد معصوم نازک اور بے ضرر سی لگی۔ عطیہ خالد کی "آس" نے یہ احساس دلایا کہ شوہر بیوی کی محبت لازوال ہوتی ہے۔ فریدہ فرید کا "فیصلہ" کے عمرایاز نے "مس ٹاپ آف آل" کو کچھ زیادہ ہی باتیں سنادیں۔ آخری جملہ نے تو ہلا کر رکھ دیا "عورت جسمانی لحاظ سے آزاد ہو سکتی ہے مگر اپنی فطرت کے باعث ذہنی طور پر بھی بلند پرواز نہیں ہو سکتی"اف! یہ سلگانے والا جملہ..... عورت کو ذہنی طور پر پسماندہ کہنا' کم پرواز سمجھنا' اس کی ترویج نہیں ہونی چاہیے۔ بنت سحر کی "املی" سچ میں کھٹی میٹھی لگی۔ صدف آصف کی "تماشا" کبھی عشق ہو تو "میں نڈر اور باحوصلہ" انا اور عزت نفس کی محافظ لگی۔ ویسے اس بار پورا ڈائجسٹ ہی معصوم' پریوں جیسی ہیروئنوں پر مشتمل تھا کہ بے ساختہ ان پر پیار آتا رہا۔ نمرہ احمد کے کیا ہی کہنے اس بار تو ہمیں بھی "نمل" کے کرداروں کی طرح "عالم تنویم" میں ہی رکھا.....

صباحت یاسمین کا "اف یہ عورتیں" انتہائی خوب صورت سوچ کا عکاس ٹھہرا خاص کر کے یہ جملہ اف یہ عورتیں بھی نا..... چاہت سے نکھرتی ہیں' چاہت سے جیتی ہیں' عمر بھر چاہت کے لیے مرتی رہتی ہیں اور چاہت ملے تو جی اٹھتی ہیں "ہارٹ آف دی اسٹوری تھا۔

"آکاس بیل" شازیہ الطاف کی اچھی کاوش رہی۔ ہاجرہ ریحان کا افسانہ "محفوظ" میں آصف کا کردار متاثر کن رہا۔ مختصر پیرائے میں بڑی نصیحت..... اچھی کاوش رہی۔ عمیرہ احمد خوب صورتی سے آب حیات کا جام اپنے قارئین کو پیش کر رہی ہیں۔ کیری آن عمیرہ' ویل ڈن گڈ جاب۔ نیوز اینکر محمد جنید سے ملاقات امپریسو رہی۔ باقی سارے سلسلے بھی دلچسپ اور حسب معمول معلوماتی تھے۔

ج ۔ پیاری ہاجرہ! صفحات محدود ہونے کے باعث آپ کا طویل تبصرہ شائع نہ کر سکے لیکن ہم نے پوری توجہ اور غور سے آپ کا ایک ایک لفظ پڑھا ہے۔

آپ نے خط کا آغاز دعا سے کیا' اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمارے قارئین کو بھی سلامت رکھے۔ ہماری کامیابی میں درحقیقت آپ سب شامل ہیں۔

لبنیٰ زبیر' اقراء نوید' انساء رشید..... منڈی بہاؤالدین

نمرہ احمد کا ناول "نمل" ہمارا موسٹ فیورٹ ناول ہے۔ خواتین ڈائجسٹ کی جان ہے یہ ناول۔ آب حیات بھی بہت اچھا ناول ہے۔ بنت سحر' حیا بخاری' عطیہ خالد' ہاجرہ ریحان کے افسانے بھی بہت اچھے تھے۔ آپی ہمارے ماحول میں رسالوں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ بہت باتیں سننا پڑتی ہیں اس کے باوجود بھی ہم پڑھتے ہیں۔ سرفراز احمد اور عاطف اسلم کا انٹرویو بھی ضرور شامل کریں۔ ہمارے کزنز قدیر' عتیق' نوید اور زبیر کہتے ہیں خط پوسٹ تب کریں گے جب ہمارا اسلام لکھا جائے گا سوان کی طرف سے ڈھیر سارا سلام۔

ج ۔ لبنیٰ' اقراء' انساء! بے حد خوشی ہوئی آپ نے ہمیں یاد کیا ہمیں احساس ہے کہ آپ لوگوں کو پرچا حاصل کرنے اور پھر تبصرہ لکھ کر ہمیں بھجوانے کے لیے کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آپ کے کزنز کو ہماری طرف سے وعلیکم السلام۔

ثانیہ مشعل اشرف..... حویلی لکھا' تحصیل دیپال پور' اوکاڑہ

سرورق مجھے اس پیڈسٹل فین کی طرح لگ رہا ہے جس کا "مکھڑا" عین میری طرف ہے۔ جی ہاں! ٹھنڈا ٹھار' گل بہار۔ "دشت جنوں" کو نہ پا کر مایوسی ہوئی۔ نمرہ احمد! اشعار کی کمی بے حد محسوس ہوتی ہے۔ "آکاس بیل" پڑھا۔ میرے اللہ..... ایسی چلتر عورتیں ہی گھر ویران کردیتی ہیں۔ "املی" بڑا چھا لگا۔ زبردست بنت سحر جی! عائشہ ناز علی نے بے حد اچھا پیغام دیا ہے۔ "محفوظ" مس مریم نے اچھا فیصلہ کیا۔ خطوط بھی خوب رہے۔ حیا بخاری نے ثمینہ اکرم کے بارے میں تو جیسے میرے دل کی بات ہی کہہ ڈالی۔ "بہار کی دستک" مسکراتی آنکھوں اور لبوں کے ساتھ پڑھا تھا۔ آسیہ رزاقی میری پسندیدہ ترین مصنفین کی فہرست میں شامل ہیں۔

ج ۔ ثانیہ! جامع تبصرہ کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ تندور کی گھی والی روٹی ور پیاز ہری مرچ کی چٹنی کی دعوت کھانے ضرور آئیں گے۔ آپ تیار کر کے رکھیے گا۔

سنبل ملک اعوان..... وند الہ دیال شاہ

آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے صائمہ اکرم چوہدری کا انٹرویو دیا۔ پر صائمہ نے اپنی تصویر شادی والی دی ہے۔ تازہ

نہیں مطلب۔ 5 سال پرانی تصویر۔ آب حیات' بہت زبردست' بہت عمدہ ہے۔ اریک کا کردار بھی بہت اچھا ہے۔ اریک کا قرآن مجید کو پڑھنا اور سیکھنا' پھر اس پر عنایہ کے رشتے کے لیے بات کرنا۔ سالار کا بڑے ہی اچھے طریقے سے سمجھانا۔ بہت اچھے جملے استعمال کیے ہیں۔ اس کے بعد دوسرا بڑا ناول 'نمل' نمرہ جی کا جو کہ خواتین ڈائجسٹ کی جان ہے کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس میں جملوں کے استعمال سے لے کر پس منظر' کردار سازی' ہر چیز اعلا سے اعلا ہے۔ اور اس خوب صورت مصنفہ کو بھی انٹرویو میں شامل کریں جیسے آپ نے صائمہ اکرم چوہدری کا ناول چھپنے کے بعد انٹرویو کیا۔ ویسے ہی آپ عمیرہ اور نمرہ کا بھی انٹرویو کریں۔ آپ کو نہیں پتا کہ میں کس قدر خوار ہو کر یہ رسالے لیتی ہوں۔ میں کوئی تین' تین چکر لگاتی ہوں بک شاپ کے پھر کہیں جاکر مجھے رسالے دیکھنا نصیب ہوتے ہیں۔

ج ۔ پیاری سنبل! ہمیں احساس ہے کہ بہت سی دور دراز جگہوں اور گاؤں دیہات میں پرچا بہت تاخیر سے پہنچتا ہے اور ہماری قارئین کو پرچا حاصل کرنے میں بہت پریشانی ہوتی ہے۔ ہم غور کررہے ہیں کہ کوئی ایسی صورت ہو کہ آپ سب آسانی سے پرچا حاصل کرسکیں۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ صائمہ جی کی تصویر پانچ سال پرانی ضرور ہے لیکن پانچ سال اتنی طویل مدت بھی نہیں کہ انسان تبدیل ہوجائے۔ آپ ان کی تصویر کو تازہ ہی سمجھیں۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عائشہ بٹ..... لاہور

شمارہ ہاتھ میں آتے ہی پہلی ہی جست میں نمل پر پہنچتی ہوں۔ نمرہ جی بہت اعلا بہت عمدہ! زمر اور فارس کی کیمسٹری کمال کی ہے۔ سسپنس سے بھرپور وحشت جنوں بھی نہایت عمدگی سے چل رہا ہے۔ ناولٹ افسانے بھی سب اچھے ہوتے ہیں۔ بٹ ہو کر عفت سحر طاہر کے بٹ ہاؤس کو بھول جاؤں؟ کہاں لکھا ہے بھئی۔ عفت جی آپ کا بٹ ہاؤس ہمارے بٹ ہاؤس میں بہت پسند کیا جاتا ہے۔ میرا بھائی سیف 'ڈائجسٹ' نہیں پڑھتا مگر ہر مہینے عفت جی کے بٹ ہاؤس کا ضرور پوچھتا ہے۔ (آیا عفت جی نے حاضری دی ہے یا نہیں) پلیز نمرہ احمد اور ہماری پیاری آپا شاہین رشید کا تفصیلی انٹرویو شائع کریں۔

ج ۔ پیاری عائشہ! آپ کی فرمائش سر آنکھوں پر..... نمرہ احمد اور شاہین رشید نے انٹرویو دیا تو ضرور شامل کریں گے۔

بٹ ہاؤس تو ہمیں بھی بے حد پسند ہے۔ کئی بار عفت سے فرمائش کرچکے ہیں۔ وعدہ تو کئی بار کیا ہے انہوں نے..... مگر مسئلہ فرصت نہ ملنے کا ہے۔ آج کل وہ شعاع میں ناول لکھ رہی ہیں۔

حرا..... وہاڑی

میں' میری بڑی سسٹرز اور میری بھانجیاں رسالے بہت شوق سے پڑھتی ہیں لیکن خواتین ڈائجسٹ کا باقاعدہ قاری "نمل" نے بنایا۔ نمرہ آپی اس ناول کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ میرے بھائی بھی نمل کو باقاعدگی سے ہر ماہ پڑھتے ہیں اور نہ صرف رسالہ لاکر دیتے ہیں بلکہ میرے ساتھ تبصرہ بھی کرتے ہیں۔ آب حیات' بہت ہی اچھی کہانی ہے۔ وحشت جنون انٹرسٹنگ اسٹوری ہے۔

ج ۔ پیاری حرا! یہ جان کر اچھا لگا کہ آپ کے گھر میں سب لوگ خواتین ڈائجسٹ شوق سے پڑھتے ہیں اور بھائی بھی جو نہ صرف پڑھتے ہیں بلکہ آپ کو لاکر بھی دیتے ہیں۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔

سانحہ ارتحال

خواتین ڈائجسٹ کی مدیرہ خصوصی امت الصبور کی ہمشیرہ اسما شعیب اس دارفانی سے رحلت فرماگئیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ادارہ خواتین ڈائجسٹ امت الصبور کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحومہ کی خطاؤں کو درگزر کرکے اپنی جوارِ رحمت میں جگہ اور اہل خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

سلمیٰ راشد ۔۔۔ ڈی ایچ اے کراچی

ناول‘ افسانے اب پہلے جیسے دلچسپی سے بھرپور نہیں ہوتے لیکن اتنے برے بھی نہیں ہوتے کہ پڑھنا چھوڑ دیں۔ عمیرہ احمد کو تو میں پڑھے بنا رہ نہیں سکتی۔ نمرہ احمد مجھے بے حد پسند ہیں ان کی جنت کے پتے تو کیا ہی کہنے مگر نمل بھی کسی سے کم نہیں مگر مدیرہ جی ذرا اس بات پر توجہ دیں کہ ان کی تحریر میں ایک مخصوص مکتبہ فکر کی چمک صاف محسوس ہونے لگی ہے۔ صدف آصف بہت واضح سیدھا سادا لکھتی ہیں بنت سحر کی املی کی عریفوں پر مشتمل تحریر بھی اچھی تھی۔ صباحت یاسمین نے مزے کا لکھا۔ ہاجرہ ریحان بھی مقبول رہیں مگر آکاس بیل نے دل بوجھل کردیا۔ خدارا افسانوی دنیا کو حقیقت کا تلخ جام نہ پلائیں۔

فیصلہ ”انتہائی میچور جان دار اور سبق آموز تحریر تھی۔ وقفے سے لکھتی ہیں۔ مگر جاندار لکھتی ہیں عمرایاز کی باتوں نے خوب شعور دیا۔

ج ۔ پیاری سلمیٰ! آپ کی تنقید اور تعریف اچھی لگی۔ ہمیں احساس ہے کہ ہماری مصنفین کی تحریروں میں نصیحت و تبلیغ کا رجحان بڑھتا جارہا ہے اور کوئی بھی چیز جو حد سے بڑھ جائے اپنا اثر کھودیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کچھ ہلکی پھلکی کہانیاں بھی شامل کرتے ہیں۔ نمرہ احمد ہوں یا کوئی اور مصنفہ ہم کسی بھی مکتبہ فکر کی نمائندگی نہیں کرتے ہم صرف کتاب اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر یقین رکھتے ہیں۔ اور ہمارے ہاں اسی کے مطابق تحریریں شامل ہوتی ہیں۔

تجزیہ نگار ۔۔۔ شجاع آباد روڈ ملتان

میری پیاری لکھاریوں‘ لاج دلاریوں سب کچھ لکھو بس بے مقصد نہ لکھو۔ اس سال کا بہترین ”ناول“ عہد الست تنزیلہ ریاض صاحبہ کا ہی رہے گا۔ پیاری نمرہ احمد آپ مجھے یہ بتائیے کہ یہ کورٹ کچہری اک عام قاری کو کس طرح متاثر کرے گی؟ عمیرہ احمد کیا آپ ہائی ایلیٹ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اتنے بھاری بھرکم الفاظ کہاں سے لاتی ہیں۔ کہانی اچھی ہے۔ طول دینے کے چکر میں ساس بھی کبھی بہو تھی بن نہ جائے۔ ”املی“ کہانی اچھی تھی ہم تو اچھل اچھل کر لیٹ لیٹ کر بھی کوئی نیکی کریں کسی کو بھی نظر نہیں آتی۔ بہرحال افسانہ اچھا تھا۔ اف یہ عورتیں (صباحت یاسمین) اتنے معصوم مرد نہیں ہوتے جتنا اس میں دکھائے گئے ہیں۔ افسانہ پڑھ کر نہ خوشی ہورہی ہے نا غم۔ ”محفوظ“ ہاجرہ ریحان۔ اس کہانی میں کیا لکھوں اگر کوئی تبصرہ نہ کروں تو برا نہ مانیے گا۔ چھوٹی بچی نے پہلی دفعہ چائے بنائی ہے تو کیا ہوا اگر دودھ زیادہ ڈل گیا۔ پتی اسٹرونگ ہوگئی۔ ہماری بچی ہے آخر کسی کو کیا اس سے۔ زندگی ایک کہانی۔ عائشہ ناز علی‘ ہیروئنوں نے دوپٹوں میں اچھل کر یا لہنگوں میں الجھ کر ضرور گرنا ہوتا ہے اور ٹام کروز سامنے سے آجاتے ہیں۔ انا جی کا کریکٹر مضبوط تھا۔ ڈائیلاگ تھے اور ”بس ایک کہانی ہی تھی“ جو لکھاری نے اپنی وسعت کے مطابق کھینچی اور خوب کھینچی۔ بھائی بڑی ہی اچھی کہانی ہے۔

اکاس بیل شازیہ الطاف ہاشمی۔ ٹریجڈی نہ لکھیں تو بہتر ہے۔ زندگی میں پہلے ہی لوگ مہنگائی اور غربت کے ہاتھوں مر رہے ہیں۔ یہ ناول ٹی وی والوں کے لیے بہت اچھے ہیں سارے تھیم خواتین ڈائجسٹ سے اٹھائے جاتے ہیں اور لکھاری کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہیں بس معصوم سا خواتین ڈائجسٹ جہاں تھا وہیں ہے۔ خدا کے لیے اچھا لکھیں‘ پوزیٹو لکھیں ”امید“ لکھیں ناامیدی مت لکھیں۔ کبھی عشق ہو تو (صدف آصف) پلکیں خم دار نہ ہوں تو کیا ہوجانا تھا۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ اپنی ساری پلکیں نوچ لوں۔ فضول کہانی‘ ولید کے فضول ایکشن ہیروئن کی غیر فطری زندگی کسی کو کیا متاثر کرے گی۔ عام قاری کے لیے بے انتہا کشش ہے اس میں۔ ”دمکمل“ زمر کا لٹوں کو ہاتھ سے گھمانا۔ گھنگریالے بال اب ٹوئسٹ ڈال دیا کہ وہ ماں بننے کے عمل سے گزر جائے گی۔ ”جنت کے پتے“ کے بعد قاری کی امیدیں بہت بڑھ گئی تھیں جو اس ناول میں پوری نہ ہو سکیں۔ کرن کرن روشنی میں بتادیتے کہ مجبور کی جانے والی عورت جو مجبوری سے یہ پیشہ اپناتی ہو کسی کے مجبور کرنے پر کرتی ہو اس کی معافی ہے۔ ”آپ کا باورچی خانہ“ چونکہ پھوہڑپن ہے۔ کچھ آتا تو نہیں‘ لیکن جب جاتی ہوں تو کچھ کرکے نکلتی ہوں۔

ج۔ پیاری تجزیہ نگار! اتنا اچھا پوسٹ مارٹم کرنے کے بعد کم سے کم اپنا نام تو لکھ دیتیں‘ ہمیں بھی پتا چلتا کہ کوفت میں مبتلا ہو کر بھی ہمارا پرچہ اتنی توجہ سے پڑھنے والی کا نام کیا ہے اور ہاں خواہ مخواہ اپنی پلکیں نہ نوچیں‘ آج کل تو بازار

میں ہر چیز ملتی ہے۔ خرید کر لگائیں۔ محمود ریاض صاحب انشاجی کے بڑے بھائی ہیں۔ انشاجی کی تحریر پر تبصرہ بہت خوب!

ثمل کے بارے میں آپ کی معلومات میں اضافہ کردیں کہ خواتین کی قارئین ثمل کو بے حد پسند کررہی ہیں اب "عام" قاری کے بارے میں ہمیں نہیں پتا وہ کون ہیں اور ثمل سے متاثر نہیں ہوں گے اور عمیرہ احمد نے تو بھی بھاری بھرکم الفاظ استعمال کیے ہی نہیں' وہ بہت سادہ اور رواں انداز میں لکھتی ہیں ان کی کہانیوں میں "بھاری بھرکم الفاظ" ہمیں حیرت ہورہی ہے۔

اللہ کا بڑا کرم ہے کہ "معصوم" سے خواتین ڈائجسٹ کو اللہ نے بڑی عزت سے نوازرکھا ہے' یہ وہیں کا وہیں نہیں ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی مقبولیت بھی بڑھتی رہی ہے۔

عائشہ صدیقہ...چیچہ وطنی گگوشالہ

میری نمرہ احمد سے ایک درخواست ہے اگر آپ ان تک پہنچادیں کہ پلیز نمرہ احمد جی آپ "جنت کے پتے" کا پارٹ ٹو لکھیں جس میں بتائیں کہ حیا اپنی بیٹی کی تربیت کس طرح سے اسلامی ویلیوز کے مطابق کرتی ہے کہ اس کی بیٹی وہ تمام ویلیوز کو اپنے اوپر بوجھ سمجھنے کے بجائے اسے دل سے قبول کرتی ہے۔

ج۔ عائشہ! آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں۔ اس لیے رائے دینے سے قاصر ہیں۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ نمرہ احمد تک آپ کی فرمائش ان سطور کے ذریعے پہنچارہے ہیں۔

شبانہ نسیم...گوجرہ

مجھے بچپن سے ہی مطالعے کا بے حد شوق ہے' اب ماشاء اللہ سے چھبیس اپریل کو میں نے اپنی شادی کی چھبیسویں سالگرہ منائی ہے' لیکن جنون اب بھی ویسا ہی ہے۔ آپ کے ادارے کی قابل تحسین بات یہ ہے کہ آپ نئے لکھنے والوں کی بے حد حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ میرے دل میں بھی بہت سی جگ بیتیاں' آپ بیتیاں' افسانے' کہانیاں ہیں' لیکن لکھنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ میں ایم اے انگلش ہوں اور پڑھی لکھی فیملی سے تعلق ہے۔ اور مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں قانتہ رابعہ جیسی اعلا پائے کی لکھنے والی مصنفہ کے شہر گوجرہ سے ہوں۔

ج۔ شبانہ! آپ اتنے طویل عرصہ سے ہمارے ساتھ ہیں اور آپ کو مطالعہ کا شوق بھی ہے۔ لکھنا چاہتی ہیں تو پوچھنے کی ضرورت نہیں' ہم نئے لکھنے والوں کی پوری حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

مسرت شاہین...پنجوڑہ' آزاد کشمیر

پندرہ' سولہ سال سے خاموش قاری ہوں۔ ثمل بہت اچھا ہے۔ آب حیات کی تو کیا بات ہے۔ آج میں سمیرا حمید کے "بورشے" کی وجہ سے لکھ رہی ہوں۔ سچ کیا عمدہ لکھا ہے سمیرا نے۔ ان کی تحریریں بہت زبردست ہوتی ہیں۔ زندگی بہت اندھیری تھی تو بورشے پڑھا۔ یوں لگا ایک دم سے روشنیاں بھرگئی ہوں۔ ان کے لفظوں نے مجھے زندہ کردیا۔ "محبت میں التجا نہیں کرنی چاہیے اہتمام کرنا چاہیے۔ التجا تو بھکاری کرتے ہیں۔" تو ہم بھکاری کیوں بنیں؟ اہتمام ہم کرنہیں سکتے تو سب اللہ پہ چھوڑدیا اور ماریہ کی جو حالت لکھی ہے وہ جیسے میری حالت ہو' فرق یہ ہے اس کے پاس بورشے اور جگنو تھے میرے پاس دوسروں کے لیے اچھی سوچ ہے۔

ج۔ پیاری مسرت! اچھی سوچ بورشے اور جگنو سے کم نہیں جو دلوں میں محبت کو جنم دیتی ہے اور آپ کی اور دوسروں کی زندگی کو آسان بناتی ہے اور یہ بھی اللہ کا انعام ہے۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ ہماری دیرینہ قاری ہیں۔ آپ کو محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں۔

خبریں وبریں

واصفہ سہیل

چاپلوسی

ہمارے اکثر فنکار جب بولی وڈ جاتے ہیں تو کچھ عرصے بعد انہیں پاکستان انڈسٹری میں خامیاں اور بولی وڈ میں خوبیاں نظر آنے لگتی ہیں اور وہ اس کا اظہار بھی کردیتے ہیں۔ (بھئی جن کے کام میں جان نہیں ہوتی وہ تو ایسا ہی کہیں گے) ان ہی لوگوں میں مومل شیخ کا شمار بھی ہوتا ہے۔ پاکستان میں جب اداکاری' ڈائیلاگ ڈلیوری' مارننگ شو کی میزبانی' ہر طرف سے فیل ہو کر وہ اپنے والد کے حوالے سے بھارت جا پہنچیں اور "بھاگ بینی بھاگ" نامی فلم کے ذریعے بولی وڈ میں قدم رکھا۔ خیال رہے مومل نے پاکستان میں کوئی فلم نہیں کی۔ (سپاٹ لہجہ اور تاثرات سے عاری چہرہ۔ فلم تو کیا ڈراما بھی نہ ملے۔) اس کے باوجود موصوفہ کو بھارتی انڈسٹری کے لوگ پاکستانی انڈسٹری کے لوگوں سے زیادہ پیار دینے والے لگتے ہیں۔ ایک بھارتی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے مومل نے کہا کہ "پاکستان اور بھارتی فلم انڈسٹری کے معیار میں بہت بڑا فرق ہے۔ (آپ کے والد کو یہ فرق نظر نہ آیا۔۔۔؟) میں نے آج تک کسی پاکستانی فلم میں کام نہیں کیا۔ (کسی نے دیا ہی نہیں۔۔۔ بھئی کام۔۔۔) لیکن میں اندازہ لگا سکتی ہوں کہ پاکستانی انڈسٹری کے مقابلے میں بولی وڈ زیادہ گرم جوش اور شفقت بھرا ہے۔ بولی وڈ کے لوگ ایک خاندان کی طرح کام کرتے ہیں۔ (تو باہر کے لوگ۔۔۔؟) ہندی فلم کرنے کے بعد میں بطور اداکارہ نکھری ہوں۔" (یہ تو فلم دیکھ کر ہی پتا چلے گا کہ۔۔۔؟)

شوق

صنم جنگ باتیں بہت اچھی بناتی ہیں (اسی لیے تو ٹی وی کا مارننگ شو اتنی کامیابی سے چلا رہی ہیں) لیکن کھانا بنانا اتنا اچھا نہیں آتا (یہ بات صنم اپنے شو میں بھی بتاتی ہیں) اکثر انہیں ناشتا بھی ان کے شوہر بنا کر دیتے ہیں (یا میں! پائلٹ کو کوکنگ ۔ کی ٹریننگ

بھی دی جاتی ہے؟) لیکن اب صنم بھی سگھڑ بننے کی کوشش کر رہی ہیں اور اس کے لیے انہوں نے باقاعدہ ایک شیف سے کلاسز لینا شروع کر دی ہیں۔ (ارے صنم! چینل پر بھروسا نہیں ہے آپ کو....؟) ویسے صنم جس طرح آپ کھانا پکانا پکانے میں دلچسپی لے رہی ہیں مستقبل قریب میں کوکنگ شو کی میزبانی کرنے کا ارادہ تو نہیں ہے۔ (آخر سگھڑ شوہر کو متاثر بھی تو کرنا ہے نا...)

حوصلہ افزائی

اولمپک گیمز کے پہلے ایونٹ میں ہی پاکستان کے تمام کھلاڑی اولمپک سے باہر ہو گئے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اولمپک کی کوئی تیاری نہیں کی جاتی۔ اس کے فنڈز کہاں جاتے ہیں اس کا جواب شاید کسی کے پاس نہیں (جواب تو اس شرمندگی کا بھی نہیں ہے جو اس صورت حال میں عوام کو ہوئی۔) پاکستان کے ویٹ لفٹر نوح دستگیر بٹ بھی یہی شکوہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "ہمیں کسی ادارے کا تعاون ہی حاصل نہیں، میں کیسے کسی ایونٹ میں حصہ لینے کا ارادہ کروں۔" (بالکل صحیح کہہ رہے ہیں آپ، ابھی تک محمد آصف کو بھی انعامی رقم نہیں ملی۔) انیس سالہ نوح دستگیر کہتے ہیں کہ "میں اگر سترہ سال کی عمر میں 212 کلوگرام وزن اٹھا سکتا ہوں تو اولمپکس میں حصہ کیوں نہیں لے سکتا۔ (بھئی آپ کے پاس کوئی سفارش نہیں ہوگی نا ورنہ....؟) وہاں تو میری ویٹ کیٹگری کے ویٹ لفٹر کو زیادہ سے زیادہ 250 کلوگرام وزن ہی اٹھانا تھا۔"

معیار

فنکار گھرانے سے (بھئی عمیمہ ملک اور دعا ملک کے بھائی جو ہیں) تعلق رکھنے والے فیروز خان نے اپنے پہلے ڈرامے سے ہی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد دوسرے اور تیسرے ڈرامے میں بھی اپنی اداکاری سے اپنے معیار کو قائم رکھا۔ اچھا اداکار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اداکار کا خوش شکل ہونا ضروری ہے؟ اس بارے میں فیروز خان کہتے ہیں کہ "بالکل نہیں، اچھی شکل صرف ایک فیکٹر ہے۔

جسے کچھ دیر کے لیے اسکرین پر برداشت کیا جا سکتا ہے۔ (جیسے کہ.... بھئی آپ خود بھی تو اپنا ذہن استعمال کریں ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی....؟) لیکن اچھا اداکار وہ ہوتا ہے، جو اپنے کردار کو سمجھے اس کے مکالموں کی ادائیگی کا خیال رکھے (جیسے کہ آپ؟) اور اپنے کردار کو اس طرح سے نبھائے کہ دیکھنے والوں کو اصل کا گمان ہو۔ کسی اداکار کے لیے سب سے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے کردار میں اپنے آپ کو کس طرح ڈھالتا ہے۔ (فیروز! آپ یہ باتیں عمیمہ کو کیوں نہیں سمجھاتے....؟)۔

گوشت کے پکوان

خالدہ جیلانی

یوں تو خاتونِ خانہ کے دن کا بیشتر حصہ کچن میں ہی گزرتا ہے۔ مگر عید الاضحیٰ میں تو یہ مصروفیت انتہا پر جا پہنچتی ہے۔ گوشت کی وافر مقدار کے ساتھ ساتھ فرمائشوں کی بھی ایک لمبی فہرست ہوتی ہے، جو گھر کے خوش خوراک اور کھانے پینے کے شوقین افراد کی جانب سے مہیا کی جاتی ہے۔ خود خاتونِ خانہ کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ وہ روزمرہ کے کھانوں سے ہٹ کر نت نئے پکوانوں سے گھر والوں اور مہمانوں کی تواضع کریں۔

اسی بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم نے عید الاضحیٰ کے لیے کچھ خصوصی پکوان آپ کے لیے منتخب کیے ہیں۔ امید ہے تعریف سمیٹتے ہوئے ہمیں داد دینا نہیں بھولیں گی۔

ہرا مسالا کلیجی

اجزاء :

کلیجی	آدھا کلو
دہی	ایک پاؤ
ہرا دھنیا	ایک گٹھی
پودینہ	ایک گٹھی
ہری مرچیں	پانچ سے چھ عدد
پسا لہسن، ادرک	دو کھانے کے چمچے
پسی کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
لال کٹی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

کلیجی میں پسا لہسن ادرک اور چار گلاس پانی ڈال کر چڑھا دیں۔ جب کلیجی ادھ گلی ہو جائے تو چھان لیں۔

ہرا دھنیا، پودینہ، ہری مرچیں، دہی، لہسن ادرک پیس لیں۔ اب ایک پتیلی میں تیل ڈال کر گرم کر لیں اس میں باریک کٹی ہوئی ادرک ڈال کر بھونیں پھر اس میں پسا ہوا آمیزہ ڈال کر کلیجی شامل کر دیں۔ جب اس کا پانی خشک ہونے لگے اور کلیجی گل جائے تو اسے بھون کر چولہے سے اتار لیں۔

ڈش میں نکال کر ادرک، ہرا دھنیا، پودینہ اور لیموں چھڑک کر گرم گرم نان کے ساتھ نوش فرمائیں۔

نمک گوشت

اجزا :

گائے کا گوشت	ایک کلو
پسا لہسن، ادرک	دو کھانے کے چمچے
نمک	ایک چمچہ
پسی کالی مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
لال کٹی مرچ	آدھا کھانے کا چمچہ
ہری مرچیں	چار سے پانچ
لیموں	تین سے چار

ترکیب :

گائے کا چربی اور ہڈی ملا گوشت لے لیں۔ ایک کھلے منہ والی دیگچی میں گوشت ڈال کر پانی اتنا ڈالیں کہ گوشت اچھی طرح ڈوب جائے پھر اس میں نمک، لال کٹی مرچ، پسی کالی مرچ اور ہری مرچیں ڈال کر دھیمی آنچ پر چڑھا دیں۔ جب پانی خشک ہو جائے اور گوشت اچھی طرح گل جائے تو اسے بھونیں دو سے تین منٹ کے لیے پھر ادرک اور لیموں چھڑک کر گرم گرم نان کے ساتھ نوش فرمائیں۔

درباری بریانی

اجزاء :

گوشت	ایک کلو
چاول	ایک کلو
پسا لہسن ' ادرک	دو کھانے کے چمچے
پیاز	دو عدد
نمک	حسب ذائقہ
پسی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
پسا دھنیا	آدھا چائے کا چمچہ
ہلدی	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
آلو بخارے	چھ سے آٹھ عدد
دہی	ایک کپ
بادیان کے پھول	دو عدد
لونگ ' کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
تیز پات	ایک عدد
چھوٹی الائچی	تین عدد
بڑی الائچی	دو عدد
گھی	حسب ضرورت
گرم دودھ	دو کھانے کے چمچے
زعفران	ایک چائے کا چمچہ
پودینہ ' ہرا دھنیا	حسب ضرورت

ترکیب :

پتیلی میں گھی گرم کریں۔ اس میں پیاز ڈال کر سنہرا ہونے تک تلیں۔ اس کے بعد اس میں گوشت ' نمک ' پسا لہسن ' ادرک ڈال کر پانی ——— خشک ہونے تک پکائیں۔ پھر اس میں لال پسی مرچ ' پسا دھنیا ' ہلدی ' آلو بخارے ' دہی ' چھوٹی الائچی اور بڑی الائچی ڈال کر بھون لیں اور ایک کپ پانی شامل کر کے ڈھک کر ہلکی آنچ پر گوشت گلنے تک پکائیں۔ ایک پتیلی میں چاول ڈالیں اس میں پانی ' نمک ' بادیان کے پھول ' لونگ ' کالی مرچ ڈال کر چاولوں کو ایک کنی رہنے تک ابال لیں۔ اس کے بعد پانی نتھار کر چاولوں کو الگ رکھ لیں۔ ایک بڑے پتیلے میں پہلے آدھے چاولوں کی تہہ لگائیں۔ اس کے اوپر تیار کیے ہوئے گوشت کے آمیزے کو ڈالیں۔ اس کے بعد بقیہ چاولوں کی تہہ لگائیں۔ زعفران کو گرم دودھ میں بھگو کر چاولوں کے اوپر ڈالیں۔ ہرا دھنیا و پودینہ ڈال کر دم پہ لگا دیں۔ مزیدار درباری بریانی تیار ہے گرم گرم سرو کریں۔

ہانڈی کباب

اجزاء :

گائے کا قیمہ	ایک کلو
لال کٹی مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
خشک دودھ	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
لیموں	دو عدد
ہری مرچ	تین ثابت ' تین باریک کٹی ہوئی
پیاز	ایک عدد
تیل	ایک پیالی
بیسن	دو کھانے کے چمچے
کالی مرچ کٹی ہوئی	ایک چائے کا چمچہ
ڈبل روٹی کے سلائس	دو عدد
پسا ادرک لہسن	ایک کھانے کا چمچہ
ٹماٹر	آدھا کلو
ہرا دھنیا	ایک گٹھی
لیموں	تین سے چار عدد

ترکیب :

سب سے پہلے قیمے میں سلائس کا درمیانی حصہ ' بیسن (بیسن کو پہلے گھی میں بھون لیں) ہری مرچ اور نمک ملا کر پیس لیں۔ ایک انڈا قیمے میں ملا کر اس کو گوندھ لیں پھر چھوٹے چھوٹے سیخ کبابوں کی طرح کباب بنا کر ہلکی آنچ پر تل لیں۔ جب کباب سنہری ہو جائیں تو نکال لیں۔ اب ایک پتیلی میں تیل ڈال کر پسی ہوئی پیاز ڈال دیں جب گلابی ہو جائے تو ٹماٹر ' سرخ مرچ ' کالی مرچ ' پسا لہسن ادرک ' نمک۔ اور ہری مرچ

ڈال کر پکنے دیں۔ جب پانی سوکھنے لگے تو ہلکا سا بھون لیں' پھر تلے ہوئے کباب پھیلا کر ڈال دیں اوپر سے لیموں کا رس اور ہرا دھنیا ڈال کر ہلکی آنچ پر دم پر رکھ دیں۔ مزیدار ہانڈی کباب تیار ہیں۔ گرم نان کے ساتھ نوش فرمائیں۔

باربی کیو بوٹی

اجزاء :

گائے کی بوٹی (انڈر کٹ)	ایک کلو
پسا لہسن' ادرک	ایک چائے کا چمچہ
پسی لال مرچ	دو چائے کے چمچے
گھی	دو کھانے کے چمچے
پپیتا	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
کباب چینی (پسی ہوئی)	آدھا چمچہ

ترکیب :

گوشت کو اچھی طرح دھولیں۔ اس پر نمک' دہی' پپیتا' لہسن' ادرک' لال مرچ' کباب چینی اور گھی لگا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ سیخوں پر بوٹیاں لگائیں اور اوون میں بیک کریں۔ چاہیں تو کوئلہ پر بھی سینک سکتے ہیں۔ مزیدار باربی کیو بوٹی تیار ہے۔ سیخوں سے اتار کر پلیٹ میں رکھیں اور سلاد کے ساتھ سرو کریں۔

ہنٹر بیف

اجزاء :

ران کا گوشت	ایک کلو
لہسن	ایک گٹھی درمیانی
سرکہ	ڈیڑھ پیالی
ادرک	ایک ٹکڑا
نمک	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب :

لہسن' ادرک کو پیس کر نمک اور سرکہ بھی اس میں ملا لیں پھر گوشت پر کٹ لگا کر مسالا اس پر لگا دیں۔ اب مسالا لگے گوشت کو کم از کم پانچ گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پانچ گھنٹے بعد گوشت کو ابال لیں' ابلے گوشت کے ٹکڑے کاٹ لیں پھر ان کو چاہیں تو اسی طرح کھالیں' زیادہ ذائقہ دار بنانے کے لیے تھوڑے سے تیل میں تل لیں۔

ڈرائی فروٹ شیر خُرمہ

اجزاء :

دودھ	ایک لیٹر
چینی	ایک تہائی کپ / حسب ذائقہ
سویاں	آدھا کپ
گھی	ایک کھانے کا چمچہ
چھوٹی الائچی	چار سے پانچ عدد
ناریل' چھوہارے	حسب پسند
پستہ' بادام' کشمش	حسب پسند
پسے چاول کا آٹا	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب :

دیگچی میں گھی گرم کر کے الائچی ڈال کر کڑکڑائیں۔ سویاں' کھوپرا' چھوہارے' پستہ' بادام اور کشمش ڈال کر بھون لیں۔ پھر اس میں پہلے دودھ اور چینی ملائیں اور الگ سے تھوڑے سے دودھ میں چاول کا آٹا گھول کر ڈال دیں۔ دس منٹ تک ہلکی آنچ پر پکائیں اور چولہا بند کردیں۔ سرونگ ڈش میں شیر خرما نکال کر میوے سے سجا کر گرما گرم پیش کریں۔

بقیہ سروے

استعمال کریں مہک 'خوشبو' ذائقہ 'لذت' سب ہی کچھ اس مٹن اسپیشل میں ملے گا۔ ہمیشہ کھانے والا بس انگلیاں چاٹتا رہ جائے گا ساتھ میں چاہے سفید چاول سرو کریں چاہے گھر کے آٹے کی نرم' خوشبودار بھاپ اڑاتی چپاتیاں یا پھر روغنی (کشمیری خوراک) خمیری روٹی + نان کلچے گرم گرم' سلاد ساتھ ضرور بنائیں لیموں سے سجا کر مزا نہ آیا تو پھر کہیے گا۔ ہاں اہم بات تو شیئر کرنا بھول چلی تھی خلوص' محبت اور خاص طور پر مہمان نوازی اللہ کریم کو پسند ہے۔ یہ نیت کرکے پکائیں' کھلائیں اور کھائیں گی تو سچا مزا آئے گا دلی خوشی ملے گی۔

3 ۔ سچ کہتے ہیں میٹھی عید لڑکیوں بالیوں' بچوں بچیوں کی عید ہے' میکے میں تو والد محترم ساتھ مل کر پکاتے کھلاتے' بلا گالا مچاتے تھے مگر سسرال میں مرد ویسے دیتی تھے مگر گھر کے کاموں میں ہاتھ لگانا بالکل اچھا نہیں سمجھتے تھے ذاتی طور پر

مجھے گھر کے کام اپنے ہاتھوں سے کرنے بہت اچھے لگتے ہیں البتہ صحت اجازت نہ دے تو پھر بوجھ لگتا ہے ورنہ کبھی نہیں کیونکہ ہمارے ابو جی کی تربیت خالص اسلامی تھی مہمان بوجھ نہیں رحمت ہے اور واقعی رحمت ہی ہوتا ہے۔ آزما کر عقل سے دیکھیے گا۔

طحہ مصطفیٰ... فاروق آباد

1 ۔ مہمان زیادہ انوائیٹڈ نہیں ہوتے کیونکہ سب ہی کی طرف قربانی ہوتی ہے تو عید مل کے سب اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے ہیں اور ہاں بھئی سارا ددھیال ایک ہی محلے میں آباد ہے۔ البتہ فرینڈز کو بلایا جاتا ہے تو خوب موج میلا ہوتا ہے۔ دعا میری چھوٹی سسٹر اس کی ذمہ داریاں صرف اور صرف کوکنگ کرنا۔ میرا صفائی ستھرائی اور امی جان کا روٹی وغیرہ پکانا۔

2 ۔ گوشت کی کوئی بھی خاص ڈش نہیں۔ مجھے تو کوکنگ کا کچھ خاص پتا نہیں۔ البتہ دعا ہوتی تو بتاتی وہ محترمہ ہاسٹل میں زیر تعلیم ہیں۔ البتہ ابلا ہوا نمکین گوشت مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ تھوڑا سا نمک' پانی اور گوشت پریشر ککر میں ڈال کر بند کر دیں۔ پندرہ منٹ بعد بوائلڈ میٹ تیار ہے۔ فاروق آباد کی مشہور اور مرغوب غذا ہے۔ یہ ہر گھر میں لازمی پکتی ہے۔ آپ بھی ٹرائی کیجئے گا۔

3 ۔ بھئی ہم تو قربانی میں بھرپور حصہ لیتے ہیں۔ گوشت بناتے ہیں۔ پیک کرتے ہیں۔ بھائیوں کے ترلے منتیں کر کرکے انہیں لوگوں کے گھروں میں دینے کے لیے بھیجتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہمارے گھروں کے مردوں کو کوکنگ کا زیادہ شوق ہے۔ کمال کے کک بھی ہیں۔

نوال افضل گھمن... گلستان جوہر کراچی

1 ۔ بقرعید چونکہ قربانی پر ڈیپینڈڈ ہوتی ہے۔ قصاب کب دستیاب ہو اور کب گوشت کی وصولی ہو۔ ویسے پہلا دن ہمارے ہاں اور دوسرا دن میری عزیز از جان دوست عارفہ معین کے ہاں ماڈل ٹاؤن میں جہاں بانو قدسیہ جی سے بھی ملاقات کا شرف نصیب ہو جاتا ہے۔

3 ۔ جی جناب کیوں نہیں اس بات میں کوئی شک نہیں کہ انٹرنیشنل لیول پر ذائقہ مردوں ہی کے ہاتھ میں ہے۔ پی سی ہوٹل وغیرہ میں اور سب فائیو اسٹار اور سیون اسٹارز میں مرد ہی بلاشبہ اعلا پائے کے شیف ہیں۔ تو میرا ہم سفر واقعی بہت میری بہت مدد کرتا ہے ہر کام میں ماہر یہ میری لک ہے۔

میری سہیلی، میری بھابی کا اہم کردار

باتیں اکرام عباسی سے

شاہین رشید

1۔ "اصلی نام؟"
"اکرام عباسی۔"

2۔ "تاریخ پیدائش؟"
"27 جولائی 1984ء۔"

3۔ "پیار کا نام؟"
"آکی۔"

4۔ "قد/ستارہ؟"
"5 فٹ 1/2 10 انچ۔"

5۔ "بہن بھائی؟"
"تین بھائی، ایک چھوٹی بہن، دو بھائی اور بہن چھوٹی ہے۔"

6۔ "شادی؟"
"میں شادی شدہ ہوں اور تقریباً ساڑھے چار سال ہو گئے ہیں شادی کو.... اور ماشاء اللہ سے دو بیٹے ہیں میرے۔"

7۔ "تعلیمی قابلیت؟"
"بی کام۔"

8۔ "شوبز میں آمد؟"
"اپنی ایک دوست کی کزن نے مجھے اس طرف راغب کیا اور ماڈلنگ سے ابتدا ہوئی۔"

9۔ "پہلا ڈراما؟"
"تھوڑا سا آسمان۔"

10۔ "آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟"
"کام پر منحصر ہے۔ کام ہو تو جلدی ورنہ آرام سے اٹھتا ہوں۔"

11۔ "ناشتہ ڈٹ کر کرتے ہیں؟"
"بالکل جی۔ صبح اٹھ کر شاور لے کر اچھا سا ناشتہ کرتا ہوں۔"

12۔ "والدین کے لاڈلے تھے؟"
"جی الحمدو للہ.... مگر بدقسمتی سے والدہ ہمارا ساتھ جلدی چھوڑ گئیں۔"

13۔ "کوئی کھانا جو بالکل پسند نہ ہو؟"
"ماش کی دال کے علاوہ سب کچھ کھا لیتا ہوں۔"

14۔ "اپنے آپ کو مکمل سمجھتے ہیں؟"
"اگر جسمانی لحاظ سے دیکھا جائے تو مکمل ہوں۔ باقی تو ہر انسان میں کمی بیشی ہوتی ہی ہے۔"

15۔ "شدید بھوک کو کس طرح کم کرتے ہیں؟"
"کچھ بھی مل جائے کھا لیتا ہوں۔"

16. "دوستوں میں دل لگتا ہے یا رشتے داروں میں؟"
"میرا ایک ہی دوست ہے .... باقی کام میں ہی بہت مصروف رہتا ہوں۔"

17. "فخر کا کوئی لمحہ؟"
"ہر لمحہ .... کیونکہ اللہ نے مجھے بہت نوازا ہے۔"

18. "آپ کو انتظار رہتا ہے؟"
"کوئی ایسا دن نہیں ہے۔"

19. "تہوار؟"
"عید۔"

21. "خوشی کو کس طرح سیلیبریٹ کرتے ہیں؟"
"مجھے سرپرائز دینے کا بہت شوق ہے۔ بیگم سے بات چھپاتا ہوں اور سسپنس کری ایٹ کرتا ہوں اور پھر کچھ ٹائم کے بعد بتاتا ہوں۔"

22. "بچپن کی کوئی بری عادت جو ابھی تک موجود ہو؟"
"بھوک بہت لگتی ہے۔ کچھ کھائے بغیر رہ نہیں سکتا۔"

23. "نوجوانی کی کوئی بری عادت؟"
"رات کو جاگنے کی عادت.... اب کچھ کم ہو گئی ہے۔"

24. "آپ کی کوئی چھپی ہوئی خوبی یا خامی؟"
"جو لوگ مجھ سے ملتے ہیں انہیں قطعی احساس نہیں ہوتا کہ میں غصے کا بہت تیز ہوں اور خوبی یہ کہ ٹھنڈا بھی ہو جاتا ہوں۔"

25. "غصے میں کیفیت؟"
"دل کرتا ہے کہ پتھر مار کر دیوار توڑ دوں۔ چیزوں کو نقصان نہیں پہنچاتا.... بس دل چاہتا ہے۔"

26. "پسندیدہ دن سات دنوں میں؟"
"جس دن میں اپنے بچوں کے ساتھ ہوتا ہوں۔"

27. "پسندیدہ موسم؟"
"سردیوں کا۔"

28. "لڑکیوں میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟"
"کبھی غور نہیں کیا۔"

29. "کوئی لڑکی گھورے تو؟"
"کوئی ایک گھورے تو ری ایکشن بھی آئے۔ سب ہی گھورتی ہیں.... قہقہہ۔"

30. "گھر میں کس کا غصہ تیز ہے؟"
"میرا ہی تیز ہے۔"

31. "زندگی میں کس چیز کی کمی محسوس کرتے ہیں؟"
"کوئی کمی نہیں .... اللہ نے بہت سی نعمتیں دی ہوئی ہیں۔"

32. "پرائز بانڈ لیتے ہیں؟"
"نہیں شوق ہی نہیں ہے۔"

33. "مشترکہ اکاؤنٹ کس کے ساتھ ہونا چاہیے؟"
"کسی کے ساتھ نہیں اپنا اکاؤنٹ ہی اپنا ہوتا ہے۔"

34. "بچت کس انداز میں کرتے ہیں؟"
"پراپرٹی اور گولڈ کی صورت میں۔"

35. "ڈبل شہریت کا شوق ہے؟"
"نہیں جی.... اپنا ملک اپنا ہی ہوتا ہے۔"

36. "شاپنگ کے شوقین ہیں؟"
"بے انتہا شوقین ہوں.... لڑکیوں سے بھی زیادہ مجھے شاپنگ کا شوق ہے۔"

37. "فضول خرچ ہیں؟"
"بالکل جی.... دل کھول کر خرچ کرتا ہوں۔"

38. "آپ کو ڈر لگتا ہے؟"
"اللہ کی ذات سے کہ میری کوئی بات 'کوئی فضول خرچی اسے بری نہ لگ جائے۔"

39. "مشکلات میں وقت گزارا؟"
"بہت شدید مشکلات میں وقت گزارا.... شادی سے ڈیڑھ سال پہلے اور شادی کے ایک سال بعد تک۔"

40. "موڈ خراب ہو تو؟"
"پانی پیتا ہوں، تھوڑی تازہ ہوا کھاتا ہوں اور بس، پھر ٹھیک ہو جاتا ہے موڈ.... زیادہ ٹائم نہیں لگتا۔"

41. "بہترین تحفہ آپ کی نظر میں؟"
"ایک اچھی سی مسکراہٹ۔"

42. "شاپنگ میں برانڈز کو ترجیح دیتے ہیں؟"
"ہرگز نہیں.... جو چیز پسند آجائے.... میرے پاس پانچ سو والا جوتا بھی ہے اور پانچ ہزار والا بھی.... پسند پر منحصر ہے۔"

43. "طبیعت میں لاپروائی ہے؟"
"بالکل بھی نہیں.... صبح اٹھتا ہوں تو اپنے بیڈ کی چادر خود ٹھیک کرتا ہوں.... اور دیگر کام بھی۔"
44. "چھٹی کا دن کہاں گزارتے ہیں؟"
"پارک میں' مالز میں اور پھر کھانا کھا کر گھر آجاتے ہیں۔"
45. "سچی محبت کس میں دیکھی؟"
"صرف اور صرف ماں میں۔"
46. "کسی کی سچی محبت دیکھنی ہو تو؟"
"اگر آپ کسی سے سچی محبت کرتے ہیں تو اسے کبھی آزمائش میں نہ ڈالیں۔"
47. "لڑکی پسند کرتے وقت کیا بات مد نظر رکھنی چاہیے؟"
"پہلے سیرت' پھر صورت۔"
48. "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"صرف اپنے کمرے میں' حالانکہ سارا گھر اپنا ہوتا ہے۔"
49. "کیا ایس ایم ایس کے جواب فوراً" دیتے ہیں؟"
"صرف بیگم کو فوراً" جواب دیتا ہوں۔"
50. "بوریت ہو رہی ہو تو؟"
"درود شریف کی تسبیح پڑھنے لگتا ہوں۔"
51. "والٹ کی تلاشی لیں تو؟"
"تو ہزار ڈیڑھ ہزار کیش نکلے گا۔ آئی ڈی اور اے ٹی ایم کارڈ.... اور بڑے بیٹے کی فوٹو نکلے گی زیادہ چیزیں لے کر نہیں نکلتا۔"
52. "اگر آپ پاور میں آجائیں تو؟"
"ایجوکیشن لازمی کر دوں گا' خواتین پہ تیزاب پھینکنے والوں کے ہاتھ توڑنے کا قانون بنا دوں گا.... اور وی آئی پی پروٹوکول ختم کر دوں گا۔"
53. "کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟"
"ویسے تو پیسے جمع کرنے کا شوق ہے مگر کپڑے اور جوتے جمع کرنے کا بھی شوق ہے۔"
54. "فیلڈ میں آنے کے بعد ایک قیمتی چیز جو آپ نے خریدی؟"
"گاڑی خریدی ہے۔"
55. "کب کنجوسی نہیں کرتے؟"
"جب بیگم اور بچوں کو کچھ چاہیے ہوتا ہے۔"
56. "کہاں کھانے کا مزہ آتا ہے.... ڈائننگ ٹیبل۔ اپنا بیڈ یا چٹائی؟"
"دستر خوان لگا کر زمین پہ چٹائی پر بیٹھ کر کھانے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔"
57. "کون سا کھانا مسلسل بھی کھائیں تو مزہ آتا ہے؟"
"اپنی بیگم کے ہاتھ کا کھانا۔"
58. "انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟"
"زیرو فیصد.... سب کچھ فیک لگتا ہے۔"
59. "اپنے آپ کو ساتویں آسمان پر کب محسوس کرتے ہیں؟"
"ابھی تو نہیں.... شاید فیوچر میں کروں۔"
60. "کھانے کس قسم کے پسند ہیں؟"
"اپنے دیسی کھانے.... اس سے آگے کچھ نہیں۔"
61. "مضبوط اعصاب کا کون ہوتا ہے۔ مرد یا عورت؟"
"میرے خیال سے عورت۔ وہ ہر روپ میں اسٹرونگ ہوتی ہے۔ خواہ بیوی کا روپ ہو' بیٹی یا ماں کا یا بہن کا۔"
62. "عشق کے بخار چڑھے؟"
"نویں کلاس سے چڑھے.... مگر شکر کہ بگڑا نہیں۔"
63. "محبت اندھی ہوتی ہے؟"
"اٹریکشن ہوتی ہے.... کہ آپ کو اچھا لگ رہا ہوتا ہے۔"
64. "کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"
"نہیں.... کسی سے نہیں۔"
65. "شادی کی رسومات میں پسندیدہ رسم؟"
"انگوٹھی پہنانے کی رسم۔"
66. "کوئی ایسی شخصیت جس کو آپ اغوا کرنا چاہتے ہیں اور تاوان میں کیا لینا چاہتے ہیں؟"
"بہت مزے کا سوال ہے.... کسی ایسے نیک انسان کو اغوا کرنا چاہوں گا' جس کے ساتھ رہ کر میں بھی نیک انسان بن جاؤں۔"

67۔ "پسندیدہ تاریخی شخصیت؟"
"کوئی نہیں۔"
68۔ "موبائل نمبر تبدیل کرنے کا شوق ہے؟"
"نہیں.... بس ایک ہی بار کیا.... باربار تبدیل کرنے سے لوگوں کو پریشانی ہوتی ہے۔"
69۔ "کیا کچھ لیے بغیر آپ گھر سے نہیں نکلتے؟"
"گاڑی کی چابی.... موبائل وغیرہ۔"
70۔ "گھر میں کوئی ناراض ہو جائے تو؟"
"نہیں اللہ کا شکر ہے کوئی ناراض نہیں ہوتا اور کوئی ہو بھی جائے تو ایکسکیوز کر لیتے ہیں۔"
71۔ "اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟"
"بالکل کر لیتا ہوں۔"
72۔ "اپنے آپ کو دوسروں سے الگ سمجھتے ہیں؟"
"ہاں.... مجھے لگتا ہے کہ میں دوسروں سے تھوڑا سا الگ ہوں.... گلیمر نے زیادہ بگاڑا نہیں ہے.... بہت سمپل انسان ہوں۔"
73۔ "دل کی سنتے ہیں یا دماغ کی؟"
"دونوں کی...."
74۔ "اچھی اور بری عادت؟"
"غصہ بہت آتا ہے / اور فرینڈلی بہت ہوں۔"
75۔ "غصہ کھانے پہ نکلتا ہے؟"
"بالکل نکلتا ہے کھانا پینا چھوڑ دیتا ہوں۔"
76۔ "خواتین تو شہرت سے گھبراتی ہیں اور آپ....؟"
"نہیں میں نہیں گھبراتا.... ہاں کبھی فیملی کے ساتھ کھانا کھا رہے ہوں تو مسئلہ ہوتا ہے۔"
77۔ "نیند فوراً آجاتی ہے؟"
"نہیں جی.... ٹائم لگتا ہے۔"
78۔ "اپنے سرہانے کیا کیا رکھ کر سوتے ہیں؟"
"موبائل۔"
79۔ "کھانا کن چیزوں کے بغیر ادھورا لگتا ہے؟"
"پانی.... بہت ضروری ہے۔"
80۔ "خدا کی حسین تخلیق؟"
"سب کچھ.... کوئی ایک چیز نہیں.... پوری کائنات۔"
81۔ "زندگی میں کس چیز کی کمی ہے؟"
"کچھ نہیں.... رب نے سب کچھ دیا ہے۔"
82۔ "نیند کے دھنی ہیں؟"
"بالکل.... گہری نیند سے کوئی اٹھا دے تو ہڑبڑا کر اٹھ جاتا ہوں۔ یعنی گھبرا جاتا ہوں۔"
83۔ "جھوٹ کب بولتے ہیں؟"
"کبھی کبھار سچویشن کے حساب سے۔"
84۔ "بدلہ لیتے ہیں؟"
"نہیں کبھی نہیں۔"
85۔ "اپنی پرسنالٹی میں کیا تبدیلی کرنا چاہتے ہیں؟"
"کچھ نہیں.... جیسا بنایا ہے۔ بہت اچھا بنایا ہے۔"
86۔ "دن کے کس حصے میں فریش محسوس کرتے ہیں؟"
"جب "جم" سے آتا ہوں۔"
87۔ "آپ کا پسندیدہ چینل؟"
"ڈرامے بہت شوق سے دیکھتا ہوں تو بس جہاں ڈراما آرہا ہو میرا پسندیدہ وہ دیکھتا ہوں۔"
88۔ "گھر آکر پہلی خواہش؟"
"بچوں کو گلے لگانے کی۔"
89۔ "موبائل رحمت یا زحمت؟"
"ضرورت ہے.... میں اس معاملے میں اتنا کریزی نہیں ہوں۔"
90۔ "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتے ہیں؟"
"میں چلتے پھرتے فقیروں کو بہت کم دیتا ہوں۔ کسی ٹرسٹ میں دے دیتا ہوں۔"
91۔ "کس ملک کے لیے کہتے ہیں کہ کاش ہمارا ہوتا؟"
"میں نے جتنا مشاہدہ کیا ہے تو محسوس کیا ہے کہ اپنے ملک سے بہتر کوئی ملک نہیں۔"
92۔ "ملک میں کیا تبدیلی ضروری ہے؟"
"ہمیں خود تبدیل ہونا پڑے گا۔ اپنی سوچ کو بدلنا پڑے گا۔"
"اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"اللہ کی مرضی.... عروج کو زوال تو آتا ہی ہے۔ اس میں کوئی مصلحت ہوگی۔"

☆

س۔ الف، گجر خان

آپ کی دوست نے بڑی غلطی کی ہے۔ ایک بھٹکی ہوئی عورت جو اپنے شوہر کو دھوکا دے کر رشتوں کا تقدس پامال کررہی تھی۔ آپ کی دوست نے اس غلط کام میں اس کا ساتھ دیا اور آپ کی دوست خود بھی اسی راستے پر گامزن ہوگئی۔ یہ آپ کی دوست پر اللہ کا کرم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کسی بڑی برائی سے محفوظ رکھا۔

اس طرح آپس میں لڑکا لڑکی کے فون پر ''قبول ہے'' کہنے سے کوئی نکاح نہیں ہوجاتا۔ نکاح کے لیے چار گواہ ہونا ضروری ہیں اور اس کے بعد باقاعدہ اس کا اعلان ہونا بھی ضروری ہے۔

اپنی دوست سے کہیں کہ اس کی عافیت اسی میں ہے کہ بے غیرت لڑکے اور بے حیا سہیلی کو بھول جائے اور آئندہ کبھی بھول کر بھی اس سے رابطہ نہ کرے۔

والدین کبھی اولاد کا برا نہیں چاہتے۔ رشتوں کا معاملہ اپنے والدین پر چھوڑدے اور جہاں وہ رشتہ کریں وہاں شادی کرلے' یہی اس کے حق میں بہتر ہے۔

صائمہ خان، پشاور

س : میرا رشتہ خاندان میں رشتے کے چچا کے گھر طے ہوا ہے۔ شادی سے پہلے میں نے اس لڑکے کو دیکھا ہوا تھا۔ میری اس سے بات چیت نہیں تھی۔ دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک تھا۔ اس نے بھی یقیناً مجھے دیکھا ہوگا کیونکہ تقریبات میں کئی بار آمنا سامنا ہوچکا تھا۔ اس کے علاوہ ایک دوبار اپنے والدین کے ہمراہ وہ ہمارے گھر بھی آیا تھا۔ جب ان کے ہاں سے رشتہ آیا تو والدین نے پسندیدگی ظاہر کی۔ مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ میں نے ہاں کردی۔ منگنی کے بعد اس نے فون پر بات چیت شروع کردی۔ اس کی بہن نے میرا فون نمبر اسے دیا تھا' لیکن جس قسم کی باتیں وہ کرتا ہے' اس نے مجھے پریشان کردیا ہے۔ اسے میرے دبلے پن پر اعتراض ہے۔ قد چھوٹا لگتا ہے۔ بار بار جتاتا ہے کہ میں زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہوں۔ میں نے کہا کہ جب اسے اتنے اعتراض ہیں تو اس نے منگنی کیوں کی۔ اپنے والدین کو منع کردیتا' وہ یہاں رشتہ نہ کرتے۔ اس پر اس نے کہا کہ میں تو مذاق کررہا تھا تم خوامخواہ سنجیدہ ہوگئیں۔ لیکن دو چار دن بعد پھر اسی طرح کی باتیں شروع کردیں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ منگنی اس کی مرضی کے بغیر ہوئی ہے اور اب وہ چاہتا ہے کہ بددل ہوکر میں انکار کردوں تاکہ اس پر بات نہ آئے۔

ہمارے خاندان کا جو ماحول ہے اس میں رشتہ طے ہونے کے بعد رشتہ توڑنے کا سوچا بھی نہیں جاسکتا کجا کہ ایک لڑکی کا انکار.... میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔

ج : اچھی بہن! آپ کا اندازہ کسی حد تک درست ہوسکتا ہے لیکن ممکن ہے کہ اس طرح کی گفتگو اس کی عادت میں داخل ہو.... کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنی برتری ظاہر کرنے کے لیے دوسروں میں بلاوجہ کے نقص نکالتے ہیں اور نکتہ چینی کرتے ہیں۔ بہرحال یہ اس کی عادت ہو یا اس رشتہ کے لیے ناپسندیدگی' دونوں صورتوں میں آپ کی تشویش بجا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ اپنی والدہ کو تمام باتیں بتادیں پھر وہ جو فیصلہ کریں کیونکہ بات خاندان کی ہے' اس لیے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہوگا۔

حمیرا بلوچ..... خضدار

شادی کے بعد ایک بھرے پرے سسرال میں آئی۔ ساس سسر کی خدمت اور نندوں اور دیوروں سے محبت کو اپنا فرض سمجھا۔ خلوص اور فرماں برداری کی انتہا کردی۔ مگر پھر بھی لگتا ہے سسرال والے خوش نہیں۔ میکے بہت کم جانا ہوتا ہے۔ ساس ڈھکے چھپے لفظوں میں دل دکھاتی رہتی ہیں۔ شوہر سعودی عرب میں کام کرتے ہیں۔ میرا بھی ویزا لگ گیا ہے۔ جلد ہی وہاں چلی جاؤں گی مگر سوچتی ہوں کہ ایک شہر میں رہ کر بھی اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں سے اتنے جتن کرنے کے بعد ملتی تھی۔ وہاں سے کیسے آؤں گی؟ ٹیلیفون کرنے پر بھی پابندی ہے۔ اچھا گھر، زیورات، شوہر کی محبت سب کچھ ہے مگر اپنوں سے دوری نے مریضہ بنا دیا ہے۔

ج : اچھی بہن! اس میں شک نہیں کہ دنیا کی تمام نعمتیں حاصل ہونے کے باوجود بے جا پابندیاں لگائی جائیں تو انسان گھٹن محسوس کرتا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جو کچھ "حاصل" ہے اس کا شکر کرکے اللہ کی رضا پر راضی اور خوش رہا جائے تو انسان بہت سی پریشانیوں سے بچ جاتا ہے۔

آپ کی ساس نے آپ پر پابندیاں لگائیں، میکے نہیں جانے دیا تو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آپ کے شوہر دور تھے۔ آپ ساس کے ساتھ رہتی تھیں، انہیں آپ کا خیال رکھنا تھا کیونکہ کسی اونچ نیچ کی صورت میں وہ اپنے بیٹے کے سامنے جواب دہ ہوتیں کہ انہوں نے آپ کا خیال نہیں رکھا۔

اب جبکہ آپ کا ویزا لگ گیا ہے اور آپ سعودی عرب جانے والی ہیں تو پریشان نہ ہوں۔ آپ کے شوہر اپنے گھر والوں سے ملنے پاکستان آئیں گے تو آپ بھی اپنوں سے مل سکیں گی۔ ضروری نہیں کہ یہ پابندیاں ہمیشہ رہیں۔ ویسے بھی بچے ہونے کے بعد عورت بہت مضبوط ہو جاتی ہے۔

انجم شاہین، ملتان

س : میرے شوہر پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہیں۔ بے حد نفیس طبیعت کے مالک ہیں۔ مگر ان کا دہرا رویہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ مالی لحاظ سے مستحکم ہیں مگر گھر میں تلا تلا خرچ دیتے ہیں۔ ضروریات کے لیے بھی پیسے مانگو تو کہتے ہیں کہ مردوں کو ایسی عورتیں سخت بری لگتی ہیں جو ہر وقت پیسوں کا مطالبہ کرتی ہیں، مہمانوں کے سامنے میرے سامنے یوں بچھے جاتے ہیں جیسے ان سے بڑھ کر میرا چاہنے والا کوئی نہیں۔ بہت رحم دل ہیں خاص طور پر صنف نازک کے حوالے سے۔ میری ایک طلاق یافتہ دوست کا مفت علاج کیا۔ اب انسانیت اور مظلوم عورت کا سہارا بننے کی خاطر اس عورت سے شادی کرنے کے درپے ہیں۔ عدنان بھائی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نیکی سے انہیں کیسے روکوں؟ میرے چار بچے ہیں اور ابھی پڑھ رہے ہیں۔

ج : پیاری بہن! شوہر کی اس "رحم دلی" پر آپ کی پریشانی بجا ہے۔ جب وہ ابھی خرچ دینے میں اتنی کنجوسی کرتے ہیں تو دوسری شادی کے بعد ان کا کیا حال ہوگا۔ اب سوال یہ ہے کہ انہیں دوسری شادی سے کیسے روکا جائے۔ وہ دوسری شادی کا تہیہ کرچکے ہیں اور جب آپ کے سامنے اپنا ارادہ بھی ظاہر کردیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی دوست بھی ان سے شادی پر رضامند ہیں۔ آپ کے منع کرنے پر اگر وہ رک سکتے ہیں تو آپ یہ کوشش کرکے دیکھ لیں۔ بصورت دیگر آپ ان سے اپنے اور اپنے بچوں کے لیے کوئی سیکیورٹی حاصل کریں۔ گھر اپنے نام کرائیں اور ان سے اپنے اور بچوں کے لیے ماہانہ خرچ لکھوائیں۔

ویسے وہ جس طبیعت اور مزاج کے مالک ہیں، اس سے تو لگتا ہے کہ آپ کی دوست کنویں میں چھلانگ لگانے جارہی ہیں لیکن اس وقت آپ اپنی دوست کو کچھ بھی بتائیں گی تو وہ یقین نہیں کریں گی۔ اگر دوست کو کسی طریقے سے سمجھا سکتی ہیں تو ایک بار کوشش ضرور کریں۔

عید میک اپ پلان

عید پر خوب صورت لباس کے ساتھ ساتھ سلیقے سے کیا گیا میک اپ آپ کی جاذبیت میں اضافہ کرتا ہے۔

میک اپ سے قبل اپنا چہرہ اچھی طرح صاف کریں۔ اس کے بعد چہرے اور گردن پر اچھا سا موئسچرائزر لگا کر تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دیں۔ تاکہ وہ اچھی طرح جذب ہو جائے' یہ آپ کی جلد کی نمی کو برقرار رکھتا ہے۔ پھر میک اپ کا آغاز کیجیے۔

سب سے پہلے فاؤنڈیشن کی تہہ لگائیے۔ خشک جلد والی خواتین لیکوئڈ فاؤنڈیشن کا انتخاب کریں۔ فاؤنڈیشن کا انتخاب اپنے چہرے کی رنگت کی مناسبت سے کریں۔

فاؤنڈیشن کے بعد فیس پاؤڈر لگائیں۔ پاؤڈر کے رنگ کا انتخاب فاؤنڈیشن کے رنگ کی مناسبت سے کریں۔ اس کے بعد بلش آن لگائیں۔ اگر آپ کا چہرہ بیضوی ہے تو بلش آن اپنے گالوں کی ہڈیوں پر لگائیں۔

گول چہرے والی خواتین بلش آن کو ہونٹوں سے کانوں کی طرف لگائیں۔ اس سے چہرہ لمبائی کا تاثر دے گا۔ دیگر ساخت کے چہروں پر بلش آن ناک سے گالوں کی طرف لگایا جاتا ہے۔

اب آنکھوں کا میک اپ کیجیے۔ آنکھوں کے میک اپ کے لیے آئی لائنر' آئی شیڈز اور مسکارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بھنوؤں کے نیچے ہلکے رنگ کا آئی شیڈ لگائیں' تاکہ یہ جگہ نمایاں ہو جائے۔ اس سے آنکھیں بڑی لگتی ہیں۔ پپوٹوں کے درمیانی حصوں پر گہرے رنگ کا آئی شیڈ لگائیں۔ انگلی سے ہلکا سا مل لیں' تاکہ دونوں آئی شیڈز کے کنارے واضح نہ ہوں اور وہ الگ الگ نہ محسوس ہوں۔ اب پلکوں پر مسکارا لگائیں۔ کالے رنگ کا مسکارا ہر طرح کی آنکھوں کے لیے سب سے بہتر رہتا ہے۔ اگر آپ نیلا' براؤن' یا کسی اور رنگ کا مسکارا لگانا چاہتی ہیں تو پھر آئی لائنر بھی اسی رنگ کا لگائیے۔ اگر ہلکی پلکیں ہیں تو مسکارا لگانے سے پہلے پلکوں پر تھوڑا سا ٹالکم پاؤڈر لگائیں' پھر مسکارا لگائیں۔ اس سے پلکیں گھنی لگیں گی۔

میک اپ کے آخر میں لپ اسٹک لگائیے' لپ اسٹک میک اپ کا سب سے اہم جز ہے' کیوں کہ یہ میک اپ کا مجموعی تاثر اجاگر کرتی ہے۔ لپ پنسل سے ہونٹوں کی ساخت نمایاں کیجیے۔ ہونٹ زیادہ پتلے ہیں تو پنسل کی مدد سے ہونٹوں سے باہر کی طرف لائن کھینچیے۔ ہونٹ اگر موٹے ہیں تو اندر کی طرف لگائیں۔ پھر لپ برش کی مدد سے لپ اسٹک لگائیے۔ ایک نرم ٹشو پیپر لے کر اسے دونوں ہونٹوں کے درمیان رکھ کر ہلکے سے دبائیے اس کے بعد دوبارہ لپ اسٹک لگائیے۔ اس سے لپ اسٹک زیادہ دیر تک ہونٹوں پر جمی رہے گی۔ اس کے بعد چاہیں لپ گلوس لگا لیجیے۔

اپنے لباس کی ہم رنگ نیل پالش لگائیں۔

اب آپ کا میک اپ مکمل ہے۔ اچھا سا ہیئر اسٹائل بنائیے اور دیکھیے اس عید پر آپ کی سج دھج کس قدر نرالی ہے۔